

ماہنامہ
دیکھن

پاک سوسائٹی
ڈراما



پاک سوسائٹی

Society

LIBRARY OF
PAKISTAN

ONE SITE. ONE COMMUNITY

چاندنگرو پبلیکیشنز

دکھن

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نوز بچہ رسوائی
رکن کونسل آف پاکستان نوز بچہ واپس دے کر

بانی ————— محمود با فیصل
نیکران ————— محمود ریاض
مدیر ————— نادرہ خاقان
مدیر اعلیٰ ————— عامر محمود
نائب مدیر ————— شجاع عمیر
مدیر قلمی ————— اصکت الصیود
رشتہ کاریت ————— خالہ جیلانی



11 اقبال آرزو حمد
11 خالد ایچم نعت



12 شاہین رشید سید علی حسن سے ملاقات
21 اویس ایچم آواز کی دنیا سے
17 سو فیاض میری بھی سنتے
26 امیر شیر مقابل ہے آئینہ



28 نجف عبد اللہ ہوائیں رخ بدل گئیں
254 آسیہ بیزا من مورکھ
134 تنزیلیہ ریاض رائیسنزل



166 مصباح علیہ ہجور نشیمن
58 ریحانہ آفتاب مجھے جینے کا حق دو
204 حیرانوشین پاتل چوڑی



105 حیا بخاری بہار منتظر ہے
235 متعم ملک آواز دو



47 یاسمین نشاط پیوند زدہ
160 زمزم سلیم ایک پل
196 حنا بشری دل بے رحم
99 شبینہ گل دس کاٹوٹ



ڈسکالارہ باب گیتہ ریگسٹری
پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 7000 روپے

ماہنامہ خواتین، ڈائجسٹ اور ادارہ خاتون ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے سچے ماہنامہ شائع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فوٹو اور اس کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما، ڈرامائی تصاویر اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ عمل کا حق رکھتا ہے۔



- | | | | | | |
|-----|--------------|----------------|-----|--------------|-------------------|
| 279 | ادارہ | موتی پختے ہیں | 272 | شعاع عمید | کرن کرن خوشبو |
| 281 | رویسینہ شریف | مُسکراتی کرتیں | 275 | بشری محمود | یادوں کے دیکھے سے |
| 283 | مدیرہ کرن | ناع میکر نام | 277 | شگفتہ سیلوان | مجھے شہر لپیٹتے |



نومبر 2017

جلد 40 شمارہ 8

قیمت 60 روپے



عکس نگار خانہ

کرن

37- ایڈووکیٹ کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے اپنی حسن پر عینک پر عین سے چھوڑ کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ٹائم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com



طلوع ہونے والا ہر نیا دن ہمارے لیے نئے نئے سبق اور تجربات لے کر آتا ہے اور ہر روز عذوبہ ہونے والا سورج ہمارے حاسن میں بلوں جھڑکا ہوا ہے۔ یہ یادیں کہیں ہونٹوں پر مسکن بن کے چمکتی ہیں تو کبھی آنسوؤں کا گھول میں بہہ جاتی ہیں۔ دنیائیں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس کے پاس اچھی بڑی یادوں کا خزانہ نہ ہو مگر ضروری نہیں کہ ہر شخص کسی بلو کا حصہ بھی ہو۔

اس ہزار سالہ قدیم دنیا میں ان گنت لوگ کم نامی کی زندگی گزار کے کم نامی کی موت کر گئے۔ مگر لوگ اپنی ذات کو کبھی پشت ڈال کر خود کو انسانیت کی بھلائی کے لیے وقف کر دیتے ہیں، انسانوں کی فلاح کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیتے ہیں، وقت کے اندھیروں میں ایسے ہی لوگ ملکتوں بن کر نکلتے ہیں۔ جدوجہد، خلوص اور سچائی کی راہ پر چلنے والے یہ لوگ روشنی کا وہ مینار ہوتے ہیں جن سے اگلی نسل راہ پاتی ہیں۔ تاریخ کے اوراق ایسے ہی لوگوں کے نام سے روشن ہیں۔

نیا ناول۔ ہوائیں رُخ بدل گئیں،

نگہت محمد اللہ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا شمار تاریخین کی پسندیدہ مصنفین میں ہوتا ہے۔ وہ متعدد ناول اور افسانے لکھ چکی ہیں۔ کرن میں ان کا ناول ”مجھے روٹھنے نہ دینا“ شائع ہو کر پسندیدگی کی سند حاصل کر چکا ہے۔ اس ماہ سے ان کا نیا ناول شروع کیا جا رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی یہ تحریر پچھلی تمام تحریروں سے بڑھ کر ثابت ہوگی۔

آہارومی انشا،

انشائی کے چہرے صاحبزادے اس طوفانی کواو دار کبہ گئے۔

إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ

پڑے کہ جو اس دنیا میں آیا ہے اسے ایک روز دینا ہے۔ اس کے باوجود دل اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پا رہا کہ رومی انشا ہمارے درمیان نہیں رہے۔ انکسین تم اور دل غم سے چور ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے قرار دے۔

ان کی اہلیہ اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل سے فرمائے۔ آمین۔

تاریخ سے دہائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- ، فکار سیّد علی حسن ”سے شاپن رشیدی ملاقات“ ، آواز کی دُنیا سے ”اس ماہ جہان میں“ (ایس ایم اے ایچ)
- ، اداکارہ ”توینا مشال“ کہتی ہیں ”میری بھی سنئے“ ، اس ماہ ”آغا جگر“ کے مقابل ہے ”آئینہ“
- ، ”راپہ منزل“، تنزیلہ وایمن کے سلسلے دار ناول کی آخری قسط ، ”ہوائیں رُخ بدل گئیں“ نگہت محمد اللہ کے سلسلے دار ناول کی پہلی قسط
- ، ”من جو کہو کہی بات نہ مالتو“، ”اسیر مڈا کاسلے دار ناول“ ، ”رکنا آداب کا مکمل ناول“ ”مجھے جیتنے کا حق دو“ ،
- ، ”بہبود نشیں“ ”مصباح علی سید کا مکمل ناول“ ، ”میری پائل چوڑی کٹکے“ ”حیرانوشین کا مکمل ناول“ ،
- ، ”جیا بخاری کا ناول“ ”بہار منظر ہے“ ، ”آواز دو“ ”مغم ملک کا ناول“ ،
- ، ”یاسین نشاط“ ”شبیدہ گل“ ”خاتون بشری اور منزل سلیم کے افسانے اور مستقل سلسلے ،

مہفت ،

”کرن کا دسترخوان“ ”کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مہفت حاصل کریں۔

سبحر باری تعالیٰ

میرا رب سب کا ہی حاجت روا ہے
وہ مانگو جو بھی جائز مدعا ہے

سراپا مغفرت ہے ذات اس کی
خطا پوشی تو اس کی اک ادا ہے

فنا ہوتی رہی ہر شے جہاں کی
فقط اللہ ہی بس باقی رہا ہے

نہ کوئی اس کا ثانی ہے جہاں میں
ہر اک شے میں وہی جلوہ تما ہے

ہے اس کے حسن کی رعنائی ہر سو
وہی از ابتداء تا انتہا ہے

ہر اک نعمت ملی اقبال کو بھی
یہ سب اس کا کرم اس کی عطیہ ہے

اقبال آرزو

سبحان مقولہ

ذکر سرکار ہوتا رہا دیر تک
یاد میں ان کی روتا رہا دیر تک

ان کی چشم کرم مہرباں ہو گئی
نعت سرکار لکھتا رہا دیر تک

یاد میں ان کی آنسو نکلتے رہے
داخل دل کے میں دھوتا رہا دیر تک

روضہ پاک سے ہم جو پھڑے تو پھر
ہجر کاٹے چھوٹا رہا دیر تک

ذکر میں مست بے خود ہوا جس گھڑی
خوشبوؤں سے مہکتا رہا دیر تک

جہنچے انجم جہاں محفل نعت میں
کیف و مستی کا چرچا رہا دیر تک

غالد انجم

سید علی حسن سے ملاقات

شاہین رشید



”اس چاندیدہ داغ نہیں“ آن ایر ہے۔“
☆ ”گلد..... کچھ اپنے بارے میں، کچھ اپنی فیملی کے بارے میں بتائیے؟“

(۰) ”جی میرا پورا نام سید علی حسن ہے اور سب مجھے علی ہی بلااتے ہیں۔ تاریخ پیدائش 11 اپریل ہے اور ماس کمیونیکیشن میں، میں نے ماسٹر کیا ہوا ہے اور فیملی میں والدین ہیں اور ایک بھائی اور ایک بہن ہے اور زیادہ تر کینیڈا اور امریکہ میں رہتے ہیں، کیونکہ وہ وہاں کے شہری ہیں تو آنا جانا لگا رہتا ہے اور میں بھی آتا جاتا رہتا ہوں۔“

☆ ”11 اپریل آپ کی تاریخ پیدائش ہے۔ شکر کریں کہ فرسٹ اپریل نہیں تھی..... اور آپ مستقل کینیڈا امریکہ میں کیوں نہیں رہتے۔“

ایک وقت تھا جب کسی سیریل کی تیاری سے پہلے ”ہیرو“ ”ہیروئن“ کی تلاش شروع ہو جاتی تھی اور جب تک ہیرو، ہیروئن کا انتخاب ہو نہیں جاتا تھا سیریل نہیں ہوتا تھا۔ مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ اب تو ماشاء اللہ انٹائیلنٹ آگیا ہے کہ کسی کی خوشامد یا تلاش کی ضرورت ہی نہیں رہی..... علی حسن بھی ایک ایسے ہی ”ہیرو“ ہیں جنہیں آپ آج کل ڈرامہ سیریل ”اس چاندیدہ داغ نہیں“ میں دیکھ رہے ہیں۔
☆ جی کیا حال ہیں ”علی حسن؟“

(۰) ”جی اللہ کا شکر ہے۔“
☆ کیا مصروفیات ہیں آج کل؟“
(۰) ”ہم“ اور ”جیو“ کے دو پروڈیکٹ ہیں جن پر کام ہو رہا ہے اور ایک نئی چینل ”اے پلس“ سے

نہیں کہ پروڈکشن آپ کا ذریعہ آمدنی بھی ہوتا ہے..... اداکاری بھی ہے، مگر بہتر پروڈکشن ہے..... تو ان شاء اللہ پروڈکشن تو ساتھ ساتھ چلتی ہی رہے گی، لازمی۔“

☆ ”نام کیا ہے اور آپ کی پروڈکشن ہاؤس سے کیا کچھ نہیں پیش کیا جا چکا ہے؟“

(۰) ”ایک تو سیریل ”وفاندہ آشتا“ ہے اور ایک سیریل ”پھر کونہ جائیں ہم“ سیریز ”کتنی گرہیں اب

(۰) ہنسنے ہوئے ”واقعی شکر ہے کہ فرسٹ اپریل نہیں تھی۔ ایک کے ساتھ ایک اور لگ گیا..... اور جہاں تک امریکہ یا کینیڈا میں رہنے کی بات ہے تو میرے یہاں اپنا پروڈکشن ہاؤس ہے اور کافی کام کر چکا ہوں اور شادی ابھی نہیں ہوئی۔“

☆ ”اچھا گڈ..... تو پہلے اداکاری میں آئے یا پہلے اپنا پروڈکشن ہاؤس بنایا؟“

(۰) ”پہلے تو میں نے اپنا ماسٹرز مکمل کیا، پھر



باقی ہیں، اس کے علاوہ نیلی فلمز کافی کی ہیں۔ تو جناب اپنے پروڈکشن ہاؤس سے کافی کام کر چکے ہیں۔ ہم، اور سیریل زیادہ کیے ہیں۔ ہم نے اور ہمارے پروڈکشن ہاؤس کا نام Aim Productions ہے۔

☆ ”اپنی تعلیم کی وجہ سے آپ اس فیلڈ میں آئے؟“

(۰) ”تعلیم تو خیر تھی ہی لیکن شوق بھی اکثر سر

ابھارتا تا کہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے..... تو جیسا کہ میں

نے کہا جراثیم تو تھے ہی، تو پروڈکشن کی تو اپنے آپ

سے کہا کہ اداکاری تو میں بھی کر سکتا ہوں..... تو بس

گھس گئے اس فیلڈ میں..... اور کچھ نہ کچھ کر ہی رہے

تھوڑے عرصے کے بعد ہی مجھے ”نیوز دن“ سے آفر ہوگئی، تو تھوڑا عرصہ وہاں کام کیا۔ دل نہیں لگا، پھر ”جیو“ سے آفر آنے کی..... پھر پروڈکشن کا کچھ پلان ہوا کہ چلو پروڈکشن کرتے ہیں..... تو پھر پروڈکشن شروع ہوگئی۔ تھوڑی بہت اداکاری بھی کی..... دوستوں نے تعریف کی اور کہا کہ اسے مستقبل بنیادوں پہ کرو تو اس طرح مستقل بنیادوں پر اداکاری کی طرف آ گئے۔“

☆ ”مشکل کیا لگا اداکاری یا پروڈکشن؟“

(۰) ”سچ بتاؤ کہ پروڈکشن بہت مشکل کام

ہے۔ بہ نسبت اداکاری کے۔ لیکن اس سے بھی انکار

بات ہے۔ دوسرے ممالک کو دیکھو تو اتنا رشک آتا ہے۔ اب تو بڑی ملک نے اور خاص طور پر دینی نے بہت ترقی کر لی ہے اور بنگلہ دیش جو کل تک ہمارا تھا، اس نے بھی خاصی ترقی کر لی ہے، تو بس دل کڑھتا ہے اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔“

☆ ”جب فیس بک، انٹرنیٹ اور اسی طرح کی چیزیں نہیں تھیں تو لوگ مطالعہ بہت کرتے تھے۔ آپ کو کچھ عادت ہے؟“

(۰) ”سچ بتاؤ کہ مجھے مطالعہ کا شوق پہلے بھی نہیں تھا اور اب انٹرنیٹ کے بعد تو بالکل بچی نہیں رہا۔ حالانکہ میں ایسے سبکیٹ کا طالب علم تھا جس میں مطالعہ بہت ضروری ہوتا ہے۔ مگر مجھے تو دلچسپی ہی نہیں۔ میں ”کنٹانی کیرا“ کبھی بھی نہیں تھا۔ اب تو جو معلومات کہنی ہوتی ہے وہ گوگل یا انٹرنیٹ سے لے لیتے ہیں۔“

☆ ”آپ لڑکوں کی طرح لڑکیاں بھی اس فیلڈ میں بہت آ رہی ہیں۔ لڑکیوں کے لیے آپ کا مشاہدہ کیا کہتا ہے؟“

(۰) ”میں دیکھتا ہوں کہ اب خاندانی ویلیوز ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ خاص طور پر لڑکیوں میں۔ البتہ جو تھوڑی بڑی عمر کی خواتین ہیں، وہ اب بھی اپنی خاندانی ویلیوز کی بہت قدر کرتی ہیں اور خیال بھی رکھتی ہیں۔ شاید بیک لڑکیاں اپنی عمر کے تقاضوں کے حساب سے پیچھے نہیں ہوں اور آہستہ آہستہ پیچھے ہوتی ہیں۔ پھر کچھ گھر کی تربیت کا بھی نتیجہ ہوتا ہے اور اس سلسلے میں، میں اپنی مثال آپ کو دینا چاہوں گا کہ دیگر لڑکوں کی طرح مجھ میں کوئی بری عادت نہیں ہے۔ جیسے کہ لڑکوں کو سگریٹ نوشی کی عادت ہوتی ہے، مگر مجھ میں نہیں ہے اور میرے دوست یار بہت حیران ہوتے ہیں۔ نہ پان چھالیہ کی عادت ہے اور اس میں گھر کا ماحول اور اچھی تربیت کا ہاتھ ہوتا ہے۔“

☆ ”گھر کی تربیت کی بات کر رہے ہیں تو

ہیں اور میرا ایک ڈراما سیریل چلا تھا۔ ”آگ“ کے نام سے ”جیو“ پر..... اس نے مجھے شہرت دی اور اس کے بعد مجھے مزید آفرز آئیں۔ اس کے بعد جتنے بھی ڈرامے ہوئے جیسے ”میری سہیلی میری بھابھی“ ”بندھن“ ”کہاں تم چلے گئے“ سب ہی پسند کیے گئے۔“

☆ ”پہلے پہل آپ نیوز میں گئے۔ پھر نیوز چھوڑ کیوں دی؟ حالانکہ اس میں بہت اسکوپ ہے۔“

(۰) ”میری پہلی کمائی نیوز ایجنر والی تھی اور ٹھیک ٹھاک تھی اور آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ ”نیوز“ میں بڑا اسکوپ ہے اور ”ٹی وی ون نیوز“ والے تو مجھے چھوڑ ہی نہیں رہے تھے۔ کیونکہ میرا لاسٹ سمسٹر بھی اسی چینل سے ہوا تھا، تو وہ تو چاہتے ہی نہیں تھے کہ میں ان کو چھوڑ دوں..... مگر پتا نہیں کیوں مجھے اس کام میں یکسانیت لگ رہی تھی کہ بس روز تیار ہو کے جاؤ اخباریں پڑھ لو..... مجھے اطمینان نہیں ہو یا رہا تھا اور میں سوچتا تھا کہ یہ میرا فیوچر نہیں ہے..... مجھے کچھ اور کرنا ہے۔“

☆ ”گھر والوں کی کیا خواہش تھی۔“

(۰) ”چونکہ اس فیلڈ میں سوائے میرے کوئی تھا نہیں تو گھر والوں نے بھی اس کو سیریس نہیں لیا اور نہ ہی کبھی حوصلہ افزائی کی، نہ ہی کوئی خاص حوصلہ شکنی۔ مگر اب اللہ کا شکر ہے کہ سب کچھ سیٹ ہے اور مجھے یاد ہے کہ بچپن میں پڑھائی بہت زور دیا جاتا تھا تو اس وقت تھوڑا غصہ آتا تھا۔ مگر اب جب اس پڑھائی کی وجہ کسی قابل بن گئے ہیں تو سوچتے ہیں کہ اگر گھر والے سختی نہ کرتے تو ہم آج یہاں نہ ہوتے۔“

☆ ”ملک سے باہر جانے کا اتفاق تو آپ کو ہوتا ہی رہتا ہے۔ واپس آ کر کیا لگتا ہے اپنا ملک؟“

(۰) ”اپنے ملک جیسا کوئی ملک ہے ہی نہیں..... بس ہمارے ملک کے حکمران اچھے ہو جائیں اور ملک کے ساتھ مخلص ہو جائیں تو کیا ہی

لڑکوں کے لیے والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ خود
دلہن ڈھونڈیں تو.....؟“

(۰) ”تو جناب والدین کی پسند سے ہی کروں گا
کوئی مجھے پسند آگئی تو بتا دوں گا، مگر فرس نہیں کروں
گا۔“

☆ ”بہ حیثیت ایک آرٹسٹ کے آج کل کے
ڈراموں کو کیسا دیکھتے ہیں؟“

(۰) ”بہ حیثیت ایک آرٹسٹ کے میں برائی تو
کر نہیں سکتا، اچھا بھی ہو رہا ہے۔ کچھ بہت اچھا نہیں
بھی ہو رہا۔ بس ایک بات کہنا چاہوں گا کہ
Content کی کمی ہے۔ سیریل کا تو
Content تو پھر بھی اچھا ہوتا ہے اور بعض اوقات
تو بہت اچھا ہوتا ہے، مگر سوپ کا نہیں۔ شروع کی
اقساط پھر بھی اچھی ہوتی ہیں، مگر پھر وہ لمبا ہی چلا جا رہا
ہوتا ہے۔“

☆ ”کوک اسٹوڈیو انجوائے کرتے ہیں؟ ویسے
کیسا لگتا ہے آپ کو؟“

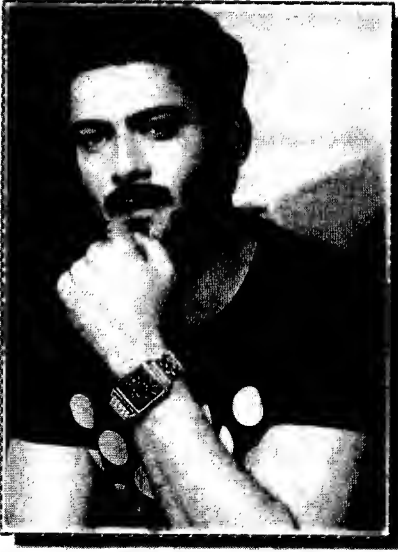
(۰) ”بس ٹھیک لگتا ہے۔ کوئی کوئی سیزن اچھا
ہوتا ہے اور سیزن میں سب گانے اچھے بھی نہیں
ہوتے ہیں۔“

☆ ”پرانا سوال ہے۔ کروار، ان سا کرنا چاہتے
ہیں؟“

(۰) ”کچھ بہت ہی مختلف قسم کا رول کرنا چاہتا
ہوں۔ عام رول تو کرتا ہی رہتا ہوں۔ دیکھیں کہ اب
میری خواہش کے مطابق مجھے کب کوئی اچھا کردار ملتا
ہے اور مجھے رومانٹک رول بھی بہت پسند ہیں، وہ بھی
کرنا چاہوں گا..... اور ”میری سہیلی میری بھابھی“
میں بھی میرا رول بہت اچھا تھا اور اس رول میں رویا
بھی بہت ہوں۔ تو مجھے عموماً سوپ کے روپ اتنے
اچھے نہیں لگتے، مگر اس سوپ کا اسکرپٹ اچھا تھا۔

اسے بہت اچھا لکھا تھا ”تبصر نشاط“ نے۔“

☆ ”فلم کی پیش کش ہو، تب رول کے لیے کیا
ڈیمانڈ ہوگی آپ کی؟“



(۰) ”یہ ہی جو ڈراموں کے لیے کہ کوئی بہت
ہی اچھا، مختلف اور رومانٹک رول ہو۔ لوگ یاد رکھیں،
تعریف کریں..... یہ نہیں کہ دو چار گانے گائے، ہیرو
بنے رہے اور کیا کرایا کچھ بھی نہیں۔ بلکہ پچھلے لائٹ
کردار بھی کرنا چاہوں گا۔“

☆ ”آپ ہوں، دیگر فن کار ہوں کردار کو اپنے
اوپر طاری کر کے کرتے ہیں۔ کیا کردار آپ کی
شخصیت کے قریب بھی ہوتے ہیں۔ مطلب عکس ہوتا
ہے شخصیت کا؟“

(۰) ”زندگی اتنی ڈراما نہیں ہے، جتنا کہ دکھایا
جاتا ہے۔ مگر پھر تھوڑا بہت عکس ضرور ہوتا ہے۔
ڈرامے میں چونکہ تکراری شروع ہو جاتی ہے۔ مگر
تھوڑی حقیقت ضرور ہوتی ہے۔“

☆ ”مگر سے نکلنے وقت ٹپ ٹپ سے نکلنے
ہیں یا بس جیسے ہیں، ویسے ہی نکل جاتے ہیں؟“

(۰) ”پہلے تو ایسا ہی ہوتا تھا کہ جن کپڑوں میں
گھر میں ہیں، نکل جاتے تھے کہ ہمیں کس نے دیکھا

ریب والی ماڈلنگ نہیں کی اور نہ ہی ابھی تک قلم کی ہے۔ مگر ان شاء اللہ اپنے سارے شوق پورے کروں گا۔“

☆ ”علی کہا بات ہے کہ آج کل سارے ہی جگہ لڑکوں نے ہلکی ہلکی ڈاڑھی رکھی ہوئی ہوتی ہے۔ جبکہ لڑکے تو ہمیشہ ہیر و ٹائپ نظر آنے کی خواہش رکھتے ہیں؟“

(۰) ”اصل مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہم ڈاڑھی نہ رکھیں تو ہم اسکرین پر بہت کم عمر نظر آئیں اور کم عمر ہیر و کو پھر اپنی جگہ بنانے میں مشکل ہوتی ہے۔ اس لیے تھوڑا سا لک چھین کرنا پڑتا ہے۔ لڑکیوں کے لیے تو یہ سہولت ہے کہ وہ میک اپ سے اپنا لک آسانی سے تبدیل کر لیتی ہیں، مگر ہمیں لڑکوں کو مشکل ہوتی ہے۔“

☆ ”ٹکلیو رول کیسے آپ نے؟“
(۰) ”شروع میں تو طے ہی ٹکلیو رول..... تو میں تو ایک طرح کے رول کر کے بہت تنگ آ گیا تھا۔“
”آگ“ میں ٹکلیو رول کیا تو پھر مسلسل ٹکلیو رول ہی ملنے لگے تو میں نے سوچا کہ یہ تو چھاپ لگ جائے گی، چنانچہ جب ٹکلیو رول کی آخر ہوئی تو میں نے انکار کر دیا۔ پھر مجھے ”تیری سہیلی میری بھابھی“ میں مجھے پوزیٹورول ملا۔“

☆ ”اور کچھ کہنا چاہیں گے؟“
(۰) ”نہیں جی..... بہت شکریہ آپ نے سب کچھ ہی پوچھ لیا ہے۔“
اور اس کے ساتھ ہی ہم نے سید علی حسن سے اجازت چاہی۔

☆☆

ہے، مگر اب ایسا نہیں ہے، اب معلوم ہے کہ ہمیں دیکھنے والے بہت لوگ ہیں تو پھر ڈرائیپ ٹائپ سے ہی نکلتا ہوں۔“

☆ ”اب تو زندگی بھی بہت حسین لگتی ہوگی؟“
(۰) ”ہاں جی..... بہت حسین لگتی ہے، بشرطیکہ کہ چمک باقاعدگی سے ملے رہیں۔“ قہقہہ.....

☆ ”اس فیلڈ میں پیسا زیادہ ہے یا محنت؟“
(۰) ”دونوں..... مگر محنت زیادہ ہے۔ کیونکہ جب تک آپ اچھا رزلٹ نہیں دیں گے، آپ کو اچھا پیسا بھی نہیں ملے گا۔“

☆ ”کسی کام کرنے کو دل نہ چاہ رہا ہو تو؟“
(۰) ”تو پھر جھوٹ کا سہارا لیتا ہوں کہ یار مصروف تھا۔ مطلب سو بہانے کر کے ٹال دیتا ہوں، مگر اسے انکار بالکل بھی نہیں کرتا۔“

☆ ”ڈھیر سا را پیسا ہاتھ آ جائے تو کس طرح استعمال کریں گے۔“
(۰) ”مجھے گھونسنے پھرتے کا، ٹریڈنگ کرنے کا بے حد شوق ہے، تو ہاتھ آئے پیسے کو انجوائے کروں گا اور خوب گھوموں گا، مزے کروں گا۔“

☆ ”اپنی کوئی ایسی خوبی جس سے خوف آتا ہو؟“

(۰) ”جی بالکل ہے۔ میری Six سنس بہت تیز ہے جو الہام ہوتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور یہ ہمارے لیے بہت نقصان دہ بھی ہوتا ہے کہ اگر ہمیں پہلے سے کچھ برا پتا چل جائے تو زندگی تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔“

☆ ”اپنا آپ کب اچھا لگتا ہے؟“
(۰) ”جب میں ٹخنے میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں، تو بے ساختہ اللہ کی تعریف کرنے کو دل چاہتا ہے کہ کیا خوب صورت نوجوان بنایا ہے۔“

☆ ”ماڈلنگ کی آپ نے؟“
(۰) ”جی..... جی گزٹل ماڈلنگ کی ہے۔ مگر

میری بھی سنتے

سونیا امشال

شاہین رشید



☆: ”پورا نام میرا؟“

(: ”سونیا امشال۔“

☆: ”میں پیار سے پکاری جاتی ہوں؟“

(: ”سونا۔“

☆: ”میری ڈیٹ آف برتھ..... اور سال؟“

(: ”3 نومبر 1991 اور میں ”قطر“ میں پیدا

ہوئی تھی۔“

☆: ”قد / ستارہ؟“

(: ”5 فٹ 9 انچ۔ خاصی لمبی ہوں ماشاء اللہ

اور ستارہ اسکار پیو ہے۔“

☆: ”میرے بہن بھائی؟“

(: ”ماشاء اللہ تین بھائی ہیں اور تین بھائیوں

کی اکلوتی بہن ہوں اور چھوٹی ہوں۔“

☆: ”میری تعلیم؟“

(: ”گرجویٹ ہوں فائن آرٹ میں۔“

☆: ”شادی؟“

(: ”اے پرسن سوال سمجھتی ہوں۔“

☆: ”مجھے شہرت کی بلند یوں پر پہنچایا؟“

(: ”سب“ ”میکے کو دے دو سندس“ بہت

مقبول ہوا تھا.....

☆: ”ٹیلنٹ سے جگہ بنی یا سفارش سے؟“

(: ”100 فیصد ٹیلنٹ سے۔“

☆: ”مارننگ پرسن ہوں یا نائٹ؟“

(: ”میں تقریباً مارننگ پرسن ہوں۔ خاص طور

پر جب شوٹ پہ جانا ہوں۔ اور نائٹ پرسن تو بالکل

بھی نہیں ہوں۔ بس جیسے ہی صبحی ہاری آتی ہوں۔

بستر پر ہوتی ہوں۔ بس۔“

☆: ”زندگی تب بری لگتی ہے؟“

(: ”جب کوئی ٹریڈس آجائے۔ کوئی کام نہ

ہو رہا ہو۔ یا کام میں رکاوٹ ہو رہی ہو۔ بہت سی

وجوہات ہو سکتی ہیں۔“

☆: ”آئینہ ہوتا ہے؟“

(: ”تم بہت پیاری ہو۔ مگر وقت ایک سا نہیں

رہتا اور ہم بڑے ہو گئے۔“

☆: ”گھر میں کوئی خوشی کی خبر سنو لوں تو؟“

(: ”سارا گھر سر پر اٹھا جیتی ہوں (محاورتا) بلکہ

آسمان سر پر اٹھا لیتی ہوں۔ جو کہ پہلے ہی ہمارے سر

پر ہوتا ہے۔“



☆: ”Shay ہوں؟“

(: ”بہت زیادہ Shy ہوں۔ اپنی بات کو صحیح

طرح بتانے میں پانی۔“

☆: ”سیاست میں میری سوچ؟“

(: ”ہم سب کو ایک ہونا چاہیے۔ ایک قوم۔

اتحاد۔ ایک دوسرے پر بچھاڑنا اچھا نہیں لگتا۔“

☆: ”موبائل پر الٹ رہتی ہوں؟“

(: ”کہ ایسا نہ ہو کہ اماں کے ایس ایم ایس

آئے ہوں اور مجھے جواب دینے میں دیر ہو جائے۔

مجھے معلوم ہے کہ دیر ہوگئی تو بہت ڈانٹ پڑے گی۔“

☆: ”میری عجیب عادت؟“

(: ”مجھے جب بہت بھوک لگتی ہے تو میرا دل

چاہتا ہے کہ سب کچھ جلدی میرے آگے آجائے اور

جب سب کچھ میرے آگے آجاتا ہے تو میری بھوک

مر جاتی ہے۔ ہے نا عجیب عادت۔“

☆: ”مرد حضرات اور لڑکوں کے بارے میں

میری رائے؟“

(: ”میری زندگی میں ”مرد“ کی صورت میں

میرے والد آئے اور ”لڑکوں“ کی صورت میں

میرے بھائی آئے۔ اس لیے مجھے اچھے لگتے ہیں۔

دیکھ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“

☆: ”مرد کب اپنے آپ کو ”ان سیکور“ فیل

کرتے ہیں؟“

(: ”میرے خیال میں جب ان کی زندگی میں

آئی ہوئی عورت گھر سے نکل کر باہر جاب کرنی ہے۔“

☆: ”سینما ہاؤس میں پہلی فلم کون سی دیکھی

تھی؟“

(: ”کون سی فلم دیکھی تھی یہ تو یاد نہیں۔ البتہ پہلی

فلم میں نے فطری میں دیکھی تھی۔“

☆: ”فقیر سامنے آجائے تو؟“

(: "تو بحث نہیں کرتی۔ آرام سے بیک سے نکال کر 50 روپے دے دیتی ہوں۔"

☆: "میرے خیال میں؟"

(: "ہمیں کچھ سیکھنے کے لیے تجربات بھی کرنے چاہیں اور دوسروں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھانے چاہئیں۔ تب ہی شخصیت میں پرکشش آتی ہے۔"

☆: "عموماً لوگ جب مل کر بیٹھتے ہیں تو؟"

(: "تو یہی تبصرے ہوتے ہیں کہ فلاں کو دیکھو کتنی ترقی کر گیا ہے۔ ہم تو وہیں کے وہیں ہیں۔ مطلب عموماً لوگوں کا تبصرہ دوسروں کے بارے میں ہی ہوتا ہے۔ اور یہ بات مجھے پسند نہیں۔ محفل میں انسان کو اپنی ہی باتیں کرنی چاہیں۔"

☆: "میرا دل دکھتا ہے جب؟"

(: "جب میں امیر اور غریب میں بہت فرق دیکھتی ہوں۔ خاص طور پر لوگوں کے روپے بہت دکھ دیتے ہیں۔"

☆: "شاپنگ میں کیا بات ناقابل برداشت لگتی ہے؟"

(: "ہنگامی۔ اب ہمارے ملک میں بہت مہنگائی ہو گئی ہے۔ ہر چیز کے لیے کئی بار سوچنا پڑتا ہے۔"

☆: "انسان کا اصل روپ دیکھنا ہوتا؟"

(: "تو اسے غصے میں دیکھیں۔ وہ تمام باتیں وہ تمام نفرتیں جو اس کے دل میں ہوتی ہیں باہر آ جاتی ہیں۔ پھر انسان کو پہچاننے میں دیر نہیں لگتی۔ اور بعض لوگ غصے میں بھی ایسی بات نہیں کرتے کہ دل دکھے۔ وہ ان کا روپ ہوتا ہے۔ کہ ان کے دل میں ہمارے لیے کچھ نرم گوشہ ہے۔"

☆: "اگر آپ میرے بیک کی تلاشی لیں تو؟"

(: "تو اس میں سے بہت سی چیزیں نکلیں گی جیسے والٹ ہے، پرفیوم ہے، میک اپ کی ضروری چیزیں ہیں۔ اور میری ضرورت کی ہر چیز نکلے گی۔"

☆: "کہاں جا کے پرسکون ہو جاتی ہوں؟"

(: "جب اپنے گھر آتی ہوں۔ لگتا ہے کہ جیسے گوشہ عافیت میں آ گئی ہوں۔"

☆: "میں جھوٹ بولتی ہوں؟"

(: "قتہیر۔" سچ میں جھوٹ بولا نہیں جاتا۔ سر نہچا کر کے اور آنکھیں بند کر کے بھی بولوں تو پکڑی جاتی ہوں۔ مہارت نہیں ہے اس کام میں۔"

☆: "اپنے آپ میں کیا بدلنا چاہتی ہوں؟"

(: "میں تھوڑی پر اعتماد ہونا چاہتی ہوں تھوڑی کمی ہے مجھ میں خود اعتمادی کی۔ بولتی بھی کم ہو۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ مغرور ہوں۔"

☆: "بچپن میں جمع کرتی تھی؟"

(: "گڑیاں..... ٹیڈی بیئر..... اس قسم کے کھلونے اور ایک ٹیڈی بیئر اور ایک گڑیا تو ابھی بھی میرے پاس محفوظ ہے۔"

☆: "غصہ کس پر اتارتی ہوں؟"

(: "کھانے پر۔ کھانا پینا چھوڑ دیتی ہوں۔ اور ایسا میں نے کئی بار کیا ہے۔"

☆: "کب الفاظ کا ذخیرہ منہ سے نکلتا شروع ہو جاتا ہے؟"

(: "قتہیر..... کیا خوب سوال ہے..... غصے میں۔ بولتے چلے جاتی ہوں۔ بولے چلے جاتی ہوں۔"

☆: "کھانے کے ساتھ کیا کھانے کی شوقین



ہوں؟“
 (:-) ”پوہنے کی چٹنی..... بہت مزے کی ہوتی ہے۔“

☆: ”کبھی گہری نیند سے اٹھ جاؤں تو؟“
 (:-) ”تو پورا دن سر میں درد رہتا ہے۔“
 ☆: ”مجھ میں یہ صفت ہے کہ؟“
 (:-) ”کہ میں پاکستانی اور غیر ملکی کھانے بہت اچھے پکاتی ہوں۔“

☆: ”میں ڈرتی ہوں؟“
 (:-) ”اپنے بابا کے غصے سے۔“
 ☆: ”بڑا وقت جو گزارا؟“
 (:-) ”صرف میں نے ہی نہیں، ہم پوری فیملی نے برا وقت گزارا، جب ہم قطر سے پاکستان شفٹ ہوئے تھے۔“

☆: ”مجھے اچھا لگتا ہے۔“
 (:-) ”فارغ اوقات میں ڈرائیونگ کرنا، میوزک سننا، موزی ویڈیو اور کسی اچھی سی کتاب کا مطالعہ کرنا۔“
 ☆: ”بہترین وقت وہ ہوتا ہے جب؟“
 (:-) ”جب انسان کے خواب پورے ہو رہے ہوں اور وہ مزید خوابوں کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کر رہا ہو۔“

☆: ”کھانا کھانے کے لیے آپشن؟“
 (:-) ”میرا پہلا آپشن تو یہی ہوتا ہے کہ اگر میں گھر میں ہوں تو اپنے بیڈ پر ہی کھانا کھاؤں..... اس سے اچھی جگہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔“
 ☆: ”میری خواہش ہے اس فیلڈ میں کہ؟“
 (:-) ”کہ میں ”ہالی ووڈ“ کے فنکاروں سے ملوں اور اپنے ملک کے سینئر لوگوں سے ملوں۔“
 ☆: ”گھر سے نکلتے وقت ساتھ لے کر چلتی ہوں؟“

(:-) ”اپنا بیگ، والٹ اور ہیڈ فون اور موبائل۔“
 ☆: ”بڑے وقت کا سامھی کون ہوتے ہیں؟“
 (:-) ”پرائے لوگ..... عموماً اپنے تو ساتھ چھوڑ

جاتے ہیں۔“

☆: ”میں محتاط رہتی ہوں؟“
 (:-) ”کسی کو اپنا فون نمبر دینے اور گھر کا ایڈریس دینے میں محتاط رہتی ہوں۔“

☆: ”کہاں خرچ کرنے میں مزا آتا ہے؟“
 (:-) ”اپنے والدین کے لیے اور اپنے بھائیوں کے لیے خرچ کر کے مزا آتا ہے۔“
 ☆: ”تغذوہ دینے وقت خیال رکھتی ہوں کہ؟“
 (:-) ”ایسا تغذہ دوں جو اس کے استعمال میں بھی آئے۔“

☆: ”بجٹ کرتی ہوں؟“
 (:-) ”کوشش کرتی ہوں۔ عموماً فضول خرچی نہیں کرتی، کیونکہ پیسہ بہت مشکل سے ملتا ہے..... بہت محنت کے بعد۔“

☆: ”کس شہر کے پکوان مزے دار ہوتے ہیں؟“
 (:-) ”ہر شہر کی کوئی نہ کوئی ڈش خاص ہوتی ہے..... مگر لاہور شہر کا ہر کھانا مزے دار ہوتا ہے۔“
 ☆: ”آج کل میرا ”آن ایر“ ڈرامہ؟“
 (:-) ”فیصلہ“ میرا کردار بہت اچھا ہے۔“
 ☆: ”مجھے فوہیا ہے؟“
 (:-) ”کیڑے مکوڑوں سے بہت ڈرتی ہوں۔ جان نکلتی ہے ان کو دیکھ کر۔“

☆: ”ڈول سچ بولتا ہے یا دماغ؟“
 (:-) ”بولتے تو دونوں ہی سچ ہیں، مگر مجھے دماغ کی باتیں زیادہ سچ لگتی ہیں۔“
 ☆: ”اپنی ایک اچھی عادت؟“
 (:-) ”محفل میں کسی کی برائیاں نہیں کرتی، چغلیاں نہیں کھاتی۔ کسی کا برا نہیں چاہتی۔“
 ☆: ”خوشی محسوس کرتی ہوں؟“
 (:-) ”صبح کی تازہ ہوا میں۔“
 ☆: ”ذائقہ کس کے ہاتھ میں ہوتا ہے، مرد یا

عورت؟“

(:-) ”گھر اور ملک میں عورت کے ہاتھ میں اور ملک سے باہر مرد کے ہاتھ میں ذائقہ ہوتا ہے۔“

☆☆

ایکس ایم اویس انجم

شاہین رشید

☆ ”کیسے ہیں آپ؟“

(۰) ”اللہ کا کرم ہے۔“

☆ ”یہ ایس ایم اویس سے کیا مراد ہے۔ یعنی پورا نام کیا ہے، اور کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟“
(۰) ”جناب میرا پورا نام شیخ محمد اویس انجم ہے۔ البتہ اکثر دوست احباب میں ”شیخو“ کے نام سے جانا جاتا ہوں۔ والد صاحب سرکاری ادارے سے ریٹائرمنٹ کے بعد آرام فرما رہے ہیں، جبکہ والدہ صاحبہ جو کہ تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ امور خانہ داری میں بھی ماہر ہیں۔ بہن، بھائیوں میں میرا نمبر تیسرا ہے۔ مجھ سے بڑا دو بہنیں ہیں اور ایک

گنزدے زمانے میں انسان کی تنہائی کے دو ہی ساتھی ہوتے تھے۔ ایک کتابیں اور دوسرا ریڈیو..... کتابوں کا ساتھ تو انسان نے چھوڑ دیا کہ انٹرنیٹ کے ذریعے ان کی تسکین ہو جاتی ہے، لیکن ریڈیو کا ساتھ نہیں چھوڑا کہ جب کچھ نہیں ہوتا، تب ریڈیو ہوتا ہے۔ اور گاؤں اور چھوٹے شہروں کے لوگ جو موبائل کا استعمال نہیں جانتے، وہ ریڈیو سے اپنا دل بہلاتے ہیں اور ان کا دل بہلاتے ہیں ”آر جے“ جو اپنی باتوں اور خوب صورت میوزک سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیتے ہیں..... ہمارے آج کے مہمان ”ایس ایم اویس انجم“ ہیں۔





دی کا تعلق ہے تو موقع ملا تو ضرور اپنے فن کو منادوں کی گرا۔ اگرچہ میری فیملی میں کوئی بھی اس فیلڈ سے وابستہ نہیں ہے، مگر فیملی کی سپورٹ ہمیشہ میرے ساتھ رہی، الحمد للہ۔“

☆ ”آپ نے کہا کہ تقریباً آٹھ سال سے ریڈیو سے وابستہ ہیں تو پہلے کس ایف ایم میں تھے؟ عام ایف ایم اور ایف ایم 101 میں کیا فرق ہے؟“
(۰) ”میرے ریڈیو کیمریز کا آغاز بھی ریڈیو پاکستان اور PBC ایف ایم 101 سے ہوا۔ اس سے قبل موبائل ریڈیو شوز کیا کرتا تھا۔ ریڈیو پاکستان ہماری ثقافت اور قومی ورثے کی حفاظت کا علمبردار ہے اور یہ ہی انفرادیت اس کو دیگر چینل سے منفرد کرتی ہے۔“
☆ ”اپنے پروگراموں کے بارے میں بتائیے اور فارمیٹ کیا ہوتا ہے، ان کا؟“

(۰) ”فنی الحال تو عفتے میں دو پروگرام ہیں۔ بروز پیر شام 7 بجے سے 9 بجے تک ہوتا ہے، جس میں ہم اپنے سامعین سے ”انوکھا سوال“ کرتے ہیں۔ دوسرا پروگرام بروز جمعہ شب 10 سے 12 استاد محترم ریحان اسلامی کے ہمراہ ”ٹھنڈی جگت“ شو کرتے ہیں، جس میں اپنے سامعین کے چہروں پر مسکراہٹیں پکھرتے ہیں اور میوزک کی سلیکشن خود کی پسند کی ہے جو کہ شو کے فارمیٹ کے مطابق ہی ہوتی ہے۔“

☆ ”ریڈیو ایک پاورفل میڈیم ہے، اس کے ذریعے ہم اپنے ملک میں کیا پیغام پہنچا سکتے ہیں؟“

(۰) ”ریڈیو ہمیشہ سے ہی پاورفل میڈیا رہا ہے۔ الحمد للہ اعلان آزادی ہو یا پھر عوام کے تعاون کی اوج، ریڈیو کا کردار ہمیشہ منفرد رہا ہے۔ ریڈیو تو ایک ایسا میڈیم ہے کہ جہاں فی وی نہیں، وہاں ریڈیو کی فریکوئنسی پہنچ جاتی ہے۔ اس کی مثال یوں لیجئے کہ ”سیاحین کی سنگلاخ چٹانوں میں ریڈیو پاکستان کی آواز پہنچ رہی ہوتی ہے اور لوگ حالات حاضر سے بھی باخبر رہتے ہیں اور دلفریب میوزک کو بھی

چھوٹا بھائی ہے۔ تعلیمی سفریوں تو کبھی ختم نہیں ہوتا، مگر پھر بھی ”ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کی تعلیم، اختتامی مراحل میں ہے۔ ویسے تو لاہور میرا آبائی شہر ہے مگر چونکہ کراچی میں میری پیدائش اور زندگی کا سفر گزرا ہے تو کراچی سے بہتر کوئی شہر نہیں لگتا اور اب رہ گیا شادی کا سوال تو (قہقہہ) شادی کا سوال کیوں پوچھا جاتا ہے، ہر خوبہ و نوجوان نے کیا ان کی ہنستی کھانسی زندگی پسند نہیں اور ہاں میری تاریخ پیدائش 8 اپریل ہے۔“

☆ ”ریڈیو سے وابستگی کب سے ہے اور ریڈیو ہی کیوں؟ فیملی میں کوئی اور بھی اس فیلڈ میں ہے؟ فی وی کا سوچا؟“

(۰) ”آواز کی دنیا یعنی ریڈیو کی دنیا سے تعلق تقریباً آٹھ سال سے ہے۔ البتہ ریڈیو پاکستان کے ایف ایم سے تعلق کو الحمد للہ 4 سال ہو گئے ہیں۔ آواز کی دنیا ایک منفرد دنیا ہے۔ آپ اپنی آواز کا بہتر استعمال کر کے خود کو منوا سکتے ہیں۔ ریڈیو کا شوق بچپن سے رہا اور آج جب ان شخصیات کے ساتھ پروگرام کرنے کا موقع ملتا ہے جنہیں ہم کبھی ریڈیو پہ نہ سنا کرتے تھے تو بہت خوشی ہوتی ہے اور جہاں تک فی

انجوائے کرتے ہیں اور معاشرے کے مسائل کو زیر بحث لا کر بہت کچھ چینیچ کیا جاسکتا ہے۔“

☆ ”ریڈیو اور ٹی وی کا موازنہ کیا جاسکتا ہے؟“

(۰) ”ریڈیو اور ٹی وی کا موازنہ کچھ ناموافق

ہی لگتا ہے۔ ریڈیو نے تو بہت مشہور فن کاروں کو جنم دیا ہے اور ریڈیو ان کی پہچان بنا ہے۔ بہر حال ہر شخص کی اپنی ایک افادیت ہے۔ ٹی وی کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

☆ ”جن سے میں نے آپ کا نمبر لیا، انہوں

نے آپ کی تعریف کی، کیونکہ ظاہر ہے کہ آپ اچھا پروگرام کرتے ہیں۔ یہ بتائیے کہ کیمرا ہو یا مائیک ایب بے جان چیز ہے، تو ایک بے جان چیز کے سامنے پرو فارم کرنا، بات کرنا، کیسا لگتا ہے؟“

(۰) ”جنہوں نے میری تعریف کی، یہ ان کا

حسن سماعت ہے۔ استادوں سے سیکھا ہے ان کی تربیت ہے کہ اچھے طریقے سے پروگرام کر لیتا ہوں اور جناب بڑا مشکل ہوتا ہے ایک کمرے میں بیٹھ کر خود سے باتیں کرنا اور مجھے یاد ہے کہ جب پہلی بار نیکروفون کا سامنا ہوا تو کم دیش 45 منٹ کا پروگرام کسپاتے ہوئے ہی کیا اور الحمد للہ پھر جو خوف دور ہوا تو اب تک سلسلہ جاری ہے۔“

☆ ”پروگرام کے لیے تیاری کرتے ہیں۔ یا

فی البدیہہ بولتے ہیں، اور بھی ایسا ہوا کہ ایک دم موضوع چینیچ کرنا پڑ گیا ہو؟“

(۰) ”پروگرام کی تیاری کرنا تو بہت ضروری

ہے۔ چاہے آپ صرف میوزک کا پروگرام کریں یا معلوماتی پروگرام..... مطالعہ کا ہونا بہت ضروری ہے اور آپ نے پوچھا کبھی موضوع چینیچ کرنا پڑا، تو مجھے یاد ہے کہ جس روز عبدالستار ایدھی صاحب کا انتقال

ہوا اس شب موضوع کچھ اور تھا اور اس خبر کے بعد ہم نے فوراً اپنا موضوع تبدیل کیا۔ تو ایسے موقع آجائیں خدا نا خواستہ تو پھر موضوع کا رخ موڑنا پڑتا

ہے اور یہ آپ کی مہارت پر ہوتا ہے کہ آپ کس طرح موضوع کا رخ بدلتے ہیں اور کس طرح مطلقہ شخصیت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، تو اس کے لیے کوئی بھی آر بے ہو اس میں ناچ کا ہونا بہت ضروری ہے اور ناچ مطالعہ سے ہی آتی ہے۔“

☆ ”لائو کالز میں بھی ایسا ہوا کہ آپ کو شرمندگی ہوئی ہو یا سننے والے کو شرمندگی ہوئی ہو؟“

(۰) ”ایسا کبھی نہیں ہوا الحمد للہ..... کیونکہ ریڈیو پاکستان سے تعلق ہے اور یہ ایک ایسا ادارہ ہے جہاں تہذیب، تیز اور تمدن سکھایا جاتا ہے اور ہمارے سامعین بھی اس چیز کا بہت خیال رکھتے ہیں، تو الحمد للہ ایسا کوئی اتفاق نہیں ہوا اور لائو کالز لینے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، ہمارا جو رات کا پروگرام ہوتا ہے اس میں ہم گفتگو ہی سامعین سے کرتے ہیں، تو کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا۔“

☆ ”آپ نے بتایا تھا کہ آپ باہر سے آئے ہوئے ڈراموں میں ڈنگ بھی کرتے ہیں، تو کیا یہ



(۰) ”فارغ اوقات میں موسیقی سن لیتا ہوں،

یا پھر مودی دیکھ لیتا ہوں اور اکثر اوقات ناؤں بھی پڑھ لیتا ہوں۔ جدید دور نے کام آسان کر دیا ہے۔ موبائل میں E Books کی صورت میں ذخیرہ موجود ہے۔“

☆ ”سوال تو لڑکیوں والا ہے، مگر اب نوجوان لڑکے بھی اس فیلڈ میں آرہے ہیں، تو کچھ کھانے پکانے سے بھی آپ کو شگفتہ ہے؟“

(۰) ”اسورخانہ واری کا آپ نے پوچھا، تو بس یہ سمجھ لیجیے کہ اپنے کھانے کا انتظام بخوبی کر لیتا ہوں اور چکن بریانی بھی بہت اچھی بنا لیتا ہوں اور کچھ اور بھی۔“

☆ ”چلیں جی، آنے والی کو بھی آسانی ہو جائے گی؟“

(۰) ”تہقہہ“ ”ارے بھی کیا میں آپ کو ہنسا کھلتا کسی کو پسند نہیں، یا اچھا نہیں لگتا، جو شادی کے لیے کہا جاتا ہے۔“

☆ ”ہم تو آپ کی بیگم کی سہولت کے لیے بات کر رہے تھے اور یہی سبب ہے آپ لاہور کے ہیں تو؟“

(۰) ”جی..... بالکل لاہور ہے میں اور لاہوریوں کو کھانے پینے کا بہت شوق ہوتا ہے، تو جناب کھانے کے معاملے میں تو ہم سے آگے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اچھا کھانا ہو، خواہ کہیں بھی ہو، گھر میں تو کھاتے ہی رہتے ہیں، باہر اچھا کھانا ہو تو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔“

☆ ”چھٹی کا دن کہاں گزارتے ہیں آپ؟“

(۰) ”چھٹی کا دن ایک ہی ہوتا ہے یا پھر کبھی کبھی دو چھٹیاں بھی مل جاتی ہیں تو پھر دل چاہتا ہے کہ گھر میں رہ کر آرام کیا جائے، تو میں گھومنے پھرنے سے زیادہ آرام کو ترجیح دیتا ہوں۔“

☆ ”ایف ایم 101 میں کن سے آپ نے بہت سیکھا؟“

مشکل کام ہے اور اس میں پیسا ملتا ہے؟“

(۰) ”ڈبنگ بھی آواز کی دنیا کا ایک شعبہ ہے اور اس میں کام کر رہا ہوں اور الحمد للہ کہ جو بھی کام اس میں لوگوں نے پسند کیا، جہاں تک پیسے کا تعلق ہے تو یہ شعبہ بھی روزگار کا ایک ذریعہ ہے اور بہت سارے لوگوں کا روزگار اس سے وابستہ ہے، خواہ وہ صدا کار ہوں یا پھر ٹیکنیکل اسٹاف ہو اور جس جگہ سے روزگار وابستہ ہو وہاں مشکل یا آسانی نہیں دیکھی جاتی۔ بس کام دیکھا جاتا ہے اور جہاں تک دستاویزی فلموں کی بات ہے تو اس میں بھی کام چلتا رہتا ہے اور سننے والے پسند کرتے ہیں اور جہاں تک دیکھنے والوں کی بات ہے تو یقیناً لوگ ان ڈراموں کو پسند کرتے ہیں، تب ہی یہ چل بھی رہے ہیں اور انڈسٹری بھی چل رہی ہے اور ڈبنگ ایک طرح سے ”آواز“ کا ایک موڈی فائن فارم ہے۔ بہت ساری ایسی آوازیں آپ کو سننے میں ملتی رہیں جن کو آپ اکثر اوقات پہچان بھی نہیں پاتے۔“

☆ ”کیمرے کے آگے آکر کام کرنے کو دل نہیں چاہتا کیا۔ یا اس فیلڈ میں آپ زیادہ ایزی فیل کرتے ہیں؟“

(۰) ”ہر انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ بہتر سے بہتر کی طرف جائے اور کیمرے کے پیچھے رہ کر تو ہم کام کر ہی رہے ہیں اور کیمرے کے آگے بہ حیثیت مہمان کے جانے کا اتفاق کافی بار ہوا ہے اور ان شاء اللہ اگر موقع ملا تو کیمرے کے سامنے بھی اپنے فن کو خوب آزمائیں گے۔ کیمرے کے سامنے والے اداکار کہلاتے ہیں اور مائیک والے صدا کار..... تعلق دونوں کا ہی فن سے ہوتا ہے..... تو ان شاء اللہ کبھی زندگی میں موقع ملا تو کیمرے کے سامنے آکر بھی اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔“

☆ ”اور کیا مشاغل ہیں آپ کے، فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟“

(۰) ”جی..... جی..... میں خود بھی چاہتا ہوں کہ اپنے استادوں کا نام ضرور لوں، جنہوں نے میری تربیت کی اور جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا، ان میں محترمہ ”ربیعہ اکرم“ صاحبہ ”محترمہ میمونہ صاحبہ“ محترمہ ”عظمیٰ بلوچ صاحبہ“..... ”مرزا ہالیوں“ ”جناب ریحان اسدی“ ”جناب عاصم بشیر صاحب“ ”جناب احتشام الحق صاحب“ اور دیگر..... جن کا میں ہر لمحہ مشکور رہتا ہوں کہ انہوں نے مجھے بہت سکھایا ان کی تربیت سے ہی آج میں مکمل ہوں۔

☆ ”شہری علاقوں کے اور دیہی علاقوں کے سامعین میں کیا فرق ہے آپ کے خیال میں؟“

(۰) ”شہری علاقوں کے سامعین اور دیہی علاقوں کے سامعین میں فرق کرنا آج کے دور میں ایک مشکل کام ہے۔“

☆ ”پروگرام کے دوران کوئی ایسا واقعہ پیش آیا کہ جو یادگار رہ گیا ہو؟ کوئی غلطی؟“

(۰) ”ایسے تو بہت سے واقعات اور اتفاقات ہوتے رہتے ہیں اور جہاں تک غلطیوں کی بات ہے تو اگر بیان کرنے میں کسی بیہوشی فہرست ہو جائے گی اور میرے لیے یادگار واقعہ تو یہ ہی ہوتا ہے کہ جب آپ کوئی اچھا پروگرام کریں اور آپ کے استاد آپ کو فون کر کے آپ کی تعریف کریں تو اس سے زیادہ اون کی کوئی بات نہیں ہوتی..... پروگرام کے اختتام پر آپ کے استاد حوصلہ افزائی کریں اور آپ کی انتظامیہ آپ کو سپورٹ کرے تو اس سے زیادہ اچھی بات کیا ہو سکتی ہے اور سامعین بھی اگر حوصلہ افزائی کریں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔“

☆ ”آپ کا ایک پروگرام ہوتا ہے ”ٹھنڈی جگت شو“ اس کے بارے میں کچھ بتائیں؟“

(۰) ”اس پروگرام میں ہمیں مذاق اور کچھ اس طرح کی گفتگو کی جاتی ہے کہ سننے والے بہت انجوائے کرتے ہیں..... تو کوئی پریشان ہے یا اداس ہے تو

☆☆

اشاخیر

اداکار

س:- ”اگر آپ کو حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟“

ج:- ”پہلے اپنے آپ کو بدلنے کی (سداکارنے کی) کوشش کروں گی، اگر اس میں کامیاب ہوگی تو سب سے پہلے بجلی و گیس کے بحران پر قابو پانے کی کوشش کروں گی۔“

س:- ”پسندیدہ شاعر؟“

ج:- ”شاعری سے بالکل بھی لگاؤ نہیں۔ ہاں

اگر پر سنائی کی بات کروں تو علامہ اقبال میرے پسندیدہ ہیں۔“

س:- ”مزا چلاؤ کا ہیں؟“

ج:- ”جی ہاں جناب، مزا بچانا اک ذرا سی چنگاری پوری عمارت کو جلا کر بھسم کر دینے کے لیے کافی ہے۔“

س:- ”کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟“

ج:- ”بذلہ سنج، باتونی، جن کے ساتھ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہو۔“

س:- ”اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی تو؟“

ج:- ”تو پھر یقیناً پاکستان پر میری حکومت ہوتی۔“

س:- ”اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟“

ج:- ”رات کا وقت، جب اندھیرے میں قبر یاد آتی ہے تو موت کا خوف اللہ سے قریب کر دیتا ہے۔“

س:- ”آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ۔“

س:- ”اصلی نام کیا ہے، مگر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟“

ج:- ”نام تو میرا سحر خیر ہے لیکن مجھے اشا کہلوانا پسند ہے، مگر والے اُشاشی کہتے ہیں۔“

س:- ”آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟“

ج:- ”آئینہ تو مجھ سے کچھ نہیں کہتا، البتہ میرا اپنا عکس مجھ سے بہت کچھ کہتا ہے بلکہ سوال پوچھتا ہے۔ کون ہو؟ کیا ہو؟ کیوں ہو؟ بلا ارادہ ہی میں خود کو خود ہی کھوجتے نکل پڑتی ہوں۔“

س:- ”حسین صورتیں دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟“

ج:- ”وہ ہی جو خود کو دیکھ کر آتا ہے۔“

س:- ”اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟“

ج:- ”تو اس میں سے قلیل سی رقم، ساوہ سا موبائل فون، سوئف ساری اور ایک عدد انگوٹھی (آرٹیفیشل) کے علاوہ کئی کچھ نہیں ملے گا۔“

س:- ”بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟“

ج:- ”کیوں؟ کیا میں انسان نہیں ہوں۔“

س:- ”مہمان کیسے چھتے لگتے ہیں؟“

ج:- ”مہمان کیسے بھی ہوں، نیچے کہنی دینے والی، کوئی میرے جیسی دو بیڑہ اگر ان کے ساتھ نہ ہوئی تو ایسے مہمان مجھے ذرا لم ہی اچھے لگتے ہیں۔“

س:- ”کھانے میں کیا پسند ہے؟“

ج:- ”آلو گوشت، گوہی گوشت، پالک گوشت، کرے لے گوشت، گوشت ہی گوشت۔“

س:- ”حقیقی خوشی کس وقت حاصل ہوتی ہے؟“
ج:- ”دھکے کے ٹھٹھنے میں جکڑے کسی انسان کو جب آپ کی وجہ سے سکھ فراہم ہونے لگے تو اس فعل کے بدلے میں جو خوشی ملتی ہے، میری نظر میں حقیقی خوشی اسی کو کہتے ہیں۔“

س:- ”زندگی سے کیا سبق سیکھا؟“
ج:- ”مسلل ملنے والی کامیابیوں نے مغرور بنا دیا تھا پھر جب پاؤں کے نیچے سے زمین نکلی تب میں نے سیکھا کہ وقت کبھی ایک سانہیں رہتا، شکر ہے میرے رب کا، جس نے مجھے تھیلے کا موقع دیا۔“

س:- ”ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟“

ج:- ”بالکل بھی نہیں۔“

س:- ”کوئی آخری بات؟“

ج:-

حالات کے قدموں میں قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے جو ستارہ تو زمین پر نہیں گرتا
گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا
لیکن کبھی دریا میں سمندر نہیں گرتا
س:- ”کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہو؟“

ج:- ”کچھ خاص نہیں، بس ہر وقت گھریلو امور کی انجام دہی سر پر سوار رہتی ہے۔“



قیمت - 400 روپے

ج:- کفایت شعار (مگر میری بہن مجھے کبجوس کہتی ہے)“

س:- ”کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟“
ج:- ”جی ہاں، بالکل۔ اسی لیے تو روزانہ صبح جلدی جاتی ہوں۔“

س:- ”وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے ہوئے سوچ آتی ہے۔ دنیا کیا کہے گی؟“

ج:- ”خاندان بھر کے لوگ اس موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ مگر میں جو بھی کرتی ہوں، ڈنگے کی چوٹ پر کرتی ہوں، کسی سے بھی نہیں ڈرتی۔“

س:- ”آپ سنسان راستے سے گزر رہی ہوں اور کتنا پیچھے لگ جائے تو؟“

ج:- ”انکی! سنسان کیوں؟ کبھی آپ ہماری گلی کا چکر لگا کر دیکھیے ایک نہ شد، چار چار شد آپ کو لڑھکتے ہوئے نظر آئیں گے، مگر بے چاروں نے بھی پیچھا نہ کیا، ہم نے نوبت ہی نہ آنے دی۔“

س:- ”آپ کی نظر میں محبت؟“

ج:- ”محبت زندگی ہے اور محبت کے بنا زندگی گزارنا ایسے ہے جیسے روح کے بنا جسم۔“

س:- ”کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟“

ج:- ”گھر والوں کی، مخلص دوستوں کی۔“

س:- ”اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے کیا؟“

ج:- ”ہواؤں میں اڑنے لگ جاتی ہوں، دل

جھوم جھوم جاتا ہے۔ مگر جس بندے / بندی نے تعریف کی، اس پر کچھ بھی ظاہر نہیں کرتی ہوں۔“

س:- ”ڈرامے دیکھتی ہیں؟“

ج:- ”جی، بالکل بھی نہیں۔“

س:- ”اگر دوست ناراض ہو جائے تو کیسے مناتی ہیں؟“

ج:- ”ضرورت سے زیادہ انا پرست ہوں، اگر سامنے والا جھک گیا تو ٹھیک در نہ جائے بھاڑ میں۔ ہاں، اپنی غلطی پر معافی مانگ لیتی ہوں۔“

پولیس و سچ بدلتی ہیں

وہ ڈسٹنگ کرنے کے ساتھ بڑے سر میں گنتا بھی رہی تھی کہ دے پاؤں اندر آتے ہوئے حمزہ جو ہاؤ کی آواز کے ساتھ اسے ڈرانا چاہتا تھا اس کی گنتا ہٹ سن کر وہیں رک گیا۔ گیت کے بول واضح نہیں تھے لیکن نے دل کے تاروں کو چھیڑ رہی تھی۔ وہ بہت اچھا لگا تھا۔ اسے دیکھنے لگا۔ جس کی لمبی چوٹی اس کی حرکت کے ساتھ جھول رہی تھی۔ پھر وہ پلٹتے ہی اسے دیکھ کر چیخ مٹا آواز کے ساتھ بولی تھی۔

”تم.....“ حمزہ نے بے اختیار اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیا تو وہ اس کے پیچھے دیکھ کر پوچھنے لگی۔ ”تم کیسے آئے.....؟“

”مطلب گیت کس نے کھولا۔“

”کسی نے نہیں میرا مطلب ہے کھلا تھا اس لیے میں سیدھا اندر چلا آیا۔ ویسے کوئی اور بھی آ سکتا تھا۔“

دوسری بات حمزہ نے اسے ڈرانے کے لیے کی تھی اور وہ ڈر بھی گئی۔

”ہاں میں پتا نہیں کیسے گیت بند کرنا بھول گئی۔ حالانکہ ای جاتے ہوئے مسلسل یہی کہتی رہتی ہیں گیت بند کرلو۔“

”چلو شکر کرو ابھی تمہاری بچت ہو گئی کسی اور نے آ کر تمہارا گلا نہیں دبا دیا۔“ حمزہ کہتے ہوئے اطمینان



DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM



سے بیٹھ گیا تو قدرے پریشان ہو کر وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”ابھی امی آ جائیں گی۔“

”پھر.....!“ حمزہ سمجھ کر بھی سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تو وہ جربز ہو کر بات بدل گئی۔

”بیلا اور چچی جان کیسی ہیں؟“

”ٹھیک.....“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اس سے پہلے کہ تائی جان آ جائیں مجھے چلنا چاہیے۔“

”جائے۔“ وہ اسی قدر کہہ سکی۔

”نہیں رہنے دو۔“ حمزہ نے ناٹم دیکھا پھر اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ ”مجھے ایک جگہ انٹرویو کے لیے جانا ہے۔“

”دعا کرتا۔“

”میں تو بہت دعا کرتی ہوں۔ ہتا نہیں اللہ میاں میری دعائیں کیوں نہیں سنتا۔“ وہ آزر دگی میں گھرنے لگی تھی۔

”سنتا ہے۔ اللہ سب کی سنتا ہے۔ بس ہر کام کے لیے اس نے وقت مقرر کر رکھا ہے۔“ حمزہ نے کہہ کر گہری سانس مچنی پھر قصداً مسکرایا تھا۔

”تم ٹینو میں بس دو منٹ میں جائے لے کر آتی ہوں۔“ وہ فوراً متحرک ہو گئی۔

”نہیں شیرینہ چائے پھر سہی۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

”پھر آؤ گے ناں؟“

”کیوں نہیں ضرور آؤں گا۔ تائی جان دھکے دے کر نکالیں گی تب بھی آنا نہیں چھوڑوں گا۔“ حمزہ نے

بظاہر ہلکے ہلکے اعزاز میں کہا پھر بھی وہ ہرٹ ہوئی تھی۔

”تمہیں ہتا تو ہے ناں؟“

”ہتا ہے وہ مجھے پسند نہیں کرتیں۔“ وہ فوراً بولا تھا۔

”لیکن ابو تمہیں بہت چاہتے ہیں۔“ وہ بھی فوراً بولی تھی۔

”تایا جان کی چاہت ہی تو مجھے ثابت قدم رکھے ہوئے ہے۔ اور سنو تم بھی ڈنگ گانا مت۔“ خزینہ کی شادی

ہر جائے پھر میں بھی دیر نہیں کروں گا۔ سن رہی ہوں ناں۔“ اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا پھر اسے

چھوڑنے گیٹ تک آئی اور اب وہ گیٹ بند کرنا نہیں بھولی تھی پھر واپس آندر آتے ہوئے اس نے ابھی اندرونی

دروازہ پار کیا تھا کہ ڈور بیل بجنے لگی۔

”اب کون آ گیا۔“ وہ بیڑا تے ہوئے واپس پلٹی اور گیٹ کھولا تو آگے حمیدہ بیگم کو دیکھ کر خائف ہو گئی تھی۔

”حمزہ آیا تھا؟“ حمیدہ بیگم نے اندر آتے ہوئے کڑے تیوروں سے پوچھا تو وہ صلیقہ بھی جھوٹ نہیں بول

سکتی تھی کیونکہ سمجھ گئی تھی کہ حمیدہ بیگم نے حمزہ کو یہاں سے نکلنے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔

”میں کیا بول چھر رہی ہوں حمزہ آیا تھا؟“ حمیدہ بیگم کی آواز مزید تیز ہو گئی۔

”جی امی۔“

”کیوں؟“ حمیدہ بیگم نے اب حکیمی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”ابو کے پاس آیا تھا امی اور جب دیکھا کہ ابو نہیں ہیں تو فوراً ہی چلا گیا۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”تو اندر بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ گیٹ پر ہی بتا دیتیں کہ تمہارا باپ گھر پر نہیں ہے۔“ حمیدہ بیگم ہنوز

انداز میں کہہ کر پھر اپنے آپ بولنے لگیں۔
 ”آیا ہوگا پیسے مانگنے۔ بھیک منگوں کو اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ سویرے سویرے منہ اٹھا کر چلا آتا ہے۔“
 ”یا اللہ۔“ وہ حمیدہ بیگم کو بولتے چھوڑ کر وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

☆☆☆

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ ماں باپ کا سایہ اس وقت ان کے سر سے اٹھ گیا تھا جب ابھی دونوں زیر تعلیم تھے۔ یوں فطری طور پر دونوں بھائی ایک دوسرے سے بہت اچھے ہو گئے۔ محنت مزدوری کے ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی اور گو کہ کسی اعلا مقام پر تو نہیں پہنچ سکے لیکن اس قابل ہو گئے کہ گھر بسا سکیں۔ حیدر علی بڑے تھے۔ ان کی طبیعت میں بردباری اور نرمی تھی۔ چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ کی طرح تھے تو احمد علی بھی ان کا اسی طرح احترام کرتے تھے۔

بہر حال حیدر علی نے شادی کی تو قسمت سے بیوی بالکل ان کے مزاج کے برعکس ملی۔ وہ جتنے نرم خوتھے حمیدہ اسی قدر تیز طرار اور کسی حد تک بد زبان بھی۔ حیدر علی کم پر راضی ہونے والے اور حمیدہ زیادہ پر بھی نالائیں۔ فطرتاً اپنی عورت تھی گو کہ شوہر کے ساتھ دیور احمد علی بھی اپنی ساری کمائی اس کے ہاتھ پر رکھتے تھے پھر بھی وہ تنگی کا رونا روتی رہتی تھی۔ شادی کے سال بھر بعد اس نے پہلی بیٹی سیدہ کو جنم دیا اس کے بعد تقریباً پانچ سال وہ اولاد نرینہ کی خواہش میں دنیا جہان کے ٹوٹے ٹوٹکے آزماتی رہی اس دوران احمد علی کی شادی ہو گئی۔

حمیدہ کے برعکس احمد علی کی اولاد دھرمہ کی صورت اس کی گود بھری تو حمیدہ جو پہلے ہی اس سے خار کھاتی تھی مزید جل بھن گئی اور بیٹے کی آرزو میں اب ڈاکٹروں کے پاس بھاگنے لگی۔ لیکن قدرت کو جانے کیا منظور تھا کہ حمیدہ نے نصیب میں اولاد نرینہ لکھی ہی نہیں تھی۔ سیدہ کی پیدائش کے چھ سال بعد نرینہ اور اس کے دو سال بعد شہرینہ پیدا ہوئی۔ شہرینہ کے بعد فاخرہ نے بھی ایک بیٹی کو جنم دیا۔

یوں حیدر علی کی تین بیٹیاں اور احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔ تقریباً دس بارہ سال حیدر علی اور احمد علی بال بچوں کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہے پھر حمیدہ بیگم نے جگہ کی تنگی کا رونا رو کر الگ گھر کا مطالبہ کر دیا۔ حیدر علی اس بات کے حق میں نہیں تھے لیکن پھر انہیں یہ ہی بہتر لگا کیونکہ چھوٹے بھائی بھادوچ کے ساتھ اپنی بیوی کا نازیبا رویہ انہیں بھی بہت کھٹا تھا گو کہ بھائی بھادوچ نے بھی ان سے شکایت نہیں کی تھی لیکن کب تک اور یوں اس سے پہلے کہ بھائی یا بھادوچ کا ضبط جواب دے جاتا انہوں نے الگ ہو جانا ہی مناسب خیال کیا۔

شان ہو گئے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت مردوں
 خوبصورت بہنوں
 منظور واصلہ
 2 قسطیں

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 250 روپے
 ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
 ☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

مکتبہ عالمی عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

احمد علی اور فاخرہ بھی خاصے دل برداشتہ ہوئے لیکن حیدر علی نے انہیں سمجھا لیا۔ اور اس وقت جب وہ الگ ہو رہے تھے احمد علی نے حمزہ کے لیے شیرینہ کو مانگا تھا۔ گو کہ ابھی بچے چھ آنھ سال کے تھے پھر بھی حیدر علی نے اپنے بھائی کو ماپوس نہیں کیا تھا۔ اس موقع پر حمیدہ نے خلاف عادت اور خلاف توقع کوئی واہیا نہیں چھپائی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ الگ گھر کی ضد منوا چکی تھی۔ پھر اس کے خیال میں ابھی تو بچے چھوٹے تھے بعد کی وہ بعد میں نمٹ لے گی۔

بہر حال الگ ہو کر بھی حمیدہ کی اس گھر سے پر خاش قائم رہی جبکہ حیدر علی بھی اس گھر سے غافل نہیں ہوئے۔ اور ان کی بیٹیاں بھی فاخرہ چچی کی ویوانی تھیں۔ بڑی سیدہ البتہ بھی ماں کے کہنے میں آ جاتی تھی۔ یوں وقت کا پہلا اپنی مخصوص رفتار سے چل رہا تھا کہ چانک احمد علی دل کے دورے میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس وقت حمزہ نے ابھی انٹر کیا تھا اور بلا آٹھویں جماعت میں تھی۔ حقیقتاً فاخرہ کی دنیا اندھیرے ہوئی تھی۔ حیدر علی بھائی کی جوان مرگی پر ٹوٹ کر رہ گئے۔ لیکن پھر انہوں نے خود کو سنایا کیونکہ انہیں بھائی کے گھر کو بھی سپار دینا تھا۔ حمزہ ان کے خاندان کا واحد چشم و چراغ تھا اور یہ صرف ان کے بھائی کی ہی نہیں ان کی بھی خواہش تھی کہ حمزہ بڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے۔ گو کہ وہ خود بخود دار ملازم تھے اپنا گھر مشکل سے چلاتے تھے پھر بھی جوان سے ہو سکتا تھا بھادوچ اور بچوں کے لیے کرتے تھے اور انہوں نے تو بچہ بھی چاہا تھا کہ فاخرہ بچوں کے ساتھ ان کے گھر آ جائیں لیکن یہاں حمیدہ آڑے آ گئیں۔ پھر فاخرہ خود سمجھ دار تھی۔ اس نے مشین سنہالی کی حمزہ بھی ٹیوشن پڑھانے لگا۔ یوں گھر کی گاڑی سہولت سے تو نہیں لیکن چل پڑی تھی۔

بہر حال وقت خواہ کیسا بھی ہو گزر رہی جاتا ہے اور اپنے ساتھ جہاں بہت کچھ لے جاتا ہے وہاں دے بھی جاتا ہے اور حمزہ کے لیے یہ بھی بہت تھا کہ وقت نے اس کی اور شیرینی کی محبت کا کچھ نہیں لگاڑا تھا بلکہ ہرگز رتے دن کے ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ جبکہ حمیدہ بیگم اب کھلم کھلا اپنی بیٹی کی اپنی بیٹی اس گھر میں نہیں پیا پیاں گی۔ جہاں دو وقت رونی مشکل سے ملتی ہو۔ حمزہ کا وہ نام نہیں لیتی تھیں لیکن حیدر علی نادان نہیں تھے سب سمجھتے تھے پھر بھی خاموش رہتے تھے۔ خاموش رہنا ان کی مجبوری تھی۔ وجہ ایک تو بیگم کی زبان درازی جس کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا تھا دوسرے حمزہ کی محنت دیکھتے ہوئے انہیں یقین تھا کہ وہ ضرور بڑا آدمی بنے گا۔ وہ اس وقت کے انتظار میں تھے۔ اس کے بعد ان کے خیال میں حمیدہ کے پاس اعتراض کا کوئی جواز نہیں رہے گا۔ خود وہ حمزہ کو دل سے چاہتے تھے اور انہیں اپنی زبان کا پاس بھی تھا۔

حمزہ نے ایم بی اے کر لیا تھا اور اب وہ ہر دن کسی پراپلائی کر رہا تھا۔ آج بھی اس کا انٹرویو تھا۔

☆☆☆

اس کی نظریں بار بار کیپوٹر اسکرین سے ہٹ کر گلاس وال سے اوپر تیور غزنی پر پڑ رہی تھیں۔ جو بے حد الجھا ہوا پریشان اور مضطرب لگ رہا تھا۔ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ سلگاتا بھی کوئی قائل اٹھا کر پختا اور پھر جیسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو جھپکے دیتا۔

وہ اس کا اضطراب اپنے دل پر محسوس کرنے لگی تھی۔ اول روز ہی وہ اس سے متاثر ہوئی تھی۔ گو کہ وہ خوابوں میں رہنے والی لڑکی نہیں تھی نہ ہی اس نے کوئی آئیڈیل بنایا تھا لیکن تیور غزنی کو دیکھتے ہی وہ اسے آئیڈیل بنا کر لے گئی تھی۔ اور پھر اسے بتا بھی نہیں چلا کہ دل کا تمنائی ہو بیٹھا جب اس پر ادراک ہوا تب وہ پہلے حیران ہوئی پھر اسے آپ پر کسی بھی کہ کہاں وہ، کہاں میں۔

تیور غزنی اس فرم غزنی انٹر پرائز کا مالک تھا اور وہ اس کی فرم میں کام کرنے والی معمولی ورکر۔ پھر وہ اکثر خود کو سمجھاتی لیکن دل نادان کہاں سمجھتا ہے۔ مزید ترغیب دیتا ہے۔ ابھی اس کا دل چاہا چانک پورے استحقاق

کے ساتھ اس کے سامنے جا لڑی ہو اور اس سے پوچھے کہ وہ کیوں اتنا الجھ رہا ہے۔ کیا بات اسے پریشان کر رہی ہے اور پھر پل میں اس کی ساری الجھنیں ساری پریشانیوں سمیٹ لے۔ وہ شانت ہو جائے پھر بھلے سے وہ خود الجھتی رہے۔ عجیب خواہش تھی وہ خود پر ہنس بھی نہیں سکی تو ساتھ تیشی نمرہ کو پکار لیا۔
”سنو.....“

”ہوں.....“ نمرہ نے مصروف انداز میں جواب دیا تھا۔
”تم نے نوٹ کیا.....؟“ اس نے کہا تو اب نمرہ فائل چھوڑ کر اسے دیکھنے لگی۔
”کیا.....؟“

”باس بہت پریشان لگ رہے ہیں۔“ اس نے انگوٹھے سے تیمور غزنی کی طرف اشارہ بھی کیا تو نمرہ نے ایک نظر گلاس والے سے اوجھڑالی پھر بے نیازی سے بولی تھی۔
”کوئی بڑا س پر اہم ہوگی۔“

”نہیں مجھے گھریلو پریشانی لگ رہی ہے۔“ اس نے اتنے یقین سے کہا کہ نمرہ نے پہلے حیران ہو کر اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگی۔

”تمہارا قیاس بالکل غلط ہے خیر۔ ان بڑے لوگوں کے گھروں میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ ان کی ساری پریشانیوں بڑا س سے متعلق ہی ہوتی ہیں۔“

”تجربے۔“
”تمہاری بات سمجھ گئی ہوں لیکن اتفاق نہیں کروں گی۔ کیونکہ بڑے لوگ میسے سے بے شک بڑے ہوں لیکن ہوتے تو بہر حال انسان ہی ہیں اور زیادہ تر دل کے دورے بھی بڑے ہی لوگوں کو پڑتے ہیں۔“ اس کی بات سن کر نمرہ ہنسنے لگی تھی۔
”ہنس کیوں رہی ہو.....؟“

”تم نے بات ہی ایسی کی ہے۔ خیر چھوڑو ہمیں کیا۔ باس پریشان ہیں تو ہوا کریں ہم کون سا سکھی ہیں۔“
نمرہ نے آخر میں سر جھٹکا تھا۔ جس کا مطلب تھا یہ موضوع ختم لیکن وہ پھر بھی باز نہیں آئی۔
”سنو باس میری ہیں؟“ نمرہ جواب دینے کے بجائے تیمور غزنی کو دیکھنے لگی جیسے اس کے چہرے پہ لکھا نظر آ جائے گا۔ پھر کندھے اچکا کر بولی تھی۔
”ہاں نہیں۔“

”ہاں کروناں۔“ وہ بے اختیار بولی تھی۔
”ہیں میں کیوں ہاں کروں اور تمہیں کیا دچکپی ہے۔ کہیں تم ان کے سننے تو نہیں دیکھنے لگی۔ چہ چہ باز آ جاؤ افسانوی ہیروئن۔“ نمرہ نے اسے اچھی خاصی سناؤ ایل نو وہ وائٹ پیس کر بولی۔
”شٹ اپ۔ میں کوئی افسانوی ہیروئن نہیں ہوں۔“
”خنے کی کوشش تو کر رہی ہو۔“

”جی نہیں۔“ اس نے رخ موڑا تھا کہ اینٹر کام کی بزر پر فوراً ریسپور اٹھالیا۔
”لیس سر!“ نمرہ بلا ارادہ اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ریسپور کھ کراٹھ کھڑی ہوئی۔
”باس نے بلایا ہے۔“ وہ نمرہ کی طرف دیکھے بغیر کہہ کر تیمور غزنی کے روم میں آ گئی۔
”جی سر۔“ اسے ہمیشہ کی طرح اسے متوجہ کرنا پڑا تھا۔
”ہاں.....“ تیمور غزنی نے چونک کر اسے دیکھا پھر اپنے سامنے رکھی فائل اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”مس خزینہ یہ فائل دیکھ لیں اور جن پیمبر ز پر جس نے نشان لگائے ہیں وہ زیر سے نہیں میل کر دے۔“

”جی سر.....“ وہ فائل لے کر جاتے جاتے اچانک اس کی طرف پلٹی تھی۔

”ایکسیکو ز می سر.....“ تیمور غزنی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ پٹپٹا گئی۔

”سروہ..... میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ آپ کا بی پریشان لگ رہے ہیں۔ کیا آفس میں کوئی.....“

”نہیں.....“ تیمور غزنی نے ایک لفظ نہیں کہنے میں اس تمام عرصے میں پہلی بار بغور اسے دیکھا تھا اور

اپنے ذہنی انتشار کے باعث بلا ارادہ ہی اس کی نظرسں ٹھہر گئی تھیں کہ وہ کیفیوز ہو گئی۔

”میں جاؤں سر؟“ اس نے پوچھا اور جواب نہ پا کر جلدی سے اپنی سیٹ پر آ گئی۔ بے دھیانی کی نگاہ پر

بھی اس کی دھڑکنیں منتشر ہو گئی تھیں۔ اور گھر آئے تک تو وہ جانے کہاں سے کہاں پہنچی ہوئی تھی۔ بے حد کمزوری

لیکن آگے عالیہ خالہ اور شرجیل کو دیکھ کر وہ اچانک بد مزہ ہو گئی۔

”السلام علیکم خالہ آپ کب آئیں۔“ اخلاق تو نبھانا ہی تھا وہ خالہ کے گلے لگ گئی اور دعائیں لے کر

الگ ہوئی تو شہرینہ کہنے لگی۔

”شرجیل بھائی بھی آئے ہیں۔“

”ہاں کیسے ہو شرجیل.....“ اس کا انداز لیا دیا تھا پھر بھی وہ کھل کر مسکرایا۔

”بالکل ٹھیک.....“

”میں چیچ کر لوں۔“ وہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں آئی تو شرجیل بھی اس کے پیچھے آ گیا تھا۔

”کیا بات ہے اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں رہتی ہو۔“ شرجیل کے شکوے پر اس نے بہت سادہ انداز میں

پوچھا تھا۔

”کس سے؟“

”میں کسی اور کی بات کیوں کروں گا۔“ شرجیل کہنے کے ساتھ چیچر کی چیخ کر بیٹھ بھی گیا۔

”پتا نہیں تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے میں نے تو کبھی کسی کے لیے کوئی خاص رویہ نہیں اپنایا ہمیشہ سے ایسی ہی

ہوں میں۔“ اس نے سہولت سے کہہ کر الماری کھول لی۔

”ہاں بے نیازی تو شروع سے تم میں بھی اب بے مروت بھی ہو گئی ہو۔“ شرجیل نے کہا تو وہ الماری بند کر

کے اسے دیکھنے لگی۔

”غلط نہیں کہا میں نے.....“

”اچھا بس کرو میں کسی بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ وہ ٹوک کر پوچھنے لگی۔

”تم پتاؤ تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے؟“

”بس گزارا ہے۔“

”تو تمہیں اور اپلائی کیوں نہیں کرتے۔“

”کیوں نہیں کرتا۔“ مسلسل کر رہا ہوں لیکن تمہیں پتا ہے سروس کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔“ اس کی مایوسی پر وہ

عکشتی سے کہنے لگی۔

”ہاں بہت مشکل ہے۔ لیکن شرجی کچھ تو کرنا پڑے گا۔ تم پر تو ذمہ داریاں بھی ہیں۔ سعد یہ آپا کے سسرال

والے کب تک انتظار کریں گے۔“

”اللہ مالک ہے۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تو اسے اچانک احساس ہوا تھا۔

”ارے خالہ بھی کیا سوچتی ہوں گی کہ میں کہاں غائب ہو گئی تم چلو میں بس دو منٹ میں چیچ کر کے آتی ہوں۔“

”ہاں جلدی آتا ہم زیادہ دیر نہیں رکھیں گے۔“ وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تو اس نے بھی داش روم کا رخ کیا تھا۔

☆☆☆

حزہ گھر میں داخل ہوتے ہی اماں اماں پکارنے لگا لیکن جب فاخرہ کو جانماز پر بیٹھے دیکھا تو ایک دم خاموش ہو گیا۔ پھر بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے جانماز کے قریب ٹیک کر بیٹھ گیا۔ جب فاخرہ نے سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو وہ بے اختیار بول پڑا۔

”آپ کی دعائیں رنگ لے آئیں اماں مجھے ایک اچھی فرم میں جاب مل گئی ہے۔“
 ”اللہ تیرا شکر ہے۔“ فاخرہ سجدے میں گر گئیں اور کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ سجدہ کتنا طویل ہوگا اس لیے خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر برآمدے میں آیا تو چکن سے آلی پیلا اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”کیوں چلا رہے تھے بھائی۔ اماں نماز پڑھ رہی ہیں۔“
 ”ہاں اور اب شکرانے کے نفل پڑھیں گی۔“ وہ کہتے ہوئے وہیں تخت پر نیم دراز ہو گیا۔
 ”کیا مطلب.....؟“

”مطلب اماں کی دعاؤں سے مجھے جاب مل گئی ہے۔“ اس نے بتایا تو پیلا ایک دم خوش ہو گئی۔

”سچ، لیکن بھائی دعائیں صرف اماں نے تو نہیں کیں۔“
 ”جتنا ہے تم نے بھی کی ہیں۔“ وہ پیلا کا اشارہ سمجھ کر اندر ہی اندر محظوظ ہو کر بولا تھا۔
 ”میں اپنی بات تو نہیں کر رہی۔“

”پھر.....؟“ وہ مزید انجان بنا تو پیلا زچ ہو گئی۔

”اللہ بھائی کیسے انجان بن رہے ہیں ٹھیک ہے میں بھی شہرینہ کو یہ خوش خبری سنانے نہیں جاؤں گی۔“
 ”اچھا جاؤ کھانا لکھو لکھو لگ رہی ہے۔ اماں کو بھی بلاؤ بانی نفلیں بعد میں پڑھ لیں گی۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کر واش بین پر جا کھڑا ہوا۔ منہ ہاتھ دھو کر پھر وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔ جب تک پیلا نے کھانا لگایا فاخرہ بھی آگئیں تو کھانے کے دوران وہ اپنی جاب کے بارے میں بتانے لگا۔ فاخرہ مسلسل شکر کرنی اور دعائیں دیتی رہیں۔
 ”اماں ساری دعائیں بھائی کے لیے میرے لیے کچھ نہیں۔“ آخر پیلا نے ٹوک دیا تو فاخرہ نے ایک دم اسے گلے لگا لیا۔

”کیوں نہیں تم پہلے ہو۔“

”بس اب خوش ہو جاؤ۔“ حزہ نے کہا تو وہ کھلکھلا کر بولی۔

”میں پہلے بھی خوش تھی۔“ پھر حزہ کو خوش کرنے کی غرض سے کہنے لگی۔ ”اماں شام میں تایا جان کی طرف چلیں گے مٹھائی لے کر۔“

”ہاں اماں! تایا جان کو تو فوراً بتانا چاہیے میری جاب کا۔ بے چارے بہت فکر کرتے ہیں۔“ حزہ نے سنجیدگی سے اس کی تائید کی تو فاخرہ اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

”بتائیں تو اتنی دیر پیدل نہیں چل سکتی۔ تم دونوں چلے جانا اور اگر ابھی جاہو تو اپنے تایا جان کو فون کر دو۔“
 ”فون نہیں اماں ہم جا کر خوش خبری سنائیں گے۔ اس بہانے شہرینہ اور خزینہ آپنی سے بھی مل لیں گے ناں۔“ پیلا کا اشتیاق دیکھتے ہوئے فاخرہ خاموش رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے میں کچھ دیر سولوں۔“ وہ دسترخوان سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کا ارادہ ایک آدھ گھنٹے کی نیند لینے کا تھا لیکن ایک بڑا مسئلہ حل ہو جانے کا اطمینان تھا جو وہ گہری نیند سو

گیا۔ شام سے کچھ پہلے بیلا نے اسے اٹھایا تو وہ یہی سمجھا کہ صبح ہو گئی ہے جب ہی ہڑ بڑا کراٹھ کھڑا ہوا۔
 ”ارے آج تو مجھے آفس جانا ہے۔“

”کیا مطلب آپ کی نائٹ ڈیوٹی ہے کیا۔“ بیلا نے سیدھے سادے انداز میں پوچھا تو وہ چونک کر دروازے سے باہر دیکھنے لگا جہاں شام اتر رہی تھی۔
 ”تایا جان کے ہاں جانا ہے بھائی۔“ بیلا زور دے کر بولی تھی۔

”ہاں چلو..... میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔“ اس نے بیلا کو کمرے سے باہر دھکیل دیا اور پھر بہت جلدت میں تیار ہو کر اسے ساتھ لے کر گھر سے نکلا تھا اور آج کا دن اس کے لیے بڑا مبارک تھا۔ قسمت ساتھ دے رہی تھی کہ اس کی خواہش کے عین مطابق گیٹ شہرینہ نے کھولا تھا۔
 ”میں یہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ کاش میں پچھا اور مانگ لیتا۔“ اس نے شہرینہ کو دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا تو وہ اس کا مطلب سمجھ کر بے ساختہ مسکرائی تھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا۔“ بیلا نے بے دھیانی سے ٹوکا تھا۔
 ”کوئی مطلب نہیں۔ چلو تم اندر جاؤ۔“ وہ بیلا کو اندر دھکیل کر شہرینہ کی طرف متوجہ ہوا تو وہ جلدی سے بولی۔
 ”تم بھی چلو ناں۔“
 ”کہاں.....؟“ وہ شرارت سے مسکرایا۔

”اندر ابو کے پاس۔“
 ”چلتا ہوں پہلے تم سے تول لوں۔ پتا ہے تمام راستہ یہی دے گا کرتا آیا ہوں کہ پہلے تم سے ملاقات ہو جائے اور اس سے پہلے کہ تائی جان تمہیں پکار لیں سن لو کہ میں کل سے آفس جو ان کر رہا ہوں۔“
 ”آفس.....“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
 ”ہاں جاب مل گئی ہے مجھے ایک اچھی فرم میں۔“ اس نے بتایا تو وہ خوش ہو گئی۔
 ”جی.....“ تب ہی اندر سے حمیدہ بیگم نے پکارا تو وہ گھبرا کر بھاگ گئی۔ اور اس کا دل چاہا یہیں سے واپس لوٹ جائے لیکن ایک تو بیلا اندر تھی دوسرے تایا جان کی محبت میں کچھ چلا گیا تھا۔
 ”السلام علیکم تایا جان۔“

”جیتے رہو میراں خوش رہو۔ بڑے دنوں بعد آئے۔“ حیدر علی نے ہمیشہ کی طرح بہت محبت سے دعائیں دے کر کہا تو اس سے پہلے حمیدہ بیگم بول پڑیں۔
 ”لو ابھی پرسوں ہی تو آیا تھا۔“ اس سفید جھوٹ پر بیلا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ اس نے اشارے سے منع کر دیا اور حیدر علی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔
 ”بس تایا جان وقت ہی نہیں ملتا۔ آج اتفاق سے جلدی گھر آ گیا تو دیکھیں آپ کے پاس بھی آ گیا ہوں۔“
 ”اماں کیسی ہیں تمہاری؟“

”ٹھیک ہیں۔ سلام کہہ رہی تھیں آپ کو اور تائی جان آپ کو بھی۔“
 ”علیکم السلام، علیکم السلام۔“ حیدر علی نے دوسری بار غالباً بیگم کی طرف سے جواب دیا تھا پھر پوچھنے لگے۔
 ”کہا مصروفیت چل رہی ہے؟“

”بھائی کو جاب مل گئی ہے تایا جان۔“ اس سے پہلے بیلا بول پڑی۔
 ”اچھا بھئی بہت مبارک ہو۔ کہاں ملی جاب؟“
 انہوں نے خوش ہو کر پوچھا تو وہ انہیں تفصیل بتانے کے ساتھ حمیدہ بیگم کے تاثرات دیکھنے لگا جو اس کے

لیے خاصے مایوس کن تھے گویا انہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ پھر جیسے ہی شہرینہ جانے لے کر آئی۔ وہ اٹھ کر چلی گئیں۔ اب پتا نہیں انہیں کوئی کام یاد آ گیا تھا یا ان کے لیے جانے آنے پر ناگواری کا اظہار تھا اسے بہر حال بہت برا محسوس ہوا اور چائے پینے کو دل ہی نہیں چاہا بس تاپا جان کی محبت تھی جو مجبور کرواتی تھی۔ پھر خیرینہ بھی سن کر آگئی۔ اور وہ لڑکی اپنی باتوں سے ماحول کو خوشوار بنا دیتی تھی۔ ابھی بھی اصرار کرنے لگی کہ وہ لوگ کھانا کھا کر جائیں لیکن وہ اماں کے اکیلے ہونے کا بہانہ کر کے اٹھ گیا تھا۔

”کتنی بد اخلاق ہیں تائی جان اور بد دماغ بھی۔“ حسب سابق باہر آتے ہی بیلا بولنا شروع ہو گئی تھی۔

”ابھی تو تاپا جان اتنے امیر کبیر نہیں ہیں اگر بنگلے گاڑی والے ہوتے تب تو تائی جان باہر سے ہی لوٹا دیتیں۔ بس بھائی اب آپ کی جاب لگ گئی ہے ناں تو پہلی فرصت میں شہرینہ کو لانے کا سوچیں۔ وہ جب ہمارے گھر آ جائے گی تب میں بھی تائی جان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کروں گی۔“

وہ خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ ٹوکا بول نہیں کہ جانتا تھا جو کچھ وہ کہہ رہی ہے اس پر عمل کبھی نہیں کر سکے گی۔ اور وہ خود گو کہ اسے بھی تائی جان کا رویہ خاصا گراں گزرتا تھا لیکن وہ ان کے بارے میں نہیں سوچتا تھا کہ وہ ایسی کیوں ہیں یا یہ کہ وہ صرف ان ہی کے ساتھ ایسا رویہ رکھتی ہیں یا دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی ایسی ہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اور نہ بھی اس نے شہرینہ پر جتنا تھا۔ بھی وہ اپنے آپ ہی معافی مانگتی تو اسے بھی ٹوک دیتا تھا۔ کبھی ہنس کر کہتا کہ ”جب میں برا نہیں مانتا تو تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔“

”بھی برا مان بھی سکتے ہو۔۔۔۔۔“ شہرینہ ایسے کسی لمحے سے خائف تھی۔

”ہاں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں تم سے خفا ہو جاؤں گا کبھی نہیں۔ تم سے خفا ہونے کا تصور میرے لیے موت سے بڑھ کر ہے۔“ اس نے کہا تھا اور یہ بات اس نے محض اس کا دل رکھنے کے لیے پونی نہیں کہہ دی تھی وہ حقیقت اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اس کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ یعنی اسے بہتر زندگی دینے کے لیے۔

گو کہ شہرینہ کے ساتھ اس کی نسبت ابا کی زندگی میں طے ہوئی تھی اور اس وقت تائی جان نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ابھی بھی وہ اس رشتے کے خلاف اس کے سامنے تو کچھ نہیں بولتی تھیں پھر بھی وہ جلد سے جلد شادی کر لینا چاہتا تھا اور شادی کرنے کے لیے ظاہر ہے پہلے اسے اپنی پوزیشن مستحکم کرنی تھی۔ اس کوشش میں کب سے تو وہ خوار ہی ہو رہا تھا اور اب صبح جہاں اسے جانا تھا وہاں اس کے خیال میں وہ اپنی محنت سے جلد کوئی اچھی پوسٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

بریکا حسان نے بی بی اے کرتے ہی اپنے ڈیڑی کے ساتھ ان کا بزنس جو ان کر لیا تھا اور ایک سال میں ہی وہ بزنس کے اسرار و رموز سمجھ گئی تھی جب ہی ڈیڑی کی غیر موجودگی میں تمام معاملات بہت خوبی سے ہینڈل کر لیتی تھی۔ ڈیڑی کو بھی اس پر پورا اعتماد تھا اکثر جب ٹورز پر جاتے تو انہیں یہاں کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ حقیقتاً وہ ان کا بازو بن گئی تھی کہ انہیں اب بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ اب تو یہ کہتے تھے کہ اگر بیٹا ہوتا تو وہ بھی اتنے کم وقت میں ان کا سہارا نہیں بن سکتا تھا۔

اور وہ سہارا بن تو گئی تھی لیکن بہر حال ایک لڑکی تھی۔ لاکھ بزنس دو مین سہی اپنے احساسات نہیں بدل سکتی تھی۔ اور اس نے ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ کیونکہ خود سے آگاہ تھی۔ جانتی تھی کہ وہ جہاں کھڑی ہو جائے ساری خوب صورتیاں وہیں سمٹ آتی ہیں۔ اور یہ بات اسے مفرد کر دینے کے لیے کافی تھی اور صرف مغرور ہی نہیں خود غرض اور ضدی بھی تھی۔ جو چاہتی حاصل کر لینا چاہتی تھی۔

بہر حال وہ جس کلاس سے تعلق رکھتی تھی وہاں یہ خامیاں کسی کو نظر تو کیا آئیں محسوس بھی نہیں ہوتی تھیں۔ جب ہی ہر ایک بے اختیار اس کی طرف کھینچا چلا آتا تھا اور وہ خود جسے دیکھ کر بے اختیار ہونی مگی وہ جانے کون تھا جس پر اس کی نظریں ٹھہر گئی تھیں۔ گو کہ اس سے پہلے اس نے اسے بھی نہیں دیکھا تھا پھر بھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسے برسوں سے جانتی ہو۔

”کون ہے؟“ اس کی بے پناہ وجاہت میں الجھتے ہوئے اس نے خود سے سوال کیا تھا کہ گلاس ڈورنک کر کے کھولتے ہوئے وہ پوچھنے لگا۔

”مے آئی کم ان میم (کیا میں اندر آ جاؤں میم.....!)“ ربیکا نے کوئی حرکت نہیں کی بس پلکوں کو فوراً سا گرا رہا تھا اور یوں محسوس کیا جیسے وہ کھینچا چلا آیا ہو۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ وہ بہت اعتنا دے اندر آیا تھا اور ٹیبل پر فائل رکھی تھی کہ اس نے بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

”تھینک یو.....“ وہ چیخ کر بیٹھ گیا پھر اپنے سامنے فائل کھول کر کہنے لگا۔

”میم باس نے مجھے یہ کچھ کا ٹریکٹ دیے تھے میں نے انہیں اچھی طرح دیکھ لیا ہے اور میرا خیال ہے کمپنی کے مفاد کو دیکھتے ہوئے ہی نہیں.....“

وہ ایک ٹک اسے دیکھ کر جاری تھی۔ دل نشیں لہجے میں بولتے ہوئے وہ اس کے اندر کی دنیا تو بھلا کر رہا تھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا یہ سننے کی اس نے کوشش ہی نہیں کی۔ وہ تو بس اس کے ہونٹوں کی حرکت دیکھ رہی تھی یا پھر ساحر آنکھوں پر کمان ابروؤں کا بھی اٹھنا کبھی سمٹنا اور وہ تھا کہ اپنی کہے جا رہا تھا کہ اچانک اس کی غائب دماغی محسوس کر کے خاموش ہو گیا پھر قدرے رک کر پوچھنے لگا۔

”معاف کیجئے گا ایک بات پوچھوں؟“

”جی.....“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”آپ حسان صاحب کی جگہ.....“

”میں ان کی بیٹی ہوں۔ ربیکا..... ربیکا حسان۔ میں نے گزشتہ سال بی بی اے کیا تو اس کے بعد ڈیڈی مجھے باہر بھیجنا چاہتے تھے لیکن میں نہیں گئی۔ اور اس وقت سے ڈیڈی کے ساتھ لگ گئی۔ یہ اچھا ہوا کہ ان کی غیر موجودگی میں میں سارا کچھ سنبھال لیتی ہوں۔“

”وہ جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی اس شخص کو پہلی نظر میں ہی اپنا مان کر نہ صرف اپنے بارے میں سب بتا دینا چاہتی تھی بلکہ اس کے بارے میں بھی سب جان لیتا چاہتی تھی۔

”ٹھیک ہے میم آپ یہ بی بی فائل دیکھ لیں۔“ وہ فائل اس کی طرف کھسکا کر اٹھ کھڑا ہوا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ یعنی کوئی ایسا بھی ہے جو اس پر کام کو فوقیت دے رہا تھا۔

”ہوں۔“ وہ فائل پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگی۔ ”آپ کا نام؟“

”حمزہ..... حمزہ احمد علی۔“ وہ ہنسا کر چند لمحے رکا کہ شاید کوئی اور سوال ہوگا لیکن اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا پھر اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

اس نے شہرینہ کو لائٹ آف کرنے کا کہہ کر آنکھوں پر بازو رکھا تھا کہ حمیدہ بیگم آ گئیں۔

”خزینہ سوئی کیا؟“

”نہیں کیا بات ہے۔“ وہ آنکھوں سے بازو ہٹا کر انہیں دیکھنے لگی۔

”وہ بس یہ کہہ رہی تھی کہ تمہاری خالہ کا فون آیا تھا بتا رہی تھی شرجیل کی ترقی ہو گئی ہے۔ میں تو کہتی ہوں

بیٹا گھر کا لڑکا ہے۔ آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا۔“
 ”امی.....“ اس نے ٹوک دیا۔ ”میں مانتی ہوں شرجیل اچھا لڑکا ہے لیکن مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔“
 ”خزنی.....“ شہرینہ جو الماری میں سروے کچھ تلاش کرنے میں مصروف تھی فوراً الماری بند کر کے اس سے کہنے لگی۔ ”عالیہ خالہ اتنا چاہتی ہیں ہمیں اور پھر شرجیل بھائی کی بھی یہی مرضی ہے۔“
 ”تم چپ رہو۔“ اس نے شہرینہ کو ڈانٹ دیا تو وہ برا سامنہ بنائی ہوئی چکر کاٹ کر اپنے بیڈ پر آ بیٹھی لیکن ساری توجہ پھر بھٹی ادھر ہی تھی۔

”پھر تم کیا چاہتی ہو؟“ حمیدہ بیگم نے اس سے پوچھا تو وہ جیسے تنگ پڑ کر بولی تھی۔
 ”میں کیا چاہتی ہوں اس بات کو چھوڑ دوں امی۔ کس مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔“
 ”بیٹا شادی کی یہی عمر ہوتی ہے۔“ حمیدہ بیگم کا ایک اسی پر بس نہیں چلتا تھا۔ ”پھر تمہارے بعد شہرینہ بھی ہے۔ تمہاری ذمہ داری سے نکلو تو اس کا سوچو۔“

”آپ پہلے اس کا سوچ لیں۔ بلکہ سوچنا کیا ہے میں تو کہتی ہوں اس کی شادی کر دیں۔ حرزہ ماشاء اللہ روزگار سے لگ گیا ہے۔“ اس نے جتنے آرام سے کہا حمیدہ بیگم اسی قدر بیڑک اٹھی تھیں۔

”تمہارا دماغ خراب ہے۔ تم سے پہلے چھوٹی کی کیسے کر دوں۔ لوگوں کو کیا جواب دوں گی۔“
 ”لوگوں کی پروا آپ کو کب سے ہونے لگی۔“ اس نے حمیدہ بیگم کے بھڑکنے کا ٹوس نہیں لیا۔
 ”کرنی پڑتی ہے لوگوں کی پروا کوئی معمولی بات نہیں ہے جب سب پوچھیں گے کہ بڑی کو چھوڑ کر چھوٹی کی شادی کیوں کی تو میں کیا جواب دوں گی۔“ حمیدہ بیگم نے کہا تو وہ زچ انداز میں کہنے لگی۔

”یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں امی۔ اب کوئی نہیں پوچھتا۔ کیونکہ ہر گھر میں یہی ہو رہا ہے۔ خیر اس بحث کو چھوڑیں میں نے کہہ دیا مجھے شرجیل سے شادی نہیں کرنی تو نہیں کرنی۔ آپ عالیہ خالہ کو صاف جواب دے دیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے پھر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ گویا بات ختم..... حمیدہ بیگم چند لمحے اسے دیکھتی رہیں اور اسے تو کچھ نہیں کہہ سکیں جاتے جاتے شہرینہ پر تھرا آلود نظر ڈالتی گئی تھیں۔

”اف میں نے کیا کیا ہے۔“ شہرینہ بڑبڑاتی پھر چھلانگ مار کر خزینہ کے بیڈ پر آ گئی اور اس کے برابر لیٹنے ہوئے پوچھنے لگی۔

”خزنی تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟“
 ”کیسا.....؟“ اس نے آنکھوں پر سے بازو ہٹانے کی زحمت نہیں کی تھی۔
 ”اوہ اوہ ادھر تو دیکھو۔“ شہرینہ اس کا بازو ہٹانے لگی۔ ”شرجیل بھائی اتنے اچھے ہیں اور کیا تمہیں نہیں پتا کہ وہ تمہیں پسند کرتے ہیں۔“

”پتا ہے۔“ اس نے پہلے بے نیازی دکھائی پھر کہنے لگی۔ ”صرف شرجیل ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگ مجھے پسند کرتے ہیں تو کیا میں سب سے شادی کر لوں نہیں شادی میں اس سے کروں گی جو مجھے پسند ہوگا۔“
 ”اس کا مطلب ہے تمہیں کوئی پسند ہے۔“ شہرینہ ایک دم اٹھ بیٹھی اور اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔
 ”ہوں۔“ اعتراف کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں سوچ اتر آئی تھی۔

”کون ہے۔“ شہرینہ نے شوق سے پوچھا تو وہ چونک کر بولی تھی۔
 ”ابھی یہ سب مت پوچھو۔“
 ”اچھا یہ تو بتا دو کیسا ہے؟“ شہرینہ اپنا اشتیاق دبا نہیں سکتی تھی۔
 ”بہت اچھا بہت نفیس جب بولتا ہے تو دل چاہتا ہے بھی خاموش نہ ہو اور اس کی آنکھیں اس کی آنکھوں

پرساگر کا گمان ہوتا ہے۔ کبھی پرسکون اور کبھی شور مچاتی ہوئی۔ ”وہ بولتے ہوئے کھوئی تھی۔
 ”چنانچہ شہری میں کیوں اس کی تمنا کرنے لگی ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اس کے قابل نہیں
 ہوں۔ مڈل کلاس کی عام سی لڑکی ہوں میں اور وہ.....“
 ”وہ کیا بہت امیر ہے؟“ شہرینہ کی بے صبری نے سارا طلسم توڑ دیا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس
 کی بات کا جواب دینے کے بجائے جھنجھلا کر بولی تھی۔

”چلو جاؤ اپنی جگہ پر مجھے سونے دو۔“
 ”سو جانا یا! پہلے اس کا بانیوڈیا تو بتاؤ۔“ شہرینہ اس کے ٹوکنے سے بد مزہا ہوئی تھی۔
 ”اس کا بانیوڈیا یہ ہے کہ اگر میری قسمت میں شادی لکھی ہے تو اسی سے ہوگی ورنہ نہیں۔“ اس نے کہہ کر
 شہرینہ کو یوں وحکیلا کہہ کر تے کرتے پچی مچی پھر بھی اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔
 ”نام کیا ہے اس کا؟“

”تیجور..... تیجور غزنی.....“ ہونٹوں نے اس نام کو کیا چھوا کہ وہ پلکیں موند کر اسی کے سنگ جانے کن
 راہوں پہ جا نکلی تھی۔

☆☆☆

وہ کتنے دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ گلاس وال سے ادھر بیٹھی وہ لڑکی خزیہ حیدر علی کام کرتے کرتے
 اچانک اسے کھوجے لیتی ہے۔ جانے یہ اس کا مشغلہ تھا یا وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ جو بھی تھا وہ اگر
 ذہنی انتشار کا شکار نہ ہوتا تو اور کچھ نہیں اندر ہی اندر محظوظ ضرور ہوتا اور پھر کی بہانے اسے اس مشغلے سے باز رکھنے
 کی سعی بھی ضرور کرتا۔ لیکن وہ اپنے ہی کسی مسئلے میں نہ صرف الجھا ہوا بلکہ بے حد پریشان بھی تھا جب ہی کچھ اور
 سوچ ہی نہیں پاتا تھا۔ آفیشل معاملات بھی وہ زیادہ تر اپنے نیچر کے حوالے کر دیتا تھا۔
 ابھی بھی وہ بے حد پریس تھا۔ مزید اس لڑکی کا بار بار نظریں اٹھا کر اسے دیکھنا پریشان کر رہا تھا۔ جبکہ وہ
 کیسوی سے کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ ایک دو بار اس نے اپنی چیر گھما کر ان نظروں سے اوجھل ہونا چاہا لیکن پھر ایک
 دم اٹھ کر آفس سے ہی نکل آیا۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ چڑھتے سورج کی پیش میں وہ بے مقصد
 سڑکوں پر گاڑی نہیں دوڑا سکتا تھا اس لیے سیدھا سونیا آبی کے گھر آ گیا۔
 ”خیریت تم اس وقت۔ مطلب آفس نہیں گئے؟“ سونیا نے اس کی بے وقت آمد پر ٹوکا تھا۔
 ”گیا تھا.....“ وہ صوفے پر ڈھے گیا۔

”پھر.....؟“

”پانی لائیں ٹھنڈا۔“ اس نے سونیا کو پھر نظر انداز کر دیا تو وہ اسے دیکھتے ہوئے فریج سے ٹھنڈی بوتل نکال
 لائی اور اسے تھما کر بولی۔

”ٹھہر دو گلاس لائی ہوں۔“

”بہنے دیں۔“ اس نے بوتل کو منہ لگا کر بڑا سا گھونٹ لیا پھر صوفے کی بیک پر سر رکھ لیا تھا۔ سونیا چند
 لمحوں کے بعد کھینچی رہی پھر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

”دیکھو غزنی میں نے تمہارے مسئلے پر بہت سوچا ہے ہر پہلو سے اگر تم اپنی جگہ ٹھیک ہو تو غلط ماما اور بابا بھی
 نہیں ہیں۔“

”بس کریں آپ بیٹھی پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں اپنی آنکھوں پر
 رکھ لیں۔

”پریشانی مسئلے کا حل نہیں ہے۔“ سونیا زور دے کر بولی تھی۔
 ”پھر کیا کروں میں۔“ وہ جیسے عاجز ہوا تھا۔
 ”شاوی.....“

”کیا.....!“ وہ ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔ ”جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں ماما اور بابا سن لیں تو.....“
 ”ایک منٹ۔“ وہ ٹوک کر کہنے لگی۔ ”ماما بابا کو سنانے اور بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“
 ”آپ کا مطلب ہے۔“

”ہاں خفیہ شاوی کر لو۔“ وہ اسے بولنے ہی نہیں دے رہی تھی۔
 ”نو.....“ وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ ”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“
 ”کیوں نہیں کر سکتے۔ میں کوئی گناہ کرنے کو نہیں کہہ رہی۔ اگر تم آرام سے میری بات سنو تو میں تمہیں بتاؤں کہ تم.....“

”نہیں آپ! خدا کے لیے آپ مجھے مزید پریشان نہ کریں۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے تو سونیا چل کر بولی۔
 ”پاکل مت غوغائی۔ ماما بابا تو مجبور ہیں۔ تم مجبور نہیں ہو سکتے۔“
 ”میری مجبوری بھی وہی ہے جو ماما اور بابا کی۔“ اس نے کہہ کر پانی کی بوتل اٹھالی۔
 ”میں جانتی ہوں پھر بھی تمہیں یہ کرنا پڑے گا۔ نہیں تو پھر ماما کی بات مان لو۔“
 ”کیسے مان لوں۔ میرا دل نہیں مانتا۔“ اس کے ضدی انداز پر سونیا کٹھور پن سے بولی تھی۔
 ”تو پھر پریشان ہونا چھوڑ دو۔“

”مجھے کوئی برا علم نہیں ہے آپ۔ مجھے پریشان کیا جاتا ہے۔ ماما بابا سارہ سب کی ایک ہی رٹ ہے۔
 آپ بتائیں میں کیا کروں۔“ وہ اونچا پورا مرام رو دینے کو ہو گیا تھا۔
 ”میں پھر کہوں گی شاوی۔“ سونیا نے کہہ کر یوں ہاتھ اٹھایا جیسے اسے بولنے سے روکا ہوا دردہ ہونٹ بھیج گیا۔
 ”سکون سے میری بات سنو غوغائی۔ یہ بہت ضروری ہے۔ بابا لوگ کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور تم بھی سکون سے رہو گے۔ سمجھ رہے ہونا۔“
 ”نہیں.....“ وہ روٹھے لکھے میں بولا تھا۔

”ٹھیک ہے ابھی نہ سمجھو۔ لیکن میری بات کو سوچنا ضرور مجھے یقین ہے تم نہ صرف سمجھ لو گے بلکہ شادی بھی کر لو گے۔“ سونیا کہہ کر یوں مطمئن سے ہوئی جیسے مسئلہ حل ہو گیا ہو۔
 ”آپ کا بھی جواب نہیں۔ ذرا یہ تو سوچیں اگر بابا کو پتا چل گیا تو.....“ اس نے اپنے تئیں سونیا کو اس وقت سے ڈرایا تھا لیکن وہ تنگ کر کہنے لگی۔

”کیسے پتا چلے گا انہیں۔ تم بتاؤ گے۔ میں بتاؤں گی، نہیں ناں پھر.....؟“
 ”پھر یہ کہاں کی باتیں چھپتی نہیں ہیں۔“

”نہ چھپیں۔ شاوی گناہ نہیں ہے۔“ سونیا کا انداز ہنوز تھا۔
 ”اچھا چھوڑیں یہ بتائیں بچے اسکول سے کب آئیں گے؟“ اس نے اس موضوع سے ہٹنے کی غرض سے

پوچھا تھا۔

”دوبجے۔ تمہارے لیے چائے بخاؤں؟“ سونیا نے ہٹا کر پوچھا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔
 ”نہیں۔ بچوں کے آنے تک میں ایک نیند لے لوں۔“
 ”ہاں ادھر میرے کمرے میں چلے جاؤ.....“ سونیا نے کہا تو وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔

”آپ کے شوہر نامدار آگئے تو.....“
 ”وہ شام میں ہی آئیں گے۔ تمہاری طرح آوارہ گردی نہیں کرتے پھرتے۔“ سونیا کے جھنجھلانے پر وہ
 ہنستے ہوئے اس کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔

☆☆☆

حزہ کو اپنی جاب پر تین ہفتے ہو گئے تھے وہ اگر مطمئن تھا تو اس کے پاس حسان صاحب اس سے خوش
 تھے۔ اس کی کارکردگی کو فراخ دلی سے سراہتے اور کسی کمی دقت اسے لگتا جیسے وہ اس پر کوئی اضافی ذمہ داری ڈال
 کر اس کی صلاحیت کو آزمانا چاہ رہے ہوں ایسے میں وہ بہت ہوشیار ہو جاتا تھا اور اب تک تو انہیں شکایت کا
 موقع نہیں دیا تھا۔ یوں بھی اس کے اندر سیکھنے اور آگے بڑھنے کی لگن تھی۔ پھر ایمان داری اور وفاداری تو گویا اس
 کی گھٹی میں بڑی تھی۔ بہر حال وہ اپنے کام سے خوش تھا۔ اس کے اندر یہ خواہش نہیں تھی کہ وہ ایک دم سے سیڑھیاں
 پھلانگتا ہوا اوپر چلا جائے بلکہ وہی بات کہ جس کام کا جو وقت مقرر کیا گیا ہے وہ اپنے اسی وقت پر ہوتا ہے۔

پھر کھر کی گاڑی سہولت سے چل رہی تھی کوئی اتنے زیادہ افراد نہیں تھے جو اسے نہیں اور بھی ہاتھ پیر مارنے
 پڑتے جس سے وہ گھن چکر بن کر رہ جاتا۔ پیلا کے بارے میں سوچنا ضرور تھا، لیکن پریشان نہیں تھا کیونکہ ابھی تو
 وہ انٹر میں پڑھ رہی تھی اور وہ اسے بی اے ضرور کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ ابا کی خواہش تھی اس لیے اماں بھی کوئی
 جلدی نہیں مچا رہی تھیں۔ ورنہ اسے اپنی شادی سے پہلے پیلا کو رخصت کرنے کی فکر ہونی اور اسے اپنی شادی کی
 جلدی بھی یوں تھی کہ ادھر حمیدہ بیگم کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ وہ اپنی بیٹیوں کے لیے بہت اونچے خواب دیکھنے لگی
 تھیں۔ جس سے وہ خائف ہو گیا تھا۔ گو کہ شہرینہ پر اسے پورا بھروسا تھا، لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ اس گھر میں سب
 سے زیادہ حمیدہ بیگم کی چلتی ہے۔ ان کے سامنے تایا جان بھی خاموش ہو جاتے تھے۔

اس وقت وہ آفس جانے کے لیے نکلا تو اسٹاپ پر تایا جان کھڑے مل گئے۔ وہ انہیں اتنی جلدی دیکھ کر
 حیران ہوا کیونکہ وہ تو دس کے درمیان آفس جاتے تھے اور ابھی آٹھ بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے۔
 ”خیر یہ تایا جان۔ آج آپ اتنی جلدی۔“ اس نے ان کے گلے لگتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں آج کل کچھ کام زیادہ ہے اس لیے جلدی نکلتا پڑتا ہے۔ تم سناؤ گھر میں سب خیریت ہے۔“
 ”جی اللہ کا شکر ہے۔ آپ آئے نہیں بہت دنوں سے۔“ وہ شکوہ نہیں کر رہا تھا بس یوں ہی بات سے
 بات نکلتی چلی گئی تو وقت کا بتائی نہیں چلا اور اس روز وہ پہلی بار پورا ایک گھنٹا لیٹ آفس پہنچا تھا۔ حسان صاحب
 آچکے تھے اور فوراً اس کی طلبی بھی ہو گئی۔

”آئی ایم سوری سر! میں آج بہت لیٹ ہو گیا۔“ اس نے ان کے ٹوکنے سے پہلے ہی معذرت کر لی پھر
 بھی وہ پوچھنے لگے۔

”کیوں؟ آئی مین کوئی برا بلم تھی؟“
 ”نوسر۔ گھر سے تو میں ٹھیک وقت پر نکلتا تھا، لیکن آگے بس.....“
 ”ہوں کنوئیںس برا بلم۔“ انہوں نے اس کی پوری بات نہیں سنی پر سوچ انداز میں اسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔
 ”تمہارے پاس بائیک نہیں ہے؟“
 ”نوسر۔“

”بائیک لے لو بہت ضروری ہے۔“ انہوں نے یوں کہا جیسے وہ ابھی جا کر بائیک خرید لے گا۔ اور وہ کیا
 کہتا خاموش ہی رہا تو وہ اسے اپنی سیٹ پر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے تھے۔

”تسیم صاحب سے بانٹک کی چابی لے لیتا۔“

”تھینک یو سسر.....“ وہ ان کے کمرے سے بہت خوش نکلا تھا۔ اور پھر اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھایا تھا کہ ربریکا آگئی۔ وہ اسے دیکھ کر دوبارہ کھڑا ہو گیا تو وہ ٹوک کر بولی۔
”پلیز حمزہ..... میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میرے لیے آپ ایسی زحمت نہ کیا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”سوری..... میں بھول گیا تھا۔“ وہ فوراً بیٹھ گیا، تو وہ انجان بن کر پوچھنے لگی۔

”زیر والوں کی فائل آپ کے پاس ہے؟“
”زیر لٹسرکشن.....“ وہ ایک طرف رخ کی فائلیں دیکھنے لگا، پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”نوس، یہاں نہیں ہے۔“

”کہاں چلی گئی۔“ وہ وہیں سوچنے کھڑی ہو گئی۔

”میں تسیم صاحب سے معلوم کر دوں۔“ اس نے کہا تو وہ سر جھٹک کر بولی۔

”ان کے پاس نہیں ہے۔ میں معلوم کر چکی ہوں۔ خیر چھوڑیں یہ بتائیں آج آپ اتنی دیر سے کیوں آئے۔“
”بس ہو گئی دیر۔“ اس نے گول مولی سا جواب دے کر ایک طرح سے اسے ٹالنا چاہا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ دیر اس کے پاس کھڑی رہے، کیونکہ وہ محسوس کر چکا تھا کہ وہ کام کے لیے نہیں کام کے بہانے اس کے پاس آئی ہے اور مشکل یہ بھی کہ وہ اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ حسان صاحب کی بیٹی کے بجائے محض اس کی کولیگ ہوتی تو وہ یقیناً اپنا رویہ بدل لیتا، لیکن اب مجبور تھا۔ اس لیے اندر ہی اندر جزبہ ہوتا اور خود کو مصروف ظاہر کرنے کی کوشش کرتا۔ ابھی بھی اس نے یہی کیا تو ربریکا کچھ دیر خاموشی سے اس کی مصروفیت دیکھتی رہی۔ پھر جانے کے بجائے چیخ کر بیٹھ گئی۔

”میں میم.....“ حمزہ کو فوراً اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

”مائی گاڈ..... آپ سیدھے سیدھے میرا نام نہیں لے سکتے۔ کوئی اتنا مشکل نام تو نہیں ہے میرا ربریکا.....“
چلیں آپ صرف رابی کہہ لیا کریں۔“ وہ اس کے مؤدبانہ انداز سے چڑھ گئی تھی۔
”ربریکا..... رابی..... لیکن.....“ وہ جانے کیا کہنے جا رہا تھا کہ ربریکا نے ہاتھ اٹھا دیا۔
”کوئی لیکن ویکن نہیں۔“

”اوکے.....“ وہ میم کہتے کہتے رک گیا۔ پھر فوراً پوچھنے لگا۔ ”آپ کو کوئی اور کام ہے۔“

”نہیں.....“ وہ سختی سے کہہ کر ایک دم اٹھ کر چلی گئی تو وہ حیران سے زیادہ پریشان ہو گیا کہ اسے کیا بات بری لگ گئی ہے۔ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر سر جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا۔ خزیہ حسب معمول اپنے ہفتے بھر کے کام نمٹانے میں لگی ہوئی تھی۔ جن میں سرفہرست کپڑوں کی دھلائی، پھر انہیں استری کر کے بنگر میں ڈالنا، اس کے بعد نہانے سے پہلے وہ اپنا فیشل خود ہی کیا کرتی تھی۔ جبکہ شہرینہ کھانے کے بعد فراغت سے پیشی اپنے موبائل پر حمزہ کے ساتھ چیٹنگ کر رہی تھی اور آج جانے حمزہ کو کیا ہوا تھا کہ مسلسل اسے اپنے کمرے پر اصرار کر رہا تھا۔ آخر میں ناراض ہو کر کبھی بات نہ کرنے کی دھمکی دی تو اس نے ہامی بھرنی لیکن پھر پریشان ہو گئی۔ کیونکہ حمیدہ بیگم کو حمزہ کا آنا ناگوار گزرتا تھا اسے بھیجنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ حمزہ بھی اس کی مجبوری سمجھتا تھا، مگر جی اس دقت کچھ سننے کو تیار نہیں تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو سیل

فون آف کر کے بیٹھ گئی۔ تب ہی خزیہ نہا کر نکلی اور اپنے کیلے بال تولیے سے خشک کر کے برش اٹھالیا۔
 ”خزیہ..... وہ ایک دم اٹھ کر خزیہ کے پاس آ گئی۔ چچی جان کے ہاں چلیں۔“

”خیریت.....“ خزیہ اپنے ہی کسی خیال میں تھی۔

”چلو نا اتنے دن بلکہ مہینے ہو گئے ہیں چچی جان سے ملے ہوئے۔“ اس نے منت سے کہا تو خزیہ اپنے بال سمیٹتے ہوئے بولی۔

”ہاں دل تو میرا بھی بہت چاہتا ہے ان سے ملنے کو، لیکن نا تم ہی نہیں ملتا۔“

ابھی تو فارغ ہونا، پلیز خزیہ مجھے تواری جانے نہیں دیتیں۔ ابھی کسی اور بہانے سے چلتے ہیں۔“
 ”کسی اور بہانے سے کیوں۔ میں جتنی ہوں امی سے کہ ہم چچی جان سے ملنے جا رہے ہیں۔“ خزیہ گویا جانے کو تیار ہو گئی تھی۔

”ٹھیک ہے، تم امی کو بتاؤ، میں جب تک چنچ کر لوں۔“ وہ خوش ہو گئی۔ جلدی سے اپنا سوٹ نکال کر واش روم کی طرف بڑھی مگر وہاں کیلے کہ حیدرہ بیگم پکارتے ہوئے آئیں۔

”شہزینہ.....“
 ”جی امی.....“ وہ رک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”سینہ آرہی ہے۔ رات کے کھانے پر کچھا اچھا انتظام کر لو۔“ حیدرہ بیگم نے کہا، بلکہ آرڈر جاری کیا تو وہ انتہائی مسکینی سے خزیہ کو دیکھنے لگی۔

”کب تک آ میں گی سینہ آ پا؟“ خزیہ نے پوچھا۔

”ایک دو گھنٹے میں آ جائے گی۔“ حیدرہ بیگم نے بتایا تو خزیہ بے نیازی سے بولی تھی۔

”ٹھیک ہے اتنی دیر میں، ہم بھی آ جائیں گی۔“

”کیا مطلب..... تم کہاں جا رہی ہو؟“ حیدرہ بیگم نے فوراً ٹوکا۔

”یہیں قریبی مارکیٹ۔ مجھے کچھ ضروری چیزیں لینی ہیں۔“ خزیہ نے اس وقت کسی بحث سے بچنے کی خاطر جھوٹ بولا تھا۔ پھر فوراً شہزینہ سے مخاطب ہوئی۔ ”جلدی کرو شہزینہ۔ آ پا کے آنے سے پہلے ہم آ جائیں پھر ساتھ کھانا بنالیں گے۔“

”ہاں دیکھو۔ درمت کرنا۔“ حیدرہ بیگم جہاں دیکھتی تھیں کہ ان کی نہیں چلے گی، وہاں سے ہٹ جاتی تھیں۔ اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں فارغہ چچی سے یوں پٹی تھیں، جیسے مدتوں بعد پھڑکے ملے ہوں۔

”یاد آگئی میری۔“ فارغہ نہال ہوئی جا رہی تھیں۔

”ارے چچی جان آپ ہر دم یاد رہتی ہیں۔ بس آفس کی وجہ سے کہیں آنا جانا نہیں ہو پاتا۔ آپ بھی تو نہیں آتیں۔“ خزیہ تو سچ پیش کرتے ہوئے شکوہ بھی کر گئی۔

”آؤں گی آؤں گی۔ اب بیٹھو تو.....“ فارغہ نے پلنگ کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے کہا تو وہ بیلا کو دیکھنے لگی جو شہزینہ کے گلے لگی اس کے کان میں جانے کیا کہہ رہی تھی۔

”یہ کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں۔“ اس نے ٹوکا تو بیلا فوراً شہزینہ کو چھوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

”سچ آبی مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے۔“

”صرف خوش ہوئی رہو گی یا کچھ ٹھنڈا اونٹ ابھی پلاؤ گی انہیں۔ اتنی سڑی گرمی میں آرہی ہیں۔“ حمزہ نے کمرے میں آتے ہوئے بیلا کی بات سن کر کہا۔

”میں ابھی لائی فوراً آپ لوگ بیٹھیں۔“ بیلا عجلت میں بھاگ گئی تو وہ شہرینہ کو دیکھ کر شرارت سے مسکرایا۔ جواباً وہ بے نیازی دکھانے لگی تھی۔

”ارے ہاں حمزہ۔“ خزینہ ایک دم خیال آنے پر کہنے لگی۔ ”مبارک ہو تم نے بائیک لی ہے۔“

”نہیں ملی ہے۔“ حمزہ نے چیخ کر بیٹھنے ہوئے کہا تو شہرینہ بے ساختہ بولی تھی۔

”کہاں ہے؟“

”اے ہی راستے میں پڑی مل گئی۔“ وہ اسے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ تو وہ روٹھ کر منہ پھیر گئی۔

”پاگل ہے یہ تو..... تم بتاؤ حمزہ کہ اپنی طرف سے کئی ہے۔“ خزینہ نے پوچھا تو وہ اس کی طرف متوجہ

ہو گیا۔

”ہاں.....“

”اس کا مطلب ہے پروموشن ہو گئی ہے تمہاری۔“

”پروموشن بھی ہو جائے گی۔ ابھی تو صرف تین مہینے ہوئے ہیں۔ تم سناؤ تمہاری جاب کیسی جارہی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ خزینہ نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے تب ہی بیلا اسکو انش لے کر آگئی اور سب کو

گلاس تھما کر کہنے لگی۔

”جانے کی جلدی مت کیجیے گا خزنی آپنی اور یہ بتائیں رات کے کھانے میں کیا کھائیں گی۔ میں وہی

بنادوں گی۔“

”ارے نہیں..... کھانے کا تکلف مت کرنا۔“ خزینہ نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ فاخرہ بول پڑیں۔

”کیوں بیٹا۔ اتنے عرصے بعد آئی ہو، کھانا کھا کر جانا۔ اپنا ہی گھر ہے چچی جان، پھر آ جاؤں گی۔ اصل

میں آج سپینہ آ پا رہی ہیں اور ہمیں جا کر ان کے لیے کھانے کا انتظام کرنا ہے۔“ خزینہ کی بات سن کر وہ شہرینہ کو

دیکھنے لگا شاکی انداز تھا۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس کی ناراضی کے خیال سے آ تو گئی تھی، لیکن زیادہ دیر رک نہیں

سکتی تھی۔ اس لیے اسکو انش کا گلاس خالی کرتے ہی بولی تھی۔

”چلو خزینہ..... سپینہ آپا کے آنے سے پہلے ہم گھر پہنچ جائیں۔“

”ہاں..... ورنہ امی تو امی..... وہ بھی اتنی باتیں سناؤ ایس گی۔“ خزینہ گلاس رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہائیں..... یہ کیا آتا ہوا۔“ فاخرہ کو ان کے جلدی جانے کا افسوس رہا تھا۔

”پھر آئیں گے، چچی جان فرصت سے آئیں گے۔“

”میں تو نہیں آؤں گی۔“ شہرینہ نے حمزہ کا پھولا منہ دیکھ کر دھیمی آواز میں صرف اسے سنانے کو کہا اور

تیزی سے باہر نکلی تھی۔ حمزہ چاہنے کے باوجود اس کے پیچھے نہیں لپک سکا۔

☆☆☆

باقی آئندہ ان شاء اللہ۔

یاسمین نشاط

پیر ویدر



مندی لگے ہاتھ دکھ رہے تھے۔ رات جو اس نے حمیرا سے مندی کانیا فیضان بنوایا تھا اس کا رنگ زیادہ نہیں چڑھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی، آج ایک کوٹ اور مندی کا لگوا لے۔ تاکہ مندی کا گہرا رنگ چمک اٹھے۔

”بلیسہ۔“ اماں اندر داخل ہوئی تھیں۔ ان کے پکارنے کے اسٹائل سے وہ سمجھ گئی کہ اگلی بات کیا ہے۔ وہ مرکز استغماہی نظموں سے انہیں دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت ایک آنکھ میں کابل لگا چکی تھی، دوسری میں لگانا باقی تھا۔

”شکون خالہ آئی ہیں۔ دوپٹا اوڑھ کر آتا۔“ اماں نے کہا۔ وہ اثبات میں سر ملاتی دوبارہ آئینے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اسے آئینہ دکھنا بہت اچھا لگتا تھا، کبھی نہیں ہوا تھا کہ آئینہ نے اسے برا کہا ہو۔ وہ گھوم گھوم آگے پیچھے ہر زاویے سے آئینہ میں خود کو دیکھتی اور آئینہ ہر بار اس کی تعریف میں زمین آسمان کے ملا بے ملاتا۔

”اے ہاں نا، وہ تعریف کی مستحق ہے۔“ وہ خود کھلائی کرتی۔

تیار تو وہ تھی ہی، سیکے بالوں کو پشت پر یوں ہی کھلا چھوڑ کر اس نے سر پر ریڈ شیفون کا دوپٹا سلیقے سے بنایا اور خود کو سراہتی اس چھوٹے سے کمرے میں آگئی، جسے وہ بیشک اور لوگ ڈرامٹک روم کہا کرتے تھے۔ اماں شکون کے ساتھ ایک اور خاتون اور لڑکی بھی موجود تھیں۔ وہ سلام کر کے اماں کے ساتھ ہی صوفے پر ٹنگ گئی۔ خاتون کی ناقدانہ نظرس اب اس کا طواف کر رہی تھیں اور لڑکی بھی اپنی چیل جیسی نگاہیں اس پر گاڑے بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی اماں نے آنکھ سے اٹھ جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ معذرت کرتی باہر آگئی۔

”توبہ۔ ایسے دیکھتی ہیں جیسے انہیں ہونہیں قربانی کا بکرا خریدنا ہو۔“ باہر آتے ساتھ ہی اس نے گویا کھل کر سانس لیتے ہوئے سوچا تھا۔ یہ اسے دیکھنے آنے والی کوئی چوتھی فیملی تھی۔ اسے ستر ہواں کیا گارافت کی تو مانو نیندریں حرام ہو گئیں۔ مزید یہ کہ اس نے ایف

بلیجہ کو جو بھی دکھتا، دکھتا رہ جاتا تھا بلیجہ، سرمئی لیشلی آنکھیں۔ اس پر گال پر پڑتے ڈھیلو، حسن رب نے دیا نزاکت اس نے سیکھی۔ اوپر سے ہر وقت تک سک سے تیار، بولتی تو گویا پھول جھڑتے، ہستی تو سارے میں رونق پھیل جاتی۔

مندی، خوشبو گویا اس کی ذات کا حصہ تھیں گھورے گورے ہاتھوں پر مندی یوں کھلتی، جیسے عشق ہو۔ کوئی کہتا جس پر مندی کا رنگ یوں کھلے اس کامیاں بہت پیار کرتا ہے کوئی کہتا، ساس جان چمڑتی ہے۔ وہ ساری باتیں سنتی کھلکھلاتی رہتی۔ ہر وقت یوں تیار پھر کرئی جیسے کہیں جاری ہو اور جو کوئی پوچھ لیتا تو ترنت جواب آتا۔

”خوابوں کے دیس جاری ہوں۔“ بے فکری، بے نیازی، اس کی ذات میں یوں رچے تھے گویا وہ کسی سلطنت کی شہزادی تھی۔ شہزادی تو رفاقت نے اسے بنا کر ہی رکھا تھا۔

چار بھائیوں کی اکوتی بہن، سب اس کے ناز و غم اٹھاتے نہ جھٹکتے، اماں نے تو حقیقتاً ”سوچ رکھا تھا۔ ان کی شہزادی کو بیابانے کوئی شہزادہ ہی آئے گا اور اس شہزادے کے انتظار میں وہ بڑے دنوں سے گن گن کر گھریاں گزار رہی تھیں۔

بلیجہ کی ہم عمر لڑکیاں اگرچہ اس کی سپہیلیاں تھیں، لیکن اندر ہی اندر اس سے جلتی بھی تھیں، اس کی خوب صورتی، رکھ رکھاؤ کے طعنے فردا ”فردا“ ہر لڑکی کو اس کی ماں سے گاہے بگاہے سننے کو ملتے رہتے تھے اور اس کا دل وہ اس کے لیے دل میں کینہ رکھ کر لے لیا کرتی تھیں اور وقتاً فوقتاً ”پاتوں باتوں میں شوگر کوڈ گولیاں وہ بلیجہ کو کھلاتی رہتی تھیں۔ لیکن بلیجہ دل کی صاف بھی نہیں کر مل دیا کرتی۔



اس روز وہ نماز نکلے تو اماں کو گھر کی چیزیں غلت میں سیٹ کرتے پایا۔ ”یا اللہ خیر“ اس نے الماری میں رکھا کٹون اسپرے کیا۔ چہرے پر کریم لگائی۔ آئینے میں

بات بنتی ہیں۔ دلہن بیگم کے ہاتھوں پر کھلی پڑی
 مندی، نیل پالش سے رنگے ہاتھ، انگوٹھیوں سے
 مزین انگلیاں، دلہن کے خود پرست ہونے کا تاوے
 رہی تھیں۔ حاشر میاں خود گیا کسی سے کم تھے اور
 مغلوب ہونا انہوں نے کسی سے سیکھا ہی نہ تھا۔ سو
 اسی احساس کے تحت انہوں نے کمرے میں آتے ہی
 جو بیان جاری فرمایا، سن کر دلہن بی نے خود ہی
 گھونٹ گھٹ الٹ دیا۔ چرت بھری سرمنی، آنکھیں
 حاشر میاں پر یوں گڑی تھیں جیسے ابھی نثار نثار ہی
 دے ماریں گی۔

”میں نے کہا، اچھے خاصے صاف ستھرے ہاتھ
 مندی سے خراب کرنے کی کیا تک تھی بھلا۔“ بات
 دہرائی گئی۔ بیگم نے اپنے بے تحاشا خوب صورت
 ہاتھوں کو دیکھا، وہ تو سمجھ رہی تھی، حاشر اس کے
 مندی بھرے ہاتھ تمام کر تعریفوں کے پل باندھ دے
 گا اور شاید ہاتھ تھامے تھامے وہ عمری بتا دے اور
 ادھر جیسے کسی نے غبارے میں کیل گھسا دیا ہو۔ وہ اب
 بھی بے یقینی سے حاشر کو دیکھ رہی تھی۔ اب حاشر کو
 سچی سنوری دلہن خوب صورت تو لگ رہی تھی، لیکن
 اس کے اندر کا خود پرست مرد۔! (اور اہل کی
 پوٹلی)

”مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی، اتنا میک اپ اور
 زیور کیوں لادیں ہیں لڑکیاں اپنے اوپر؟“ اب وہ بیڈ کی
 پائنتی پر بیٹھا سرٹ داچ اتار رہا تھا۔ اور بیگم کو اپنا آپ
 چقدر محسوس ہو رہا تھا۔ (سرٹ جوڑے اور سرخ میک
 اپ کی وجہ سے اور کیا خبر اگلا جملہ اس کا یہ ہی ہو) بیگم
 چپ چاپ اٹھی اور واش روم جا کر منہ دھو آئی۔ اب
 کہ حاشر میاں کی آنکھیں پٹی تھیں۔ (دلہن سے
 اس روم عمل کی توقع جو نہیں تھی) حاشر میاں کے دل
 کو تو خچر کچھ نہیں ہوا، البتہ پندار کو نہیں لگی اور اچھی
 خاصی لگی۔ اپنے الفاظ کی سچی بکس بھلا دی۔

بیگم نے سارا زیور اتار کر ڈوں میں پیک کیا اور
 اٹھا کر سیف کے لاکر میں رکھ دیا۔ ایک آرام دہ سوٹ
 زیب تن کرنے کے بعد لنگا دوبارہ پیک کیا اور اسے

اے کے بعد تعلیم کو خیر یاد کہہ دیا۔ سارا دن ادھر ادھر
 چوڑیاں بھرتی وہ انہیں سخت ناپسند تھی۔ وہ لوگوں کی
 کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتی تھیں۔ اس لیے بیگم
 کے حسن سے خوف زدہ تھیں اور چاہتی تھیں جلد ہی
 اس کے جوڑ کا رشتہ طے اور وہ عزت سے اسے اپنے
 گھر کا کرس۔

خالہ شکون نے بڑی تعریفیں کی تھیں۔ اچھی امیر
 فیملی، لڑکا اچھی پوسٹ پر، مختصر سا خاندان، انہیں بس
 خوب صورت لڑکی ورکار تھی۔ حسن سیرت ہوتی تو
 سونے سا گ۔

وہ لوگ جاتے ہوئے امید کا دیا ان کے ہاتھ تھما
 گئیں۔ انہیں بیگم بہت پسند آئی تھی، بس وہ لڑکے کی
 مرضی جانا چاہ رہی تھیں اور اس میں بھی انہوں نے
 بہت دن نہیں لیے۔ ایک ہفتے بعد ہی انہوں نے
 منظوری کی سند دے دی۔

رفاقت کے دل میں خوشی کے پھول کھل اٹھے۔ وہ
 اسٹیشن میں اگرچہ ہم پل نہ تھیں۔ لیکن انہوں نے
 پھر بھی بیگم کو ٹوک بھر جیز دیا۔ انہوں نے بہت کچھ بنا
 رکھا تھا بیگم کے لیے۔ بیگم کو بھی حاشر کی تصویر پسند
 آئی تھی۔ جو کہ ادھر سے بھجوائی گئی تھی۔ ٹوپیں میں
 حاشر صاحب بھی دمک ہی رہے تھے۔ کسی نے تعریف
 کی، کسی نے دل جلانے والے ریمارکس دیے۔ پھر
 بھی شادی ہو ہی گئی۔

مندى اور بارات اس طمطراق سے آئی کہ محلے
 والوں نے دانتوں تلے انگلیاں داب لیں۔ یوں لگ رہا
 تھا جیسے حقیقت نہیں ڈر رہا ہو۔ اب تو سب کو ہی بیگم کی
 قسمت پر رشک آنے لگا۔ شنزادی کو کیا ہے واقعی
 شہزادہ آگیا تھا۔ وہ دلہن بنی قیامت ڈھا رہی تھی۔
 کہنیوں تک مندی کے تیل بوئے اس نے خود شوق
 سے بنوائے تھے سب نے کیسے کیسے تعریف کی تھی۔
 سرخ رنگ میں وہ کھلی پڑ رہی تھی۔ رخصتی ہوئی،
 رفاقت کا گھر سونا ہوا اور رونق حاشر میاں کے کمرے
 میں جات رہی۔

حاشر میاں دیکھ تو چکے تھے۔ دلہن بیگم بات بے

بھی لمحہ اسٹور روم میں رکھ آئی۔ اس وقت اسے ایک ڈائجسٹ یا کتاب کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ کاش دوسری ضروری اشیاء کے ساتھ وہ یہ بھی رکھ لاتی۔ حاشر میاں تو دل برداشتہ ہو کر موہاگل پر بڑی ہو چکے تھے۔ بیٹے نے بھی لمبی تان لی۔ یوں یہ خوب صورت وقت دو اناپرست اور خود پسند لوگوں کی فطرت کی نذر ہو گیا۔

☆☆☆

اگلے دن حاشر میاں کے اٹھنے سے قبل ہی وہ چڑی کاگوٹا لگا ہکا پھلکا سوٹ پہنے باہر صحن میں موجود اس کی بھتیجیوں بھانجھٹیوں کے ساتھ کپ شپ لگاتے موجود تھی۔ ساس، سرس نہال کہ کیسی کھل مل جانے والی ہو۔ مگر مندریں خوش کہ دہسن خوب صورت ہے، مگر خربے والی نہیں۔

حاشر میاں نے کھلی کھڑکی سے آدھا گھنٹا تو یہ منظر ملاحظہ کیا، پھر برداشت ختم ہو گئی اور لگے آوازیں دینے۔ ”بیٹے۔۔۔ بیٹے۔۔۔ لی۔“ کو بی ایک منٹ لگا وہ بیٹے سے ملی ہو گئی۔

بیٹے فرماں برداری کے تمام ریکارڈ تو ترقی رویہ دیا رہے تھے۔ حاشر نے ناقدانہ جائزہ لیا۔ آج اس کا چہرہ میک اپ سے مبرا تھا۔ ریڈ گرین چڑی کاگوٹے والا سوٹ۔ یہ اس کی عزیز از جان سینی نمونہ نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا۔ اس کے گورے پاؤں کو لہا پوری چپل میں مقید تھے اور اس میں کوئی ٹنگ نہیں تھا، بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔

”آپ نے بلایا تھا؟“ جب حاشر نے نظروں سے تولنے والا کام جاری رکھا تو بیٹے نے پوچھ لیا۔

”ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔“ حاشر ایک لمحے کو گڑبڑایا۔

”میں نے تمہیں کچھ سمجھانا تھا، بیٹھو۔“ سامنے اشارہ کیا۔ وہ سنبھل صوفے پر ٹنگ گئی، یوں کہ اس کے منہ دی لگے دونوں ہاتھ گود میں دھرے تھے۔ سر جھکا ہوا اور دوپٹے سے مریں۔ دائیں پاؤں کا ٹوٹھا مضطرب انداز میں ہلاتی وہ جی جان سے شامی فرماں سننے کے لیے

منتظر تھی۔

”تم پر فیوم کون سالگاتی ہو؟“ سوال آیا۔

”ہائیں۔“ اس نے جھٹ سے سر اٹھایا۔

”جینٹلس پر فیوم لگاتی ہوں۔“ آہستہ سے کہہ کر

اس نے قدرے توقف کیا، پھر بولی۔ ”اماں کتہی ہیں

عورتوں کو خوشبو لگا کر ہر نہیں لکھنا چاہیے، مرد متوجہ

ہوتے ہیں تو گناہ ملتا ہے۔ میں نے جینٹلس لگانا شروع

کر دیا۔ تاکہ مرد متوجہ نہ ہوں۔“ معصومیت بھرا

جواب دیا۔ حاشر کا دل چاہا اس لاجب پر دل کھول کر

تقدیر لگائے، لیکن ضبط کر لیا۔ (اماں کی کھائی پونٹلی ٹن

ٹن بجنے لگی تھی۔)

”تو لگاؤ ہی مت۔“ وہ کہہ کر لیٹ گیا۔ اب یہ لگاؤ

مت والا فرماں ناقابل ہضم تھا۔ اس کا تو سکھار پر فیوم

لگائے بغیر یو اینی نہ ہوتا تھا۔ اس ایک رات میں ہی وہ

جان گئی تھی، شہزادے کے سنگ رہنے کے لیے اسے

بہت کچھ چھوڑنا پڑے گا اور وہ ذہن میں حساب لگاتی پھر

رہی تھی کہ کیا کیا وہ آسانی سے چھوڑ سکے گی۔

☆☆☆

شام کو ولیمہ تھا اور ولیمہ کے بعد اسے اماں ساتھ

لے جانے کا ارادہ رکھتی تھیں مکلاوہ، چوٹھی کی

رسم۔ حاشر میاں نے بڑے پیار سے سمجھایا۔

”اتنے سال اماں پلاو کے ہاں رہ کر جی نہیں بھرا

تمہارا، بس رہنے دو۔ میں کیسے سوؤں گا تمہارے

بغیر؟“ (اللہ رہے)

”ہائیں۔۔۔ جیسے رات کو سوئے یا پھر اب تک کی

بچھلی ساری راتیں۔“ وہ سوچ کر رہ گئی۔ وہ سمجھ گئی

اس محل میں رہنے کے جو شرائط و قواعد لاگو ہوں گے

اسے نبھانے پڑیں گے۔ اس نے سہولت سے اماں کو

منع کر دیا اور وعدہ کیا مہمانوں کے جلتے ہی وہ رہنے

آئے گی۔ اماں با آسانی مان گئیں۔ کوئی بد مزگی نہیں

ہوئی۔ ولیمہ کے اگلے روز وہ لوگ تین دن کے ہنی

مون پر مری چلے گئے۔ ان تین دنوں میں بھی نہ وہ حاشر

سے بے تکلف ہو سکی نہ وہ اس سے خوش گئے اس کا

تیار بیچہ کہیں پیچھے ہی رہ گئی۔ ایک ماں، بسو، بھابھی ہی زندہ بچی۔ بچوں کی فرمائشیں، ساس، سرکار پر پیزی کھانا، ہر دیکھ ایند پر دعوتیں اس کے پاس وقت ہی نہ بچا کہ ایک لڑی رنگ کر آئینہ میں اپنا سر لپا ہی دیکھ لیتی، گزرتے وقت نے اس کا فکرو بھی قدرے فریبی مائل کر دیا تھا اور اسے یاد تھا کہ حاشیہ بہت شروع میں اسے بتا دیا تھا اسے موتی عورتیں قطعاً پسند نہیں تھیں۔ اس نے ویٹ کم کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہ کی، وہ اپنی زندگی میں ممکن ہو گئی۔ مہندی، کاچل، سرخی یا ڈور سب خواب و خیال ہو گیا۔ لیکن اس کی وجہ صرف اس کی مصروفیت نہیں تھی، بلکہ وجہ کوئی اور تھی جو کوئی نہ جان پایا تھا۔



اسے اڑاتی اڑاتی خبریں ملا کرتی تھیں۔ شہزادہ حاشیہ ہر روز نئی لڑکی کے ساتھ کسی نہ کسی ڈیٹ پوائنٹ پر پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ انور کرتی تھی۔ نہ بھی کرتی تو کیا کر سکتی تھی۔ اس کی داوی کہا کرتی تھیں۔ مو کو تب تک راہ راست پر نہیں لایا جاسکتا جب تک وہ خود نہ چاہے، رو لو، منت کر لو، بچوں کے واسطے دے لو۔ وہ تب ہی سدھرے گا جب اس کا اپنا بی چاہے گا، مرد کسی تعلق کسی رشتے کو چیر کر زنجیر نہیں کرنا اور بیچہ نے زنجیر بننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اپنے آپ کو بچوں میں گم کر لیا۔ حاشیہ آتا۔ اس کی طرف دیکھا اس کی شخصیت پر اعتراض کرنا اور لپ لپ کھول کر اپنی دنیا میں گم ہو جاتا۔

گزرتے سالوں میں حاشیہ اور گھر والوں کے رویے نے اسے احساس دلایا تھا کہ شاید دنیا میں اس سے بڑھ کر بد صورت اور پھوپڑ عورت کوئی نہیں، وہ کسی بھی بات پر کڑھتی نہیں تھی۔ کسی کے اعتراض کو وہ ختم کرنے کی کوشش ضرور کرتی تھی۔ لیکن اس نے جانا کوئی بھی اس سے خوش تھا نہیں۔

مندیں ہمیشہ بڑی بھانج کے گیت گاتی نظر آتیں۔ وہ بھانج جو ہمیشہ ان کی آمد پر یا تو بازار نکل جایا کرتی یا پھر

کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کا وہ بنا اور دھنا اپنے آپ کو سمیٹ کر چلنا۔ تیار تو وہ پہلے بھی تک سب سے رہتی ہی تھی، لیکن حاشیہ میاں کو اس کی تیاری میں پینڈو لچ نظر آتا۔

”دھنا سر پر مت لو۔ مائی کی لک سے جان چھڑاؤ۔ اور یہ دھیلے دھالے کام والے کپڑے۔ اف تو بہ! ہلکے رنگ پہنا کرو۔ بلکہ اگر جینز اور ٹائٹس پر ٹاپ پہن لیا کرو تو اچھی خاصی لگو۔“ شہزادے کے خیالات کچھ زیادہ ہی آزادانہ تھے۔ جینز اور ٹاپ کا سن کر ہی وہ لرز گئی۔ کہیں وہ سچ میں پکڑ کر پہنائیں نہ دے۔ اہل نے یہ تو دیکھا لڑکا شہزادہ ہے، یہ نہ سوچا اس شہزادے کی شہزادی سے وہ نباہ کر بھی پائے گی یا نہیں۔ وہ عام سی محلوں میں رہنے والی لڑکی اور وہ پوش ایریا کا ڈرن لڑکا گویا اس لباس میں اس کی دونوں مندریں بھی کم و بیش لبوس ہی نظر آتیں۔ لیکن بیچہ کے لیے یہ سب ناقابل قبول تھا۔

حاشیہ کے مسلسل ٹوکنے پر وہ بنا تو سر سے کندھوں پر آگیا، لیکن وہ جینز اور ٹاپ پہننے کی ہمت نہ کر سکی۔ وہ اکثر جب اسے لے کر باہر نکلتا تو سارا راستہ اس کا موازنہ گزرنے والی لڑکیوں سے کرتا رہتا۔ اس دن بنا بتائے اسے سلون لے گیا اور ہینو اسٹائلسٹ فائرہ سے اس کا جدید ہینو کٹ بنوایا۔ بیچہ کی شکل میں نئے ہینو اسٹائل سے واضح چینیج آیا۔ اسے اپنا چرو اچھا لگ رہا تھا۔ حاشیہ جان گیا وہ خوش ہے، ساتھ ہی اسے جینز پہننے والا لیکچر پھر سے پلایا۔ اس نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور دوسرے کان سے اڑادی۔

وہ بیوی کام والے کپڑے پہننا چھوڑ چکی تھی۔ جیولری، میک اپ اور تو اور باتھوں پر مہندی لگانا بھی جس کا اسے سب سے زیادہ دکھ تھا، پھر بھی وہ ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے حاشیہ کو دکھ ہو۔ لیکن اس سب کے باوجود حاشیہ اس سے خوش نہیں تھا۔

بچے ہو گئے، وہ ان میں مصروف ہو گئی، ساس، سر، شوہر، بچے، مندوں کا آنا جانا۔ مصروفیت میں ایسے گم ہوئی کہ اپنا سر لپا بھلا ہی دیا۔ وہ ہر وقت تک سب سے

”ٹھیک تو ہے میرا حلیہ، گھر میں جوان ملازم ہیں، ڈرائیور، ٹھیک اب میں غیر مردوں کے سامنے بناؤ سنگار کرتی اچھی لکڑوں کی، خواہ مخواہ گناہ مکاؤں، اور حاشر کو بھی مجھ سے کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ تم تاج اچانک آگئی ہو، اس لیے تمہیں اس حلیے میں مل گئی۔ صبح سے الماریاں صاف کر رہی تھی۔ نہانے جانا تھا مجھے ابھی۔“

ایسے تئیں اس نے نمرو کو مطمئن کرنا چاہا تھا۔ لیکن وہ نمرو تھی، اس کی بہت گہری دوست، بنا کے اس کے دل کی باتیں جان لینے والی۔ اب کیسے مطمئن ہوئی۔ لیکن اس نے زیادہ کیرید نامناسب نہیں سمجھا۔ اگر وہ کسی بات کا پردہ رکھنا چاہتی ہے تو اسے کیا ضرورت، تھوڑی دیر بیٹھ، اوھر اوھر کی گپ شپ کر کے وہ واپس چلی گئی اور جاتے جاتے یلحہ کو اپنے گھر آنے کی تاکید کر گئی۔ اس نے وعدہ کر لیا۔ حالانکہ اسے امید نہیں تھی کہ حاشر اسے اس کی دوست کے گھر لے جائیں گے۔ ان کو اس پرانے محلے میں جاتے ہوئے اپنی ہنگ محسوس ہوتی تھی۔ وہ اس پر بہت خرچ کرتا تھا۔ آؤٹنگ پر بھی لے جاتا۔ کسی نہ کسی ویک اینڈ پر وہ بچوں کو سینما دکھانے بھی لے جاتا۔ اس کے لیے شاپنگ بھی کرتا۔ لیکن جیسے ہی وہ اس کا لایا سوٹ، جوئی، کچھ بھی پہنتی، وہ برا سامنے بیٹھتا۔ گہرے رنگ تم پر سوٹ نہیں کرتے۔

وہ ہلکے رنگ پہنتی تھی۔ اس کا حلیہ واقعی کام کرنے والیوں جیسا ہو گیا تھا۔ ہلکے رنگ، سیدھے بال، بنامیک اپ کے چہرہ ہاتھ چہرہ کسی بھی آرائش سے مستثنیٰ۔ ہر وقت پتوں میں کھیلتی، یلحہ تو کہیں سے بھی لڑکی دکھتی ہی نہ تھی۔



حاشر کی پروموشن ہوئی۔ اس نے اپنے سارے دوستوں کو وہ فیملی ڈنر کے لیے انوائٹ کر لیا۔ انتظام باہر لان میں کیا گیا تھا۔ وہ خوبشیرک کے ساتھ گئی رہی۔ شام تک سب کچھ تیار تھا۔ صاف ستھرا گھر، بچے، وہ اپنا

بیاری کا بہانا بنا کر ہائے ہائے کا غلغلہ مچائے رکھتی۔ سروی ہوتی یا گرمی چائے کا کپ اور ٹی ٹائم بسکٹ کا ہاف رول، پھر بھی وہ بہت اچھی بھابھی تھی۔ ساس بھی ہمہ وقت بڑی ہوس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتیں۔ حالانکہ کبھی جو ساس صاحبہ اوھر رہنے چلی جاتیں تو اپنے رویے سے اگلے ہی دن انہیں واپس جانے پر مجبور کر دیتی اور حاشر بھی تو ہر وقت نکتہ بھابھی سے متاثر ہی نظر آتا۔

”تم نے کبھی نکی بھابھی کو دیکھا ہے۔“ وہ اس کے حلیے پر ناقدانہ نظر ڈالتا۔ ”چار جوان بیٹوں کی ماں کہیں سے بھی لگتی ہیں اور ایک تم ہو۔“ تان ہمیشہ ایک تم ہو پر آکر ٹوٹی۔

”ہاں ایک میں ہوں۔“ وہ ٹوٹھ برش کرتے ہوئے آئینہ میں اپنی شکل دیکھتی تو اسے ”یلحہ“ یاد آ جاتی۔ نزاکتوں سے بھری یلحہ جو اماں کے گھر میں ہل کر پانی نہ چیتی تھی اور اب یہاں کوئی اسے ایک گھونٹ پانی دینے والا نہ تھا۔

اس روز نمرو آگئی۔ یہ ہی کوئی چھ سات سال بعد۔ سانپو سی نمرو کا رنگ روپ ہی اور ہو گیا تھا۔ چمکتا چہرہ، ڈانکی کے بال، برانڈڈ کرتاؤز، رن گلاسز لگائے وہ کوئی اور ہی نمرو تھی۔ شادی نے تو اسے یکسر بدل ڈالا تھا۔ اس نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو وہ ہنس پڑی۔

”شادی کے بعد بدلنا پڑتا ہے اپنے آپ کو۔ ورنہ یہ جو شوہر حضرات ہیں، بے وفائی کرنے میں ویر نہیں لگاتے اور یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، پتلی رنگت، اڑے بال، متوحش آنکھیں، یا اللہ! یلحہ یہ تم ہو۔“ اس نے اب غور کیا تھا اس کی حالت زار پر۔

”کیا ہوا، مجھے وہی تو ہوں۔“ وہ ہنس دی۔ کھسیانی نہی۔

”نہیں۔ تم وہی نہیں ہو۔ یہ لہسن، پیاز کی مہک میں ڈوبی لڑکی یلحہ امتیاز تو نہیں۔ جہاں تک میں جانتی ہوں حاشر بھائی اچھی پوسٹ پر ہیں۔ تمہیں فٹاشل براہم بھی کوئی نہیں۔ کیا تمہا پر نہیں جاتی ہو حاشر بھائی کے ساتھ۔ ان کے لیے تمہارا حلیہ قابل قبول ہے؟“

گھریلو عورت ہونے پر۔ لیکن حاشر شرمندہ ہونے والے مردوں میں سے نہیں تھا۔ کمرے میں آتے ہی فرمان جاری ہونے لگا۔

”خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ان سب کو بتا رکھا ہے تم کس بیک گراؤئڈ سے تعلق رکھتی ہو، شرابا، لجانا، خواہ مخواہ مجھ سے جھجھکتا ہمارا گھٹی میں ہے۔ انہوں نے دانستہ ہمارے ساتھ ہمارا نفور و مسکین کیے۔ ورنہ یہ تو ان کا مزاج ہی نہیں، محلے اور سوسائٹی کا فرق تو حلیمہ سے ہی نظر آ جاتا ہے۔ اب دیکھو تیل غم لاکھ شارٹ شرٹ اور کیپری پہن لو، ہمارے بولنے، کھانے پینے پر ہر چیز سے ہمارا محلہ نظر آتا ہے۔“

وہ کھلم کھلا بے عزتی کر رہا تھا۔ بلیہ صبر کے گھونٹ
نی رہی تھی۔ اس کا دل شدت سے چاہا جو اب اس کی
چھلکی تھی تو اس کی تمام تر زیادتیوں کو مسہرہ ہی تھی۔
جس پر طبقے سے حاشر کا تعلق تھا اس طبقے میں ایسی
زیادتیاں برداشت کرنا عورت کو سکھایا نہیں جاتا تھا۔
اس طبقے کی عورت اگر مرد کے برابر کھڑی ہوتی ہے تو
حقوق بھی برابر کی لیتی ہے۔ یہ جو دن رات بے
عزتی کرنے کا پروگرام حاشر اور اس کی فیملی چلائے
رکھتی تھی کوئی اور مسہرہ کر تو کھا تھا۔

یلتھ نے سوچ لیا تھا جان لیا تھا۔ وہ اس گھر کے کسی
فرو کے لیے باعث خوشی نہیں وہ اپنے آپ کو جتنا
مرضی آزار پہنچا لے۔ لیکن اس سارے کے نتیجے میں
اس نے ایک اور کام کیا۔ اپنے آپ کو بے حس کر لیا۔
کسی کے رویے پر دھی نہیں ہونا۔ کوئی بولتا رہے،
اسے کوسنوں سے نوازتا رہے۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے
چلنے پھرنے میں نقص نکالتا رہے۔ اس کی بلا سے وہ
کس کس کی خاطر کتنا کتنا بدلتی اپنے آپ کو۔ سب کچھ
قبول والا تھا۔ اور کیا کرتی؟ کبھی نہیں سنتی تھی۔

✱ ✱ ✱

حاشر کو وہ پہلی نظر میں اچھی لگی تھی۔ وہ اس روز اپنے دوست سے ملنے اس کے گھر گیا تھا۔ لگی سے

نیا ڈریس اتھا لرو اتس روم کی طرف جارہی تھی۔ جب
حاشر کسی کام کی غرض سے اندر آیا۔ اس کو غور سے
دیکھا۔ وہ منتظر کھڑی ہو گئی، فرمان سننے کے لیے۔

”میرے سب دوستوں کی بیویاں بالی سوسائٹی مودو کرنے کے سارے کر جاتی ہیں۔ فیشن سے لے کر سیاست تک، وہ ہر ٹاپک پر بلا ٹھکان گفتگو کر سکتی ہیں۔ تم محض ٹاپک پر گفتگو کر سکتے ہو؟“ وہ استہزاء پوچھ رہا تھا۔ ”ہیں، نہیں۔ لیکن، کیا، بچے، مہتری کوشت کے علاوہ۔“ اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی حاشر نے دوبارہ کہہ۔ وہ بیشک کی طرح خاموش رہی۔ وہ جواب دے سکتی تھی، لیکن دینا نہیں چاہتی تھی، بیشک کمال کے ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

”نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے تم ان سب میں سروائیو کر سکو گی؟“ وہ پھر بولا۔

”آپ چاہتے ہیں کہ میں باہر نہ آؤں؟“ اس نے یازید پر ڈالے کپڑے بند پر رکھ دیے اور واپس مڑنے کو بھی کہ حاشر کی آواز کالوں میں بڑی۔

”اب اتنا ایٹمی بخود دکھانے کی ضرورت نہیں۔ بس جس چیز کے بارے میں نہ جانتی ہو، منہ نہ کھولنا۔ بانی سب جانتے ہی ہیں تم سوشل نہیں ہو، خالصتا گھریلو ”عورت“ ہو“ حاشیے نے عورت پر خاصا زور دیا۔

وہ لڑائی، جھگڑے، بحث سے دور بھاگتی تھی۔ خاموشی سے تیار ہونے چل دی۔ بڑے سلاول بعد وہ سلاول سے تیار ہوئی تھی۔ اور باہر آتی وہ رونق محفل میں لگتی تھی۔

”میں بھی کموں حاشر نے اپنی بیوی کو اتنا چپا کر
کیوں رکھا ہے۔“ حاشر کے ایک دوست نے بے
پاک نظموں سے اسے توالتے ہوئے کہا۔ وہ گھبرائی
نہیں۔ اس نے سب ممانوں کو ڈیل کیا۔ سب کے
ساتھ باتیں کیں۔ سب اس کی صلاحیتوں کے معترف
ہوئے اور حاشر کو بار بار احساس دلاتے رہے کہ اس کی
بیوی بڑی گنتی ہے۔ وہ بہت خوش قسمت ہے وغیرہ
وغیرہ۔ یہی حق ہو گئی۔

کس نے اس کے کپڑوں پر نکتہ چینی کی نہ اس کے

تہمارے سر پر چڑھ کا ناچے گی۔ کچھ بہن کی، کچھ لگ رہی ہو۔ بھی سرانجامت ورنہ پھٹ جائے گی، اپنے حسن سے تمہیں مغلوب کرے گی اور پھر تم پر حکومت کرے گی۔ تم کسی سے تم ہو۔ ہاں کم تو وہ کسی سے بھی نہیں تھا۔ ہاں اگر اس کو اپنے سے کم تر لڑکی پسند آگئی تھی تو یہ اور بات تھی۔ اس نے اماں کی بات اچھی طرح باندھ کر والٹ میں رکھی۔ (لڑکی ہوتی تو پلو سے باندھتی)

پہلی رات جب حاشر میاں نے ولسن کے منہ دی رنگے ہاتھ دیکھے تو دل گویا بھاگ نکلنے کو بے تاب ہوا۔ ”منہ دی کسی کے ہاتھ پر یوں بھی رچتی ہے۔“ وہ تو سوچتے ہی رہ گئے، لیکن اگلے ہی پل والٹ سے آواز آئی۔ آواز کیا مانند۔ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر راز دل کہنے کی حسرت کو دل ہی میں دبایا اور لگے گوہر افشالی کرنے۔ اس پر گہرے رنگ بست اٹھتے تھے اور تلکے رنگوں میں اس کا رنگ روپ اور نکھرنے لگتا۔ حاشر میاں کو ہر روپ بھاتا، مگر اماں کے گولڈن الفاظ پھر رفتہ رفتہ وہ اماں کے ہی لفظوں کی چھالوں میں بڑے رہنے کو ترجیح دینے لگے۔ وہ اچھی لگتی۔ بری لگتی، ہر وقت ساس کی طرح مین میکہ نکالنا، اعتراض کرنا فطرت بن گئی اور اس سارے میں حاشر نے دیکھا ہی نہیں کہ وہ جو زندگی سے بھرپور لڑکی تھی، کہیں چپکے سے مر گئی تھی اور شاید دفن بھی ہو گئی تھی۔ اس محل کے ایک کمرے میں۔



اماں نے اس کا سونا سونا روپ دیکھا تو پوچھ لیا۔ ”تو خوش نہیں ہے بیٹے؟“ وہ ہنسی کا فیدہ بنا رہی تھی۔ پلٹ کر اماں کو دیکھنے لگی۔

”ناخوش ہونے کی کون سی وجہ ہے۔ محل میں رہتی ہوں۔ نوکر، چاکر، گاڑی، کسی چیز کی کمی نہیں۔ پھر میں ناخوش کیوں ہوں گی۔“ فیڈر بنا چکی تھی۔ ہنسی کے منہ میں دیا۔ باہر تینوں بچوں کے لڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ جا کر انہیں منع کرنا چاہتی تھی۔ لیکن نہیں

گزرتی لڑکیوں کے ٹوے میں وہ اسے سب سے مغفرو ہی لگی۔ اس نے ارسل سے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اس نے اس کا سارا شجرہ نسب بتا ڈالا اور اگلے چند دن میں ہی حاشر پر انکشاف ہوا وہ اس لڑکی جس کا نام بیٹھ امتیاز تھا، کی محبت میں پور پور ڈوب چکا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے اس کے ذہن پر وہ ہنسی سوار رہنے لگی تھی۔ اس نے ارسل کے گھر کے بلاسب چکر لگانے شروع کیے تو وہ بھی کھڑکا۔ پوچھنے پر حاشر نے سب کہہ ڈالا۔

”شریف لڑکی ہے، شریف خاندان۔ اس طرح کی حرکتیں اسے بدنام کر ڈالیں گی۔ سیدھی طرح رشتہ بھیجو اور اسے اپنا لو اور اگر کوئی اور ارادہ ہے تو پھر باز رہو۔ محلے کی لڑکیاں ہماری اپنی نہیں ہیں۔“ ارسل نے اسے سمجھایا اور وہ سمجھ بھی گیا۔ مگر وہی ای اے میں رہنے والی نئی نئی امیر ہوئی اماں کو محلے کی لڑکی سے عشق کرنا کچھ بھایا نہیں۔ سب نے سمجھایا، لیکن حاشر کی سوئی اسی لڑکی پر اٹکی رہی۔ بھوک ہڑتال کر ڈالی۔ اماں نے بالا ہی بالا اس لڑکی کی معلومات اکٹھی کیں اور پھر اماں شکورن جو کہ رشتہ کروانی والی خالہ کے نام سے مشہور تھیں نے مہر لگا دی کہ لڑکی اور اس کا خاندان انتہائی شریف ہے اور اتنے گئے گزرے بھی نہیں، ٹھیک ٹھاک آمدن اور ٹھیک ٹھاک رہن سہن ہے۔ اماں کے کچھ خدشات دور ہوئے، کچھ انہوں نے خود ہی نہیں کیے اور یوں اماں شکورن کی وساطت سے یہ رشتہ طے پا گیا۔

حاشر میاں بڑے خوش ہو گیا ہفت اقلیم ہاتھ آگئی ہو۔ اماں نے سمجھو تا تو کر لیا۔ لیکن بیٹے کو چند سنہری باتیں بھی ازر کرادیں۔

”دیکھو بیٹا، تم نے جو چاہا، پایا، وہ لڑکی تمہاری ہو گئی، تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ حد سے زیادہ خوب صورت اور اوپر سے غریب محلے کی۔ ہمیشہ میری بات یاد رکھنا، کبھی اسے مت بتانا کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ کبھی اسے اہمیت دے کر سر پر مت چڑھانا۔ وہ خوب صورت ہے بلا کی اور یہ بات وہ جانتی بھی ہے۔ لہذا اس کی تعریف مت کرنا۔ ورنہ

اٹھی۔

”تیری ساس کا سلوک تو مجھ سے اچھا ہے؟“ اب انہیں بے چینی تھی یا کوئی اور مسئلہ۔ وہ کئی بھی تو بہت دنوں بعد تھی۔ وہ سب کچھ جان لیتا چاہتی تھیں۔

”سب اچھے ہیں۔ اپنی اپنی زندگی میں مگن۔“ اب وہ پتلی کو تھک رہی تھی۔

”نہیں، میرا مطلب ہے۔ حاشرہ۔ تو بدل گئی ہے۔ ہار سنگا ریاضی عورت کا زیور ہوتا ہے۔ یوں سر جھاڑ، منہ جھاڑ، دیکھ تو کتنی بوڑھی لگ رہی ہے تو اور نہیں تو کم از کم ہاتھوں میں گھری لگایا کر۔ کیسے بد رونق ہو رہے ہیں۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک نہ زیور، جھمکے کیا ہو گیا تجھے۔“ اہل پریشان تھیں، متفکر تھیں۔ بلیہ کا دل بھر آیا۔ اور آنکھیں بھی۔

”اہل۔ حاشرہ کو یہ سب پسند نہیں۔ سو میں نے چھوڑ دیا۔ اسے میرے اٹنے بیٹھنے کھانے پینے، چلنے پھرنے، پہننے اوڑھنے سب میں اس غریب مٹکے کی لباس آتی ہے۔ اہل آپ نے اس محل میں مجھے بیاتھے ہوئے ایک مل بھی میرے بارے میں نہ سوچا۔ میں کیسے رہ پاؤں گی ان لوگوں کی دیواروں کے اندر، جہاں سے مجھے یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں نظر ہی نہیں آتیں۔ آپ نے تو میرا بھلا ہی سوچا ہو گا نا۔ لیکن۔“ وہ بولتے بولتے چپ کر گئی۔ بچے اندر آ گئے تھے۔

وہ دو دن اہل کی طرف رہی۔ سارا محلہ پھری۔ پھوپھو سلائے، کپا گینہ، زرمینے باجی، رفعت خالہ، اس کی بچہ جن سے وہ بیوٹن پڑھنے جاتی تھی اور قرآن پاک بھی اور حاشرہ کے رشتے کی حمایت بھی، ارسل (بیٹے) کے کہنے پر۔ رفعت آپا سے فرمائشی کھیر بوائی اور جب انہوں نے اس کے ساتھ روپ کے بارے میں پوچھا تو اس نے وہ راز اگلا۔ جسے کوئی نہ جان پایا تھا۔

”مہندی، زیور، اچھے کپڑے، خوشبو، تیری پہچان تھے بلیہ؟“ انہوں نے گرم گرم کھیر پالے میں ڈال کر اس کی طرف بڑھائی۔ اسے گرم کھیر پسند تھی۔ مہندی کھیر کھانیں سکتی تھی۔

”حاشرہ کو میرے مہندی لگے ہاتھ بہت اچھے لگے

تھے کیا۔ لیکن اس نے مجھے کما اچھے بھلے ہاتھ گندے کر لیے۔ اس رات میں ہاتھوں سے مہندی کارنگ تو نہ اتار پائی، مگر میرے دل سے مہندی اتر گئی۔ میں عاشق تھی مہندی کی۔ میں نے اپنا عشق چھوڑ دیا۔ اس مجازی خدا کے لیے جس کے سنگ مجھے زندگی گزارنے کا اذن دیا گیا تھا۔ اسے میرا دمکتا واپس پند نہیں آیا۔

میں نے وہ عارضی خوب صورتی بھی اپنے چہرے سے دھو ڈالی۔ میرے دکتے کپڑے اسے پسند نہیں آئے، میں نے وہ بھی بدل ڈالے۔ اس کی باتوں کا کیرٹا میری تھی مٹی خوشیوں کو ہولے ہولے کھاتا رہا۔ وہ میری تعریف نہیں کرتا تھا، لیکن میرے سامنے اگر غیر عورتوں کی تعریفیں کرتا تھا۔ ان کی آنکھیں، ان کے بال، ان کے کپڑے، ان کا لائف اسٹائل، میں نے سب کچھ خاموشی سے سنا، برداشت کیا۔ لیکن اس روز جب میری دونوں نندیں گھر آئی ہوئی تھیں اپنے شوہروں کے ساتھ۔ تو۔۔۔ میری۔۔۔ نند کے شوہر نے کچن میں کھڑے ہو کر جو کچھ مجھے کامیاب دماغ غموم کیا۔ اس نے مجھے کہا کہ حاشرہ کو تو میری قدر ہی نہیں۔ تم

اس قدر خوب صورت ہو اور وہ باہر کی عورتوں میں خوب صورتی دھونڈتا پھرتا ہے اور اس کی تعریف، اس کی نظریں مجھے سن کر گئیں خالہ۔ میں جہاں کی تہاں رہ گئی۔ بس میں نے اپنے سارے خواب لیٹے اور انہیں دل کے نہاں خالوں میں رکھ دیا۔ میں نے مہندی کا جل، پرفیوم سب لگانا چھوڑ دیا۔ پتا ہے کیوں۔ کوئی مجھے دیکھے اور تعریف کرے اور میرا دل اپنے شوہر سے پھر جائے۔ اس لیے میں اس غیر مرد کی اسپر ہو جاؤں۔ اپنے شوہر، اپنے بچوں سے بے وفائی کروں۔ اس لیے میں نے مانی کا چولا پہن لیا۔ ہار سنگار چھوڑ دیا۔ کوئی مجھ پر غلط نظر نہ ڈالے اس لیے میرا دل کسی کی تعریف پر نہ کھنچے اس لیے مجھے خیر ہے، لوگ میرے حلیے سے مجھے مانی (کام کرنے والے) سمجھتے ہیں۔ بری نظر نہیں ڈالتے۔ میں نے خود کو بچالیا ہے۔ ورنہ یہ حسن اور اس کی آرائش مجھے لے ڈوبتی خالہ۔ تعریف جو مجھے میرے شوہر سے نہیں

اپنی بیٹیوں کے لیے سکھ بھی مانگ لیا کریں تو کوئی شہزادی پتھر کی نہ ہو۔ اور شہزادے بھی اگر ماؤں کے ناجائز مطالبات اپنے دالٹ میں نہ ڈالے پھر اس تو خالی دامن کو تاسف سے نہ بھرتا رہے۔ اور انہی فسیلوں کے پیچھے زندگی قتلگاریاں مارے نہ کہ سناٹے۔ وہ جانتی تھی حاشا شرب جان گیا ہے۔ اپنے عمل پر شرمندہ بھی ہے اور آج وہ یقیناً ”محافلِ تلافیٰ کرے گا اپنے ردیوں پر۔ اماں کی تھمائی پوٹلی کہیں دریا برد کر دے گا۔ اس کے لیے لہر و جود کو محبت کے دھماکے سے روک کر نے کی کوشش بھی کرے گا۔

لیکن۔۔۔
روح میں کب پیوند لگتا ہے؟

ملی، کہیں اور سے ملی تو میرے لیے جسم کی آگ بن جاتی۔ میرے بے رنگ ہاتھ، سونی کلاسیاں، خالی آنکھیں، میرے لیے جنت ہیں۔ بس اتنا کہتا ہے کہ مائیں جب خوب صورت بیٹیوں کو جنم دیتی ہیں تو انہیں شہزادوں کی آس مت دلایا کریں۔ محلوں کے خواب مت دکھایا کریں کہ محلوں کے اونچی فسیلوں کے اس پار سب کچھ مہر لایا کرتا ہے۔ نہ شہزادی چھتی ہے، نہ خواب۔ ”وہ چپ ہوئی تو رفعت خالہ کو اس کے اندر کا سناٹا گونجتا محسوس ہوا۔

”لیکن حاشا نے تم سے محبت کی تھی۔ ارسل نے بتایا تھا مجھے۔“ رفعت خالہ نے کہا تو اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر بل کے بل انہیں دیکھا۔

”یہ کیسی محبت تھی خالہ جس نے میرے اندر سے ریح ہی کھینچ لی۔“ کھیر پالے میں جوں کی توں پڑی تھی۔ ٹھنڈی کھیر اسے پسند نہیں تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جوتے کی نوک سے پکارش اڑھڑے گئی۔

”میں نے خالہ آپ کے سامنے اپنی ذات کے بچنے اڑھڑے ہیں۔ کسی اور کو میرے چاک پیرا بن کا پتہ نہ چلے۔ ورنہ میں لیر لیر ہو جاؤں گی۔“ خالہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ آنکھوں میں نقین دہانی تھی۔

وہ مڑی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ مانوس جوتوں سے نظر اوپر اٹھی تو اٹھی رہ گئی۔ حاشا اور ارسل کھڑے تھے اور جانے کب سے۔ آج وہ بے بھرم ہو گئی تھی اس شخص کے سامنے۔ جسے اس کی ماں نے اس کے لیے چنا تھا۔ اپنی شہزادی بیٹی کے لیے جو اسے محل میں رکھتا اور شہزادیوں کی طرح عیش کرواتا۔

شہزادے نے اسے محل میں بھی رکھا تھا۔ عیش بھی کروائے تھے۔ لیکن اس کے روح کے اوپر پیر رکھ کر اس کا ایک ایک خواب کرجی کرجی کر کے شہزادے کی آنکھ میں تاسف تھا۔ دکھ تھا۔ شرمندگی تھی۔ اس نے اپنی دا میں جیب سے دالٹ نکالا۔ کھولا۔ کچھ نامعلوم سا ڈھونڈا۔ (پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی)۔ پھر داپس رکھ لیا۔

شہزادیوں کی مائیں محل اور عیش کے ساتھ ساتھ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

300/-	ساری بھول ہماری تھی	راحت جبین
300/-	او بے پروا بجن	راحت جبین
350/-	ایک میں اور ایک تم	تزیلہ ریاض
350/-	بڑا آدمی	ضم محرر کریشی
300/-	دیکھ زوہ محبت	صائمہ اکرم چوہدری
350/-	کسی راستے کی تلاش میں	میونہ خورشید علی
300/-	ہستی کا آہنگ	ثمرہ بخاری
300/-	دل موم کا دیا	سائرہ رضا
300/-	ساڈا چڑیا دا چنبا	نفیسہ سعید
500/-	ستارہ شام	آمنہ ریاض
300/-	مصنف	نمرہ احمد
750/-	دست کوزہ گر	فوزیہ یاسمین
300/-	محبت من محرم	سمیرا حید

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

ملکیتہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

محبت کا حقیقی دور

کی تپش کا عکس اس کے وجود سے ظاہر ہو رہا تھا۔
تور پہ نظر بس جمائے دفعتاً وہ جھکی تھی اور تور کے اندر
ہاتھ ڈال کر گرم گرم روٹیاں نکالنے لگی۔

”ہائے، اوئے..... جھکی ہوئی ہے۔ فی سہلی۔“
عورتوں میں جیسے شہد کی مکھیوں کی طرح جھنجھٹا ہٹ
شروع ہو گئی تھی۔ مگر وہ جیسے ساعت سے محروم ہو گئی
تھی۔ اک جنوں اک عالم خود فراموشی کی کیفیت تھی،
اسے چلتی پوروں کا بھی احساس نہیں تھا۔ نہ ہی حق دق
رہ جانے والی عورتوں کی باتوں اور نظروں کا احساس
تھا۔ جب ہی ساری روٹیاں نکال کر اس نے پرات
میں رکھیں اور تور سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا عشق میں ہے مرجاٹیاں..... ایسا رنگ تو
محبت میں ہی چڑھتا ہے۔“ پیچھے عورتیں حیرت سے
آنکھیں پھاڑے اس کی سرخ پوروں کو دیکھتے تبصرہ
کر رہی تھیں اور وہ پرات کمرے سے نکالے گھر کو جاتے
راستے کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔

”تم سے محبت کرنے کا صلہ ہی تو ہے کہ میں
ساری زندگی ظالم سانج سے تم سے محبت کے جرم میں
طعنے سنوں جگر کو کھائے درد کی اذیت سہوں۔ یہ اعزاز
تمہاری محبت نے ہی تو دان کیا ہے کہ میں تا عمر شوق
کی اکھن میں سلگتی رہوں..... اور تم دور بیٹھ کر میری
بے بسی کا تماشا دیکھو..... مجھ پہ ہنسو..... میری محبت پہ
قہقہے لگاؤ۔ ہاں تم ایسا کر سکتے ہو..... کیونکہ تم مرد جو
ہو۔“

ننگے پاؤں اونچے نیچے راستوں پہ چلتے کوئی

تیری جدائی میں کچھ تو نہیں ہوا ہے
میرے قاتل بس کوئی اندر سے مر گیا
”تیری دوری، تیری کمی سے اک آگ لگی
ہوئی ہے دامن دل پہ، جس کا شعلہ دل کے کونے میں
سلگ رہا ہے۔ یہ آگ کب بجھے گی، یہ جلن کب ختم
ہوگی..... میں نہیں جانتی۔ مجھے لگی بھی یا نہیں..... میرا
وجود خاستر ہو رہا ہے۔“

تور پوری شدت سے جل رہا تھا۔ یہ اک اوسط
درجے کا گاؤں تھا۔ جہاں ابھی کیس کی فراہمی عمل
میں نہیں آئی تھی۔ گاؤں کی عورتیں تور میں ہی روٹیاں
لگاتی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اپنے شب و روز
بھی سناٹی جاتی تھیں۔ وہ بھی اس ماحول کا حصہ تھی،
مگر ہمیشہ کی طرح خاموش تھی۔ یہ خاموشی اس کی
ذات سے مقناطیس کی طرح چپک گئی تھی۔ اب تو
سب ہی اس کے ساکت لبوں کی عادی ہو چکی تھیں۔
وہ ہمیشہ آٹے کی پرات اٹھا کر آتی تھی۔ اپنی باری
آنے پہ خاموشی سے روٹیاں لگاتی اور اپنی طرح
روٹیاں بن جانے پہ خاموشی سے چل دیتی تھی۔ اس
کے پیچھے کتنی چہ میگوئیاں ہوتی تھیں، اسے ان سے
کوئی سروکار نہ تھا۔

اس وقت بھی گاؤں کی عورتیں تور کے ارد گرد
اپنی اپنی پرات اٹھائے باتوں میں مصروف تھیں۔
بیک وقت دو عورتیں ہی روٹیاں لگا سکتی تھیں۔ ان
میں سے اک وہ بھی تھی۔ جو روٹیاں لگانے کے بعد
تور پہ خاموشی سے نظر بس جمائے بیٹھی تھی۔ دیکھتے تور

نوکیلا پتھر پیروں تلے آیا تھا۔ جس کی چھبیں سے اس کے قدم ڈگ گئے تھے۔
 ”یہ قدم میں نے اسی وقت بکنے سے روک لیے ہوتے تو آج یہ نوکیلا پتھر راہ میں نہیں آتا۔ خود اذیت سے سوچتے ہوئے اس نے پانی سے بھری آنکھوں کو صاف کیا کہ راستہ نظر آئے، مگر اگلے ہی پل پھر آنسوؤں نے اس کی راہیں دھندلی کر دی تھیں۔

☆☆☆



نا کام سعی کر رہی تھی۔ اویز یوسف کے اچانک بولنے پہ وہ اک دم چونک گئی تھی۔ کنگ پورڈ پہ کھیرے کاٹنے اس کے ہاتھ اک پل کو ٹھکے تھے۔ مگر اگلے ہی پل لمبی سانس خارج کرتے اس نے اپنا کام جاری رکھا۔ اویز یوسف کے اصرار پہ انداز پہ اس نے نفی میں سر ہلاتے اسے دیکھا تھا۔

”محبت کرنے کی بات تم ایسے کرتے ہو جیسے لوگ لولی باپ کھانے کی بات کرتے ہوں۔“ اس کا انداز ہمیشہ کی طرح استہزاء سے ہو گیا۔

”تم کب مجھے سیریلٹی لوگی۔“ وہ جیسے جھنجلا گیا تھا۔ کوئی جنگ تھی جو اس کے اندر مسلسل جاری تھی اور وہ مزاحمت کرتے کرتے جیسے ٹھنکنے لگا تھا۔ ساویہ سحر نے اس کے جھنجلائے انداز پہ اسے بے ساختہ نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔ لب بچنے دیوار سے پشت ٹکائے بلو جینز وائٹ شرٹ میں لمبوس وہ بغور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”آج پھر یہ دورہ کیوں پڑ گیا تمہیں؟“ اس کے سوال نے اویز یوسف کو مزید جھنجلائے پہ مجبور کر دیا۔

”میری محبت وقتی ابال نہیں ہے، جسے تم دورے کا نام دو۔۔۔۔۔۔ محبت نہیں کر سکتیں تو کم از کم جو تے مت مار کرو۔“

اویز یوسف کو جیج غصہ آ گیا تھا اور آتا بھی کیوں نہ۔۔۔۔۔۔ اکثر ویشر یہ موضوع ان کے زیر بحث رہتا تھا۔ وہ اصرار محبت کرتا اور وہ ہر بار اسے سخت ست سنا کر دامن بجا کر چل دیتی تھی۔ عرصہ سے یہ لک چھپ کا کھیل چل رہا تھا، جس پہ ساویہ سحر کو کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ مگر اویز یوسف کی قوت برداشت جیسے اب جواب دینے لگی تھی۔

محبت کا جواب محبت سے نہ ملنے اور نظر انداز ہونے پہ اویز یوسف کی پر سٹائی جیسے شدت پسندی کی روش اختیار کرنے لگی تھی۔ غصہ، ضد اس کی شخصیت کا خاصا نہیں تھا، لیکن اب یہ دونوں عناصر جیسے اس کی شخصیت سے جدا نہیں ہو رہے تھے، تب ہی تو

ہر دوسرے تیسرے روز وہ ساویہ سحر کے رو برو آ کھڑا ہوتا تھا۔ محبت سے لبریز نگاہوں سے اس بے مہر، سنگ دل کو کتکتا رہتا تھا جو ہر بار سنگ باری کر کے اسے پلٹنے کا کہہ کر انجان بن جاتی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے، کیوں اتنی گرمی میں مر جییں چپا رہے ہو۔“ ساویہ سحر کو اس کا غصہ بلا وجہ لگا۔ سلا دکت چکا تھا، جسے وہ باؤل میں سیٹ کرنے لگی۔ اویز یوسف نے اک نظر اسے دیکھا اور جیسے خود کو کول ڈاؤن کرنے لگا۔

”میرے بیسٹ فرینڈ کی بہن نے کال کر کے مجھے سے محبت کا اظہار کیا ہے۔“ اس نے جیسے بحر مومن کی طرح جرم کا اعتراف کیا۔ ساویہ سحر اک دم سے پر جوش ہو گئی۔

”واؤ! ڈیش گریٹ نیوز کا نگر بولیشن (یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔۔۔۔۔۔ مبارک ہو۔) یوسف نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی خوشی کو ملاحظہ کیا اور جیسے اس کا ضبط ٹھکنے لگا۔ اسے بازو سے پکڑ کر اک جھٹکے سے اپنی طرف کیا۔ ساویہ سحر اس غیر متوقع صورت حال کے لیے قطعی تیار نہ تھی۔ اسے اویز یوسف سے ایسے کسی عمل کی امید بھی نہ تھی۔ تب ہی وہ توازن نہ سنبھال سکی اور بے ساختہ اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھ گئی۔ آنکھوں میں بے حد تیر آ گیا تھا۔ اس کے دونوں شانوں کو سختی سے دبوچے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے کھڑا تھا۔ ساویہ سحر کا دھان پان جیسا وجود اس کے لمبے چوڑے وجود کے آگے جیسے چھپ سا گیا تھا۔ حواس قابو میں کرتے اس نے اس کے بازو اپنے شانوں پر سے ہٹانے کی سعی کی تھی۔ مگر اس کی اپنی پکڑ یہ کراہ کے رہ گئی۔

”میں نے صرف تم سے محبت کی ہے اور مرتے دم تک تم سے ہی عشق کرتا رہوں گا۔ بھلے تم سے شادی نہیں ہوئی، مگر بیوی کا درجہ صرف تمہیں ہی دوں گا، کوئی اور اس مقام تک پہنچ بھی نہیں سکتی۔ آئی سمجھا! یہ بات اپنے ننھے سے دماغ میں بٹھالو۔“ سختی سے کہے لفظوں کی شدت اس کی آنکھوں کی پوروں کی صورت اس کے شانوں پہ جیسے گڑی گئی تھی۔

”کیا بد میزری ہے ادیر، چھوڑ دیجئے۔“ ساویہ

☆☆☆

سادیہ سحر، نذیر احمد کی اکلونی بیٹی تھی۔ نذیر احمد سے بڑی بہن بقیہ تھیں جن کے تین بیٹے تھے۔ پھر نذیر احمد تھے اور پھر ان سے چھوٹے سنی۔ جب ساویہ سحر اس دنیا میں آئی تو پورے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بیس سال بعد ان کے خاندان میں کسی لڑکی نے جنم لیا تھا۔ ساویہ سب کی آنکھ کا تارا تھی۔ نذیر اور صدف نے اسے پھنسی کا چھالہ بنا رکھا تھا۔ ہر کوئی ہی صدف کو مبارک باد دے رہا تھا۔ ساویہ بھی بھی بیویوں جیسی حسین کہ نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ جواک بار دیکھ لیتا نظر ہٹانا بھول جاتا۔ سب ہی خوش تھے۔ لیکن اگر کوئی ناخوش تھا تو وہ زنگس تھیں۔ صدف کی دیوہانی..... نذیر احمد اور سنی، دونوں بھائیوں میں مثالی محبت تھی۔ سال بھر کے وقفے سے دونوں بھائیوں کی شادی ہوئی تھی۔ زنگس کی گود اللہ نے جلد ہری کر دی تھی۔ اس نے بیٹے کو جنم دیا تھا۔

اسفر کو دیکھ کر صدف کو اپنی خالی گود کا شدت سے احساس ہوتا تھا۔ اس کے بعد بھی زنگس کئی بار اس عمل سے گزریں، مگر اللہ نے اس وجود کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی اٹھالیا۔ قدرت کو بھی صدف پہ ترس آ گیا تھا۔ تب ہی شادی کے آٹھ سال بعد ساویہ سحر کی آمد کی نوید پہ وہ خوشی سے پاگل سی ہو گئیں۔ نذیر احمد بھی بہت خوش تھے۔ ساویہ سحر کو دیکھ کر ان کی خوشی دوچند ہو گئی تھی کہ انہوں نے صرف اولاد دلائی تھی اور رب کائنات نے ان کی دلی خواہش ساویہ کے روپ میں پوری کر دی تھی۔ زنگس پورے خاندان میں صدف کی داد دہا دیکھ کر دل مسوس کے رہ گئی تھیں۔ کسی قدر رقابت کا احساس ہوا تھا۔ بیٹی پیدا کرنے کی آس میں انہوں نے ان گنت بار کوششیں کی تھیں۔ مگر ہر بار وجود ان کی کونہ میں ہی دم توڑ دیتا تھا۔ اپنی گرتی صحت کے باعث انہوں نے اب جیسے اپنے ارمانوں پہ مبرک کی چادر ڈال دی تھی، مگر ساویہ سحر کی آمد پہ ان کے ارمانوں کی چادر سرکے گئی۔ انہوں

سحر کو اس دیوانے کی آنکھوں سے جمائی دیوانگی سے خوف ریزہ کی ہڈی میں اترتا محسوس ہوا۔ وہ پچھڑ پچھڑا کے رہ گئی۔ اس کے شکنجے سے خود کو چھڑانہ کی تو عیسیٰ نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ ادیر یوسف کو جیسے اس کی مزاحمت پہ ترس آ گیا۔ اس کے شانے چھوڑ کر دو قدم پیچھے ہٹ کر وہ دوبارہ دیوار سے جا لگا۔ ”پھر کبھی ایسی فضول حرکت کی تو تمہارا منہ توڑ دوں گی۔“ اپنے شانوں کو دباتی وہ درد سے جیسے دہری ہوئی۔

”برداشت کی بھی اک حد ہوتی ہے۔ میں تمہیں کب سے کہہ رہی ہوں مجھے نہیں ہے تم سے محبت اور تم.....“ وہ اک عیسیٰ نظر اس پہ ڈال کر اک ٹاپے کو لب بھینچ کے رہ گئی۔ ”اچھی زبردستی ہے۔ روز منہ اٹھا کر آ جاتے ہو اور حکم صادر کرتے ہو کہ میں تم سے محبت کر لوں۔ اب تم بچے نہیں رہے۔ جو میں تمہاری حرکتوں کو بچکانا سمجھ کر نظر انداز کر دوں، پورے پچیس سال کے ہو گئے ہو، بہتر ہوگا، اپنے اندر نیچور لی لاؤ..... کان بوائے والی حرکتیں چھوڑ دو۔“ وہ کچھ زیادہ ہی چراغ پا ہو گئی تھی، اس کی جسارت پہ۔ ”چار سالہ عمروں کے فرق کو بیچ میں لا کر خود کو عقل کل ظاہر کرنے کی کوشش مت کیا کرو میرے سامنے۔ کہاں سے بڑی لگتی ہو، بتاؤ۔“ وہ اچانک اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے لمبے چوڑے وجود کو گھورتے ساویہ سحر چند قدم پیچھے ہو گئی۔

”اپنی عملیت کی دھاک اپنے اسٹوڈنٹس پہ جمایا کر دو، مجھ پہ نہیں۔ باقی رہی محبت تو وہ تو میں تم سے کر داکے ہی دم لوں گا۔ تم ہی ہو گی جو مجھ سے محبت کر دگی۔ میرے بنا اک بلی نہ رہ سکو گی۔“ مضبوط لہجے میں اپنی بات کہہ کر وہ رکائیں نہیں تھا۔ چٹن سے اور پھر گھر سے نکلتا چلا گیا۔

”پاگل..... بے وقوف انسان۔“ سر جھٹک کر ساویہ نے اک بار پھر اپنے دکھتے شانوں کو دونوں ہاتھوں سے دبایا اور بیچ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ساری

ساتھ اس کے حسن میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ خاندان کے کئی لوگ تقاضا کرنے لگے تھے، مگر نذیر احمد نے سب کو منع کر دیا کہ ابھی وہ پڑھ رہی تھی۔ وہ تھرڈ ایئر میں تھی۔ اس کے پاس محلے کے کافی بچے پڑھنے آتے تھے۔ ایسے میں آگ دن نرس اویز کے کان پکڑے اس کے پاس آئیں۔

”ساویہ میری بچی، ذرا اس نالائق کو بھی پڑھا دیا کرو۔ میٹرک کے پیپر زہونے والے ہیں، مگر اسے پتہ نہ ہے کہ میٹرک کی بات کیا ہے۔“

”ساویہ سحر نے مسکراتے ہوئے اویز یوسف کو دیکھا جو ماں سے اپنا کان چمڑا کر اسے سہارا رہا تھا۔ کتابوں کا اسٹاکش بیک کندھے پر ڈالے بے فکری سے چیونٹ چار رہا تھا۔ بلیک جینز، نی ٹرٹ میں کھلندرا سا اویز یوسف بکھرے بالوں کو ہاتھ سے سنوار رہا تھا۔ صدف چوکی پہ بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔ نرس کی بات سن کر مسکرانے لگیں۔“

”نالائق تو نہ بولو نرس! اتنا اچھا تو ہے میرا بچہ۔“ صدف کا کہنا تھا کہ بیک چوکی پہ بیٹھ کے وہ اچھل کر صدف کے پہلو میں جا بیٹھا۔

”بس تانی جان، اک آپ ہی ہیں اس دنیا میں جو مجھ سے محبت کرتی ہیں۔“ مصنوعی ایکٹنگ کرتے اس نے صدف کے شانے پہ ٹھوڑی جمائی اور چھلی ہوئی گاجر اٹھا کر کترنے لگا۔ صدف مسکرا دیں۔

”یہاں تانی جان سے جڑ کے بیٹھنے کے لیے نہیں لائی، اٹھو، جاؤ پڑھو جا کے ساویہ کے پاس۔“ نرس نے بھی پلنگ سے براجمان ہونے سے سہمورتے ہوئے کہا۔ وہ ان سی کر گیا۔ ساویہ تب تک اٹھ کر کچن میں جا چکی تھی۔ چائے اس نے پہلے ہی چڑھا رکھی تھی۔ چائے کے ساتھ منٹوں میں کیاب فرائی کر کے لے آئی تو نرس اسے دعا کہیں دیتے لگیں۔

”سچ ہے بھابھی، بیٹی سے ہی سکھ ہے۔“ چائے کی پیالی پکڑتے انہیں بھرکھک ہوئی۔

”تمہاری بیٹی بھی آجائے گی، مگر نہ کرو۔ اسفر کی پھر اس شریر کی شاوی کرو گی تو اللہ دو بیٹیاں دے

نے پھر اس عمل سے گزرنے کی ٹھانی، مگر قدرت کو ابھی شاید منظور نہ تھا۔ تب ہی خوش خبری آنے میں تین سال لگ گئے۔ وہ بیٹی کے لیے وظیفہ کرنے لگیں۔ مگر جب ان کے پہلو میں اویز یوسف آیا تو ان کا دل بچھ سا گیا۔

اسفر اب گیارہ سال کا ہو چکا تھا۔ ایسے میں دوسرے بیٹے کی آمد پہ انہیں خاص خوشی نہیں ہوئی تھی۔ صدف جب چار سالہ پریوں جیسی ساویہ سحر کی انگلی تھامے انہیں مبارک باد دینے آئیں تو انہیں بیٹی نہ ہونے کا افسوس دو چند ہو گیا۔ لیکن بظاہر ان کا رویہ صدف اور ساویہ سے دکھاوے کی محبت کا ہی تھا۔ انہوں نے ساویہ کو پلٹا کے پیار بھی کیا اور کئی پہول مسوس کے بھی رہ گئیں۔ وہ تو ڈاکٹر ز نے انہیں مخوس خبر دی کہ اب وہ دوبارہ اس عمل سے نہیں گزر سکیں گی، ورنہ شاید وہ آخری دم تک کوشش کرتیں۔ ساویہ سحر کاٹ میں لیٹے اویز یوسف کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ کو اپنے چھوٹے سے ہاتھ میں پالے کر محبت سے کھلکھلا کر دکھ رہی تھی۔ خوش ہو رہی تھی۔ اویز یوسف نے اس کی انگلی اپنی ٹمھی میں بند کر لی تھی، جسے اس نے جھٹکے سے چمڑانے کی کوشش کی۔ انگلی تو نہیں چھٹی، مگر اویز یوسف منہ بسور کر گھڑ پھاڑ کر رونے لگا تھا۔ ساویہ سحر اک دم سے ڈر کر صدف اور نرس کو دیکھنے لگی۔

”مما، چاچی یہ میری انگلی نہیں چھوڑ رہا۔“ ساویہ نے جیسے اس کی شکایت کی۔ دونوں ہی اس کے منہ بسور نے یہ مسکرا دیں۔

وقت بیت رہا تھا۔ نرس نے خود کو سمجھایا تھا۔ مگر کبھی کبھی ہوک بھی اٹھتی تھی۔ صدف کو اللہ نے دوسری اولاد نہ دی۔ نہ اس نے بھی اللہ سے ضد کی۔ وہ ساویہ کو پاکر ہی شاوٹھیں۔ اسفر نے اولیول کے بعد کینیڈا اپنے ماموں کے پاس شفٹ ہونے کی بات کی تو یوسف اور نرس نے اس کا وہیں ایڈمیشن کروا دیا۔

ساویہ کالج میں آگئی تھی۔ گزرتے وقت کے

وچپی کا سامان لیا ہے۔ اس دن تمام بچے چلے گئے
تھے، مگر اس نے اویز یوسف کو روک رکھا تھا اور حساب
کے سوال حل کروا رہی تھی۔ ایگزام سر پہ آگئے تھے۔
اب تو اسے مسلسل پڑھتے چار گھنٹے ہونے کو آئے
تھے۔

”ساویہ آپی! پلیز میں تھک گیا ہوں۔“ اویز
یوسف نے جیسے رہائی کے لیے آواز بلند کی۔

”چپ کر کے سوال نمبر چار حل کرو۔“ ساویہ
نے سختی سے کہا۔ وہ منہ ہٹا کے سوال نمبر چار کا پی کرنے
لگا۔ نظریں مسلسل روشن ہوئی اسکرین پہ تھیں۔ ساویہ
سحر بھی یہ تماشا اور اس کی چور نظروں کو کافی دیر سے
دیکھ رہی تھی۔ تب ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے
سامنے سے سیل فون اٹھا کر کال پک کی تھی۔ اویز
یوسف اپنی جگہ چکا رہ گیا۔

”السلام علیکم! آج اویز پڑھائی میں بڑی ہے،
آپ بعد میں کال کر لیجیے گا۔“ اس نے کال ریسیو
کر کے دوسری طرف کی بات سننے بغیر کہا۔ وہ کال
منقطع کرنے لگی تھی، جب نو عمر لڑکی کی آواز آئی۔
”آپ کون ہیں اویز کی؟“ حد درجہ شکلی لہجے پہ
ساویہ کو اک لمحے میں احساس ہوا کہ نئی نسل کہاں
جارہی ہے۔

”میں اس کی کزن ہوں۔“ ساویہ نے بہت
ضبط کر کے کہا۔ ”صرف کزن یا کچھ اور.....“ دوسری
طرف سے آتی نو عمر آواز پہ ساویہ کا فشار خون بلند
ہونے لگا تھا۔ اپنے سے چار سالہ چھوٹے اویز کو اس
نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔ سیل فون
سے باہر آتی آواز اویز یوسف کی سماعت نے بھی
محفوظ کر لی تھی۔ وہ نظر کے ساتھ سر بھی کتاب، کا پی پہ
چمکائے کب سے سوال پہ ہی بین پھیرے جا رہا تھا۔
کال پہ بنا کوئی جواب دیے اس نے سیل فون ہی
آف کروا۔

”پہن قسم کی فضول لڑکیوں کی کا لڑ آتی ہیں،
تمہارے نمبر پہ۔“ سیل فون اس کی کا پی پہ پھینک کر
اس نے سخت دیر سے سوال دہرایا تھا۔ اویز یوسف کا

”ہائی جان ایسی باتیں نہ کریں مجھے شرم آتی
ہے۔“ وہ منہ چھپا کر شرمانے کی ایکٹنگ کرتے
کباب اٹھا کر کھانے لگا۔

”اویز یوسف! آپ کی باتیں ختم ہو گئی ہوں تو
آپ یہاں تشریف لے آئیں۔ شاباش۔“ ساویہ سحر
نے خشک آواز میں اسے پکارا تو کباب اس کے منہ
تک جا کے رک سا گیا۔ ساویہ سحر سے اسے بچپن سے
ہی تھوڑا ڈر لگتا تھا۔ وہ سختی ذہین دھن اور سمجھ دار بھی وہ
انتہائی نٹ کھٹ اور شیر تھا۔

وہ اکلوتی لڑکی تھی۔ اس بات پہ اس میں غرور و
گھمنڈ تو نہ تھا، ہاں وہ بہت رکھ رکھاؤ والی لڑکی تھی۔
بلاوجہ فضول گوئی اور حرکتوں سے اجتناب کرتی تھی اور
نہ ہی ایسا کرنے والوں کو پسند کرتی تھی۔ محلے،
خاندان بھر سے جیسے ساویہ سحر کی تعریفیں آتیں، ایسے
ہی اویز یوسف کی شراوتوں کی داستان آتی تھی۔ آج
اس نے کسی کی بکری کے کان مروڑ دیے۔ آج اس
نے کرکٹ کھیلنے کسی کا شیشہ توڑ دیا۔ آج اس نے
بائیک ٹھونکی دی۔

وہ دونوں مزاجاً اک جیسے تھے، مگر اطوار الگ
تھے۔ وہ ساویہ سحر کی گڈ بک میں بھی نہیں رہا تھا۔ وہ
ہمیشہ چاچی، چاچا کو اس کے لیے فکر مند ہی پاتی تھی۔
اس کی خشک پکار پہ منہ بسورتا بیگ اٹھانے لگا
کہ اس پڑھا کو سے تھوڑا دیتا بھی تھا جو ہر سال ٹاپ
کرتی تھی اور محلے، خاندان بھر میں اس کی واہ واہ
ہوتی تھی۔ جب جب پڑھنے سے کوئی جی چراتا تو
خاندان بھر کے لڑکے، لڑکیوں کو ساویہ کی مثال دی
جاتی تھی۔ جن میں اویز یوسف سرفہرست تھا۔ جسے
بچی اٹھتے بیٹھتے ساویہ کی مثال دے کر پڑھنے کی
طرف راغب کرنے کی ناکام سعی کرتے تھے۔

چند دنوں میں ہی ساویہ کو احساس ہو گیا کہ وہ
بے حد ذہین ہے، مگر پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتا تھا
اور جلد ہی ساویہ سحر نے سراغ بھی لگالیا کہ اس کی

سر اور ہاتھ کیا۔ مری ہوں بات میں بیچا جان سے..... کہتی ہوں واپس لیں سیل فون تم سے..... اسی لیے تم بھند تھے سیل فون کے حصول کے لیے۔ ہر دو منٹ پہ تمہارا سیل فون بجنے لگتا ہے۔“ ساویہ بھڑک اٹھی تھی۔ وہ کتنی ہی بار اس عمل پہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی، مگر ہر بار بچوں کے سامنے اسے موقع نہیں ملتا تھا۔ سب کے سامنے بات کر کے وہ اس کی عزت نفس مجروح نہیں کرنا چاہتی تھی اور آج جب اسے قسمت سے موقع ملا تو اس نے ساری حسرت پوری کر دی۔ نہ صرف اسے اس بد تمیز لڑکی پہ غصہ تھا، وہ اویز یوسف پہ بھی شدید برہم تھی۔

”آپنی پلیز نہ پیا سے ذکر نہ کیجیے گا۔ قسم آپ کی۔ میں خود لڑکیوں کو کال نہیں کرتا۔ وہ خود میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔“

اویز یوسف منہ بسور کر جیسے خود کو بری الذمہ ظاہر کرنے کی کوشش۔ ساویہ نے سیکھی چوتوں سے اسے گھورا۔

”ہاں تم فلمی ہیرو ہونا۔ اسی لیے سب تم پہ مروتی ہیں۔“ ساویہ کے جل کے بولنے پہ وہ بے ساختہ مسکرا کے لب دیا گیا۔ اگر اسے بتا دیتا کہ ایسا ہی ہے تو وہ اور لڑنے لگتی۔ لیکن ساویہ اس کی مسکراہٹ دیکھ چکی تھی۔ ”اب سے اگر پڑھائی کے دوران تمہارا سیل آن ہوا۔ کوئی کال، میسج آیا تو سب کے سامنے تمہاری کوٹ لگاؤں گی۔ چچا جان کو تو میں نے ہر حال میں تمہاری اس ایکٹیوٹی کی رپورٹ دینی ہے۔ غضب خدا کا، عمر دیکھو اپنی اور حرمتیں دیکھو۔ درجن بھر لڑکیوں کے نمبر ہیں تمہارے سیل فون پہ..... یہ زیب دیتا ہے نہیں، پڑھ لکھ کر نام کمانا ہے یا عاشقی میں ہی عمر گزارنی ہے۔“ ساویہ سحر کا غصہ کسی طور قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

کسی کو چاہتا، کسی کو چاہتے رہنا یہ احساس ہی بہت دل فریب ہے اور میں ایسی ہی کیفیت میں جینا اور مرنے چاہتا ہوں۔ آپ کو میری یہ ایکٹیوٹی اچھی نہیں لگی، ٹھیک ہے۔ آپ کے انداز سے سمجھ گیا ہوں کہ آپ کی نظر میں میری اس حرکت سے میں مانس ہو گیا ہوں۔ میں آج ابھی سے یہ حرکت چھوڑ کر اپنے دوستوں کی گید رنگ بدل لوں گا۔ آئی پر اس۔ لیکن میں اس محبت کا انتظار ضرور کروں گا۔ جسے میں اپنی زندگی میں دیکھنے کا خواہش مند ہوں، جو میری زندگی ہوگی۔“ پندرہ سالہ اویز یوسف کیا بول رہا تھا۔ ساویہ سحر تو بس ساکت اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے چہرے کے عزم کو اس نے چنداں اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کے خیال میں یہ لوائسٹوری پہ مبنی فلیس دیکھنے کا بھوت تھا جو اسے اس عمر میں محبت نامی بلا کو گلے لگانے کا چکا لگا ہوا تھا۔ لیکن جب اب آگے روز اس کے سیل فون کی اسکرین اک بار بھی روشن نہ ہوئی تو ساویہ کو حیرت ہوئی جس کا اس نے اظہار بھی کر دیا۔

”میں نے سم بدل لی ہے۔ صرف مم، پپا کے پاس نیا نمبر ہے۔“ اس نے بہت سنجیدگی سے بتایا تھا۔

”اور محبت۔“ ساویہ نے جیسے چڑایا۔

”اسی کا تو انتظار ہے۔ دیکھیں کب درد دل پہ دستک دیتی ہے۔“ وہ شوخ مسکراہٹ اور کھلی آنکھوں میں شرارت سمو کے ایسے بولا کہ ساویہ سحر ہاتھ میں تھامی حساب کی بک اس کے سر پہ مار کے رہ گئی۔

”سدھر جاؤ چھوٹو۔“ وہ بھی ہنس پڑی تھی۔

”اگر پپا کو بتا کر آپ کو سکون ملے گا تو آپ بتا دیں شوق سے۔ آپ کی ہر بات اپنی جگہ درست ہے۔ ساویہ آئی پڑھ لکھ کر نام پھینکا کمانا ہے، تاکہ معاشرے میں اک اسٹیٹس ہو، لیکن اگر میرے پاس

☆☆☆

اور مضبوط سمجھ میں اپنے عزم و ارادے در پردہ چھپ کر کے چلا گیا۔

”جانے کب بڑا ہوگا۔“ ساویہ نے اس کے اس عمل کو بچکانہ حرکت سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کا خیال تھا کالج کھلنے تک چچا جان اسے خود اس کے پاس پڑھنے کے لے آئیں گے۔ مگر جب ایسا نہ ہوا تو اسے ادیز کے لفظ یاد آنے لگے۔ اس کے فاصلے ایڑ کے پیچھے ہونے والے تھے۔ وہ ساری توجہ پڑھائی میں مبذول کر کے ادیز کیا اس سے جڑی ہر بات بھول گئی۔ ادیز نے فرسٹ ایئر کے ساتھ ایونٹ پر وگرام میں سافٹ ویئر انجینئرنگ میں بھی ایڈمیشن لے لیا تھا۔ یہ خبر اسے صدف سے ملی تھی۔ پڑھائی چور اک ساتھ دو ڈگری کیسے لے گا۔ اس کے لیے بھی باعث حیرانی تھی، لیکن جب فرسٹ ایئر میں اس کی بورڈ میں دوسری اور سافٹ ویئر میں پہلی پوزیشن آئی، تو سب کے ساتھ ساویہ سحر نے واٹس ٹنلے انگلی دہرائی۔

پھر تو کامیابی کا نہ رکھنے والا سلسلہ چل نکلا تھا۔ کامیابی کے جھنڈے گاڑتا وہ جیسے ساویہ کو کہیں بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ ساویہ نے ماسٹرز کے بعد مقامی کالج میں ٹیچر کے لیے اپلائی کیا تھا اور جلد ہی اسے تعینات بھی کر لیا گیا تھا۔

”یہ تیس ساویہ جی! میری سافٹ ویئر انجینئرنگ کی ڈگری۔“ وہ شاور لے کر نکلتی تھی، جب سرشام ادیز یوسف اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ لمبا چوڑا ادیز یوسف اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ کافی عرصہ بعد اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس اب ٹائم ہی کب ہوتا تھا چچا جان کے گھر چکر لگانے کا۔ جب بھی وہ جاتی تو کم ہی ان کا سامنا ہوتا تھا کہ وہ گھر پہ رات کو ہی لوٹتا تھا۔

”مجھے کیوں دے رہے ہو؟“ ساویہ نے ڈگری لے کر حیرت کا اظہار کرتے اک نظر یارکس پہ ڈالی، جوں جوں نظریں مارکس پہ پڑ رہی تھیں اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔

پکا میں تو نرس کو فون کر دیں کہ آج ہانڈی نہ بنانا، میں بھجوا دوں گی یا گھر آ جاؤ کھانے پہ..... یوں یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ رزلٹ آ گیا تھا۔ ادیز نے بورڈ پہ تیر نہیں مارا تھا، ہاں مگر اس کے اچھے نمبر لینے پر سب کی رکی سانس بحال ہوئی تھی۔

”یہ تمہارا ہی کمال ہے ساویہ، ورنہ تو مجھے پکا یقین تھا کہ اس کی اک دو پرچوں میں سہلی تو ضرور آئے گی۔“ بچی مٹھائی ساویہ کے منہ میں ڈالتے اسے سراہ رہے تھے۔ ادیز یوسف کا منہ بن گیا، جسے دیکھ کر نڈر اور صدف مسکرانے لگے۔

”یہ زیادتی ہے پپا، مانا ساویہ آپ نے بہت اچھا پڑھایا، مگر پڑھنے والے کو بھی کریڈٹ جانا ہے۔“ اس نے جیسے احتجاج ریکارڈ کروایا۔

”بھئی بات تو سو فیصد درست کہی ہے میرے بچے نے۔“ نذیر احمد نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ووٹ پا کر وہ اور گلے کا ہار بن گیا۔ اسی اثنا میں اس کا فون کینیڈا سے آ گیا۔ ”واہ چھوٹے، تو نے اے گریڈ لاکر تو ہم سب کو حیران کروا دیا۔ ساویہ کو سلام ہے۔“ اور وہ جو اپنی تعریف سے کھلنے لگا تھا۔ پھر کریڈٹ ساویہ کو جانا دیکھ کر لب بھجھ گیا۔

”بھئی ساویہ اب تم اس کو پڑھانے کا ذمہ لے لو۔ تاکہ کم از کم گریجویٹ تو ہو جائے۔“ نرس نے بھی آئندہ کی ذمہ داری ساویہ پہ ڈالی۔ وہ مسکرا کر سعادت مندی سے سر ہلاتی تھی۔

”میں اب آپ سے نہیں پڑھوں گا۔ سارا کریڈٹ آپ کو مل گیا، مانا آپ نے مجھے تعلیم کی طرف راغب کیا، لیکن اس سے کہیں زیادہ اب میں آپ سے مسابقت کرنے کے لیے پڑھنے لگا ہوں، جب ہر کوئی خاندان میں آپ کی علیت، فہانت کی مثالیں دیتا ہے۔ پہلے شرمندگی ہوتی تھی، مگر اب..... اب میں آپ کا ریکارڈ توڑوں گا۔ جہاں لوگ خاندان بھر میں آپ کی مثال دیتے ہیں، اب وہیں میری بھی دیا کریں گے۔ جسٹ ویٹ اینڈ سی۔“ وہ وقت رخصت اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا

”ساری باتوں کو نظر انداز کرتے ہیں مگر حیرت سے پوچھا۔ کئی بار وہ یہ سوال کرنا چاہتی تھی، مگر موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے سوال پہ ہولے سے مسکرایا۔“

”جب سے دل کی دنیا بدلی۔“
”ہیں۔“ سماویہ ناٹھی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ بھرپور مسکراہٹ سے اس کے چہرے پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔

”میری زلیخا نہیں گی؟“ اس کی نظروں اور سوال پہ سماویہ پہ جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ گئے تھے۔ وہ نہ ٹھہری کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ جہاں اسے اویز یوسف کی جرات دنگ کر گئی تھی وہی اپنی تالو سے لگی زبان بھی حیران کر رہی تھی۔

☆☆☆

مرد محبت کا جو خوب صورت لبادہ اوڑھ کر عورت کے پاس آتا ہے، عورت اسے کفن بنانے کو ترجیح دے کر اسے زیب تن کر لیتی ہے، مگر مرد جلد ہی اس خوب صورت لبادے کو اپنی انا اور غصے تلے تار تار کر کے عورت کے تن سے کفن کا احساس تک چھین کر چلا جاتا ہے۔ کمرے میں دبی دبی سسکی کی آواز سراسر رہی تھی۔ کمرے کی روشنی زرد تھی۔ مٹی سے لپے فرش پہ کمرے کے اک گوشے پہ جائے نماز بچھائے سرسجدہ میں رکھے، وہ سسکیاں بھر رہی تھی، کبھی یہ سسکی ہلکی ہوتی تھی، کبھی تیز.....

”اللہ! لیوں سے رب کا نام نکلنے کی دیر تھی، پھر اک تانا لگ گیا۔“

”اللہ..... اللہ..... اللہ..... میرے اللہ.....
میرے اللہ..... یہ محبت لے ڈوبی مجھے..... اتنا درد..... اتنی کک..... اتنی چھین ہے۔ اس میں اگر جو پتا ہوتا تو کبھی نہ کرتی۔ اللہ کو کی ایسا بھی کرتا ہے، محبت میں جیسا اس نے میرے ساتھ کیا۔ کیا یہ ہی اس کی محبت تھی۔ اتنی کمزور..... اللہ تو نے کیوں ڈالی اس کی محبت میرے دل میں..... کیوں اللہ کیوں..... دل گئی میں..... مٹ گئی میں..... اللہ دل گئی ہیں۔“ سرسجدہ

”واہ چھوٹو، غضب کے مارس ہیں شاپاں۔“
اس نے نظر دوڑاتے ہوئے سابقہ لب و لہجے میں کہا۔
”شکر یہ سماویہ جی..... لیکن میں اب چھوٹو نہیں رہا دیکھیں۔“ اس نے سر و قد ہوتے اس سے نکلنے قد کو دکھایا۔ وہ چھٹا تھا۔ سماویہ سحر کا ساڑھے پانچ فٹ قد بھی اس کے آگے چھوٹا لگ رہا تھا۔

”قد سے کیا ہوتا ہے چھوٹو۔ عمر میں تم سے چار سال بڑی ہوں۔“ سماویہ نے بتایا۔

”ہاں چار سال بڑی ہیں، جب ہی اک نوزائیدہ بچے سے اپنی انگلی نہ چمڑا سکی تھیں۔“ بڑوں سے سنی بات اچانک اویز یوسف کے لبوں سے نکل گئی۔ سماویہ کو بھی یہ بات کچھ خاص یاد تو نہیں تھی، مگر بڑے اکثر اس قصے کا ذکر کر کے ہنسنے لگے۔

”تب میں چھوٹی جو تھی۔“ سماویہ نے جیسے دفاع کیا۔ ”اب بھی لڑائی کر کے دیکھ لیں، نہیں چمڑا سکیں گی۔“ جب میں نوزائیدہ تھا جب آپ کی انگلی نہیں چھوڑی تو اب تو میں بڑا ہو گیا ہوں۔“ اویز یوسف کا بدلتا لہجہ، مبہم انداز باتیں۔ سماویہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

”سماویہ جی! میں نے آپ سے کہا تھا نہ مجھے محبت کی تلاش ہے۔“ وہ اس کے پھیلے بالوں پہ نظریں جمائے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ہاں تو۔“ سماویہ کو حیرانی ہوئی۔
”مل گئی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جیسے اطلاع دی۔

”نہیں ایجر والی حرکتیں گئی نہیں تمہاری۔“ سماویہ نے جیسے ہنسی اڑائی۔ ”آپ کی نظر میں شاید میں آج بھی وہی میٹرک والا اویز یوسف بین ایجر ہوں، مگر اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ بچپن اور فلٹر کرنا میں نے اسی لیے چھوڑ دیا تھا، جب آپ نے نازی کی کال ریسیڈ کی تھی اور اس کی باتوں سے آپ کو اتنا غصہ آیا تھا، وہ بھی میرے حافظے میں ہے سماویہ جی۔“ وہ بہت بردباری سے کہہ رہا تھا۔

”یہ آپ جی سے میں سماویہ جی کب سے ہو گئی

میں تھا، لیکن اللہ سے ہوتی سرکشی سے جیسے کرے گی
اک اک شے اس کے دکھ پہ دھبی ہو گئی تھی۔ وہ تڑپ
رہی تھی۔ سبک رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں سے چا
نماز بھگ رہی تھی۔ ماحول کی اداسی اس کی سسکیوں
سے مزید بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

”مما میں لاہریری چارہی ہوں۔“ دوپٹا سلپٹے
سے سر پہ ڈال کر اس نے پرس اٹھاتے ہوئے صدف
کو مطلع کیا، وہ عصر کی نماز کے لیے چا نماز بچھا رہی
تھیں۔

”اس وقت چارہی ہو۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا
پھیل جائے گا۔“ صدف نے فکر مندی سے ڈھلتے
سورج کی طرف دھیان دلایا۔

”کالج میں آج معمول سے زیادہ دیر ہو گئی،
ورنہ کالج سے ہی چلی جاتی۔ میں جلدی آ جاؤں
گی۔“ سادوہ کو بھی احساس تھا کہ واپسی میں اندھیرا
پھیل جائے گا۔ وہ لاہریری ہمیشہ اپنی کوئیگ کے
ساتھ کالج آف ہونے کے بعد چلی جاتی تھی، لیکن
آج اچانک ڈائریکٹر صاحب نے میٹنگ رکھ لی تھی،
جس کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ دیر ہی کے باعث کوئیگ
نے بھی ساتھ چلتے سے معذرت کر لی تو وہ گھر لوٹ
آئی تھی۔ لچ کر کے تھوڑی دیر ستانے کے بعد نماز
ادا کر کے وہ لاہریری کے لیے تیار ہو گئی کہ اسے کل
کے لیکچر کے لیے ضروری مواد چاہیے تھا۔

”باہر چارہی ہونو تو گھر جا کر حلوہ نمس کو دیتی جاؤ،
میں اوپز کا انتظار کر رہی تھی کہ آئے تو اس کے ہاتھ
بھیجوں بلکہ ایسا کروتم اوپز کے ساتھ چلی جاؤ۔ دیر بھی
ہو گئی تو مجھے فکر نہیں ہوگی۔“ صدف کو بولتے بولتے
جیسے خیال آیا۔ سادوہ جو حلوہ کا ڈبا اٹھائے چن کی
طرف بڑھنے لگی تھی۔ اس کے قدم بھی اک لمحے کے
لیے رک گئے۔

”کہاں تم اکیلی رکشا ٹیکسی کے لیے خوار
ہوگی۔ اوپز کے ساتھ جاؤ گی تو کنولس کا ایٹھ بھی نہیں
ہوگا۔“ صدف کی بات پہ وہ سر ہلا کر ڈبا اٹھا کر باہر نکل

آئی۔

بچی کا اپنا کاروبار تھا۔ گوکہ مذہر صاحب کا
کاروبار اچھا چل رہا تھا۔ لیکن بچی معاشی لحاظ سے ان
سے کافی اچھے حال میں تھے۔ پھر اس کی کینیڈا کی
کمائی بھی آتی تھی اور اوپز کی بھی۔ جن کی وجہ وہ مزید
مالی لحاظ سے مستحکم ہو گئے تھے۔ اوپز نے حال ہی میں
نئی کارلی تھی۔ گھر میں اک گاڑی پہلے ہی موجود تھی۔
سادوہ چلی گئی تو انہوں نے ٹیٹ لاک کیا اور
نماز ادا کرنے لگیں۔

☆☆☆

چند گھروں کے قاصطے پہ موجود بڑے سے گھر کا
دروازہ بجانے پہ ماسی نے دروازہ کھولا تھا۔ سادوہ کو
دیکھ کر ماسی نے غیر مقدی مسکراہٹ چہرے پہ سہائی۔

”سلام باجی ا“ ملازمہ پرانی تھی اور سادوہ سے
واقفیت بھی رہی تھی۔ ”ولیکم السلام اکیسی ہو گل۔“ اس نے بھی جواباً
مسکراتے ہوئے اس کا حوالہ درپافت کیا۔ ”اچھی
ہوں باجی، بڑے دنوں بعد چکر لگایا۔“ سادوہ ماسی
کے ساتھ لاؤنچ میں داخل ہوئی۔

”ارے سادوہ آؤ، آؤ بھئی، کہاں رستہ بھول
آئیں آج۔“ نمس نے اسے دیکھتے ہی گلہ شروع
کر دیا۔

”السلام علیکم۔ یہ ممانے حلوہ بھیجا ہے۔“
”ہیٹھو، ہیٹھو بھابھی کے ہاتھ میں تو واقعی چادو
ہے۔ جو بنائی ہیں لذت ہی ہوتا ہے اور گاجر کا حلوہ تو
اوپز کی کمزوری ہے۔“ نمس اسے قریبی صوفے پہ
بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے صدف کی تعریف کرتے
لگیں۔ وہ مسکرا کر رہ گئی۔

”کہیں چارہی ہو کیا؟“ نمس نے اس کی
تجاری دیکھ کر استفسار کیا۔

”جی لاہریری چارہی تھی۔ ممانے کہا آپ کو
حلوہ دیتی جاؤں۔“ سادوہ غصے کی تھی۔

”ارے تھوڑی دیر تو بیٹھ جاؤ۔ چائے پی کے
چلی جانا۔“ نمس نے اخلاکارو کتنا چاہا۔

رہا۔

”اوہ!“ سیاویہ کو ہی جیسے ہوش آیا۔ وہ سرعت سے اس تک بڑھی تھی۔
”یہ“ اس کی گھبرائی ہوئی آواز بمشکل نکلی۔ وہ خوف زدہ نظروں سے اس کے ہاتھ میں موجود پتل کو دیکھ رہی تھی۔

”پتل ہے باقاعدہ لائنس ہے میرے پاس۔“
اس نے جیسے اس کی لم علمی میں اضافہ کیا۔
”لیکن تم اسے لے کر کیا کر رہے ہو؟“ وہ سخت گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ وجہ اوہ یوسف کے چہرے پہ پھیلی سنجیدگی اور غصہ تھا۔
”خودکشی!“ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کمال سکون سے کہا۔

”لیکن کیوں؟“ وہ جیسے حیرت کی وادی میں غرق ہو گئی تھی۔ اس کا انداز اس کے تہوار سے سمجھ نہیں آ رہے تھے۔
”تمہاری وجہ سے!“ اوہ یوسف چیخے سے اٹھ کر اس تک آیا تھا۔
”میری وجہ سے۔“ اس کی حیرت و صدمے سے بری طرح آواز نکلی۔

”اس نے آج تک حشرات تک کو اپنی ذات سے تکلیف نہیں دی تھی۔ اور وہ جیتا جاگتا انسان اپنی خودکشی کے لیے اسے مودالزام ٹھہرا رہا تھا۔“
”ہاں تمہاری وجہ سے۔۔۔ سالوں سے تمہارا اقرار سننے کے لیے روزِ تم تک آتا ہوں اور تم مجھے دھتکار دیتی ہو۔ میرے محبت سے بھرے دل کو بے گانگی کے پتھر مارتی ہو۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ سمجھیں۔“ اپنی بات کے اختتام میں اس نے پتل کی نال سے اس کے شو لڈر کو ہلکا سا دھکا دیا تھا۔
اس کے سنجیدہ، بے خوف لہجے کی سرد سرسراہٹ سے وہ یوں ہی بے دم ہو رہی تھی۔ اس کے تہوار اور ہاتھوں میں دبا پتل اسے پہلے ہی حواس باختہ کر گیا تھا۔ ہلکے سے دھکے پہ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔
”اوہ!“ اس کی صدمے سے بمشکل آواز نکلی

”چاچی پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ اند میرا پھیل جائے گا۔ اماں پہلے ہی فکر مند ہو رہی تھیں۔“ اس نے سہولت سے معذرت کر کے دو بائس پر بجا یا۔ وہ چاہنے کے باوجود اوہ کا نام نہ لے سکی کہ صدف نے اسے اس کے ساتھ جانے کو کہا تھا۔ اس میں بھی صدف اور نذر احمد کا خون تھا جو اپنی ذات کے لیے کسی کو استعمال نہیں کرتے تھے۔
”ہاں یہ تو ہے۔ تم ایسا کرو اوہ کے ساتھ چلی جاؤ۔ اتفاق سے وہ گھر پہ ہے۔“ نرگس کو بھی اس کے اکیلے پن کا احساس ہوا۔ تو انہوں نے بن کہے اس کی انجمن سلجھا دی۔
”چاچی میں چلی جاؤں گی۔“ اس نے تامل کہا۔

”ارے کیوں غیروں والی بات کر رہی ہو۔ اوہ گھر میں ہی ہے۔ ناہوتا تو اور بات تھی۔ کہیں بھی چانا ہوا کرے تو بتا دیا کرو اوہ چھوڑ آیا کرے گا۔ تم تم پوچھو یہی جان مارتے ہیں۔ سن لیا کہ تم اکیلی گئی تھیں تو مجھے بھی باتیں سنائیں گے۔ جاؤ وہ اوپر اپنے کمرے میں ہے اسے بولو نہیں ساتھ لے جائے گا۔“ نرگس کے اصرار پہ وہ سر ہلائی پرس صوفی پہ پہن رکھتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے دروازے پہ دستک دی مگر اندر سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو اس نے لاک کھمایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کمرانیم اند میرا تھا۔ اک پل کو تو سیاویہ کی آنکھیں کچھ دیکھنے کی بصیرت بھی نہیں رکھتی تھیں۔ اند میرے میں اسے اک شعلہ سا نظر آیا تھا۔ جو بڑی غور کرنے پہ واضح ہوا کہ وہ سگریٹ کا شعلہ تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دیوار پہ لگے سوچ بورڈ کو تلاش کر کے بن روشن کر دیے کمر روشن ہوتے ہی اس کی نظر نے شعلہ کی طرف تعاقب کیا تھا اور اس کی آنکھیں جیسے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے ہاتھ میں پتل لیے اوہ یوسف بھی کمر روشن کرنے والے کو دیکھ رہا تھا۔ اور سیاویہ کو دیکھ کر نا وہ چونکا نا ٹھنکا بس خاموشی سے اسے دیکھتا

اگر جودہ بے حد قریب نہ ہوتا تو شاید نہ پاتا۔
 ”جب مرجاؤں گا تب اس طرح بکارتی رہو گی۔ دیوانوں کی طرح، پانگلوں کی طرح، لیکن میں لوٹ کے نہیں آؤں گا تب تڑپو گی، بسکوی۔“ اس کا بدلہ لہجہ سادیہ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے کر گیا تھا۔ اس کے چہرے کی بے خونی اور اپنے لفظوں کا عزم واضح تھا۔ بات کے اختتام پہ اس نے ہسٹل کپڑی سے لگالی تھی۔ سادیہ میں جانے کہاں سے اتنا حوصلہ آ گیا کہ اس نے تیزی سے اس کا ہسٹل والا ہاتھ پکڑنے کی اور اس کو شش میں ادیز کے سینے سے آگئی تھی۔ وہ اتنی خوف زدہ ہو گئی تھی کہ اس کا دل چڑیا کی طرح پھڑپھڑانے لگا تھا۔ اس کی دھڑکنوں کی پھڑپھڑاہٹ کو محسوس کر کے ادیز یوسف پھرے سمندر سے

”کیوں ستا رہی ہو مجھے۔ عرصہ سے اک ہی سوال کرتا ہوں تم سے اور تم۔۔۔ محبت نہیں کرتیں تو میری محبت کو محسوس تو کرو۔ میری دیوانگی کو سنجیدگی سے تو لو۔ تمہیں خود محبت نا ہو جائے تو پھر کہنا۔“ وہ پتھرائی آنکھوں سے اس کی دیوانگی دیکھ رہی تھی۔ ادیز یوسف کو اس کے پتھرائے دجود پہ بلا کا غصہ آیا تھا۔ جھٹکے سے اس کے بال آزاد کر کے اس نے اس کے دجود کو پیچھے دھکیلا تھا۔

”پلیز مت کر۔۔۔ میں۔۔۔ میں بھی کرتی ہوں تم سے محبت۔“ سادیہ نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے لب کو کہتے سنا تھا۔ اور اسے جیسے خود پہ حیرت ہوئی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ حیرت ادیز یوسف کو ہوئی تھی لیکن اب کے سادیہ نے اس کے ہاتھ سے ہسٹل لے کر دروازہ اچھال دیا تھا۔

ادیز یوسف کے چہرے کی بشارت لوٹنے لگی تھی۔ خوشی سرعت سے اس کے دجود کا احاطہ کر گئی تھی۔ جب کہ سادیہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی تھی۔ ☆☆☆

سادیہ کھل کے واقعے کے بعد سے جب سی لگ گئی تھی۔ لائبریری جانا تو زرد رہ گھر تک جھٹک آئی تھی اور جب اس نے حواس کو قابو میں کر کے اک اک منظر کو ذہن کی اسکرین پہ چلنے دیا تو اسے وہ کسی فلم کا سین لگنے لگا۔

”اسٹوڈیو گھاس۔۔۔ بالکل ڈفر ہے۔“ وہ ہڑبڑا کے رہ گئی تھی۔ سر جھٹک کر بھی وہ ان مناظر کو جھٹک نہیں پار رہی تھی۔ کالج میں بھی وہ غیر حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتی رہی تھی۔ حیات جیسے سو گئی تھیں۔ اس اک پل میں جیسے کچھ ہو گیا تھا۔ لیکن کیا؟ اس سوال کا جواب وہ خود بھی دریافت نہیں کر پار رہی تھی۔ اک

”تو پھر جو صحیح ہے۔ وہ کام تم کیوں نہیں کرتیں۔ کیوں اقرار نہیں کرتیں مجھ سے محبت کا۔“ ادیز ضدی سنجے کی طرح پھر کر بے حد قریب کھڑی سادیہ کے بال ٹھکی میں بھر گیا۔ سادیہ کا سر جھٹکے سے اوجھا ہوا تھا۔ وہ سی کر کے رہ گئی۔
 ”جب مرجاؤں گا تب اس طرح بکارتی رہو گی۔ دیوانوں کی طرح، پانگلوں کی طرح، لیکن میں لوٹ کے نہیں آؤں گا تب تڑپو گی، بسکوی۔“ اس کا بدلہ لہجہ سادیہ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے کر گیا تھا۔ اس کے چہرے کی بے خونی اور اپنے لفظوں کا عزم واضح تھا۔ بات کے اختتام پہ اس نے ہسٹل کپڑی سے لگالی تھی۔ سادیہ میں جانے کہاں سے اتنا حوصلہ آ گیا کہ اس نے تیزی سے اس کا ہسٹل والا ہاتھ پکڑنے کی اور اس کو شش میں ادیز کے سینے سے آگئی تھی۔ وہ اتنی خوف زدہ ہو گئی تھی کہ اس کا دل چڑیا کی طرح پھڑپھڑانے لگا تھا۔ اس کی دھڑکنوں کی پھڑپھڑاہٹ کو محسوس کر کے ادیز یوسف پھرے سمندر سے

ساکت جھیل کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس کی انگلی میں ابھی تک سگریٹ سلگ رہا تھا۔ باباں ہاتھ ہوا میں بلند تھا۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی سادیہ نے گرفت میں لے رکھا تھا۔ دائیں ٹولڈر پہ سادیہ کے نیلر بڑی طرح پوسٹ ہو گئے تھے۔ وہ خاموشی سے اپنی ٹھوڑی پہ اس کے بالوں کی سرسراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ لیجے حیات میں پہلا موقع تھا جودہ اس کے اتنے فریب تھی۔ اس نے اسی خاموشی سے اپنا ہسٹل والا ہاتھ اس کی گرفت سے پھڑانا چاہا تھا۔ مگر بدحواسی کے باوجود سادیہ نے گرفت مزید مضبوط کر کے اس کے سینے سے سر اٹھایا تھا۔ وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کئی ٹاپے ادیز بھی اسے دیکھتا رہا وہ یقیناً کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی تاہی اسے یہ احساس تھا کہ وہ ادیز یوسف کے کس قدر قریب ہے۔
 ”ہاتھ چھوڑا“ ادیز نے آہستگی سے کہا۔
 سادیہ نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔
 ”مت کر دیہ پلیز!“ وہ نرم دل لڑکی تھی آکھوں میں آنسو بھر آئے۔
 ”میں کر دوں گا۔“ اس کا لہجہ اٹل تھا۔
 ”ادیز یہ غلط ہے۔“ وہ جیسے حواسوں میں لوٹنے لگی تھی۔

سنا تھا جس نے اس کے وجود کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ کوئی آنسو پس تھا جس کے ٹپکنے میں وہ جھپٹنے لگی تھی۔ کالج آف کر کے وہ باہر لگی تو اس کے اعصاب کو جیسے جھٹکا لگا۔ نظروں کے سینے سامنے اوپر یوسف بلو جھڑو ہائٹ ٹی شرٹ میں یلو جیکٹ پہنے ٹھاسز آنکھوں پر چڑھائے گاڑی سے ٹپک لگائے دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے دروازے پہ نظریں جمائے ایستادہ تھا۔ ساویہ کے قدم بے ساختہ اس کی طرف اٹھ گئے۔

”تم یہاں؟“ اس کے ذہن میں فوراً کسی انہونی کا خیال آیا۔

”فوراُ چڑیا کی طرح گھبرا جاتی ہو۔ سب ٹھیک ہے کیا میں تمہیں پک کرنے نہیں آ سکتا۔“ اس کے گھبرائے انداز کو دیکھ کر اوپر نے اپنے آنے کی وضاحت کے ساتھ جیسے سوال کیا۔

”تم کیوں لینے آ گئے۔ مجھے لاہریری جانا ہے۔“ اسے اچانک لگا اور کام یاد آیا۔

”تو کوئی بات نہیں، میں لاہریری لیے چلتا ہوں۔ ایسی کیا بات ہے۔“ اوپر یوسف نے سیدھا ہوتے ہوئے اس کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

خاموشی سے بیٹھ گئی تو اوپر اس کی طرف کا دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف چلا آیا۔

گاڑی راستہ طے کرنے لگی تھی۔ وہ خاموشی سے نظریں وڈا اسکرین پہ جمائے چپ بیٹھی تھی۔ اوپر نے کئی ایک بار اس کے سائیکسٹ و وجود کو گردن موڑ کر دیکھا تھا۔ اب کے اس سے رہا نہیں گیا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ ساویہ کی نظر اک لمحے کو اس سے ملی تھیں۔ پھر اس نے دوبارہ اپنی سابقہ سرگرمی میں مصروف ہونا چاہا۔ مگر اوپر جیسا ضدی انسان یہ کہے ہوئے دیتا۔ اس نے دوبارہ اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔

”جب تمہارے چہرے کو دیکھ کر مجھے سکون ملتا ہے تو کیوں رخ پھیر لیتی ہو؟“ عجیب سی سرسراہٹ تھی اس کے لہجے میں۔ ہنا کچھ بولے وہ چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس میں شاید اتنی مزاحمت کرنے کی بھی ہمت نہ تھی کہ وہ اس کا ہاتھ اپنی ٹھوڑی سے ہٹا پاتی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں محبت کے پلکتے شعلے دیکھ کر وہ اک بار پھر لگا وڈا اسکرین پہ مرکوز کر چکی تھی۔ اوپر یوسف نے اس کے اس عمل کو بے حد مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

”محبت نے بالآخر اپنا آپ منوالیا تم سے۔ محبت ہو چکی ہے تمہیں مجھ سے۔“ اوپر یوسف نے جس قدر دیر جیسے لمحے میں کمال سکون سے جملہ کہا تھا وہ کسی قدر چونک کر اس کی سمت لگا کر گئی۔ لمحے کے ہزار حصوں میں خیر اور خوف اس کی آنکھوں میں آسایا تھا۔ اس کی متوحش اور بے یقین نظروں کو اس نے بہت محبت سے دیکھا تھا۔ پھر ہولے سے مسکرا کر سر اثبات میں ہلاتے بیک ویو مرر اس کی آنکھوں پہ فوکس کرتے کہا تھا۔

”اپنی آنکھوں کے بدلے رگ خود ہی دیکھ لو۔ اپنی متوحش دھڑکنوں کو خود ہی پرکھ لو۔ محبت کا عکس تمہارے وجود سے آشکار ہو رہا ہے ساویہ۔ اب تو اسے قبول کر لو۔ خود کو باور کرا دو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔“ وہ ہولے ہولے سحر جھونک رہا تھا اور ساویہ ساکت مہر بہ لب اسے نکتے جاری تھی۔

”سچ پوچھو تو میں نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہو جائے گی۔۔۔ ہاں جس لمحے تم نے مجھے فلرٹ سے روکا اس گھڑی میں نے تم سے اک مقابلے کی لفٹا قائم کر لی۔۔۔ میں بڑھالی میں تمہاری واہ واہ پہ چڑنے لگا تھا۔ تب ہی تمہیں پیچھے جھوڑنے کے لیے جی توڑ محنت کرنے لگا۔ اس مقابلے میں ان گنت راتوں کا ادھار ہے مجھ پہ۔ میں پاگلوں کی طرح بڑھنے لگا۔ صرف تم سے مقابلے میں جیتنے کے لیے اور جبر ہی نہیں ہوئی تم سے مقابلہ کرتے کرتے کب میں خود کو تمہارے دربار دل میں ہار

سادہ میں اپنی فیملی کو آپ کے گھر لانا چاہتا ہوں۔“ اس وقت وہ اسٹاف روم میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اگلے پچھر میں تھوڑا سا ٹائم تھا۔ وہ اپنا پچھر پڑھ رہی تھی۔ اتفاق سے اس وقت اسٹاف روم خالی تھا۔ عمیر کیمسٹری کے پچھرار تھے۔ پینتیس چالیس کے لگ بھگ تھے۔ انھی پر سنائی تھی۔ سادیہ کو پسند کرنے لگے تھے اور اب جب گھر میں ان کی شادی کی بات ہونے لگی تو انہوں نے گھر والوں کو اشارے میں بتا دیا کہ وہ کسی کو پسند کرتے ہیں گھر والوں نے خوشی کا اظہار کیا تو وہ سادیہ سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگے۔ اور اب جب وہ اتفاق سے انہیں اکیلی نظر آ گئی تو انہوں نے مدعا عرض کرنے میں ذرا دیر نا لگائی۔

عمیر کے اچانک کہنے پر سادیہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔ ان کے جملے میں نا سوال تھا نا استفسار، یوں جیسے وہ اطلاع دے رہے تھے۔
”کس سلسلے میں؟“ سادیہ کو ان کے انداز پر حیرانی تھی۔

”میں آپ کو پسند کرتا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ عمیر نے کھلے لفظوں میں پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ وہ بے طرح چونک گئی۔ اس کی نگاہ کے سامنے اوپن یوسف کا سراپا لہرا گیا۔ جانے کیوں، جب بھی کوئی اس سے محبت اور پسندیدگی کی بات کرتا تھا تو چمچم سے وہ محسوس آ جاتا تھا۔ جو اس کے لیے پاگل تھا۔ جیسے دیوانگی سے باز رکھنے کے لیے اس نے جھوٹ کہہ تو دیا تھا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن اس دن سے اس کے اندر اک خاموشی اتر آئی تھی۔ جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔

”اس خاموشی کو میں آپ کی رضا سمجھوں۔؟“
عمیر اسے استفہامیہ بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں نیل بیج انھی تو ماحول میں ارتعاش سا برپا ہو گیا۔ بریک ٹائم تھا۔ اسٹوڈنٹس کا شور ماحول میں گونجنے لگا۔ پچر بھی اسٹاف روم میں داخل ہونے

اوپن یوسف کسی ساحر کا روپ دھار چکا تھا جو ماحول میں سحر طاری کر گیا تھا۔ ”جس لمحے مجھ پہ منکشف ہوا تھا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں اور جس محبت کی مجھے تلاش تھی وہ تم ہوتو میں کئی دن تک خود کو، اپنے احساسات کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ حیرت کا پہاڑ مجھ پہ ٹوٹ پڑا تھا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔“

سادہ چپ چاپ اس کی کتھان رہی تھی۔ یوں جیسے اس کے پاس پوچھنے کو کچھ نا تھا۔ صد شکر کہ لاجریری کی عمارت آ گئی تھی۔ سادیہ کو بھی اس صورت حال سے فرار کا موقع مل گیا تھا۔

☆☆☆

عورت کی سیدھی سادی زندگی میں مرد سارے اصول تو زنا داخل ہوتا ہے اپنی محبت اور وفا کے بلند و بالا دعوے سے عورت کا اعتماد جیت کر اسے اپنا عادی بنا لیتا ہے۔ عورت وہ ہی دیکھتی ہے جو وہ دکھاتا ہے، اپنی ذات، ترجیحات اس مرد سے وابستہ کر لیتی ہے۔ خود پہ اٹھتی انگلی کی پروا کیے بغیر وفا کرتی ہے۔ اک مرد کی محبت میں سب کا بھروسہ توڑتی ہے۔ لیکن جب مرد کا دل محبت کے کھیل سے ادب جاتا ہے تو جاتے ہوئے اسی عورت کے منہ پہ کس کے تماچا مار جاتا ہے کہ اسے عورت پہ اعتبار نہیں۔

نہجہ کے وقت دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے وہ سسک رہی تھی۔ نیم اندھیرا کمرانہ بے ملکا ہو گیا تھا۔
”میں محبت نہیں کرنا چاہتی تھی اس کا نٹوں بھری راہ گزر پہ تو مجھے تھسٹ لایا اور اب جب میرا وجود لہو لہو ہو گیا ہے تو تو نے منہ موڑ لیا۔ یہ انصاف نہیں۔ میرے اللہ یہ انصاف نہیں۔“ آنسوؤں سے تر چہرہ خود پہ گزری اذیت کی داستان سنا رہا تھا رب العزت کی پارگاہ میں وہ اس پہ مہر کی شکایت کر رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ سسک رہی تھی۔ ٹرپ رہی تھی۔ مگر سناٹے میں اس کی پکار سننے والا کوئی نا تھا۔ اس کی ٹرپ دیکھنے والا کوئی نا تھا۔

لگے تھے۔ عمیر چند لمحے اسے خاموشی سے دیکھتے رہے پھر اپنی چیئر پہ جا کے بیٹھ گئے۔

سواویہ جب تک بیٹھی رہی اسے عمیر کی نظریں خود پہ گڑی محسوس ہوتی رہیں۔

گھر آ کر وہ بھول بیٹھی تھی۔ کالج سے لوٹی تو صدف نرگس کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھیں۔ کھانا کھا کر وہ تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گئی تھی۔ پھر جانے کب آنکھ لگ گئی۔ جاگی تو صدف گھر میں موجود تھیں۔

”سواویہ اٹھ کے تیار ہو جاؤ۔ تمہارا کولیک عمیر اپنی ماں اور بہنوں کو لے کر آیا ہے۔“ صدف گھرے میں داخل ہوئی تھیں۔ وہ بہت ایکسائیٹڈ بھی لگ رہی تھیں۔ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”جی!“ آواز میں حد درجہ خیر تھا۔ صبح ہی عمیر نے اپنی خواہش ظاہر کی تھی اور شام کو وارد بھی ہو گیا تھا۔ بیچ ماں اور بہنوں کے۔ اسے کسی قدر کوفت کا احساس ہوا۔ وہ ابھی اس وقت کسی کے سامنے جا کے ڈمی بننے کے موڈ میں نہیں تھی۔

”جلدی اٹھو! میں نے ناشتے کے لوازمات منگوا کر کچن میں رکھ دیے ہیں، تم بس جلدی سے چائے بنا لو۔ کوئی اچھا سا سوٹ پہن کر تیار ہو جاؤ۔“ صدف ماں کی طرح ہدایت کرتی جا رہی تھیں وہ بے دلی سے اٹھ کر وارڈروب کی طرف بڑھ گئی۔ ہاتھ میں آنے والا پہلا سوٹ نکال کر چھینچ کرنے چلی گئی۔ لائٹ سا تیار ہو کر کچن میں آئی تو لوازمات کے شارپرز پڑے تھے۔ چائے تیار کرتے اس نے لوازمات پلیٹوں پہ سلیتے سے رکھنا شروع کر دیے ٹرائی میں پلیٹوں کو سلیتے سے سیٹ کر کے وہ چائے نکال رہی تھی۔

”کس کی خاطر مدارت کی تیاری ہے؟“ اویز یوسف کی آواز اک دم سے ساعتوں میں پڑی تو وہ بری طرح اچھل پڑی، چائے ہاتھ پہ گرتے گرتے پٹی۔

”ارے آرام سے، میں ہی ہوں، کوئی بھوت

دیکھ لیا جو اتنا ڈر گئی ہو۔“ وہ اس کی چیخ اور اک دم پلٹ کر ہاتھ سینے پر رکھ لینے پہ ہنس پڑا تھا۔ سواویہ کی خوب صورت آنکھوں میں اک نامعلوم سا ڈر آ گیا تھا۔ وہ یوں متوحش ہو گئی تھی جیسے اویز یوسف نے چوری کرتے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ اس کا پلٹنا تھا کہ اویز یوسف مبہوت ہو کر یک ننگ اسے دیکھے گیا۔

آنکھوں میں خوف سموئے بلک سوٹ میں مسٹر ڈاکٹر بلیک دوپٹا لیے وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ وہ بے ساختہ اس کی طرف چند قدم آگے آیا تھا۔

”جس سنور کر تو تم مزید حسین لگتی ہو۔“ وہ دھیمے سے سرگوشی کر گیا تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہو کر جیسے خود پہ قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

”گیسٹ آئے ہیں؟“ وہ لوازمات سے بھی ٹرائی سے سلک اٹھا کر کھانے لگا۔

”ہاں وہ.....“ سواویہ گڑبڑا کے چپ رہ گئی۔ اور اک دم سے رخ پھیر گئی۔

اویز یوسف نے اک نظر جی ٹرائی اور دوسری نظر سواویہ کی پشت پہ ڈالی جو ٹرے میں چائے کے کپ سیٹ گر رہی تھی۔ اس نے جھپٹے سے اس کے بازو کو پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا تھا۔

”کون ہیں یہ مہمان!“ سواویہ اس کے انداز سے جیسے لرز گئی۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی تیاری۔ ستواں ناک میں چمکتی لوگ۔ اس کا سجا سنورا روپ جو مفہوم سمجھا رہا تھا وہ اس کے اندر آگ لگا گیا۔

”میرے کولیک کی ٹیبلٹی ہے۔“ سواویہ کی مجبوری تھی کہ اسے جواب دینا تھا۔ وہ ایسے جان چھوڑنے والا تھوڑی تھا۔ سواویہ نے ٹرائی میں چائے کی ٹرے رکھی اور جلدی سے چن سے نکلتا چاہا۔ مگر اس کے ہاتھ ٹرائی کو پکڑتے اس سے پہلے اس کی کلائی اویز یوسف کے مضبوط ہاتھ کے ٹکے میں آ گئی تھی۔

”اور کس سلسلے میں آئے ہیں یہ لوگ؟“ وہ کلائی پہ دباؤ ڈالتے اس کی کجبراری آنکھوں میں

جھانک رہا تھا۔ وہاں سیادیہ کو اپنی نازک کلائی چھڑانے کی کوشش میں پسینہ آ گیا۔
”تم نے تو کہا تھا، تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔“ وہ جیسے اپنا غصہ کنٹرول کر رہا تھا۔

”ہاں کہا تھا، صرف چھپیں اس فضول حرکت سے روکنے کے لیے۔ ورنہ اس میں کوئی سچائی نہیں تھی۔“ سیادیہ نے ہمت کر کے سچ کہہ دیا۔ اویز یوسف لب چھپتے کئی ٹاپے اسے دیکھتا رہا پھر اس کی کلائی مڑوڑا کر کے پیچھے لے گیا۔
”اویز!“ وہ کراہ گئے رہ گئی۔

”میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں پر کھنے میں، نامیرا دل تمہارے احساسات پہچانے میں نیکین اگر تم نے جھوٹ ہی کہا تھا تو تم اب اس جھوٹ کو نبھاؤ گی۔ یہی بات ان مہمانوں کی خاطر تو صبح کی۔ تو آؤ میرے ساتھ۔۔۔“ وہ اس کی کلائی کھینچتا چکن سے نکلنے لگا تھا۔

”اویز کیا بچپنا ہے۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔“ سیادیہ کلائی چھڑانے کے جتن کرنے لگی۔ جو اسے ساتھ لیے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

”ان کی خاطر مدارت کی تم فکر نہ کرو۔ میں انہیں ہمارے ویسے کی شاندار دعوت کھلاؤں گا۔“ اس پر چنداں اثر نہ ہوا تھا۔

”اویز باگل ہو گئے ہو۔ چھوڑو میرا ہاتھ!“ سیادیہ اسے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتا دیکھ کر مزید گھبرا گئی۔ جانے وہ کیا کرنے جا رہا تھا۔ سیادیہ کا دل سوکھے پتے کی طرح کا پٹنے لگا۔ لیکن اس ضدی اور ہٹ دھرم یہ کوئی اثر نہ ہوا۔ سیادیہ کی دلی خواہش ہوئی وہ اپنی آنکھیں بند کر لے نا کچھ دیکھے نا کچھ کہے کیونکہ جو کچھ وہ کرنے لگا تھا اسے تصور میں سوچ کر ہی اس کی جان نکل رہی تھی۔

اویز یوسف اسے کھینچتا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا۔ جہاں عمیر اس کی ماں اور تین بہنوں کے علاوہ صدف اور نذیر احمد بھی براجمان تھے۔ گھبراہٹ ہوئی سیادیہ کا ہاتھ تھامے اویز یوسف جس طرح

کمرے میں داخل ہوا تھا اس سے کمرے میں موجود باتیں کرتے نفوس کے لب جہاں ساکت ہو گئے وہیں نگاہیں پتھر انگلیں۔ عمیر اور اس کی ماں بہنیں اک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگی تھیں تو عمیر اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا تھا۔ صدف اور نذیر احمد بھی ہکا بکا رہ گئے تھے۔

”آپ سب یقیناً سیادیہ کو مانگنے آئے ہیں مگر جو ہستی پہلے ہی کسی کی ہو اسے کسی اور کو سونپنا نہیں جاسکتا۔ یہ میری ہے اور میری ہی رہے گی۔ آپ سب کی تشریف آوری کا بہت شکریہ خاطر مدارت سے معذرت آپ لوگوں کو شادی میں ضرور بلاؤں گا۔ اب آپ لوگ جاسکتے ہیں۔“ اویز یوسف کی آواز جیسے حضور اسرافیل کی طرح سب کی سماعتوں میں گونجی۔ عمیر کی ماں بہنیں عمیر کی شکل دیکھنے لگیں تو عمیر سیادیہ کی، جو اپنا ہاتھ اویز کو پکڑائے سر جھکائے کھڑی تھی۔ اویز کے گھٹ کی طرف اشارہ کرنے پہ مہمان خاموشی سے اٹھے اور دروازے سے نکلنے چلے گئے۔

صدف اور نذیر احمد ساکت بیٹھے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ بلا کی بے یقینی تھی ان کی نگاہوں میں۔ اویز یوسف نے اک دم سے سیادیہ کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ ان دونوں کی طرف بڑھا۔ ان کے قدموں تلے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر وہ ان کے ہاتھ تھام گیا تھا۔

”آپ دونوں کو شاید برا لگا ہو۔ مگر یہ ہی سچ ہے۔ میں سیادیہ سے محبت کرتا ہوں اور اسی سے شادی کروں گا۔“ وہ اپنے ازلی بے خوف اور اسلجے میں اپنے عمل کی معافی مانگتا انہیں اپنے خیالات سے آگاہ کر رہا تھا۔

”لیکن بیٹا سیادیہ تم سے بڑی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔“ صدف جیسے بمشکل بولی تھیں۔ سیادیہ کا جی چاہ رہا تھا اویز یوسف کا گلابادے جو اس کے ماں، باپ کے سامنے اسے شرمندہ کر گیا تھا۔ جس نے بڑی صاف ستھری زندگی گزاری تھی اور آج اس پر ابھی بے یقین نظریں اسے چھ رہی تھیں۔ کچھ نا کر کے بھی وہ

مجرم بن گئی تھی۔

”مام آپ گھر جائیں، میں آ کر آپ سے بات کرتا ہوں۔“ اوپز یوسف کے لیے بھی نرمس کاری ایکشن ضرورت سے کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ تب ہی سرد لیکن آہستہ آواز میں بولا۔

”ہاں میں چلی جاؤں تاکہ تم اس عمر رسیدہ کے ساتھ محبت کا کھیل کھیلتے رہو۔“ نرمس چمک کے بولیں۔ ساویہ نے کرب سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”مام انس انف“ اب کے اوپز یوسف زور سے دھاڑا تھا۔ اک لمحے کو نرمس بھی ڈر گئیں۔

”آپ گھر جائیں۔“ وہ پہلے سے زیادہ سرد مہری سے بولا۔

”ٹھیک ہے جارہی ہوں لیکن سب کان کھول کر سن لو۔ میرے چیتے جی ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ سب اپنی اپنی خوش گمانی بھول جائیں۔“ نرمس جاتے جاتے بھی گل فٹانی کرتی چلی گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد نذیر احمد بھی خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔

”تائی جان“ وہ ساکت کٹری صدف کی طرف بڑھا تھا۔

”تم اس وقت یہاں سے چلے جاؤ ادیز“ صدف کی آواز درد سے بول بھل آئی تھی۔ اوپز نے ان کے ضبط کیے ہوئے چہرے کو اک نظر دیکھا۔ نرمس کے لفظوں نے جسے یقیناً ان کے دلوں پہ بر چھیاں چلا دی تھیں۔ وہ اک نظر ساویہ پہ ڈال کر تیزی سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

”گھر میں موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ صدف اور نذیر احمد اپنی جگہ خاموش ہو گئے تھے تو ساویہ اپنی نظروں میں جیسے چور ہو گئی تھی۔ کچھ تا کر کے بھی وہ مجرم بن کر سب کی نظروں اور باتوں کو برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ رشتے جب اپنی اصلیت دکھا دیں تو انسان یوں ہی خاموش ہو جاتا ہے۔ بچی ان دنوں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ گھر جا کر اوپز نے نرمس کو دو نوک لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ ساویہ

”چار سال کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا تائی جان اگر یہ مجھ سے آٹھ سال بھی بڑی ہوتی تب بھی مجھے کوئی عذر قابل قبول نہ ہوتا۔“

”یہ تمہاری سوچ ہے بیٹا نرمس اور بچی کی نہیں۔“ صدف در پردہ جتا گئی تھیں۔ انہیں نرمس کے مزاج کا بہت اچھی طرح پتا تھا۔ پہلے وہ ساویہ سے بہت محبت جتاتی تھیں اگر انہیں واقعی ساویہ سے محبت ہوتی تو وہ اسفر کے لیے اپنے خاندان میں لڑکیاں نادیکھ ہی ہوتیں۔

”مہری زندگی میں فیصلے میرے ہوتے ہیں تائی جان، آپ کوئی مینشن نالیں۔“ وہ انہیں اعتماد دلا رہا تھا۔

”تمہارا دماغ تو ٹھکانے پر ہے ادیز“ شوخی قسمت کہ اس وقت نرمس ادھر کو آ گئیں۔ صدف، نرمس کے ساتھ بازار میں ہی تھیں جب نمبر کی کال آئی تھی۔ نرمس بھی مہمانوں سے ملنے کے خیال سے آئی تھیں۔ مگر دروازے پہ ہی مہمانوں کا غصہ اور بڑبڑاہٹ سن کر اندر آئیں تو اوپز کے جملے ان کی سماعت پہ ہتھوڑے کی طرح برے۔ اوپز یوسف اک دم سے سرودھ ہو گیا۔

”ماما ہم نے تمہاری ہر ضد پوری کی ہے لیکن ابھی تم اتنے بڑے نہیں ہوئے کہ اپنی زندگی کے سب سے اہم فیصلے کرنے کھڑے ہو جاؤ۔“ نرمس نے جھجھک برسوں پرانی کدورت چھپا کر تھی وہ اس کٹری اک دم سے آشکار ہو گئی۔ ساویہ اپنی جگہ پھر کہن گئی تھی۔

”تمہارے لیے لڑکیوں کی کمی ہے جو تم عمر رسیدہ کے چکر میں پڑے ہو۔“ نرمس کی سچ لوائی پہ صدف ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ نذیر احمد شریف منٹ انسان تھے انہوں نے سچی بلا ضرورت نرمس سے گھنگھوڑیں کی تھی تو اب ان کی سچ لوائیوں پہ کیسے برہمی کا اظہار کرتے۔ رہی ساویہ تو وہ کچھ بولنے کے قابل ہی کہاں تھی۔ اتنی ذلت پہ اس کی زبان تالو سے لگ گئی تھی۔

سے ہی شادی کرے گا۔ زکس بھی اپنے موقف سے اک اچھے بچے کو تیار نہیں۔
 ”تم کسی راہ چلتی کو پسند کرلو میں اس سے تمہاری شادی کروں گی مگر سادیہ سے مر کے بھی نہیں۔ جس کی وجہ سے میں برسوں حسد کی آگ میں جلی ہوں۔“

اویز نے بیٹی کو فون کر کے کل ہی لوٹ آنے کا کہا تھا۔ سادیہ کالج چلی تو عمیر نے یہ بات پورے اسٹاف کے سامنے پھیلا دی کہ کیسے اسے گھر بلا کر سادیہ اپنے کزن کے ساتھ ہاتھ پکڑے کھڑی تھی۔ ان کی بے عزتی کی۔ ہر کوئی فردا فردا اس واقعے کی تفصیل پوچھ رہا تھا۔ اور وہ جو گھر سے اس لیے نکل گئی تھی کہ ان سوچوں سے رہائی ملے۔ وہ اک نئے امتحان پڑھنے کی تھی۔

”اویز یوسف جس طرح تم نے میرا تماشہ لگا دیا ہے، تم خود سکون سے نہیں رہو گے۔ برسوں کی نئی میری عزت یہ تم نے داغ لگا دیا۔ اللہ کرے تم مر جاؤ“ کالج کے سامنے اسے اپنا منظر دیکھ کر سادیہ کو بلا کا غصہ آیا تھا۔ وہ کل سے چپ تھی مگر اسے کالج کے باہر دیکھ کر عمیر نے جس طرح اپنے ساتھ کھڑے سا بھی کو لیک کو اشارے سے ان دونوں کی طرف اشارہ کیا۔ یہ سب دیکھ کر وہ برداشت نہ کر سکی تو بول پڑی۔ اویز یوسف اسے ساکت نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں وہ رکشا کو اشارہ کر کے اس میں سوار ہو چکی تھی۔ وہ نظریں سڑک پہ جمائے کتنی ہی دیر کھڑا رہا۔

گھر پہنچ کر وہی کل والی سوگواریت دیکھ کر سادیہ کا دل بوجھ ہو گیا۔

”اویز یوسف یہ کس امتحان میں ڈال دیا تم نے مجھے تم کبھی سسکی نہیں رہو گے۔“ آنکھوں میں آنے پانی کو صاف کرتے اس نے صدف کے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ دوپٹا منہ پہ ڈالے لیٹی ہوئی تھیں۔ سادیہ کے دل پہ گھونسا لگا۔ روز اس کی واپسی کے وقت کا خیال کرتے صدف حاق وچہ بند ہوئی

تھیں۔ خود اس کے لیے کھانا نکالتی تھیں۔ روز کی رو داد سنتی تھیں لیکن آج وہ بے جان لیٹی ہوئی تھیں۔
 ”مہما طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی۔ ایسے کیوں لیٹی ہوئی ہیں؟“ سادیہ سے زیادہ دیر برداشت نہ ہو سکا۔ صدف نے دوپٹا چہرے سے ہٹا کر اسے دیکھا۔ معصوم سادہ چہرہ لے کر ان کی ہری شکل بچی انہیں بہت عزیز تھی۔ بہت محبت تھی انہیں اپنی اگلی اولاد سے اتنی کہ اولاد دیرینہ نہ ہونے کا بھی انہیں غم نہ ہوا ساری عمر۔

”ہما، میرا یقین کریں۔ اویز نے جو کھا وہ اس کی سوچ ہے مجھے اس سے کوئی محبت و جبت نہیں ہے۔ میں۔۔۔“

”کاش سادیہ میں ہاتھ رہی ہوتی۔ تو نے میرے گھر جنم نہ لیا ہوتا تو آج۔۔۔ آج یہ ذلت میرے مقدس میں نہ ہوتی۔ زکس نے خاندان بھر میں بات پھیلا دی ہے سب میری تربیت پہ تھوکر کر رہے ہیں۔“ صدف کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ سادیہ لب کاٹ رہی تھی۔

”اویز یوسف اللہ کرے تم مر جاؤ۔ مر جاؤ تم!“ اس کے دل سے اک بار پھر بد دعا نکلی تھی۔ اسی وقت نذیر احمد حیرت فاری سے ہما کے چلے آئے تھے۔
 ”بیٹی کی کال آئی ہے۔ اویز کا بہت بڑا ایکسپینٹ ہو گیا ہے۔ بہت سیریس حالت ہے۔ بیٹی بس کچھنے والا ہے۔ اس نے ہمیں اسپتال کچھنے کی درخواست کی ہے۔“ نذیر احمد، سادیہ کو دیکھ کر اک لمحے کے لیے رکے تھے۔ اگلے بل انہوں نے فرائے سے کال کی بات سب بتا دیا تھا۔

”ہائے میرا بچا“ صدف بھی ہول کر اٹھی تھیں۔ جلدی سے چادر لے کر گیٹ بند کرنے کا کہہ کر نذیر صاحب کے پیچھے نکلیں۔ وہ سب کچھ فراموش کر گئی تھیں۔

”اویز یوسف اللہ کرے تم مر جاؤ۔ مر جاؤ تم!“ اس کے اپنے الفاظ کانوں میں گونجنے تو اس نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لے لیا۔ اسپتال میں اک

قیامت منتظر تھی۔ ڈاکٹر زنا امید کی کا اظہار کر رہے تھے۔ شوٹلر کی بڑی ٹوٹ گئی تھی۔ سر کے پچھلے حصے پہ شدید چوٹ لگی تھی۔ پیٹھ پہ جا بجا کچھ چھگئے تھے۔ نرگس، صدف کے گلے لگ کے رو رہی تھیں۔ صدف اعلا ظریفی کا مظاہرہ کرتی انہیں دلا سادے رہی تھیں۔ ادیز کے لیے دعا گو تھیں۔ آپریشنز ہو گئے تھے مگر اسے ہوش نہیں آ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے ڈاکٹر ز منتظر تھے۔ کچھ بعید نا تھا اسے ڈیڈ ویکس کر دیا جاتا۔

☆☆☆

کبھی لفظ نہیں ہوتے فقط آنسو ہوتے ہیں، ندامت کے۔ بد دعا اتنی جلدی قبول کرنے والا دعا قبول کرنے میں اتنی ویری کیوں لگاتا ہے۔ تجھے دعا دوں تو بھی الگ رہ کر تڑپوں، بد دعا دے کر درد کروں تو بھی سکوں۔۔۔ یہ کس عذاب میں جان ہے۔ غلطی والے کہتے ہیں تو میرا نہیں ہے۔ لیکن اس دل کا کیا کروں جس میں تیرے علاوہ اور کوئی نہیں۔ نا تجھے سرعام اپنا کہہ سکتی ہوں نا تیرا نام لے کر سرعام رو سکتی ہوں میں کیا کروں۔ میں کہاں جاؤں۔

آنسو قطار در قطار آنکھوں سے بہ رہے تھے۔ کبھی کبھی دنیا کے سامنے جتنی کہ خود کے سامنے بھی ہم مسلسل جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ اپنے احساسات و جذبات کو سات پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں، مگر کوئی اک لمحہ ہمارے اوپر سے سارے پردوں کو سرکا کر ہمیں آشکار کر جاتا ہے۔ جب سب نے ناامیدی ظاہر کر دی تو اس کے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر لیوں سے نکلنے لگے اور یہی ہی لمحہ اسے باور کر گیا کہ اس کا پردہ سرک گیا ہے۔ ادیز یوسف کی دیوانگی نے کب اسے اپنی گرفت میں لیا تھا، اسے خبر نہ ہوئی۔ وہ روز ہی اس کا دامن پکڑ کر عشق و جنون کی داستان سنانے لگتا تھا۔ اس کے لفظوں کی آغاج نے کیسے اس کے دل کو لپیٹ میں لیا وہ نہیں جانتی تھی۔

وہ اس حقیقت کو کبھی کسی لمحے قبول کرنا نہیں چاہتی تھی، وہ جانتی تھی یہ آسان نہیں ہے۔ جو کچھ رونما ہوا۔ وہ بہت پہلے ہی اپنی بصیرت کے بنا پر سب دیکھ

چکی تھی۔ تب ہی ہر بار ادیز یوسف کو دھکا دیتی تھی۔ مگر وہ بھی اپنی ہٹ کا لیکا تھا۔ اپنے فیصلوں میں اٹل تھا۔ سادہ نے اپنی ذات کو متاثر بننے سے بچانے کے لیے یہ خول خود یہ تان رکھا تھا۔ مگر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اور اب اس کی بد دعا جانے کیسے قبول ہو گئی تھی۔ اس نے کتنی ہی دعائیں کی تھیں کہ ادیز محبت نامی بلا اس کا پیچھا چھوڑ دے، مگر ایسا کچھ نہ ہوا اور اب جو ہوا وہ بہت برا تھا۔ رات آدھی بیت گئی تھی، مگر اسپتال سے کوئی امید افزا خبر نہیں آ رہی تھی۔ صدف اس کے اکیلے پن کا خیال کر کے لوٹ آئی تھیں، مگر ان کے چہرے کی ناامیدی! انہوں نے جس طرح سادہ یہ نظر ڈالی وہ ڈھکے ٹھکی تھی۔

”میرے اللہ..... اللہ اس کو زندگی دے دے۔ میرے مالک اسے زندگی دے دے، بد نے میں بھلے میری لے لے۔“ تہجد کی نیت کر کے اس کے لب بس یہ ہی ورد کر رہے تھے۔ جانے کب وہ جا نماز پہ ہی سو گئی تھی۔

☆☆☆

”جب مر جاؤں گا، تب اس طرح بیکارتی رہوگی۔ دیوانوں کی طرح، پانگوں کی طرح، لیکن میں لوٹ کے نہیں آؤں گا، تب تڑپوگی، سکسوگی۔“ اس کے لفظوں کی بازگشت اس کے ہوش و خرد سے بے گانہ وجود کو بھی جھنجھوڑ رہی تھیں۔ سادہ یہ سحر کوئی کمزور، بے لگام نفس و احساسات کے زیر اثر رہنے والی لڑکی نہیں تھی، تب ہی تو ادیز یوسف کے شویدہ جذبات کے آگے سالوں کھڑی رہی۔ وہ اس جنونی لڑکے کو اپنی ذات سے مایوس کرنا چاہتی تھی، اسے خبر تھی وہ جس معاشرے کا حصہ تھی، وہاں چار سال کا فرق لوگوں کو چالیس کے برابر لگے گا اور سب اسے ہی الزام دیں گے کہ اس نے اپنے سے چار سالہ چھوٹے لڑکے کو پھانس رکھا ہے۔ لیکن اس کی کوئی احتیاط اس کے کام نہیں آئی۔ اپنے اور ادیز کے بیچ رکھے فاصلے کے باوجود ادیز یوسف تیزی سے ہر دیوار کو گرا گیا تھا۔ لیکن دیوار گرتے ہی سارا ملہ اس

کے وجود کو لبو لہان کر گیا تھا۔ وہ جس نے کبھی محبت کی گلاب دادی کی خوب صورتی نہیں دیکھی تھی، وہ اس کے کانٹوں سے لبو لہان ہونے لگی تھی۔ ایسے میں جب اسے دنیا کے سامنے مجرم بنانے والا نظر آیا تو دیکھے دل سے بے ساختہ وہ جملے ادا ہو گئے جو وہ کبھی ادا نہیں کرنا چاہتی تھی اور اب وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبینوں میں جکڑا پڑا تھا۔ اس نے دیکھتے ہی منہ پہ ہاتھ رکھ کر اپنی چیخوں پہ قابو پایا تھا۔

”تمہاری وجہ سے وہ اس حال کو پہنچا ہے۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ تمہیں کبھی بہو نہیں بناؤں گی اور اس نے کہا تھا وہ تمہارے بتا مر کے دکھائے گا۔“ نرگس نے اسے دیکھتے ہی جیسے گلہ کیا تھا۔ نظریں چرا کر وہ خاموشی سے آنسو بہانے لگی تھی۔ جانے نرگس اسے مورد الزام ٹھہرا رہی تھیں یا انہیں کچھ تداستار ہا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکی۔

”اللہ پلینا نا!“ آسمان کی طرف سراٹھا کر اس نے کپکپاتے لیوں سے گڑگڑا کے کہا تھا۔ آنسو تیزی سے رخساروں پہ بہ نکلے تھے۔

”انہیں ہوش آ گیا ہے۔ کانگریس۔ ڈاکٹر چیک کر رہے ہیں انہیں۔“ نرس تھمتا تے چہرے کے ساتھ خوش خبری دے کر دواؤں کا پرچا تھما لگی تھی۔ وہ بے ساختہ گھٹنوں کے بل مار بل پہ گر گئی تھی۔ بے شک وہ رب ہی ہے جو دلوں کی آہ کو سنتا ہے۔ پھر اک افراتفری لگ گئی اور کئی گھنٹوں کے صبر آزما انتظار کے بعد ڈاکٹر نے اس سے ملنے کی اجازت دی۔

”تم جاؤ..... سب سے پہلے تم ملواس سے۔ وہ خوش ہو جائے گا۔ جاؤ۔“ نرگس نے سب کے ساتھ کھڑی سادیہ کو تھام کر بے ساختہ دردازے کی طرف دھکیلا تھا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے صدف کو دیکھنے لگی تھی۔ صدف نے نظریں چرا لی تھیں۔ نرگس نے اسے دردازے سے اندر دھکیل دیا تھا۔

میرے دل کے ہر صفحے پر
خیر ہو تفصیل سے تم

وہ جس کی محبت کو سالوں سے جھٹلاتی آ رہی تھی، اس نے اک ہی جھٹکے میں اسے خود پہ آشکار کر کے جتا دیا تھا کہ کس قدر دیوانگی دکھا سکتا تھا۔ وہ خاموشی سے لیٹا جھٹ کو مہورے جا رہا تھا۔ سادیہ کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ خود میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ قدموں کی آہٹ پہ اس کی نظروں کا ارتکاڑ ٹوٹا تھا۔ وہ اس کے بیڈ کے پاس چپ چاپ کھڑی تھی۔ ادیز یوسف کے چہرے پہ اسے دیکھ کے جو رنگ آئے تھے وہ اسے مزید شرمندہ کر گئے۔ بیڈ پہ ہاتھ رکھ کر اس نے جیسے بھٹکل خود کو کھڑا رکھا ہوا تھا۔ ادیز یوسف نے اس کا دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھ میں تھام کر خاموشی سے اپنے سینے پہ اس کا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن سادیہ کے ہاتھ سے دل تک پہنچ رہی تھی۔

”ادیز یوسف تم سے بہت محبت کرتا ہے۔“ اس نے بہت دھیمے سر دل میں کہا تھا۔ سادیہ نے اک نظر اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اٹھارہ گھنٹوں نے اس کے صحت مند چہرے کو زردی میں بدل دیا تھا۔ کب کی رکی سسکی سادیہ کے ہونٹ سے پھر پھڑا کے آزاد ہوئی۔ دھپک کے رد پڑی۔ روتے روتے اس کی پیشانی بے ساختہ ادیز یوسف کے ہاتھ پہ آ پڑی تھی۔ جس کے نیچے سادیہ کا ہاتھ دبا تھا۔ وہ ٹی ٹانے بچپوں سے روئی رہی۔ ”میری زلیخا ہونگی؟“ وہ اس کی بچکیوں پہ بند باندھنا چاہ رہا تھا کہ وہ پھر ترخ کر اسے باتیں سناے گی، مگر اس کے آنسوؤں میں جب مزید روانی آ گئی تو ادیز یوسف کو تشویش ہونے لگی۔

”سادیہ اتنا مت رد۔ میں ٹھیک ہوں بار۔ ہاں پتا چلا ہے نرس نے بتایا ہے اک وقت میں مجھے ڈیڈ ڈیکٹر کر دیا تھا، ڈاکٹر ز نے۔ لیکن اب میں ٹھیک ہوں، تمہارے پاس رہوں گا۔ روز تمہارے گھر آ کر تم سے محبت کی بھیک مانگوں گا اور تم ہر بار کی طرح دھتکارنی رہنا۔ یوں ہی عمر گزر جائے گی۔“ وہ اسے چپ کرانے کے لیے جودل میں آ رہا تھا بول رہا تھا۔

”جیپ بالکل!“ ساویہ نے جھپٹنے سے سر اٹھا کر نہایت طبعیت کے عالم میں اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ بایاں ہاتھ پہلے ہی اویز یوسف کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ اور دایاں ہاتھ اس کے منہ پر رکھا تو ماحول میں اک دم سے خاموشی طاری ہو گئی۔ اویز یوسف نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے رخساروں سرخ ہوتی ناک اور سوچی آنکھوں کے گلابی ڈورے دیکھ رہا تھا۔ جو سارے راز افشا کر چکے تھے کہ وہ جیسے اٹھارہ، انیس گھنٹوں سے روٹی رہی تھی۔ ”کیوں کیا جان بوجھ کے ایکسٹرنٹ تم نے؟“ وہ چہرے پر نہایت براہی لیے اسے گھور رہی تھی۔ اک پہل کو اویز یوسف کے چہرے پر حیرت کا رنگ چھایا، پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی جو لبوں پر ہاتھ رکھنے کی وجہ سے بظاہر نمایاں نہ ہو سکی، مگر مسکرائی آنکھیں ساویہ کو مزید غصہ دلا لگیں۔

”بھئی نے غصے میں کہا تھا۔“ ساویہ کے کپکپاتے لبوں سے بمشکل نکلا۔ اویز یوسف جیسے غار ہو گیا۔

”ہاں پتا ہے میری کو اسٹار جو ہو۔ مجھے جیسی ہی ہو، جتنا مجھے غصہ آتا ہے، اتنا تمہیں بھی..... لیکن اس حادثے سے اک چیز تو اچھی ہو گئی۔“ وہ یوں اس کے دلوں ہاتھ تھاے گفتگو کر رہا تھا۔ جیسے بہت خوب صورت وادی میں ہو، اس وقت اسے کسی درد تکلیف کا نہ احساس تھا، نہ مشینوں میں جکڑے وجود کا۔

”کیا؟“ پانی پلوں پر اٹکنے لگا تھا۔ اب بوند ٹھنک کر پلوں کی پہرے دار بن گئی تھی۔ جیسے کہ ساویہ کب تحیر سے نکل کر پلک جھپکے اور وہ کب رخسار پر لکیر بنائی اپنا سفر مکمل کرے۔

”مجھے یہ آگاہی ہو گئی کہ میری زیلخا کو بھی مجھ سے بہت محبت ہے، جو میرے بنا اک پہل نہیں رہ سکتی۔ بھلے معاشرتی ڈاروؤں نے اسے اپنے جذبات و احساسات چھپا لینے پر مجبور کیا تھا، مگر مجھے کھونے کے ڈر نے اس اپنی لڑکی کو کالج میں تبدیل کر دیا۔“ اس کے درست قیاس پر وہ ایک دم سے نظریں چرانے لگی۔ اویز یوسف کے لیے اس کا شرمایا، گھبرایا سراپا نیا تھا۔ دل کو ایسا سکون ملا جو بھی نہیں ملا تھا۔

”شکر ہے، یہ اعزاز بخشے گا۔ بول نہیں سکتی تھیں، پہلے کہ تمہیں بھی محبت ہے۔“ اس نے دونوں ہاتھوں میں موجود اس کے ہاتھوں پر دباؤ بڑھایا۔ نیچے میں ڈرپ لگے ہاتھ پر دباؤ بڑھا تو نینڈل پہ خون کا دھبا نمودار ہونے لگا۔

”اویز!“ اس نے بے ساختہ اپنے ہاتھ چھڑا کر ڈرپ لگے ہاتھ کو تمام کر بنوڑ معائنہ کیا کہ کہیں خون زیادہ تو نہیں نکل گیا، لیکن شکر تھا بچت ہو گئی تھی۔ ”اشق بے دوق!“ وہ اس کے چہرے پر نظر ڈال کر گھر کئے سے خود کو نہ روک پائی۔ جبکہ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی ڈھٹائی پر وہ پھر سے اس کے ہاتھ کا جائزہ لینے لگی۔ ”باہر سب ملنے کو منتظر کھڑے ہیں، جا کر بھیجی

مشکل میں اپنی، اگرچہ کچھ ہو جاتا، جواب دو۔“

”او!“ وہ آنکھوں سے اپنے لبوں پر پڑے اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے منہ سے آواز نکالنے لگا، اس کا اشارہ سمجھ کر ساویہ نے ہاتھ اس کے لب پر سے ہٹا کر پہلو سے لگا نا چاہا، مگر اس کا دوسرا ہاتھ بھی اویز یوسف کے قابو میں آچکا تھا۔

”عجیب دادا گیری ہے، خود منہ بند کر کے کھڑی ہو اور حکم دے رہی ہو، بولو۔“ اس نے شوقی سے اسے دیکھتے مسکراتے ہوئے کہا۔ ساویہ کے تیر انداز، اس کا اس اویز یوسف کے عرصہ سے بے قرار دل کو جیسے قرار دے رہا تھا۔ ساویہ اب بھی سوالیہ نظریں لیے کھڑی تھی۔ وہ اس کی نظروں کا مضمون جان گیا تھا۔

”تم نے ہی تو کہا تھا۔ اویز یوسف تم مر جاؤ! پھر کیسے تمہاری بات ٹالتا۔ تم نے پہلی بار تو مجھ سے کوئی فرمائش کی تھی، کیسے نظر انداز کرتا۔“ وہ اتنی محبت اور اسنے پر بخش لہجے سے گویا تھا کہ ساویہ سحر کی آنکھیں پھر پانی سے بھرنے لگیں۔ اویز یوسف کا چہرہ پانی پہ رقص کرنے لگا۔

ہوں سب کو۔ اب سکون ہے انسانوں کی طرح لیٹے رہو۔“ اس کے ہاتھ کو اٹھائی سے بیڈ پر رکھ کر اس نے پروگرام بتایا۔

”اودھ لو بار..... میں کسی سے ملنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ تم بس میرے پاس بیٹھی رہو۔ میرا ہاتھ تھام کر۔ قسم سے مجھے کسی درد کا احساس نہیں ہوگا پھر۔“ ساویہ کے گھورنے پر وہ مصحوبیت سے تسلیں کھانے لگا تھا۔ ”پلیز نہ۔“ اس کے اصرار پر ساویہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

☆ ☆ ☆

ادیز یوسف ڈی سٹارج ہو کر گھر لوٹ آیا تھا۔ گوکہ ڈاکٹر نے ابھی مکمل بیڈ ریسٹ کا کہا تھا۔ شوئرز کی ہڈی کے باعث اسے ڈرائیوگ وغیرہ سے سختی سے منع کیا گیا تھا، لیکن وہ کب تک کر بیٹھے والا تھا۔ روز ہی صدف کے پہلو سے لگا رہتا۔ ساویہ کی احتیاطی تدابیر پر ہنستا رہتا۔

”باتی جان اسے لیکچرار کے بجائے ڈاکٹر ہونا چاہیے تھا۔ ہر وقت ڈاکٹر ساویہ سحر کے طبی مشورے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ نہ کہتا وہ نہ کرنا۔ دوا نا تم پہ لو۔“ صبح میں کیا کھایا تھا۔ جبکہ فوڈ اس وقت اس حالت میں مت کھاؤ۔ لطف..... کیا بیٹی ہے آپ کی۔“ وہ صدف سے جڑا سبزی بناتی ساویہ پر نظر پڑیں۔

جسے اس کی شکایت کر رہا تھا۔ صدف مسکرا دیں۔ ”تمہارے بھلے کے لیے ہی تو کہہ رہی ہے بیٹا۔“ اس واقعے کے بعد سے صدف نے بھی دل صاف کر لیا تھا۔ نرس کا انداز بدلا تو انہوں نے بھی ساتھ لب و لہجہ اپنا لیا کہ ان کے دل میں تو پہلے بھی کوئی کدورت نہیں تھی۔

”ہاں آپ نے بھی بیٹی کا ساتھ دینا ہے۔“ اس نے منہ چھلایا۔

”تو یہ ہے مجھے معاف رکھو۔ میں جا رہی ہوں وضو کرنے۔ تم دونوں خود ہی لڑتے رہو۔“ صدف خود کو صاف بھاکر وضو کرنے چل دیں۔ سبزی بن گئی تھی، وہ لو کر کئی اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

”خالما! چائے ہی پلا دو۔“ وہ بھی کچن میں آ دھکا۔ ساویہ نے کچن کے فرنیچر کے اندر جھانکا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اس نے بنانا فیک بنایا تھا۔ گلاس

”تعلق سات سال کا ہو یا سات ماہ کا۔ خسارہ نادان عورت کے حصے میں ہی آتا ہے۔ مرد کچھ میں جا کے مانگتا ہے اور پھر اسی عورت کو بازار کی رونق بنا دیتا ہے۔ لیکن اب دل کی دلہیز سے محبت کو رخصت کر دیا میں نے کہ جب تم اصلی مرد ثابت نہ کر سکے خود کو تو تمہاری رنگ بدلتی محبت کا اعتبار کیا۔ خاص مرد کے لیے کردار کو داغ دار کیا، وہی عام نکلا اور عام مرد کی میری زندگی میں کوئی جگہ نہیں۔“ وہ آج بھی ان لفظوں کو یاد کر کے یوں بلک بلک کے رو رہی تھی، جیسے یہ کل کی بات ہو۔ شیرید محبت ہو یا شیرید نفرت، دونوں ہی غلط ہیں۔ جنون بھی سکھ نہیں دیتا اور محبت کا جنوں جب سر چڑھ کے بولتا ہے تو انسان بدحواس ہو کر وہ کچھ کر جاتا ہے جو شاید وہ بھی حواس میں رہ کر نہیں کر پائے۔ کبھی وہ الفاظ زبان سے محبت کے مارے کے منہ سے نہ نکلیں جو غصے کی حالت میں نکل جائیں۔ ہاں وہ دیوانی ہی تو تھی۔ مانگ تھی جو غصے کے پیچھے پیچھے جذبات کو نہ دیکھ سکی۔ بس غصیلے لفظوں کی آگ کے شعلوں میں دھڑا دھڑا جل کر سب فراموش کر گئی اور اپنا نقصان کر گئی اور اب اس نقصان میں اسے ساری عمر گزارنا تھا۔ اس خسارے کا ایک اک بل اس نے خود خریدنا تھا اور اب وہ ساری عمر روٹی بھی رہتی تو بھی اس کا خسارہ گھٹتا نہیں، بڑھتا ہی جاتا۔ اس نے ایسی سلاخوں میں خود کو جکڑ رکھا تھا جہاں سے رہائی ممکن نہیں تھی۔ اس نے جان بوجھ کر

میں انڈیل کر اس نے شیک کا گلاس اس کے قریب شلیف پہ رکھ دیا۔ وہ شیک کا گلاس دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑا۔ ”اب چائے کے نقصانات اور شیک کے فوائد ہی بتا دو۔“ اس نے جیسے اس کی خاموشی پہ چوٹ کی۔ اسے بولنے پہ اکسایا۔

”نہیں بولتی۔“ اس نے نروٹھے پن سے

جواب دیا۔

”کیوں؟“ جرح ہوئی۔

”میری باتیں پھر تمہیں طبی مشورہ ہی لگیں گی۔“

”ضروری ہے کہ مرلیضانہ باتیں ہی ہوں کچھ اور باتیں بھی ہو سکتی ہیں۔“ اس نے جیسے وحیان ولایا۔

وہ جتانے لگی، وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔

”مثلاً کیسی باتیں؟“ وہ مطلوب مسالے کا جار ڈھونڈ رہی تھی مصروف انداز میں پوچھ بیٹھی۔ اس کے انداز کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرایا۔

”پیار بھری باتیں۔“ جابر لگی تھی جو ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے چئی۔ وہ ایک دم سے بلس کر کے لب دانتوں تلے دبائی۔

”شکل دیکھی ہے اپنی۔“ مسکراہٹ چھپانے کو وہ اک دم سے رخ پھیر گئی تھی۔

”تمہاری آنکھوں میں اکثر دیکھی ہے اور ساری زندگی دیکھنے کی خواہش ہے۔“ ذرا جھک کر اس کے دائیں کان کے قریب اس نے جیسے سرگوشی کی تھی۔ وہ اس صورت حال سے بری طرح ہٹا گئی۔

”ہٹو پرے بہت بدتمیز ہو تم۔“ وہ دد قدم آگے بڑھی تھی۔

”دیے میں نے اک تجزیہ کیا ہے۔“ شیک کے گلاس اٹھا کر لبوں سے لگاتے اس نے جیسے بات شروع کی۔ ”کیسا تجزیہ۔“ وہ الٹے ہاتھ سے شیک کا

گلاس اٹھائے گھونٹ بھر رہا تھا۔ نفی میں سر ہلاتے ساویہ نے بے ساختہ کہا۔

”سیدھے ہاتھ سے پیو۔ سب شیطان کے

پیٹ میں جا رہا ہے۔“ وہ دائیں شولڈر کی طرف اشارہ کر کے بے چارگی سے کندھے اچکا کر مجبوری ظاہر کر گیا۔ ساویہ کو بھی اس کے بینڈیج کا وہیان آیا تو اس نے آگے بڑھ کر گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر اس کے لبوں سے لگا دیا۔ ادیز یوسف کی آنکھوں کی روشنی مزید بڑھ گئی، اتنی محبت پہ۔ اس نے شیک کا خالی گلاس شلیف پہ رکھ دیا۔

”بولو نا کیسا تجزیہ۔“ اس کی سوئی دیں انکی ہوئی تھی۔

”مجھے لگتا تھا، میں تم سے بہت شدید محبت کرتا ہوں، لیکن ایسا ہے نہیں۔“ وہ اپنی بات کہہ کر اک ٹاپے کو رکھا تھا۔ وہ استفہامیہ بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم مجھ سے کہیں زیادہ شدید محبت کرتی ہو مجھ سے۔“ بے حد جونی۔“ اس نے مزید کہا۔ ساویہ کو اختلاف کا کوئی پہلو نظر نہیں آیا تھا تو اقرار کا بھی۔

”یہ الہام کب ہوا تمہیں۔“ فردٹ باسکٹ سے سیب اٹھا کر اسے دھو کر اب وہ قاشیں کانٹنے لگی تھی۔

”بس ہو گیا۔“

”میں اتفاق نہیں کرتی۔“ ادیز اپنے بچتے ہوئے سیل فون کی طرف متوجہ ہوا، جس نے ماحول میں ارتعاش سربرا کر دیا تھا۔

”کس نے یا کر لیا۔ اس وقت۔“ وہ سیل فون جیب سے نکالتا بڑبڑانے لگا۔

”کون ہے؟“ سیب کی قاش اس کے منہ میں ڈالتی وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی اور اسے پوچھتے احساس نہ ہوا کہ اس کا لہجہ کتنا ہٹکی ہو گیا۔

”کوئی نامعلوم نمبر ہے۔“ اسکرین پہ نظر ڈالتے اس نے سچ گوش گزار کیا، اس وقت تک کال کٹ گئی۔

”چلو جی چھٹی۔ تمہاری اسکول والی حرکتیں گئیں نہیں نہ ابھی تک۔“ وہ تھکی چوتھوں سے گھور رہی تھی۔

خاندان بھر میں ساویہ اور اویز کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ بچی تک بھی یہ بات پہنچی تو وہ اک پل کو خاموش ہو گئے۔ اگلے پل انہوں نے اویز کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس کی رضائیں راضی ہیں۔ زکس بھی خاموش تھیں۔ شاید وہ اویز کی ایکسیڈنٹ کے بعد سے چپ سی ہوئی تھیں۔ شاید وہ اس کی دیوانگی کو بھانپ چکی تھیں کہ وہ خود کو بھی نقصان پہنچانے سے روک نہیں کرے گا۔

وہ ساویہ کے لیے کتنا جنونی تھا، یہ ان پہ کھل گیا تھا۔ وہ ساویہ کے پاس ہی تھا، جب اس کے نمبر ماما کی کال آنے لگی۔ اس نے پک کر لی کہ شاید کوئی کام ہو، لیکن جب دوسری طرف سے ماما کی بیٹی رشا کی آواز آئی تو اسے کچھ حیرانی ہوئی۔

”کیسے ہو اویز؟“ وہ بہت لگاؤ سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔ یہ ماما کا نمبر ہے نا۔“ وہ کنفرم کرنا چاہ رہا تھا۔ ساویہ کل کے پیچھے کے لیے پوائنٹ لکھ رہی تھی، لیکن اس کا سارا دھیان اس کی گفتگو کی طرف تھا۔

”ہاں ماما کا ہی ہے۔ اپنے نمبر سے کئی بار کال کی، لیکن تم اٹھاتے ہی نہیں، تو آج ماما کے نمبر سے ٹرائی کیا اور تم سے بات ہو رہی ہے۔“ وہ بہت لگاؤ سے کہہ رہی تھی۔ اس کی کہتی آواز قریب بیٹھی ساویہ کی سماعت بھی سن رہی تھی۔

کوئی خاص بات کرنی تھی۔“ اویز جلدی سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا۔

”ہاں..... اگر تم بڑی ہو تو میں بعد میں کال کر لیتی ہوں۔“ دوسری طرف سے خیال کر کے آپشن دیا گیا۔

نہیں، تم کرو۔“ اویز نے اک نظر ساویہ کے چہرے پر ڈالی جو خود کو لاپرواہا کر رہی تھی۔

”سنا ہے تم ساویہ سے شادی کر رہے ہو اور اس

”نہیں یار..... اتنی بے اعتباری؟“

”تم بتی سم لو، جس کا نمبر صرف میرے پاس

ہو۔“ اس نے دھوکس سے کہا۔

”او کے اور کوئی حکم۔“ وہ شوخی سے شرارتی

مسکراہٹ لیبوں پہ سجائے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ وہ منہ بتا کے روئی۔

”میری زلیخا! یہ تیری شدت محبت مجھے مزید

پاگل کر دے گی۔“ وہ بے ساختہ کہہ کر اس کی شدت کا

اسے احساس دلایا گیا تھا۔ ساویہ کے لیے بھی یہ احساس

نیا تھا کہ وہ اس کے لیے جنونی ہو رہی تھی۔ حالانکہ

جنونی تو اس کی نظر میں وہ تھا۔

☆☆☆

”اب میں تجھ سے تیری محبت نہیں مانگوں گی۔

تو انسان ہے۔ خودی کے نشے میں دھت ہے۔ تکبر

کے لبادے میں گم ہے۔ اب میں اس بارگاہ میں اپیل

کروں گی، جہاں تیری نہیں چلتی۔ جہاں سے تو مجھے

دھککا نہیں سکتا۔ تیرا مغرور گھر وندا وہی اٹھیرے گا۔

محبت کا فیصلہ کرنے والے اگر تو میرا نصیب ہے تو، کتنا

ہی بھاگ لے تھک ہار کے تو نے یہیں آنا ہے۔ تیری

بڑی بڑی باتیں۔ اک دن تجھے خود جکڑ کرے بس

کر دیں گی۔ تب تیرے پاس کوئی راہ فرار نہیں ہوگی۔

تجھے ندامت ہوگی۔“

لفظ ہمارے قیدی ہوتے ہیں، لیکن جب لبوں

سے نکل جائیں تو ہم اس کے قیدی ہو جاتے ہیں۔ وہ

بھی اک عرصہ سے لفظوں کی قید میں سانس لے رہی

تھی۔ لفظوں کی دو وہاری تلوار جکڑ کو کاٹ رہی تھی۔

دوسرے پہ کیا وار خالی جائے تو انسان یوں ہی تملتا تا

رہ جاتا ہے اور جب خود کو مفتوح پاتا ہے تو خود ہی بلبلاتا

جاتا ہے۔ وہ بھی اک عرصہ سے بلبلاتا رہی تھی۔ تڑپ

رہی تھی، سسک رہی تھی، اپنی ہی عدالت میں خود کو

مجرم ٹھہرا کر سزا بھی خود ہی بھگت رہی تھی۔ یہ سزا کب

تک تھی، وہ لاعلم تھی۔ سزا ختم بھی ہوئی تھی یا نہیں، وہ

اس سے بھی لاعلم تھی۔

سے محبت کرتے ہو۔“ اویز یوسف جو بے توجہی سے اس کی گفتگو سن رہا تھا۔ سادوہ کے ذکر پر الارٹ ہو گیا۔ وہ بھی اپنا نام سن کر مزید کانٹشس ہو گئی۔
 ”ٹھیک سنا ہے۔“ اویز یوسف نے ہلکے جھپکتے اقرار کر لیا۔
 ”بہت محبت کرتے ہو اس سے؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
 ”ہاں.....“

”اور جو میں بچپن سے تم سے محبت کرتی چلی آ رہی ہوں، اس کا کیا؟“ وہاں سے جیسے کوئی بم پھوڑا گیا۔ اویز چونکا ضرور، مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ہاں مگر سادوہ کا دل جل کے خاکستر ہو گیا۔ ”بھپھو (نرس) نے ہمیشہ سے مجھے کہا کہ یہ میرے اویز کی دلہن بنے گی اور میں نے ہمیشہ سے تمہارے سنے دیکھے اور اب تم خود سے بڑی عورت کے لیے مجھے ٹھکرا رہے ہو۔“ چار سالہ بوائی کا طعنہ جیسے سادوہ کے لیے گالی بن گیا تھا۔ اس کا چہرہ پیکا پڑ گیا۔ اویز یوسف کے چہرے کا رنگ بھی پھٹیر ہو گیا۔

”شٹ اپ رشتا نہ مجھے تم سے محبت ہے، نہ میں ماما کی کسی بات کا جواب دینے کا پابند ہوں۔ تمہیں جو گلے شکوے کرنے ہیں ماما سے کرو۔ نہ مجھے تم سے محبت ہے نہ ہی یہ جاننے میں کوئی دلچسپی کہ تم کب سے اور کیوں مجھ سے محبت کر رہی ہو۔“ اپنی بات سنی سے کہہ کر اس نے کال کاٹ دی تھی۔ چند سیکنڈز کے بعد کال دوبارہ آنے لگی تو سادوہ دھواں دھواں چہرے کے ساتھ چھت کو جانی میڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ جلتی اسکرین کو اس نے ٹیٹس سے دیکھا تھا، اس کا حساب بعد میں بے باق کرنے کے ارادے سے اس نے سیل فون سوچ آف کر دیا۔ اور بے ساختہ میڑھیوں کی طرف قدم بڑھا دیے۔ تار سے کپڑے اتارتی خود کو معروف ظاہر کرتی وہ اٹنے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔ ملتینا رشتا کے لفظوں نے اس کے دل کو ٹھیس پہنچائی تھی۔
 ”اک اسٹوپڈ کی بات یہ تم رو کر خود پہ ظلم

کر دو گی۔“ وہ تاریک دوسری طرف سے کپڑے سر کا کر اس کے سامنے آ گیا۔

”میں اپنی قسمت پہ آنسو بہا رہی ہوں۔ کیا ضرورت تھی کہ ہمیں خود سے چار سالہ بڑی کزن سے محبت ہوتی اور تمہاری محبت مجھے بھی محبت کرنے پہ مجبور کر دیتی اور اگر ہوتی ہی تھی ہمیں محبت تو کیا یہ ضروری تھا کہ میں تم سے پہلے دنیا میں آ کر لوگوں کے طعنہ سنی۔“ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ ملتینا ہر طرف سے یہ جملہ سن سن کر دل برداشتہ ہو گئی تھی۔

ہم بہت بڑھ گئے کبھی کبھی کچھ معاملوں میں شاید کبھی ہاشور نہیں ہو سکتے تھے۔ جیسے ہمارے معاشرے میں مرد سے بڑی عمر کی لڑکی سے شادی کو بچوں معیوب سمجھا جاتا تھا، جیسے خدانا خواستہ کوئی فیج فعل ہو۔ حالانکہ اسلام کی واضح مثال حضرت خدیجہ اور پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اسلام اور اس کی مثالوں کو اپنے مفاد کے لیے بطور وحال استعمال کرنے والے لوگوں میں سے ہیں۔

سادوہ نے اک عرصہ تک اپنے جذیوں کی نفی صرف اک اسی فرق کی وجہ سے کی تھی اور شاید تا عمر کسی کو اس کے جذیوں کی خبر نہ ہوئی، اگر جو اویز یوسف نے اپنی زندگی کو داؤ پہ نہ لگا دیا ہوتا۔ چار سال عمر کا فرق اس کے حلق کا وہ کاٹنا بن گیا تھا جو کسی طور نگلا نہیں جا رہا تھا۔ بھلا جذبات عمروں کا فرق دیکھتے ہیں۔ ”کوئی کچھ بھی کہے، جب مجھے فرق نہیں پڑتا تو تم کیوں اپ سیٹ ہو رہی ہو۔“ اویز یوسف اسے تادیر سمجھا تا رہا تھا۔ اس کا موڈ ٹھیک کرنا رہا تھا۔ بظاہر اس کے اصرار پر اس نے موڈ ٹھیک کر لیا تھا، مگر اندر جو آگ لگ گئی تھی، وہ بجھ نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

”اویز اتم سے کچھ بات کرنی تھی۔“ وہ گھر میں داخل ہوا تو نرس نے اسے دیکھتے ہی آواز دی۔
 ”آپ نے ممانی جان سے کب اور کیوں رشتا کے لیے بات کی تھی۔“ وہ بھی ان سے بات کرنا ہی

چاہتا تھا، ایسے میں جب انہوں نے صدا لگائی تو وہ بنا کسی تاثر کے سوال کر گیا۔ "نرس! اک لمحے کے لیے اسے دیکھتی رہیں۔ وہ ہم نظر آ رہا تھا۔"

"ہاں بیٹا اچھے اتنا بھی حق کہاں ہے کہ میں کوئی فیصلہ کر سکوں۔" نرس کا چہرہ ہل بھر میں ملول ہو گیا۔ اوپن یوسف کو اپنے کڑے لہجے پر اک ہلکے لیے ندامت ہوئی تو وہ صوفے پر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا مام، لیکن آپ کو ممانی اور رشتا سے کوئی بھی بات کرنے سے پہلے مجھ سے تو پوچھ لیتا چاہیے تھا۔" اس نے نرم لہجہ کر کے شکایت کی۔

"کب پوچھتی تھ سے، جب رشتا میری گود میں آئی تو تم اس وقت دو سال کے تھے۔ مجھے اتنی بھائی کہ میں نے ہل بھر میں سب کو کہہ دیا کہ رشتا میری اوپن کی دلہن بنے گی اور پھر بڑے ہونے کے بعد بھی میں بھابھی اور رشتا کے سامنے یہ ہی بالا چوتی رہی، اگر جو خیر ہو جاتی پہلے کہ تم ساویہ سے....." نرس بولتے بولتے اک دم دنگی ہو گئیں۔ وہ چپ چاپ انہیں سن رہا تھا۔

"کہہ دیا ہے میں نے بھابھی اور رشتا سے، مار لیں مجھے جو تم اور معاف کر دیں۔ بھابھی کا دل بڑا ہے، وہ تو چپ کر گئی، مگر رشتا نے رو، رو کر اپنا حشر کر لیا ہے۔ اس کی اک ہی خد ہے کہ وہ تم سے ہی شادی کرے گی۔"

"فار کا ڈسک مام! آپ جانتی ہیں میں ساویہ کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کر سکتا۔ تم کہیں آپ اس بکھیرے کو۔ ممانی کو کہیں، لیکن اور شادی کر دیں رشتا کی، میرا انتظار نہ کریں۔" اس نے دو ٹوک لہجے میں اپنا فیصلہ شاد دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ نرس چند لمحے کچھ سوچتی رہی تھیں۔

☆☆☆

لچ نامم میں وہ جلد ہی آفس سے فری ہو گیا تو بے ساختہ کالج کے باہر آ کر اس کا ویٹ کرنے لگا۔

کالج آف ہوئے ہی لڑکے لڑکیاں نکل رہے تھے۔ آہستہ آہستہ رش کم ہونے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے کھڑا ہو کر اس کی آواز کا انتظار کرنے لگا۔

"باری بچہ کیا مست آئی ہے۔" لڑکوں کا ٹولہ آپس میں گفتگو کرتے گزر رہا تھا۔ جب اک لڑکے نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

"نہیں بار، بھلے مست ہے، مگر جو بات مس ساویہ کی ہے وہ کسی میں نہیں۔ پریوں جیسی حسین ہیں، جب چلتی ہیں تو قیامت ڈھا دیتی ہیں۔" اوپن یوسف بے دھیانی میں ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ساویہ کے نام پر اس کی ہر حس متوجہ ہو گئی۔ وہ بیٹنا سیکڑا ہر کے لڑکے تھے۔ جو تھے تو اسٹوڈنٹ، مگر جنہیں فی میل بچہ کی عزت کرنی نہیں آتی تھی۔ وہ یوں بچہ کے حسن کی تعریف سر راہ کر رہے تھے، جیسے کوئی اٹھائی کیر کرتا ہے۔ لچ ہی ہے کہ اب اساتذہ کی عزت خواب بن کے رہ گئی تھی۔

"ہاں یہ تو ہے۔" بھلے والے نے بھی حامی بھری۔ اوپن کی گفتگوں لچ کی تھیں۔ شدید پیش میں وہ ان کی طرف بڑھا تھا۔

"تم یہاں۔" اس کے بے حد قریب ساویہ کی آواز آئی تو اس نے گردن کھما کر اسے دیکھا۔ مسکراتی ہوئی وہ استہکامیہ بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اوپن نے دوبارہ گردن کھما کر ان لڑکوں کو دیکھنا چاہا، مگر وہ ڈرائی وی میں نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ اس نے پورا محوم کر دیکھا، مگر اسنے لڑکوں کی پشت میں انہیں پہچاننا مشکل تھا۔

"کسی کو ڈھونڈ رہے ہو۔" ساویہ نے اس کے انداز پر پوچھا۔

"آؤ کھر ڈراپ کر دوں۔" اس نے فرنٹ ڈور کھول کر اسے پیٹنے کا اشارہ کیا۔ اس کے پیٹنے کے بعد ڈور بند کر کے ڈرائیو تک سیٹ پر آ گیا۔

"لچ نامم میں آ دارہ گردی ہو رہی ہے۔" "ہاں، لچ تمہارے ساتھ کرنے کا سوڈ تھا۔ اس لیے چلا آیا۔" اس نے ویسی آواز میں کہا۔

”موڈ آف ہے؟“ سادیہ نے اسے بخور دیکھا۔ اس کے چہرے پہ بلا کی سنجیدگی تھی۔
 ”نہیں ٹھیک ہے۔“ اس نے ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی روکی تھی۔ اسے اترنے کا اشارہ کر کے وہ بھی اتر آیا تھا۔ سادیہ اس کے انداز کا بخور جائزہ لے رہی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ ایسے تاثرات کم ہی اس کے چہرے پہ نظر آتے تھے۔ وہ خاموشی سے سچ کر رہا تھا۔

”کیا بات ہے اویز! ایسے کیوں ہو رہے ہو۔“
 سادیہ سے رہائش نہیں گیا تو پوچھ بیٹھی۔
 ”تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو۔“ فورک ہاتھ میں پکڑے وہ اچانک اس سے سوال کر گیا۔ سادیہ اک بلبل کو حیران رہ گئی۔

”جس طرح سمندر کے پانی کی کبھی کوئی پیمائش نہیں کر سکتا، اتنی ہی محبت ہے تم سے۔“ وہ حیران تو تھی، مگر ساتھ ہی دل کی بات بھی کہہ گئی۔ اویز جیسے کچھ سوچ رہا تھا۔

”تم کالج چھوڑ دو۔“ اویز نے اسے بخور دیکھتے ہوئے جیسے دھماکا کیا۔ ”لیکن کیوں؟“ سادیہ کے لیے اچھے کی بات تھی۔ وہ بے طرح چونک گئی۔
 ”بس میں نہیں چاہتا کہ اب تم پیچھا رہا رہے ہو۔“ اس کا انداز قطعی تھا۔

”لیکن اویز! میں ماسٹرز کے فوراً بعد سے پڑھا رہی ہوں، اب تو کئی سال ہو گئے۔ اچھی چل رہی ہے، مجھے کوئی ایٹو نہیں ہے، پھر.....“ سادیہ کو اس کی ڈیمانڈ کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ تھوڑا پریشان بھی ہو گئی۔

”بس مجھے ایٹو ہے نا۔ اس لیے کہہ رہا ہوں۔“
 اس کا انداز قطعی اور دو ٹوک ہو گیا۔
 ”لیکن وجہ بھی تو ہوتا چلے۔“ سادیہ کو اس کا انداز ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

”وجہ جاننا چاہتی ہو تو سنو، جن اسٹوڈنٹس کو تم پڑھاتی ہو وہ تمہارے پیچھے اتنی چیب کمٹ کرتے ہیں کہ.....“ اویز یوسف کی آواز تیز ہوئی، تو اس نے

لب پیچ کر جیسے اپنی آواز اور اپنے غصے کو کنٹرول کیا۔
 ”میں برداشت نہیں کر سکتا کہ میری ہونے والی بیوی کے متعلق لوگ ایسی چیب باتیں کریں اور میں کھڑا انہیں دیکھتا رہوں، اگر نکل نہ جاتے تو حشر کر دیتا دونوں کا۔“ اویز یوسف کا غصہ بے برا حال تھا۔ سادیہ کو اس کے غصے کی وجہ تو سمجھ آ گئی، مگر اس کا تقاضا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔

”اگر کوئی اخلاقی اعتبار سے گراؤٹ کا شکار ہے تو اس کے ڈر سے میں کیوں اپنی سالوں کی پیچھا رہا شپ چھوڑ دوں۔“ سادیہ کو اعتراض ہوا۔

”میں جو کہہ رہا ہوں، کبھی محبت ہے تمہاری کہ تم اتنا نہیں کر سکتیں میرے لیے۔“ وہ اسے بخور دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت ضدی بچہ لگ رہا تھا، جو ہر حال میں اپنی بات منوانا چاہتا تھا۔

”تم سے محبت اپنی جگہ اویز، لیکن تمہاری ڈیمانڈ نا جائز ہے۔“ وہ کوئی کم عمر الٹ میارن نہیں تھی جو بنا چوں و چرا کیے اس کی مان لیتی۔ پیچورڈ سوچ کی حامل درس و تدریس سے وابستگی رکھتی تھی۔ اپنے حق و دفاع میں بولنا جانتی تھی۔

”اوکے، یعنی تمہاری نظر میں میری بات کی رتی برابر اہمیت نہیں، تمہیں اپنی فیلڈ عزیز ہے۔“ اسے جیسے دکھ ہوا تھا۔

”تم محبت کے نام پہ بلیک میل کیوں کر رہے ہو۔“ سادیہ اسے سمجھانا چاہتی تھی۔

”بس مجھے جواب مل گیا۔ جان گیا ہوں تمہاری نظر میں میری کیا اوقات ہے۔“ وہ سخت طیش میں آچکا تھا۔

”لویز!“ سادیہ نے جیسے اسے جذباتی ہونے سے روکنے کی ناکام کوشش کی۔

”بس..... بات ختم ہو گئی۔ اٹھو گھر ڈراپ کر دوں تمہیں۔“ وہ حلاوت سے ہاتھ اٹھا کر خود بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ سادیہ کو بھی بلا کا غصہ آیا تھا۔ لیکن وہ لب پیچ کر چپ چاپ اٹھ گئی تھی۔ بل کے پیسے رکھ کر اویز بھی نکل آیا تھا۔ سارا راستہ خاموشی رہی تھی۔

دونوں میں سے کسی نے بات نہیں کی تھی۔ ادیز اپنی جگہ ناراض تھا کہ سادیہ نے اس کی بات نہیں مانی تو سادیہ کو بھی اس کا تقاضا غصہ دلا گیا تھا۔

☆☆☆

بلیس کے دوسرے نمبر والے بیٹے کی شادی کا شور اچانک اٹھا تھا۔ بلیس نے آنا فانا دونوں بھائیوں اور باقی رشتے داروں کو کارڈ بھیج کر جلد سے جلد پہنچنے کی تاکید کی۔ بلیس نے بھابیوں کے میکے تک میں کارڈ بھیجے تھے۔ نیکی اور نذیر صاحب نے تو یہی طے کیا کہ وہ شادی سے اک دن پہلے آئیں گے۔ سادیہ کو بھی گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے آزادی تھی۔ ایسے میں سب نے ہی حویلی جانے کا پلان بنالیا۔ ادیز کی کار میں نرگس، صدف اور سادیہ تھیں۔ ادیز ڈرائیو کر رہا تھا۔ نرگس فرنٹ سیٹ پر جبکہ صدف اور سادیہ بیک سیٹ پر براجمان تھیں۔ ادیز یوسف نے اسے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ ہر بار لڑائی پہ وہ لعلق کا مظاہرہ کرتا تھا۔ بولی چال بند کر دیتا تھا۔ تاوقتیکہ ناراضی نہ ختم ہو جاتی۔ ہر بار سادیہ ہی پہل کر لی تھی اور وہ تھوڑی سی حیل حجت کے بعد مان جاتا تھا، لیکن اب کے اک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ گزشتہ واقعے کے بعد سے دونوں میں بات چیت بند تھی۔ دونوں ہی اپنی اپنی ضد پہ اڑے ہوئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح سادیہ نے دواک بار کال کر کے بات کرنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ کال کاٹ دیتا تھا۔ ایسے میں جب نرگس کی ہدایت یہ گاڑی رکی تو سادیہ بے زاری سے ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔ لیکن جب رشنا نکل کر آئی تو اسے دھیان آیا گاڑی اس کے کھر کے آگے رکی تھی۔

”رشنا تم یہاں بیٹھ جاؤ، میں پیچھے چلی جاتی ہوں۔“ نرگس فرنٹ سیٹ خالی کر کے تیزی سے نیچے اتر آئیں۔ لہرائی، بل کھانی رشنا خوشبو میں بسی فرنٹ سیٹ پر آکر براجمان ہو گئی۔

”السلام علیکم؟“ رشنا نے خوش اخلاقی دکھائی چاہی۔ ”وعلیکم السلام خوش رہو؟“ صدف نے نرگس کے لیے

جگہ پیتا تے ہوئے کہا۔ نرگس کی یہ حرکت سب کو محسوس ہوئی تھی۔ سادیہ کا دل جل کے خاک ہو گیا۔

”ادیز یوسف پہ اک تیز نظر ڈال کر اس نے غصے سے چہرہ کھڑکی کی طرف پھیر لیا۔

”بھابی تو جا نہیں رہیں، طبیعت ٹھیک نہیں ان کی، اس لیے میں نے رشنا کو ساتھ لے لیا کہ نیکی کا دل بھل جائے گا۔“ نرگس، صدف سے گویا تھیں۔

ادیز یوسف نے بیک ویو مرر سے اس کے غصے سے سرخ چہرے کو دیکھا تھا۔ رشنا کی آمد سے وہ بھی لاعلم تھا۔ نرگس نے رکنے کا کہا تو اسے یہ ہی لگا کہ انہیں کوئی کام ہوگا ممانی سے، مگر رشنا کی آمد اور پھر نرگس کا سیٹ چھوڑ کر پیچھے چلے جانا۔ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ وہ کچھ نہ بول سکا۔ اگر ناراضی نہ ہوتی تو شاید وہ رشنا کو اپنے ساتھ بیٹھنے ہی نہ دیتا۔ لیکن اب جس طرح سادیہ سلگ رہی تھی یہ دیکھ کر دل کو سکون مل رہا تھا۔ اس کی جلن پہ محبت سے ناراض دل کو ٹھنڈی پھوار محسوس ہو رہی تھی۔

”ادیز کوئی ڈھنگ کا سوگ ہی لگا دو۔ کم از کم سفر تو خوش گوار ہو۔ لاؤ میں لگاؤں۔“ رشنا خود ہی کہتی سی ڈی لگا لگی۔

خود کو میں یوں کھودوں کہ پھر نہ کبھی پاؤں ہو لے ہو لے زندگی کو اب تیرے حوالے کروں

صنم صنم..... صنم رے

تو میرا صنم ہوا رے

دلفریب رونا ننگ سوگ لگا کر وہ انجوائے کرنے لگی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ تحریک رہی تھی، گاڑی میں بیٹھی بیٹھی۔ سادیہ کا جی جاہادہ اک سیکنڈ کی بھی دیر کے بنا گاڑی سے اتر جائے۔ آنکھوں میں بار بار پانی آ رہا تھا، جسے وہ غیر محسوس طریقے سے دوپٹے سے خشک کر رہی تھی۔ چند فٹ کے فاصلے پہ وہ جسے لا پرواہ بے حس سمجھ بیٹھی تھی، وہ بار بار اپنی نگاہ سے اس کی بے قراری کا جائزہ لے رہا تھا۔

☆☆☆

ہے۔ ”نہ چاہتے تھے یہی اس کے منہ سے نکال
گیا۔ اوپز یوسف کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔
”اتنی محبت کرتی ہو مجھ سے کہ رشنا سے مجلس
ہونے لگیں۔“ اس نے چپے چڑا کر مزالیا۔
”کوئی نہیں کرتی، میں تم سے محبت، سمجھے تم۔“
وہ جلا اٹھی۔ شدت جذبات سے آواز گلے میں گھٹ
گئی، آسو بہنے لگے۔ اوپز یوسف نے بہت محبت
سے اس کے گلے کو دیکھا تھا۔ جانتا تھا وہ گل سے سلگ
رئی ہوگی۔

”اتنی بڑھی لکھی اور سمجھ دار لکھرار اور ایسی
حرکت، چہ چہ۔“ اس نے جیسے اس کی ہچکا کر حرکت پہ
تاسف کیا۔

”محبت بے خودی کا سبق ہے اوپز یوسف۔
عاقل و بالغ، شعور و بے شعور نہیں دیکھتا۔ عقل، سمجھ
یو جو محبت کے آگے اپڑیاں رگڑتی ہیں۔ بنا سوچے
سمجھے عشق کی جلتی بجلی میں خود کو جھونک دینے کا
مطلب آپ نہیں سمجھو گے۔“ سادیہ کو اس کی بات
آگ لگا گئی تو ترخ کے بولی۔

ہاں اتنی محبت ہے تو اک ہفتے سے ناراض
ہوں، مٹا نہیں سکتی تھیں۔“ اس نے جیسے کلائی پہ دباؤ
پڑھا کر غصہ دکھایا۔

”چار سو بیچ کر چکی ہوں، اک کا بھی جواب دیا
تم نے؟ سو سے زائد کالز میں، اک بھی ریسیو کی، کیا
چاند یہ چاکے منائی تھیں۔“ وہ الٹا براہم ہو کر پاؤ
دلانے لگی۔ وہ جب ناراض ہوتا تھا، اس کی حالت
رو، رو کر دگر گول ہو جاتی تھی، مگر وہ غصے کا اتنا تیز تھا
کہ جب تک غصہ نہیں اترتا تھا وہ بات نہیں کرتا تھا۔
خاموشی سے اپنی ڈیزھ اپنٹ کی مسجد بنا کر بیٹھ جاتا
تھا۔

”ہاں تو غصہ تھا۔ تم نے میری بات جو نہیں
مانی۔“ وہ خود کو حق بجانب سمجھ رہا تھا۔

”تو ابھی کیوں بات کر رہے ہو، جاؤ تمہاری
رشنا تمہیں ڈھونڈ رہی ہوگی۔ بہت محبت کرتی ہے تم
سے۔“

وہ سب طویل سفر کے بعد سمجھے ہمارے حویلی
پہنچے تو سب نے ان کا بھرپور استقبال کیا۔ ان کی
خوب خاطر تواضع کی گئی۔ رات دیر تک ڈھونڈ کا رنگ
چھاپا رہا۔ بالیس کا چھوٹا بیٹا حمزہ، سادیہ کو عرصہ بعد دیکھ
کر ساکت رہ گیا تھا۔

”میں کیا اوپز ایہ ماموں کی کڑی تو بڑی سوتی
ہوتی جا رہی ہے۔“ اوپز یوسف پردوں میں ہی بیٹھا
تھا۔ حمزہ سے اس کی اچھی دوستی تھی۔ ایسے میں حمزہ
نے جب سادیہ کے بارے میں کہا تو اوپز کے جیسے
آگ لگ گئی۔

”زبان سنجال کر بات کر، ہونے والی بھابھی
ہے تیری۔“ اوپز یوسف نے اک سیکنڈ کی دیر کے پتا
اسے سختی سے تنبیہ کی۔ حمزہ اس کے انداز پاک پل کو
ٹھنکا۔

”اچھا..... ابھی ہوئی تو نہیں۔ میں فرانی
کر لوں۔“ حمزہ نے شوشی سے کہا۔ مگر اوپز یوسف کا
غصے سے دکھتا چہرہ دیکھ کر جھٹ ہاتھ جوڑ گیا۔

”اوپار، مذاق کر رہا تھا۔ خبر اتنی سی حویلی میں
کہ تو باگل ہے اس کے پیچھے۔“ حمزہ نے جیسے اپنی
جان چھڑائی۔ اوپز کو اب اس شور و میل سے ابھرن
ہونے لگی تھی۔ یہاں آ کر تو وہ اور بھی نظروں سے
اوجھل ہوئی تھی۔ لیکن حمزہ کی بات سن کر اس کا دل
اجاٹ ہو گیا تھا۔ اس کا بس چلنا تو وہ سادیہ کو لے کر
فورا وہیں شہر چلا جاتا۔ وہ کافی دیر سے اسے ڈھونڈ رہا
تھا۔ جب ہی وہ اسے جگن میں نظر آئی۔ کشمیری چائے
کے لیے ڈرائی فروٹ کاٹ رہی تھی۔ اس وقت جگن
میں سناٹا تھا۔ وہ اکیلا تھی۔ اوپز یوسف جگن کے
دردازے سے فیک لگائے خاموشی سے اسے دیکھ رہا
تھا۔ اتنے ذلیل ہے وہ اس سے ناراض تھا۔ نبل رہا تھا،
نہ بات ہو رہی تھی۔ اب اسے دیکھ کر دل اک دم بے
قابو ہو رہا تھا۔ نیلے رنگ کے سوٹ میں وہ اتنی مصحوم
لگ رہی تھی کہ اس کی نگاہ نہیں ہٹ رہی تھی۔
”یہاں کیوں آئے ہو۔ جاؤ اپنی لگتی سکتی رشنا
کو ٹائم دو۔ جو کل سے تمہارے ساتھ چپکی ہوئی

”ہاں یہ تو ہے، کل بتا یا اس نے مجھے۔“ شوفی سے اس کا لالہ بھجوا کا چہرے کو دیکھتے اس نے چیخے جلتی پہ پیٹرول ڈالا۔ ساویہ ہنڑک اٹھی۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے، ورنہ یہ تھری تمہارے سینے پہ اتار دوں گی۔“ اس وقت وہ محبت کی ماری اک الہر دوشیزہ لگ رہی تھی جو رقابت کی اکٹن میں جل جل کے بھسم ہو رہی تھی۔ اوین یوسف کو اس کا جنوں نہال کر گیا تھا۔ اوین یوسف نے اسے شانوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کیا۔

”میری لیلیا اچھا نا اب غصہ چھوڑ دو۔ مجھے کسی رشتا وشنا کی ضرورت نہیں، اس سے بس تھوڑی سی بات کر لی کہ تمہیں ستاؤں بس اور کچھ نہیں۔ تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتی، آئی مجھ۔ لاکھ..... دس لاکھ رشتا بھی آجائیں۔“ وہ چپ چاپ آنسو بہا رہی تھی۔ اوین کا دل گداز ہو گیا۔ اسے بے حد پیار آ رہا تھا اس پر۔ پھر نہ لڑنے اور ناراض نہ ہونے کے وعدے وعید ہو رہے تھے۔ جو ہر دونوں میں ٹوٹ بھی جاتے تھے۔ پھر دونوں نے مل کے شیریں چائے بنا لی تھی۔

”تم مردانے میں زیادہ نہ آنا اور خصوصاً حمزہ سے دوری رکھو۔“ وہ اسے تنبیہ کرتا نہ بھولا۔ ”کیوں۔“ وہ حیران ہوتے ہوئے سوال کر بیٹھی۔ جواب میں وہ اسے گھورنے لگا۔

”اک تو تمہارے سوال ختم نہیں ہوتے، بس بول دیا تو عمل کرو۔“ اس کے جرح پہ وہ چڑھنے لگا۔ ”میں کیوں کروں..... تم رشتا کو ٹائم دو، میں حمزہ سے مل کے آئی ہوں۔ کیا بات کرنی ہے اسے۔“ ساویہ نے بھی جلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے وہ چکن سے لگنے بھی لگی تھی۔ اوین نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے روپر کیا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں اپنی سحر آ نکھیں گاڑ کر دیکھنے سے بولا۔

”میری گاڑی میں پہل موجود ہے۔ اک گولی تمہارے پیچھے میں اتاروں گا، دوسری اپنے، آئی

سمجھ۔“ لہجے میں سختی تھی۔ اس کی شہادت کی اٹلی ساویہ کی پیشانی سے ٹکی ہوئی تھی۔ اسے اس کے انداز پہ لسی آ گئی۔ ان دونوں کا مسئلہ یہ تھا کہ دونوں ہی جذباتی اور غصیلے تھے۔ دونوں ہی جنون کی حد تک اک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ دونوں ہی اک دوپے کے بتارہ نہیں سکتے تھے۔

☆☆☆

وہ چار ہائیوں پہ بستر سیٹ کر رہی تھی کہ رات گئے تک سب ہلا گلا کر کے پڑ ہی سوتے تھے۔ یہ سارے کام حویلی کی عورتیں ہی مل کے کرتی تھیں، لیکن چونکہ پچیس کی کوئی بیٹی نہیں تھی، تو صرف بڑی بہو صبا ہی تھی ہولی تھی۔ لیکن ساویہ کے آجانے سے صبا کی ہڈی میں تھوڑی ہوا لگی تھی۔ جس کا اس نے برملا اظہار بھی کیا تھا۔

”الف تو یہ سب کی وقت ہے وقت کی جانے، کافی، لسی کھانے کی ڈیمانڈ نے مجھ اکیلی کی تو سمجھو منت ہی مار رہی تھی۔ جب سے تم آئی ہو تم نے کتنی ہی ذمہ داری اپنے سر لے لی، حالانکہ دو، دو ملازمہ بھی رکھی ہیں، مگر توبہ، اتنے مہمانوں کی فرمائشیں پوری کرنا آسان تھوڑی ہے۔ شکر ہے تم آ گئیں اور تم بھی آ کر مہمان بن کر ہر وقت میک اپ کرنے اور ڈانس گانے میں نہیں لگی ہو۔“ صبا اس کی تعریف کرتے دیکر لڑکیوں کی طرف بھی اشارہ کر گئی۔

”بے فکر رہیں بھابھی، شادی تک آپ کے ساتھ ہوں۔“ اس نے بھرپور یقین دلایا تھا۔ اس وقت بھی وہ سب کے لیے بستر لگا رہی تھی۔ جب اس کی نظروں کے عین سامنے آ کر طرح داری رشتا بیٹھ گئی۔ ساویہ نے اک نظر اس کے سچے سنورے روپ کو دیکھا اور پھر سے اپنے کام میں لگ گئی۔ رشتا بخور اسے دیکھ رہی تھی۔

”ساویہ آئی ا“ رشتا نے آئی۔ زور دے کر گفتگو کا آغاز کیا۔ ساویہ کچھ بولی نہیں جس نظر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ غالباً اس سے بات کرنے کے موڈ سے ہی آئی تھی۔ ”میں اوین سے بہت محبت کرتی ہوں

وہ بھی انجوائے کرتی، مگر یہ سب سن کر رشنا نے جتنا کڑوا منہ بنایا تھا، اس سے سادوہ کو ابھمن ہونے لگی تھی۔ وہ خود کو بہت غیر محفوظ محسوس کرنے لگی تھی۔ اسے اپنے محسوسات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اندر جلن بھی شدید تھی۔ جب بھی رشنا کو کوئی اور اویز کا نام بھی لیتا تو وہ غصے سے بے قابو ہونے لگتی تھی۔ مصروفیت کی بنا پر اویز ٹائم نہ دے پاتا تو وہ رو، رو کر آنکھیں سجا لیتی۔ محبت سے زیادہ اس کے اندر محبت کو کھونے کا ڈر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور اس ڈر پہ مہر لگاتے تھے روز رشنا جیسے لوگ، جن سے کسی کی خوشیاں برداشت نہیں ہوتی تھیں۔ چاہتی تو وہ بھی رشنا کو جواب دے سکتی تھی۔ مگر وہ اس طرح کی غیر منجیدہ فطرت نہیں رکھتی تھی۔ تب ہی چپ چاپ بچن میں آ گئی۔ پین میں دو دھ ڈال کر اس نے کافی کا جبار نکالا تھا۔

”اویز کے لیے کافی میں بناؤں گی۔ آخر کو مستقبل میں مجھے ہی اس کے کام کرنے ہیں۔“ اس کے ہاتھ سے کافی کا جارا چمک کر رشنا نے کہا۔ سادوہ نے اک نظر اس کی اوچی حرکت پر ڈالی اور سب کے لیے چائے بنانے لگی۔ وہ جتنی دیر چائے بناتی رہی اتنی دیر میں رشنا کافی بنا کر چلی بھی گئی۔ سادوہ کا ضبط جواب دے گیا۔ اس کی آنکھ سے پانی بہنے لگا۔ کس ویدے سے رشنا، اویز یوسف پہ حق جتا گئی تھی اور ایسا اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک اسے نرس کی سپورٹ نا حاصل ہوتی۔ وہ اسے ساتھ لائی ہی اسی مقصد سے تھیں کہ اویز اس کی طرف سے رخ پھیر لے۔ وہ کھلے عام مخالفت جو نہیں کر سکتی تھیں۔

”میں نے بھابھی سے پیغام بھیجا تھا کافی کے لیے، تم نے کیوں نہیں بنائی۔“ اویز کافی سے بھر انگ شیلٹ پر رکھ کر اس سے استفسار کر رہا تھا۔

”اویز! سادوہ آبی بڑی تھیں تو انہوں نے مجھے کہہ دیا، بنانے کو بس۔“ اس کے پیچھے رشنا بھی بھاگی بھاگی داخل ہوئی۔ سادوہ اس کی غلط بیانی پہ اسے دیکھنے لگی۔ تھینا کافی کا گھونٹ بھرتے ہی اویز سمجھ گیا تھا کہ کافی اس کے ہاتھ کی نہیں ہے۔

بہتر ہوگا، آپ پیچھے ہٹ جائیں۔ آپ کو شرم نہیں آئی خود سے چار سالہ چھوٹے لڑکے کو پھنساتے ہوئے۔ اگر آپ کو کم عمر ہم سفر کی تلاش تھی تو میرے خیال سے یہ آپ کے لیے کون سا مشکل کام ہوگا۔“ رشنا نے اپنے لہجے کی کڑواہٹ اس پہ اٹھیلنا شروع کر دی تھی۔ چار سالہ فرق سادوہ کو اک بار پھر چابک کی طرح لگا تھا۔ ”میں بچپن سے اویز سے محبت کر رہی ہوں اور پھپھو (نرس) کا کہنا ہے میں ہی ان کی بہو بنوں گی۔ سو آپ کے لیے بہتر یہ ہی ہوگا کہ اپنے بڑھتے قدم روک لیں۔ بالفرض اویز نے آپ سے شادی کر بھی لی تو کل کو بڑھی کہہ کر آپ سے بے زار بھی ہو سکتا ہے۔“

رشنا نے اتنی جلدی مستقبل کا نقشہ کھینچا کہ اک بل کو سادوہ سانس بھی نہ لے سکی۔ چار سالہ عمروں کا فرق ہر کوئی جتا جتا کر اسے احساس کمتری میں ڈال گیا تھا۔ اس کے جنون کی اک وجہ یہ ڈر بھی تھا کہ اگر جو اویز اس کا نہ ہو سکا؟ وہ محبت میں اس حد تک آ گئے بڑھ گئی تھی کہ شاید اویز بھی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اویز یوسف کے مقابلے میں اس کی محبت میں زیادہ جنون تھا۔

”سادوہ! بھی تمہارے لیے پیغام آیا ہے کہ کافی کی نیڈ ہے۔“ اس سے پہلے کہ وہ رشنا کو کچھ کہتی۔ شاید وہ کچھ کہنے کے لائق ہی نہیں تھی۔ صبا پیغام لے کر آئی تھی، اس کے چہرے پہ معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر سادوہ سمجھ گئی کہ یہ فرمائش اویز کی طرف سے بطور خاص اس کے لیے آئی ہے۔

”میں ابھی بنا دیتی ہوں۔“ اس نے ہولے سے مسکراتے ہوئے کیا۔

”خود دے بھی آنا، کافی کا لطف دو بالا ہو جائے گا۔ پینے والے کے لیے“ صبا آنکھ دیا پتی چلی گئی تھی۔ خاندان بھر میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اویز سادوہ سے ہی شادی کرے گا۔ خود وہ ہر کسی کو میری ہونے والی بیوی کہہ کر ہی متعارف کرواتا تھا۔ اپنے تئیں صبا سے چھیڑ کر گئی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو

”میں تم سے بات نہیں کر رہا رشتا۔ میں نے سوال سنا دیا یہ سے کیا ہے۔“ اویز نے گردن موڑ کر قدرے ترخ کر رشتا کو کہا۔

”میں بتا رہی تھی، لیکن رشتا نے کافی کا جار مجھ سے لے کر کہا کہ یہ کافی بنا نہیں گی، کیونکہ مستقبل میں انہوں نے ہی تمہارے کام کرنے ہیں۔“ سادیہ کو غصہ تھا، تب ہی اس نے من و عنان اس کا جملہ گوش گزار کر دیا۔

”دوہری گلد! سادیہ سحر، رشتا بی بی نے کہا اور تم نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ کل کو کوئی مجھے تم سے مانگنے آئے تو طشت میں سجا کر اسے میرا وجود پیش کر دیتا۔ کوئی مزاحمت، کوئی جرح نہ کرنا۔“ اویز یوسف تلخ لہجے میں تاسف سے کہہ رہا تھا۔ سادیہ کو بھی احساس ہوا کہ وہ بلاوجہ رشتا کے سامنے چپ ہے تب ہی اس کی بدتمیزیاں بڑھ رہی تھیں۔

”اور رشتا بی بی! آپ کو کس نجوی نے مشورہ دیا، میری ضروریات کا خیال رکھنے کا؟ کافی میں صرف سادیہ کے ہاتھ کی پیتا ہوں، ورنہ نہیں پیتا اور اگر آپ کو اب بھی کوئی خوش گمانی ہے کہ مستقبل قریب میں آپ نے میرے کام کرنے ہیں تو اسے کسی کنویں میں پھینک آئیں۔ مجھے آپ سے کوئی وابستگی نہیں ہے، نہ ہوگی۔“ اور یوسف کا رخ رشتا کی طرف ہو گیا۔ وہ جو اس کی ذرا سی التفات کو محبت سمجھنے لگی تھی، بری طرح توہین پہ تعلقا کہ سادیہ پہ اک قہر بھری نظر ڈال کر پھر پختی یکن سے چلی گئی۔ یقیناً اس کا رخ نرس کی طرف ہی ہوتا تھا۔

”دوسری کافی بنا دوں۔“ سادیہ نے اس کے غصیلے چہرے کی طرف دیکھا۔

”ضرورت نہیں ہے، اپنا کام کرو۔“ وہ یکن سے نکل گیا تھا۔ یقیناً وہ خفا ہو چکا تھا اور اسے ہونا بھی چاہیے تھا۔ وہ اس کے لیے ساری دنیا سے لڑ جاتا تھا اور وہ اس کے لیے ہی بول نہیں پارتی تھی۔ سادیہ نے ترچھی نظروں سے اس کے اٹھتے قدموں کو دیکھا تھا۔ وہ حوبلی کے پیچھے حصے کی طرف چلا گیا تھا۔ جہاں

صرف پھولوں اور پھولوں کے پیر تھے۔ رات کے وقت یہ حصہ قدرے سنیان ہوتا تھا۔ اکثریت چھتوں یا کمروں میں پائی جاتی تھی۔ سادیہ کافی لے کر آئی تو وہ ماربل کے شیخ پہ بیٹھا ہوا تھا۔ کافی کگ شیخ پہ رکھ کر وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ چند ٹائیے دونوں کے مابین خاموشی طاری رہی۔ سادیہ نے ڈرتے ڈرتے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ لائق بنا بیٹھا تھا۔ جیسے اس کے وجود سے ہی انجان تھا۔

”ناراض ہو؟ جواب نہ دار تھا۔“

”اویز تم سے پوچھ رہی ہوں۔ ناراض ہو۔“ جواب نہ پا کر اب کے اس نے اس کا بازو ہلایا۔

”تو کیا نہیں ہونا چاہیے؟“ گردن موڑ کر وہ الٹا ہی سے پوچھنے لگا۔

”ہاں تم اپنی جگہ درست ہو۔ میری غلطی ہے کہ مجھے رشتا کو روکنا چاہیے تھا، لیکن جانے کیوں جب کوئی ہمارے متعلق کسی قسم کی بات کرتا ہے تو میں کچھ بول نہیں پاتی۔ اس گھڑی مجھے لگتا ہے کہ میرا سارا اعتماد کھینچ گیا ہے۔“ اس نے اپنی دلی کیفیت شیر کر لی۔

”بہت خوب اک کالج لیکچرار اس قسم کی بات کر رہی ہے جو فصاحت و بلاغت رکھتی ہے۔ تم سے اچھی تو پھر رشتا بی بی ہوئیں جس نے بالکل دس جماعتیں پڑھی ہیں اور میرے ساتھ کوئی محبت نامی شے کے نہ ہوتے ہوئے بھی دھڑلے سے تمہارے سامنے مجھے اپنا کہہ گئی۔“ اویز نے جیسے استہزائیہ انداز میں غصہ نکالا۔

”ہاں مجھ سے اچھی ہے وہ، تو جاؤ اسی کے پاس“ الٹا ہی اثر ہوا۔ سادیہ بھڑک کر شیخ سے اٹھنے لگی۔ اویز نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روکا۔

”صرف مجھے ہی غصہ دکھانا آتا ہے تمہیں۔“ زمانے بھر کی باتیں سنائی ہو، ذرا سے شک پہ میری نسلوں کو رگید ویتی ہو۔ مردوں کی شان میں زمین آسمان اک کر دیتی ہو۔ مجھے دو کوڑی کا کرنے میں

دیر نہیں لگائیں۔ باقی سب کے سامنے تو سانپ سونگھ جاتا ہے نا۔“ اوپر کو ابھی تک اس کے نہ بولنے کا قلع ققا، جس کا اظہار کر رہا تھا۔

”اسے چاہی کی سپورٹ حاصل ہے، تب ہی وہ اتنا اثر دیتی ہے۔“ ساویہ نے احساس دلایا کہ پس پردہ اس کی ماں ہے۔ جس کے لیے وہ کچھ غلط نہیں بول سکتی تھی۔

”پس پردہ بھلے کوئی ہو، تمہیں اتنا تو اعتبار ہونا چاہیے کہ میں صرف تمہارا ہوں۔ نہ کہ تم مجھے دان کرو۔“ اس کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

”وان کب کیا؟“ جرح کی۔

”اس نے ہاتھ سے کافی کا جار لے لیا۔ میرے لیے چکن میں کڑی ہو کر کافی بنائی رہی اور آپ یہ سارے سین ملاحظہ کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ خراماں خراماں گ اٹھائے مجھے کافی دیئے بھی آگئی اور آپ چپ رہیں۔“ سارا نقشہ کھینچنے پر ساویہ کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”مسمومیت، سخت زہر لگ رہی ہو اس وقت۔ بہت غصہ ہے تم پر۔“ اوپر یوسف نے ٹھکی سے منہ بھلا کے کہا۔ اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

”ایسا کیا کروں کہ تمہارا غصہ ختم ہو جائے۔“

ساویہ نے اسی سے پوچھا۔

”اتنی رونا ٹھک جگہ ہے۔ پھولوں کی خوشبو ہے، تمہاری ہے۔ باقی بھی میں بتاؤں؟“ اوپر کے اک دم سے لہجہ بدلے اور احساس دلانے پر ساویہ کو بھی احساس ہوا۔ وہ بہت شرارتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”بہت فضول ہو تم۔“ وہ جلدی سے اپنا منگ اٹھا کر لبوں سے لگائی۔

☆☆☆

”محبت اتنی ضدی ہے کہ ہر انسان کو زندگی میں کبھی نہ کبھی جت کر کے۔ اپنا آپ منواتی ہے۔ خواہ عمر کا کوئی بھی حصہ ہو، یہ اتنی ہٹ دھرم ہے کہ جب تک محبت کی لٹی کرنے والے سے اقرار نہ کروالے۔

تب تک اس کے اگر درد مند لائق رہتی ہے اور جب محبت کرنے والا اس کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے تو یہی ہی محبت اسے ذلیل و خوار بھی کرتی ہے، رلاتی بھی ہے، سکاٹی بھی ہے۔ محبت کر کے بہت کم لوگ خوش رہے ہیں، دیکھو نہ محبت کرنے والوں کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ کب کون کسی کو ملا؟ محبت نے سب کو آسوی دان کیے۔ تم میری بہت اچھی بیٹی ہو۔ جب میں نے پہلی بار تمہارا وجود اپنی کونکھ میں محسوس کیا تو میں کتنی خوش ہوئی تھی۔ یہ لفظوں میں بتا نہیں سکتی۔ میری آٹھ سالوں کی مراد تمہاری صورت پوری ہونے والی تھی۔ پھر جب تمہیں پہلی بار اسی طرح میرے چلو میں لٹایا گیا تو میں ساری رات تمہیں چومتی رہی تھی۔ تم میری بہت اچھی بیٹی بنی رہیں۔ پڑھائی، حسن، کردار تم نے کسی مقام پر مجھے شرمندہ نہیں کیا۔ پانچ سال بعد خاندان میں آنے والی تم پہلی لڑکی تھیں۔ سب کچھ صحیح چل رہا تھا، لیکن اچانک اوپر سے تمہاری محبت..... اس محبت نے تمہیں سب کے سامنے تماشہ بنا دیا۔ نہ صرف تمہارا بلکہ میرا اور تمہارے بابا کا بھی..... زکس کی دل جلی بائیں، طھر، ہنسی..... وہ رشنا کو جس طرح ساتھ لگائے کھوم رہی ہے۔ سب اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ کسی طور تمہیں اپنی بہو نہیں بنانا چاہتی، بس اوپر کی وجہ سے چپ ہے۔ لیکن میں اپنی اکلوتی بیٹی کی تذلیل نہیں دیکھ سکتی۔ لوگوں کی باتیں نہیں سمجھ سکتی کہ میری بیٹی نے کم عمر لڑکے کو چھاس لیا۔ ہمارے معاشرے میں مرد بھلے چندہ سال بڑا ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اگر لڑکی غلطی سے سال بھر میں ہوتی ہے اس کے لیے بدناما داغ بن جاتا ہے۔ لوگ منہ بھر کر باتیں کرتے ہیں۔ لڑکی کے کردار پر انگلی اٹھاتے ہیں۔ جب اسلام اور اس کی مثالیں کسی کو یاد دلانے پر بھی یاد نہیں آتیں۔ اس سے پہلے کہ یہ محبت تمہارا مزید تماشہ لگا دے، میں نے اور تمہارے بابا نے فیصلہ کیا ہے کہ آج نماز جمعہ کے بعد تمہارا نکاح حمزہ سے کر دیا جائے، حمزہ کی بھی خواہش ہے اور آپا

”ایز اوپر ہے۔ اس نے بلایا تھا۔ آنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے منا کر نیچے آ رہی تھی۔ ساویہ آئی! اویز بھلے آپ کے سامنے محبت کا دھوا کرتا ہے لیکن پچھو (نرس) آپ سے سخت نفرت کرتی ہیں۔ اویز اب مجھ سے بھی لائق نہیں رہا ہے۔ اسے میری محبت کی قدر آگئی ہے۔ وہ آپ سے صرف اس لیے شادی کرے گا کہ آپ اس کی وجہ سے خاندان بھر میں بدنام ہوگئی ہیں۔ اس بدنامی اور بڑھتی عمر کے ساتھ آپ کو کون پوچھے گا۔ اس نے کہا ہے وہ پہلے مجھ سے شادی کرے گا، بعد میں آپ سے..... آپ جا چیں تو جا کر پوچھ لیں اس سے۔“

رشا جیسے دھماکے پہ دھماکا کیے جارہی تھی۔ ساویہ صدف کی باتوں سے پہلے ہی غم مردہ ہوگئی تھی۔ رشا کی باتیں اسے زندہ درگور کر گئیں۔ اگر اویز نے رشا یا نرس سے کوئی وعدہ کیا تھا تو اسے کیوں لاعلم رکھا تھا؟ اسے کیوں دھوکا دے رہا تھا؟

”میں تو جارہی ہوں اب سونے، ساری رات جاگتی رہی ہوں۔“ رشا عجیب سی ہنس کر اس کے سامنے سے چلی گئی۔ وہ کئی لمحے اپنی جگہ سے مل بھی نہ سکی۔ رشا کے لفظوں کا اثر تھا یا اس کے دل کی بے کلی، اس کے قدم بے ساختہ محبت کو جاتی بیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اسے یقین تھا رشا جھوٹ بول رہی ہے۔ اویز کو رات مردانے میں سونے کے لیے جاتے اس نے خود دیکھا تھا۔ پھر وہ محبت پہ کیسے آیا؟

وہ اپنا شک دور کرنے کو گئی تھی۔ اسے محبت پہ کوئی نظر نہ آیا تو اسے رشا کے جھوٹ پہ غصہ آئے۔ لگا۔ وہ پلٹ کر بیڑھیاں طے کرنی لگی تھی۔ جب کہنے میں جا رہی تھی لیٹا اسے کوئی وجود نظر آیا۔ وہ لہو پھول ہو گیا تھا۔ اپنا شک دور کرنے کو وہ ذرا احتیاط سے آگے گئی تھی۔ لیکن اس پہ جیروں کے پہاڑ ٹوٹ چڑے۔ وہ اویز یوسف ہی تھا۔ وہ ذرا اور آگے گئی تو اسے اس کی بنیان پہ سرخ دجے نظر آئے۔ دھڑکتے دل سے اس کے قدم چار پانی تک جا رہے

(بقیہ) کی بھی۔ نکاح یہاں اس لیے کر رہے ہیں کہ سارا خاندان گاؤں والے جمع ہیں اور سب ہی دیکھ لیں گے کہ نرس کی بات میں کتنی سچائی ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ تم سے پوچھنا کیا ہے، اب دیکھنا ہے کہ تم اچھی محبوبہ بنتی ہو یا اچھی بیٹی۔“ وہ صدف کے پہلو میں آکر لیٹی تو صدف نے بنا اسے مخاطب کیے بولنا شروع کر دیا اور ان کا لفظ لفظ بغور سنتی ساویہ جیسے ساکت ہوگئی۔ اس کے لب جیسے بولنا بھول گئے۔ صدف اپنی بات کہہ کر خاموش ہوگئی تھیں۔ شاید انہیں بھی بیٹی کی حالت کا اندازہ تھا۔ اس کے درد کا احساس تھا تو اپنے بے رحم فیصلے کا بھی، لیکن وہ دل کے ہاتھوں بیٹی کا تماشا نہیں لگا سکتی تھیں۔ رات ساویہ پہ پڑی ہماری تھی۔ نکلے آنسوؤں سے بھجک رہا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ آواظِ حلق میں گھوٹا پڑ رہی تھی۔ محبت عورت کے لیے اک امتحان گاہ ہے۔

☆☆☆

عشق واجب تھا ہم پر جو ہم نے کر ڈالا وفا فرض ہے ان پر دیکھیے کیا کرتے ہیں مجھ کی اذان سے پہلے ہی اس نے بستر چھوڑ دیا تھا۔ رات بھر نرم بستر اسے سویوں کی طرح چھتا رہا تھا۔ سورج نکلنے والا تھا۔ نیا سورج اس کے لیے کیا پیغام لانے والا تھا، وہ بے خبر تھی۔ صدف نے بھلے اس پہ فیصلہ چھوڑ دیا تھا، مگر وہ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔ اسے تو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ یہ سب سن کر اویز کیاری ایکٹ کرے گا۔ وہ چائنا ڈھونڈ رہی تھی، شب ہی محبت کی بیڑھیاں اترتی رشا کو دیکھ کر وہ کسی قدر چوٹ لگی۔ وہ اتنی اتنی رازداری سے رہی تھی۔ اسے اچانک سامنے دیکھ کر رشا جیسے ڈر سی گئی۔

”آپ ہیں ساویہ آپ آئی تو بہ میں تو ڈر گئی۔ کسی نے دیکھ لیا ہوتا تو..... تماشا بن جاتا، تو بہ۔“ رشا ہنسی۔ اس وقت بھی یک مسک سے تیار لب اسٹک میک اپ میں گھوم رہی تھی۔ ساویہ کو حیران ہوئی۔ ”کیا دیکھ لیتا کوئی؟“ ساویہ نے محبت کو جاتی بیڑھیاں کو بغور دیکھا۔ انداز میں حد درجہ حیران تھی۔

تھے۔ مرید آنے پہ وہ دھبے واضح ہو گئے تھے۔ جو سفید بنیان پہ جا بہ جانظر آرہے تھے۔ وہ اک دم سے لڑکھرائی گئی۔ تو کیا زشتیج کہہ رہی تھی؟ ادیز نے اسے دھوکا دیا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح باقاعدہ اس کی بنیان کو چھو کر دیکھ رہی تھی۔ تب ہی ادیز کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ خود یہ جھکے وجود کو دیکھ کر اک بل کو حیران ہوا، مگر سادیہ کو دیکھ کر جیسے اس کی حیرت دو چنڈ ہو گئی۔

”تم..... اس وقت یہاں؟“ وہ اک ساتھ کئی سوال کر گیا۔

”تمہیں کیا لگا تھا، تم اپنی عیاشیوں میں لگے رہو گے اور مجھے خبر نہ ہوگی۔“ سادیہ کے لہجے میں زمانے بھر کی نفرت آ گئی تھی۔ ادیز جی نیند سے جاگا تھا۔ ایسے میں اپنی بنیان سادیہ کی کتھی میں بچنے دیکھ کر اس کا غصیلہ جملہ سن کر وہ کسی قدر حیران ہوا۔

”کیا ہوا ہے، کیوں غصہ ہو رہی ہو؟“ وہ جیسے صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں غصہ ہو رہی ہوں۔ تم پہ۔“ وہ ہنسی ”ادیز یوسف تم پہ غصہ تو دور، اب میں تم پہ تھوکتا بھی پسند نہیں کروں گی۔ تم کیا ہو۔ تمہارا کردار کتنا مکروہ ہے، سب کھل گیا مجھ پہ۔“ وہ بے رحمی سے اس کے کردار کی دھجیاں اڑا رہی تھی۔ منہ بھر بھر کر باتیں سنا رہی تھی۔

”کیا بکواس کر رہی ہو سہی؟ ایسا کیا دیکھ لیا تم نے۔“ ادیز یوسف کی آنکھیں چو پٹ ہو گئیں۔ ساری نیند بھاگ گئی۔ اس وقت تو وہ سر پہ کھڑی آگ بگولا ہوتی سادیہ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”دوبارہ میرا نام مت لینا اپنی گندی زبان سے۔“ مجھے ساری زندگی افسوس رہے گا کہ میں نے تم جیسے بد کردار انسان کے لیے خود کو متاثر بنایا۔ تم انتہائی گرے ہوئے انسان ہو۔ مجھ سے پوچھ رہے ہو کیا ہوا؟ تمہاری بنیان تمہاری بد کرداری کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہے۔“ سادیہ کے بنیان کھینچنے پہ وہ بے طرح چونک کر مردن پتی کر کے بنیان کا جائزہ لینے لگا کہ

آخر ایسا کیا ہے، جس پہ سادیہ چراغ پا ہو رہی ہے۔ ”یہ“ وہ اچھل گیا۔ ریڈلپ اسٹک کے جا بہ جا نشان دیکھ کر اس کا چہرہ اک پل کو رنگ بدل گیا، جسے سادیہ نے چوری پکڑے جانے سے تعبیر کیا۔

”کسی تمہاری قسم، مجھے نہیں پتا یہ.....“ ”بکواس مت کرو..... اب میں تمہارے لفظوں میں نہیں آؤں گی۔ جتنا تم جیسے بچ انسان پہ اپنے جذبے لٹائے یہی بہت ہے۔ اب اور نہیں۔ میں حمزہ سے آج نکاح کر رہی ہوں۔ نکال پھینکا ہے، تمہیں اپنی زندگی اور دل سے۔“ وہ جانے کیا، کیا بولی رہی تھی۔ اس کے کردار پہ جی بھر کر باتیں سنا رہی تھی اور جب اچھی طرح بھڑاس نکال چکی تو تیزی سے سیز حیاں اتر گئی۔ ادیز یوسف حیران پریشان سر پکڑ کر رہ گیا تھا۔ یہ کیا کہہ گئی تھی وہ۔

☆☆☆

ایک لخت و چھوڑا اوکھا ہے
چن میڈی من کجھ قسطل کر
نکاح خواں آچکا تھا۔ اس اچانک نکاح پہ حویلی میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ ادیز یوسف دیوانوں کی طرح سادیہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ مگر وہ اسے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی

”تائی جان! یہ سب کیا ہو رہا ہے اچانک۔“ وہ صدف کے کھنٹے تمام کر زمین پہ بیٹھتا چلا گیا۔ آواز بھرا سی گئی تھی۔ صدف نے دھمی نظروں سے اس کے ہارے ہوئے انداز کو دیکھا تھا، پھر نظر چرا گئیں۔

”یہ سادیہ کا فیصلہ ہے۔ میں نے فیصلے کا اختیار اس پہ چھوڑ دیا تھا۔“ یہ سن کر وہ مزید ڈھے گیا۔

جانے کیوں اک خیال سا آیا
ہم نہیں ہوں گے تو کیا کی ہوگی
وہ اس وقت لڑکیوں کے جرمٹ میں بیٹھی تھی۔ مولوی صاحب آنے والے تھے۔ جب ادیز یوسف بنا کسی کا خیال کیے اندر داخل ہو گیا۔

”آپ سب باہر جائیں، مجھے اس سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔“ اس کے سر دلچہ پہ سب ہی

میں چلی گئی۔

رشنا، نرگس کے شانے پہ جھولتی ہنس ہنس کر دہری ہو رہی تھی۔

”ہاں..... اور دیکھو سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی، یعنی ساویہ راستے سے ہٹ گئی اور اس کے سامنے میرا نام تک نہ آیا۔“ نرگس کو بھی بے طرح خوشی تھی۔

”جب اللہ کسی کا پردہ رکھتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے فاش نہیں کر سکتی۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ نے اپنا پردہ رکھا، مگر اللہ نے اسے میرے سامنے فاش کر دیا۔ آپ کی سیاست آپ کی نفرت سب سامنے آ گئی۔“ ادیز یوسف اندھیرے سے نکل کر اچانک سامنے آیا تو رشنا اور نرگس کی شئی کم ہو گئی۔

”میں شہر واپس جا رہا تھا کہ یہاں میری دنیا لٹ گئی۔ چابی بھول گیا تھا، لینے آیا تو خبر ہوئی کہ میرا تو وجود ہی مٹ گیا۔“ وہ بہت دھمی نظروں سے نرگس کو دیکھ رہا تھا۔ شدت کرب سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بھینا اس کا دل بلبلاتا تھا۔ ماں، بچے کے لیے قربانی دیتی ہے، لیکن آپ نے آج اپنی انا، ضد اور نفرت میں اپنے بیٹے کی خوشیاں، دلی سکون اس کی نوعمری کی محبت، اس کے وجود کی قربانی لے لی۔ کچھ دیر نل تک میں ساویہ کے لیے مر چکا تھا۔ اب آپ کے لیے بھی مر گیا۔ آج کے بعد آپ میرا چہرہ نہیں دیکھ پائیں گی، کبھی نہیں۔“ ادیز یوسف لہو رنگ آنکھیں لیے جیسے آیا تھا دیسے ہی چلا گیا۔ نرگس اور رشنا کتنی ہی دیر چپ رہ گئیں۔

☆☆☆

فارغ نہ جایے مجھے، مصروف جنگ ہوں اس چپ سے جو کلام سے آگے نکل گئی ادیز شہر چلا گیا تھا۔ ساویہ سلامتہ انداز میں مہمانوں کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ صدف بار بار اس کا ساٹ چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ نکاح کے بعد سے اس نے اک لفظ منہ سے نہیں نکالا تھا۔ نہ ہی روئی تھی۔ وہ جب اپنا فیصلہ سنانے ان تک آئی تھی تب اس کی

کھٹکتی تھیں۔ آخر میں مبا بھی نکل گئی تو وہ اس کی سنوری قیامت کے قریب آیا۔ جس کے ہر انداز سے سکون بھٹک رہا تھا۔ ادیز یوسف کے دل پہ جیسے بر چھیاں چلنے لگیں۔ ”تو یہ بھی تمہاری محبت..... یہ تھا تمہارا جنون..... میرے کردار پہ بات کر رہی تھیں، خود کا کردار کیا ہے جو اک کی ہوئے نہیں رہ سکیں۔ ایسا کیا ہو گیا، حمزہ اور تمہارے بچ جو نکاح کرنے لگیں راتوں رات اس سے۔ میں بھی رشنا سے شادی کروں گا اور جلد کر کے تمہیں دکھاؤں گا کہ تم میرے بنارہ سکتی ہو تو مجھے بھی تمہاری کوئی پروا نہیں۔ تم سے لاکھ بہتر وہ رشنا ہے۔“ شدید غصے میں اندر کی ساری جھلن کھولن اس کے پرسکون وجود پہ اثر ٹیل رہا تھا۔ زبان بے قابو ہو گئی تھی۔ وہ مہر بہ لب سب سن رہی تھی۔ جب وہ اچھی طرح بھڑاس نکال چکا تو خود پلٹ گیا۔ وہ خاموشی سے مرر کے آگے کھڑی چوہری سیٹ کرتی رہی۔ پھر نکاح خواں آیا اور نکاح بھی ہو گیا۔ رات حمزہ کے بڑے بھائی کی بارات جانی تھی اور اس سے پہلے ہی گھر میں اک اور بیوا آ گئی تھی۔

☆☆☆

بدلا جو وقت گہری رفاقت بدل گئی سورج ڈھلا تو سائے کی صورت بدل گئی اک عمر تک میں اس کی ضرورت بنا رہا پھر یوں ہوا کہ اس کی ضرورت بدل گئی ”واہ پچھو جان! مان گئی آپ کی ذہانت کو۔“ آپ نے واقعی درست کہا تھا، اگر ادیز کو کوئی اس محبت سے منہ موڑنے پہ مجبور کر سکتا ہے تو وہ خود ساویہ ہے، ورنہ دنیا کی کوئی طاقت اسے پیچھے نہیں ہٹا سکتی ہے اور بھلا ہو حمزہ کا، جسے ساویہ اتنی پسند آ گئی کہ اسے اپنانے کے لیے اس نے ہم دونوں کا ساتھ دیا، اگر وہ نہ ہوتا تو میری لب اسٹک لگی بنیان ادیز تک کیسے پہنچتی۔ وہ تو اندھیرے میں حمزہ نے اسے پہننے کو دی تو ادیز کو خشک بھی نہ ہوا کہ اس میں ہماری کوئی سازش ہے جو حمزہ کے کہنے پہ چھت پہ جا کے سو گیا اور بے چاری ساویہ! ادیز کی بیوی بننے کا خواب دل میں لیے حمزہ کے نکاح

دروں حالت دلہ لڑان کا دل بچ گیا تھا۔ اک بلی کو خیال آ یا وہ خود نرگس کے پاؤں پکڑ کر اپنی بیٹی کی خوشیوں کی بھیک مانگیں اوپر یوسف کا ساتھ مانگ لیں۔ مگر وہ اپنی خود دار فطرت نہ سمجھتا نہ کر سکیں۔ بالآخر شادی بھی انجام پا گئی۔ فنی ولہن گھر آ گئی۔ ولیمہ بھی بخیر و خوشی انجام پا گیا۔ مہمان گھروں کو لوٹنے لگے تو صدف اور نرگس نے بھی رخت سرفراہ بنا دیا۔

”آپ لوگ جائیں، اب یہی میرا سسرال ہے۔ میں شہر نہیں جاؤں گی۔“ صدف نے جب ساویہ کو چلنے کی ہدایت کی تو اس کی طرف سے آنے جواب پر سب ہی ساکت رہ گئے۔

”ابھی رخصتی نہیں ہوئی۔ اک سال بعد ہوگی۔“ صدف نے اسے سمجھانا چاہا۔ ”کلاچ ہو گیا، اب میرے لیے رخصتی کوئی معنی نہیں رہتی، ابھی ہوا سال بعد۔ آپ کالج میں فون کر دیجیے گا۔ میرا ریزائن ہے۔“ اس نے دونوں لچے میں کہا۔ پھر سب نے لاکھ سمجھا یا۔ اس کی نہ ہاں میں نہیں بدلی۔

”بہٹی جیت فنی ماں، لیکن محبوبہ میرے اندر ہمیشہ بین کرتی رہے گی۔“ صدف کے گلے لگتے اس کے دل سے ہو کر اٹھی تھی۔ جو فقط اک بھگی کی صورت باہر آئی تھی۔ آنکھیں خشک بغیر ٹھیں، مگر صدف ماں ٹھیں، ان کے دل میں نیزے کی طرح جھگی چھ گئی۔

واپسی کے سفر میں سب اپنی جگہ خاموش تھے۔ صدف نے نرگس سے خود بات نہیں کی تو نرگس بھی خاموشی سے رشنا سے سارا راسخ سردیائی آئی تھیں۔ نذر اور بچی اپنی اپنی جگہ چپ تھے۔ ساویہ کے بغیر صدف کو گھر کا ٹ رہا تھا تو نرگس کے لیے بھی گھر میں داخل ہوتے قیامت منتظر تھی کہ اوپر راتوں رات گاؤں سے دہی اور پھر ہاں سے پو۔ ایس شفٹ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

نہیں گلدنا وقت و چھوڑے وا
بن یار گزرا کون کرے
دنیا توں کنارہ ہو سکدا
یاراں توں کنارہ کون کرے

”تیری وہ بلی مر جائے گی آ کر اک بار دل لے لے“ جانے اس اک چیلے میں کیا کچھ تھا کہ وہ جو بچی نہ لوٹنے کا عزم کر کے گیا تھا، لوٹ آیا۔ ”مجھے معاف کر دے، میں بھی تم دونوں کا محرم ہوں۔ تو دوست تھا۔ لیکن تیرے ساتھ دھوکا کیا۔ نرگس آنٹی نے میری ساویہ میں دیکھی تو مجھے اپنے پلان میں شامل کر لیا کہ تم دونوں کے الگ ہونے سے رشنا تمہیں پابندی اور میں ساویہ کو۔ لیکن پلان کرتے

ہوئے ہم بھول گئے کہ کچھ رشتے روح کے ہوتے ہیں۔ رشتا تو تمہارا نام تک نہ پا سکی اور میں ساویہ کے حقوق اپنے نام کروانے کے باوجود اسے نہ پاسکا۔ تیرے جانے کے بعد وہ یہاں سے بھی واپس نہیں آئی۔ مردوں سے نہیں ملتی کہ تجھے اس کا مردوں سے ملنا پسند نہیں تھا۔

اک دن اماں نے یوں ہی گھر میں رخصتی کر دی۔ اس نے مجھے پہلی رات ہی واضح کر دیا کہ میں اس کا وجود تو حاصل کر سکتا ہوں، مگر محبت، احساس اور روح نہیں۔ مجھے اس کے لفظ ہے روح لگے تھے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کے لفظوں کی مضبوطی کا قائل ہو گیا۔ میں مرد ہوں، اس کا تیرے لیے رونا، سسکنا مجھے جلاتا رہا۔ میں نے کئی بار اس کے ساتھ زبردستی کی، مارا پیٹا، تیرا نام لے کر رونے پر تارچ کیا، مگر اس کے نوحے جب میرے دل کو کھنڈر کرنے لگے تو میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ میں نے وجود تو حاصل کر لیا تھا، مگر اس کے دل کی ویران بستی اپنے نام نہ کر سکا۔ میں نے جلد ہی دوسری شادی کر لی کہ مجھے بھوی چاہیے تھی، کسی کے اجر میں رونے والی زلیخا نہیں۔ وہ آج بھی تیرے لیے روتی ہے۔ تجھے غصے میں کہے لفظ یاد کر کے بین کرتی ہے۔ معافیاں مانگتی ہے۔“

”کہاں ہے وہ؟“ اوپر یوسف پوری داستان سن کر کہنا تو بہت ماجہ چاہ رہا تھا۔ حمزہ کے کپے مظالم پر اسے جنم واصل کرنا چاہتا تھا، مگر اس کے منہ سے نکلنے والا پہلا جملہ اسی کے لیے تھا۔

”حویلی کی کھجلی طرف اک کمرہ ہے، اسی میں جا نماز نہ بھائے رو رہی ہوگی یا نیم کے بیڑ کے سائے میں بیٹھی خود سے باتیں کر رہی ہوگی۔“ حمزہ کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی، اس کے قدم تیزی سے کھجلی سمت کواٹھ گئے تھے۔ دور سے ہی سفید دوپٹے کے ہالے میں وہ نیم کے بیڑ پر اٹلی پھیرتی نظر آتی تھی، اس کے قدم جیسے زمین سے چپک رہے تھے جنہیں وہ بمشکل محسوس رہا تھا۔ وہ اس کے قریب گیا تھا۔ نیم

کی سخت چھال پہ چلتی اس کی اٹلی کو بغور دیکھ رہا تھا اور جب کمر درمی چھال پہ چلتی اس کی انگلیوں کو دھماکان سے دیکھا تو اس کی روح تک جھنجھٹا گئی۔ ”اوپر یوسف“ اٹلی سے وہ بار بار اس کا نام لکھ رہی تھی، جس کی وجہ سے چھال اس کی اٹلی پہ چپک رہی تھی۔ وہ آج بھی اتنی بے رحم نہیں تھی کہ چھری پاسی کمر درمی بیڑ سے بیڑ کے سینے پہ ختم دیتی۔

”مجھے خبر ہے، میں بہت بے وقوف ہوں، اپنے آنسوؤں کو چھالنے کا قریب مجھے آج بھی نہیں آیا۔ حالانکہ اب تو سب روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اب تک تو تمہارے روز، روز تھا ہونے کی ادا پہ مجھے عادی ہو جانا چاہیے تھا، لیکن میں آج بھی یہ دل نہیں کھینچ سکتی ہوں۔ گاہ گاہ تمہیں پکارتی ہوں۔ تمہیں باتوں کی لکیروں میں تمہارا نام ڈھونڈتی ہوں۔ لیکن مجھے کہیں کچھ نہیں ملتا۔ پھر رب نظر آتا ہے اور کچھ نظر نہیں آتا۔“ اس کے لفظ آنسوؤں میں ڈوب اور ابھر رہے تھے۔ اوپر یوسف کا دل جیسے کسی نوک دار پتھر سے چلا جا رہا تھا۔ اتنا حزن، اتنا ملال تھا لہجے میں کہ ساعت سے جیسے درد چپک گیا تھا۔

”سی“ اس نے ہولے سے پکارا تھا۔ اس پکار کے ساتھ ساتھ کد کی جنبش اور سکیوں کی صدا بھی جیسے جبر کی تھی۔ کئی ٹاپے وہ بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے بیٹھی رہی۔ شاید وہ اس پکار کو اپنا واہمہ بھی سمجھتی۔ ”سی“ اس نے دوبارہ پکارا تھا اور وہ اک جھٹکے میں سیدھی ہو گئی تھی۔ بے یقین نظروں اور بے یقین تاثرات تھے۔ اس کا حسین روپ گہنا گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے زرد چہرہ خود پہ نرے شب و روز ماہ و سال کی ایسی داستان بیان کر گیا کہ اوپر یوسف کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ بے ساختہ بیڑ کے بیڑ تلے اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

ساویہ جیسے بنا پلٹیں جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل ایسا ہی تھا، اگر کچھ تبدیلی آئی تھی تو اس کے چہرے پہ، اک ٹھہراؤ، اک سوز کی صورت۔ جن آنکھوں میں غصہ اور شرارت ہمہ وقت رہتی تھی ان

کے لبوں پہ چل گیا۔

”وہ سب تو غصے میں کہا تھا۔ ہاں جتنی شدید محبت ہے تم سے اتنا شدید غصہ بھی تھا تم پہ..... کسی کا سایہ تم پہ برداشت نہیں تھا، لیکن یہ وجہ نہیں تھی، مجھے محبوبہ اور بیٹی میں سے کسی اک کو زندہ رکھنا تھا بس..... اس کی آواز پہ پھر آنسوؤں کا غلبہ طاری ہو گیا۔

”بے رحم لوگ کھا گئے ہماری محبت اور خوشیوں کو۔“ اویز یوسف دیوانوں کی طرح اپنے بال نوچنے لگا۔

”ابھی بھی دیر نہیں ہوئی ہم شادی کر لیں گے۔ حزرہ خود تمہیں طلاق دے گا۔“ اویز یوسف نے اس کے ہاتھ پہ دباؤ بڑھایا۔ ساویہ نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔ ریت کی طرح پھسلنے اس کے ہاتھ پہ دباؤ بڑھاتے ہوئے اویز یوسف کی ہتھیلی میں اس کی شہادت کی انگلی رہ گئی۔

”آج بھی انگلی نہیں چھڑا سکو گی۔“ اویز نے جیسے بچپن یاد دلایا۔ وہ روتے روتے ہنس پڑی۔

”ساتھ رہنا، پیار پانا ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا، لیکن اسے مانگتے رہنا اسے سوچتے رہنا۔ اسے کھوجتے رہنا۔ یہ وہ عشق ہے جو دل کے کونے میں سلگتا رہتا ہے۔ یہ احساس کہ کہیں بھی رہو۔ کتنے دور رہو۔ خیالوں میں سب سے زیادہ تم ہی پاس ہوتے ہو۔“ اس کی ترسی ہوئی آنکھیں اس کا چہرہ نگاہوں میں بھر کر جیسے سیراب ہونے لگی تھیں۔

”بلا نہیں سکتی تھیں مجھے۔“ گلہ اس کے لبوں پہ مچل گیا۔

”بلائی تو اچھی بیٹی کیسے کہلاتی۔“ وہ ہنسنے لگیوں تلے مسکرائی۔ وہ اذیت سے لب چل کے رہ گیا۔

”تم نے شادی کی؟“ اسے دھیان آیا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“ جرح کی۔

”اتنے سال در بدر ای سوال کا جواب ڈھونڈتا رہا، کا تب تقدیر سے مانگتا رہا کہ اس نے تمہارا عشق

میں اک بے غمی، حزن و ملال تھا۔ وہ آج بھی اتنا وجہ تھا۔“ کیسی ہو؟“ بہت درد تھا اس اک چھوٹے سے سوال میں۔ اسے جیسے یقین آ گیا تھا کہ وہ بھائی اپنے ہوش و حواس میں اسے دیکھ رہی ہے، تب ہی اندر گودھنی آنکھوں سے سوئی اس تیزی سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلنے لگی کہ اویز یوسف نے بے ساختہ اس کی آنکھوں پہ اپنی ہتھیلی رکھ دی۔

”مت رواتا۔“ ساویہ نے تیزی سے اس کی ہتھیلی آنکھ پر سے ہٹائی تھی۔

”مت چھپاؤ اپنا چہرہ میری نظروں سے۔ مدتوں دعا کی ہے اس چہرے کو دیکھنے کی۔“ اس کا لفظ لفظ جیسے رورہا تھا۔ پتھر گڑونا تو وہ بھی تھا، مگر وہ تو جیسے اپنا وجود ہی کھوئے بیٹھی تھی۔ اتنا درد تھا، اس کے سچے میں ایسی حسرت بھری نظروں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی کہ وہ اس کے سنگ مٹی میں بیٹھا اپنے آنسو پہ قابو نہ کر سکے۔

”بولو نہ کیسی ہو۔“ ساویہ کا ہاتھ بے ساختہ اس کے بائیں رخسار پہ آٹھمرا تھا۔

”جب تم ساتھ نہیں ہوتے تو یہی دنیا بربادی لگتی ہے، سارے رنگ پھیکے لگتے ہیں خود پہ اختیار کھونے لگتی ہوں۔ تب ہر کوئی روک روک کر پوچھتا ہے۔ ایسی کیوں ہو رہی ہو، اتنی دھمی کیوں ہو؟ رونا کیوں آ رہا ہے۔ تب میرے سامنے لفظ نہیں ہوتے کہ انہیں مطمئن کر سکوں، تب انہیں جھٹلا دیتی ہوں۔ نفی مسکراہٹ اونچی ہنسی سے درد چھپا لیتی ہوں اور اب جب تم ساتھ ہو تو مجھے کسی کو جواب دینے کی فرصت نہیں کہ میری صبح اور شام تمہارے سنگ جویتی ہے۔ تم ضروری سے ہو میری زندگی کے لیے۔“ وہ واقعی کوئی دیوانی تھی، جس کا لفظ لفظ لوح پڑھ رہا تھا۔ اویز نے بہت محبت سے اپنے گال پہ جو جو اس کا ہاتھ تھا مام کراپے دونوں ہاتھوں میں بھر لیا۔ ”کیوں کیا تم نے نکاح؟ ذرا سی بے اعتباری یہ صرف اک لب اسنگ کے نشان پہ اپنی میری زندگی کو داؤ پہ لگا دیا تم نے۔“

یہ بھی تمہاری محبت۔“ سالوں پہلے کا گلہ اویز یوسف

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

✽ کرتے ہوئے ہالوں کو دکھائے

✽ بے بال ۱۲ سال

✽ ہالوں کو شیواور چھدار ۱۲ سال

✽ مردوں کو ہالوں اور بچوں کے لئے

یکساں مفید

✽ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت - 150/- روپے

سوہنی ہیرائل 12 سال کی لڑکیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری

کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ خودی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں

یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک

پونل کی قیمت صرف 150/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے بھی آڈر بھیج

کر جڑ پازرل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے بھی آڈر اس

حساب سے بھجوائیں۔

2 یونٹوں کے لئے 350/- روپے

3 یونٹوں کے لئے 500/- روپے

6 یونٹوں کے لئے 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگز پ مارکیٹ، سیکٹر فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں

میں حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگز پ مارکیٹ، سیکٹر فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

میرے اندر ڈالا تو نصیب میں کیوں نہیں؟ تب اک رات کشف ہوا کہ تم میرے لیے آخرت میں ہو۔ تم میری وہ زلیخا ہو جو بھلے میرا نصیب یہاں نہ بن سکیں، وہاں جنوگی اور وہاں میں کسی کو ہمارے بیچ نہیں آنے دوں گا۔“ ساویہ کو جہاں اپنا کشف اس کے منہ سے سن کر حیرانی ہوئی وہیں اس کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔

”تم نے کیوں نہ کی پھر محبت، کیوں گھر اور دل نہیں بسایا پھر؟“ اویز یوسف کو پرانی ساویہ کو اس کے چہرے پہ ڈھونڈنے میں بہت دقت پور ہو رہی تھی۔ وہ واقعی اس سے زیادہ جنونی محبت کرتی تھی۔ تب ہی تو کا وجود ہجر میں کھل گیا تھا۔ ساویہ پر درد مسکراہٹ چہرے پہ سجائی۔

قسم لے لو تمہارے بعد

کسی کا خواب دیکھا ہو

کسی کو ہم نے چاہا ہو

کسی کو ہم نے سوچا ہو

کسی کی آرزو کی ہو

کسی کی جستجو کی ہو

کسی کی راہ دیکھی ہو

کسی کا قرب مانگا ہو

کسی کو ساتھ رکھا ہو

کسی سے آس رچی ہو

کوئی امید باندھی ہو

کوئی دل میں اتارا ہو

کوئی تم سے پیارا ہو

کوئی دل میں بسایا ہو

کوئی اپنا بنایا ہو

کوئی روٹھا ہو تو ہم نے

اسے رو، رو منایا ہو

دبیر کی حسین رت میں

کسی کا ہجر جھپٹا ہو

کسی کی یاد کا موسم

میرے آنگن میں کھلا ہو

کسی سے بات کرنے کو

کبھی یہ ہونٹ ترسے ہوں
کبھی کی بے وفائی پر
کبھی یہ نین برسے ہوں
کبھی راتوں کو اٹھ اٹھ کر
خیرے دکھ میں نہ روئے ہوں
خسٹ لے لوتہارے بعد
اک پلی بھی سوئے ہوں
خسٹ لے لوتہارے بعد
کبھی مہتاب دیکھا ہو
خسٹ لے لوتہارے بعد
کبھی کا خواب دیکھا ہو

ادیز یوسف اس کے آنسوؤں میں جسکے لفظ لفظ
دل کو کٹا محسوس کر رہا تھا۔ وہ نگاہیں سب کچھ کہہ گئی
تھی۔ دونوں نظر بھر کر اک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
دو عشق کے مارے ساتھ دور رہے تھے، کبھی
چپ ہو کر باتیں کرنے لگتے، پھر کبھی چپنے لگتے۔ وہ
ان پلوں میں سالوں کی دوری کو سمیٹ لینا چاہتے
تھے۔

”تم لو اپس شہر نہیں گئیں آج تک؟“

”تم جو ہمیں چھوڑ کر گئے تھے۔ امید تھی ایک
دن ہمیں لوٹ کر آؤ گے۔ نہ لی تو پھر کہاں وعودے
پھر دے گے۔“ وہ اس کے زندگی کی رفق سے عاری
چہرے کو دیکھ کر رہ گیا۔

”اتنی محبت کرنی اور مجھ سے؟“ وہ آج بھی
اٹھارہ سنا جاتا تھا۔

”تمہاری سوچ سے کہیں زیادہ۔“ اسے پتا تھا
کیا جواب ہوگا جب ہی مسکرا دیا۔

چلو اٹھو اب اور برداشت نہیں ہوتا۔ ہم بہت
دور چلے جاتیں گے۔“ وہ اس کے ڈھلکتے آنکھوں کو سر
پھاڑنے لگا۔

”دور تو جا رہی ہوں۔“ وہ مجرد انداز سے
مسکرائی تھی، اسے اٹھانے کی کوشش میں وہ ڈر کر اس
کی انگلی پر گرفت مضبوط کر گیا تھا۔

”کیا مطلب..... تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“

”سی“ اس کے چہرے پر پھیلی اذیت دیکھ کر وہ ایک
دم سے پریشان ہو کر اسے پکارنے لگا۔
”پریشان نہ ہو، میں ٹھیک ہوں۔“ اس کی
آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ جنہیں وہ پلٹیں چمک
چمک کر بار بار کھول رہی تھی۔ ادیز یوسف نے اس کا
ڈھلکتے سر کو اپنے بازو کا سہارا دیا۔ ”تم ٹھیک نہیں ہو۔
حزہ گاڑی لگا لو۔“ اس نے اسے کہنے کے بعد چیخ کر
حزہ کو آواز دی تھی۔ حزہ دور سے ہی دو دیوانوں کو
پلٹے آنسو بہاتے دیکھ کر اپنے آنسو صاف کرتے
رب سے معافی کا خواستگار تھا۔ ادیز یوسف کی پکار پر
وہ بے ساختہ گاڑی لٹالنے بھاگا تھا۔ لیکن بہت دیر
ہو چکی تھی۔ اسے برین ہیمرج ہوا تھا۔ ادیز یوسف کی
منگی میں دلی اس کی انگلی سے جان ہو گئی تھی، مگر وہ
دیوانوں کی طرح اس کے زرد چہرے کو دیکھتا رہا تھا،
جس پر اب ایک سکون طاری ہو گیا تھا۔
”انگل! آپ قاتل ہو۔ آپ نے بڑی مہاکو
مار دیا۔ وہ کہتی تھیں میرے قاتل ایک بار آ کر صورت
دکھا دو۔ پھر میرا دم نکل جائے گا۔ تو آپ ہی وہ قاتل
ہو جس کے لیے بڑی مہاکو ماری رہی تھیں۔“ حزہ کا چار
سالہ بیٹا اس سے ٹھکی سے پوچھ رہا تھا اور اس کا چہرہ
دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ ”میرے قاتل مجھے جینے کا
حق تو دو۔“ وہ جب بھی ناراض ہوتا تھا تو وہ یہ جملہ
کہتی تھی، لیکن یہ ہی جملہ اس کی زندگی پہ لاکو ہو گیا کسی
نے اسے جینے کا حق نہیں دیا۔ ”مرد کو محبت کرنے سے
پہلے اپنی ماں سے اجازت لینی چاہیے، تاکہ اس خطا
چلو کی ماں کی عزت مجرد نہ ہو۔“ ادیز یوسف اس
کے کمرے سے اس کی یادیں سیٹھلے آ رہا تھا۔ جب
دیوار پر لکھے اس جملے نے اسے پیشانی دیوار سے
ٹکاکر آنسو بہانے پر مجبور کر دیا۔

☆☆

شبینہ گل

درس کا لٹھ



کے خاندان کو پستوں سے جتنا تھک سمن ٹھوک نکل کر رہا۔

”ماں کہتی ہے مولیٰ کے پتوں کا ساگ بڑا لذیذ بنتا ہے“ کہہ کر اس نے سر جھکا لیا۔ چاچا کرم دین کی آنکھوں میں ترحم ابھرا پھر اس نے قصداً ”لا پروا انداز اپنایا۔

”ٹھیک ہے پتر ماں کو کنارہ دوں گا کل سے۔“ وہ سر اٹھائے بنا اسی طرح اڑیوں پر گھوما اور تیز تیز چلتا گھر آ گیا تھا۔ چاچا کرم دین کی متاسف نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا اور جب وہ نظریں اوجھل ہو گیا تو اپنا رومال جھٹک کر کندھے پر ڈالا اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہا۔

”واہ رے مولا، تیری تو بی جانے۔۔۔ خیرات بانٹنے والے آج خود خیرات پر آگئے۔ ایسی ذلت سے پہلے تو اٹھالے مولا۔“

مسلمان ماں کو بتانا نہیں سکا کہ مولیٰ کے تے آج بھی مل جاتے اگر وہ تھوڑا بے شرم بن جاتا۔ مگر کیسے بن جاتا۔ گھڑی نے دو بجنے کا اعلان کیا اس نے آنتوں کی آہ و زاری پر اپنی انا کو کوسا، قدسیہ نے شلتے شلتے یونی فرنیج کا وروانہ کھولا اور اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ فرنیج کے سبزی والے ڈبے میں ایک بڑے سائز کا آلو بڑا تھا۔ قدسیہ نے کسی ہیرے جواہرات کی طرح اسے ٹٹھکی میں دو چالو باورچی خانے میں بھاگی۔

نہ پیا نہ نمائے۔ بس آلو کے باریک باریک قتلے کانٹے ڈھیر سارا پانی اور نمک مرچ ہلدی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔ تین روٹیوں کا آٹا گندھا بڑا تھا۔ اس کے پیڑے بنائے اور تو اچولہے پر رکھا ہی تھا کہ گلی میں شور سا اٹھا۔ آہ دیکا، جیجی دیکا، گریرہ دیکاری، آوازیں اتنی بلند ہوئیں کہ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر باہر نکلے۔

”یا الہی خیر۔“ گلی کے رخ پر بنے کمرے کی کھڑکی کھول کر اس نے باہر جھانکا۔ سامنے والے گھر کا وروانہ پورا اٹھلا تھا اور گھر کی مالکن بانو دلیپز کھڑی اپنے گال بیت رسی تھیں۔

”کیا ہوا ہے سلیمان؟“

بلا مبالغہ کوئی تیسری بار اس نے ایک ایک ڈبے کو ہلا ہلا کر اور پھر کھول کھول کر دیکھ لیا۔ جب ہلانے پر کوئی آواز نہیں آئی تو صاف ظاہر ہے کہ ڈبا خالی ہے، بجائے پھر ڈھکن کھول کر وہ ڈبے کے اندر کون سا معجزہ تلاش کرنے کے لیے جھانکتی تھی۔ ہر ڈبا یوں کھولتی جیسے پچھلی بار اسے کھولنا بھول گئی ہو۔ وہ قدسیہ کا باورچی خانہ تھا کسی پانچ ستارہ ہوٹل کا نہیں۔ اس میں تو مگن کر آٹھ وں ڈبے ہی دھڑے تھے۔ بس۔ ٹھک ہار کر اس نے ایک بار پھر کونے میں پڑی پیاز کی نوکری سے کپڑا ہٹایا۔ معجزہ وہاں بھی نہ ملا۔ وہ کپڑا واپس سلیقے سے پھیلا کر باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔ سفید پوش عورت کے پاس اس کا سلیقہ ہی واحد خزانہ ہوتا ہے جسے نہ تو وہ بچ سکتی ہے نہ پکا کر بچوں کو کھلا سکتی ہے، ہاں مگر اس سے راز کھولنا تین ضرور ڈھانکا سکتی ہے، سو وہ بھی یہی کر رہی تھی۔

”مسلمان، بیٹا تم نے سبزی والے سے مولیٰ کے پتوں کا کہا تھا۔“ وہ کمرے میں سر نہیو ڈائے بیٹھے اٹھارہ سالہ بیٹے کے پاس آس لیے آئی۔ اس نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

”جی کہا تھا۔ آج تو وہ تے پھینک چکا، کل کا وعدہ کیا ہے کہ رکھوے گا میرے لیے۔“ قدسیہ نے ایک گہری سانس بھری۔

”چلو آج نہ سہی کل کی ہانڈی کی فکر تو دور ہوئی۔“ مولا تیرا شکر۔“ مسلمان اواس نظروں سے ماں کو جاتا دیکھنے لگا۔ بھوک سے سترنی آنتوں کے ساتھ وہ شکر کا کلمہ کیسے بڑھ لیتی تھی، مسلمان کی سمجھ سے باہر تھا۔ سبزی والے نے اس کے سامنے مولیٰ کے تے پتے پھرے کے ڈھیر پر پھینکے تھے مگر وہ اسے روک نہ سکا کیونکہ اس وقت دکان پر بے حد رش تھا۔ وہ درجنوں لوگوں کے بیچ کیسے اپنا پردہ کھول دیتا۔ سب کے چلے جانے کے بعد اس نے سبزی والے سے کہا۔

”چاچا۔۔۔ میری ماں نے کہلایا ہے کہ کل سے مولیٰ کے تے پتے پھرے پر نہ پھینکنا، ہمارے لیے رکھ دینا۔“

چاچا نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ وہ ان

ناگوارو نے اسے حال میں لا چٹا۔

”ہائے میں مر گئی۔“

ماستھے ہاتھ مارنی وہ باورچی خانے کی طرف بھاگی
چوہا بند کیا، بے دھبیان میں گرم ڈھکن کو جو ہاتھ لگا کر
جلد جلائی وہ الگ، جو ایک آلو کی ہنڈیا چلی وہ غم الگ۔
بے اختیار ایک آنسو اس کے گال پر لڑھک کر دوپٹے
میں گم ہو گیا۔ بانو کلاکھوں کا بل اسباب لناس کے دل
میں دکھ کی ایک لہر بھی نہ اٹھی۔ اپنا چند روئے کا ایک
آلو جلا تو اسے لگا کائنات لٹ گئی۔ کون سی شے کسی کی
کل کائنات ہے، کون جانے۔

بو جھل دل کے ساتھ تین روٹیاں پکا کر اس نے اوہ
جلے آلو میں مزید پانی ڈال کر دسترخوان پر رکھ دیا جسے اس
نے اپنے میاں اور تین بچوں کے ساتھ احتیاط سے
کھایا۔ یضمان اور رانیہ تو چھوٹے تھے البتہ سعادت
اور سلمان آدھا پیٹ ہی ہاتھ روک کر پیچھے ہٹ گئے۔
دن کا طعم ہوا تمام۔ شام اتر آنے سے قبل ہی رات
کی فکر و امن گیر ہو گئی۔ لیکن رزق کا وعدہ رب کا وعدہ
ہے۔ رات کو سلیمان نے چنا پلاؤ پکایا اور بڑی پلیٹ بھر
کر ان کے گھر دے گئی۔ ساتھ سوچی کا طعمہ بھی تھا۔
سلیمان کی بیوی بیٹی آئی تھی اسی لیے اہتمام کیا تھا۔ ان
سب نے شکر بجالا کر کھایا اور وہ قافل دن بھی تمام ہو
گیا۔



ایسا نہیں تھا کہ سعادت کھٹو تھا۔ اسے جوتیاں
چٹکتے ساتھ آٹھ ماہ ہو گئے تھے مگر نوکری نہ ملتی تھی۔
اتنے مہینوں میں ہزاروں روپے کا قرض اس پر چڑھ چکا
تھا اور اب مزید کوئی ایک آنہ بھی قرض دینے کو تیار نہ
تھا۔ تعلیم اتنی تھی نہیں کہ کوئی اعلا نوکری مل پائی اور
معمولی نوکری پر اس کی صورت اڑے آجائی۔ وہ بلا کا
خوبرو، وجیہ اور شاندار مرد تھا۔ کئی مرتبہ اسے دکان پر
سیلز مین رکھا گیا مگر لوگ اسے مالک سمجھنے لگتے اور مالک
حسد کا شکار ہو کر اسے نوکری سے فارغ کر دیتا۔ کچھ تو
صورت اچھی تھی کچھ اچھے وقتوں کے سنبھال کر رکھے

اس نے کھڑکی کے پاس کھڑی برابر والی پڑوسن کو پکار
کر پوچھا۔

”بانو کی بیٹی کا جینز جو ری ہو گیا۔“

سلیمان نے آہستہ آواز میں کہا تو قدسیہ کا منہ کھل
گیا۔

”بانو کی بیٹی۔۔۔ وہ آمنہ؟ اس کا جینز؟ وہ تو ابھی صرف
آٹھ برس کی ہے، ہن۔“

سلیمان نے ناک پر انگلی رکھ کر قدسیہ کو افسوس
بھری نظر سے دیکھا۔

”نہں تو تجھے نہیں پتا کیا۔ پشوریوں کے گھر تو جس
دن لڑکی پیدا ہوتی ہے اسی دن ایک جوڑا صندوق میں
گرا کر جینز بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر روز ہی اس
صندوق میں کچھ نہ کچھ گراتے ہیں تو وقت پر جینز بننا
ہے۔“ قدسیہ ہونق بنی سلیمان کو دیکھتی رہی جو مزید
کہہ رہی تھی۔

”فیر آمنہ آج آٹھ کی توکل اٹھارہ کی۔ ہے بھی بانو
اور مراد کی اکلوتی دھی۔ آٹھ سالوں میں تو نجانے کیا کیا
اکٹھا کر رکھا تھا دونوں نے چینیوں کی فرنیچر تک رکھا تھا۔
پچاس ساٹھ تو لے تو صرف سونا تھا۔ کیرا برتن الگ۔ پر
دیکھو قسمت سب لٹ گیا۔ بازار ہی تو گئی ہوئی تھی بانو۔“

سلیمان نے کہیں سے سمجھج کر ایک موٹا سا آنسو
گال پر گرایا اور آگے بڑھ کر بانو سے ہمدردی کرنے
لگی۔

”حق ہا۔۔۔ سلمان سو برس کا بل کی خبر نہیں۔“
قدسیہ نے دکھ سے سوچا اور کھڑکی بند کر دی۔

”ایک ہم ہیں جو چوہا گرم رکھنے کے جتن کرتے
ہیں، ایک وہ ہیں جو سالوں کا جمع جتھالیے بیٹھے ہوتے
ہیں۔ یہ بھلا عمر رضی اللہ عنہ کا دور تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو
قینے کا دور ہے۔ یہاں کسی کو کسی کی کیا خبر۔ یہاں تو ایسی
نفسا نفسی ہے کہ کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے کو بھی
خبر نہیں کہ ساتھ والا سانس بھی لے رہا ہے یا گزر
گیا۔“

قدسیہ زیر لب کہتی کمرے سے نکلی تو کچھ جلنے کی

اس کے اچھوڑے جیلے کے پورے مفہوم سمجھنے میں قدسیہ ماہر تھی۔ تیزی سے برتن اور چھری اٹھا کر وہ برآمدے میں آئی اور بچوں کو پکارا۔

”آجاؤ بچو گرما کھاؤ۔“ پھر آواز قدرے دھیمی کر کے خود کھانا کے سے انداز میں بولی۔

”گرما بڑا بھاری ہوتا ہے، ایک ایک قاش سے ہی سب کا پیٹ بھر جائے گا۔“

سعادت نے دکھ کو نیزے کی صورت دل میں گڑتا محسوس کیا۔ قدسیہ نے گرمے کی چھ قاشیں بنائیں۔

ارادہ تھا کہ چھٹی قاش وہ سعادت اور سلمان کو آدھی آدھی دے دے گی۔ فیضان اور رانیہ تو چھوٹے تھے ان کے لیے ایک ایک قاش بھی کافی تھی۔ رہ گئی وہ خود۔

تو ماں تو بیٹھ اپنا نوالہ اولاد کے منہ میں ڈالتی ہے۔ ابھی وہ لوگ کھا ہی رہے تھے کہ گھنٹی بجی۔ سلمان نے کھڑکی سے دیکھا۔

”ابو۔ مسرور بابا آئے ہیں۔“ قدسیہ اور سعادت کی نظریں ملیں۔ سعادت نے آخری ٹکڑا منہ میں ڈالا اور اٹھا۔

”بیٹھک میں بٹھاؤ میں آ رہا ہوں۔“ قدسیہ نے خاموشی سے چھٹی قاش پلیٹ میں رکھ کر سلمان کو تھمائی۔

”جاؤ بیٹا، یہ مسرور بابا کو دے آؤ۔“ پلیٹ لے کر بیٹھک کی طرف مڑ گیا اور وہ چھوٹے بچوں کی لچائی نظروں کی مایوسی سے نگاہ جراتی اٹھ گئی۔

مسرور بابا، سعادت کے والد کا پرانا نمک خوار تھا۔ اس نے سعادت کو اپنے ہاتھوں میں کھلا کر بڑا کیا تھا۔

دکان کے کام کاج گھر کا سودا سلف سعادت کو اسکول لانے لے جانے کی ذمہ داری ہر کام مسرور بابا کے ذمے تھا۔ وقت بدلا حالات بدلے۔ آج سعادت اور مسرور بابا ایک درجے پر کھڑے تھے۔

”پتر صرف دو سو روپے کی ضرورت تھی، تھوڑا سا سودا گھر لے جاؤں، کھانے کو ایک روٹی تک نہیں۔“

سعادت کا سر جھک گیا۔

”بابا، آپ یقین نہیں کریں گے، سودا ہمارے گھر کا

گئے لباس ایسے تھے کہ سب کو شگ میں مبتلا کر دیتے۔ کوئی اسے ضرورت مند سمجھنے پر تیار ہی نہ ہوتا۔ ایک زمانہ جانتا تھا کہ وہ جدی پشتی کاروباری خاندان تھا لیکن باپ دادا کا کاروبار بکثرت ایسا ٹھپ ہوا کہ وہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ قریبی خیر خواہ بھی کہتے کہ ان کی ٹھٹ باٹ اور آن بان کو بری نظر کھائی ورنہ یوں سونا خاک ہوتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جوان کے ملازمین تھے اب وہ ترقی کر کے کاروباری بن چکے تھے۔

نوکری کی تلاش سے تھک کر سعادت اپنے دوست وارث کے میڈیکل اسٹور پر جا بیٹھا۔ وہ اس کا گہرا دوست تھا لیکن اس کی طرح وہ بھی سفید پوش تھا۔ سلازمین رکھنے کی عیاشی کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا اور بیٹا اللہ نے اسے دیا نہیں تھا سو خود ہی دکان چلاتا تھا۔ ایک آدھ بار سعادت اس سے بھی قرضہ لے چکا تھا لیکن مزید مانگنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ بس سر جھکائے بیٹھا رہتا۔ وارث خوب گھمٹتا تھا لیکن کچھ کرنے سے قاصر تھا کیونکہ اس کی چار بیٹیاں تھیں جن میں سے تین بیاہے جانے کی عمر میں تھیں اور ایک کی شادی بھی طے ہو چکی تھی۔ وہ بس اپنا دال دلیہ چلاتا تھا۔

اس روز سعادت ضرورت سے زیادہ خاموش تھا۔ کئی دن موبی کے پتے کھالیے تھے۔ ایک بار پھر چولہا ٹھنڈا تھا۔ صبح ناشتے میں سب نے صرف ایک ایک پیالی چائے پی تھی اور پڑوس سے آیا نیاز کا کلہوہ دو دو چمچ چٹھ لیا تھا۔ وارث دوسرے کھانے اور قیلولہ کے لیے دکان بند کر کے ایک ٹھنڈے کے لیے گھر جاتا تھا۔ وہ اٹھا تو سعادت کو بھی اٹھنا پڑا۔ باتیں کرتے کرتے دونوں پیدل ہی گھر کی طرف رواں دواں تھے۔ راستے میں وارث نے رک کر ایک پھل والے سے گرما خرید اور آدھا کٹا کر سعادت کو دے دیا۔ دل پر بے حد بوجھ لیے سعادت نے خاموشی سے تھمیا اس سے لیا اور دونوں اپنی اپنی گلی میں مڑ گئے۔ گھر آ کر تھمیا اس نے قدسیہ کو پکڑا دیا۔

”وارث نے دلا دیا۔“

بھی سارا ستم ہے۔ میں بے حد شرمندہ ہوں۔ آپ یہ گرا کھائیں، ہم نے بھی دن کے کھانے میں یہی کھلایا ہے۔ جیسے ہی مجھے کہیں سے میسے طے میں فوراً آپ کو کبھی پہنچا دوں گا۔ ”مسرور بابا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”مجھ سے تیری یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی پتر۔ تیرے باپ کے دفتوں میں تو پھلوں کے ٹوکڑے آتے تھے ٹوکڑے۔ لنگر چلتا تھا تیرے گھر۔ آج یہ کیا ہو گیا پتر۔ اللہ مجھ پر رحم کرے۔“

”آزائش! یہ بلیا آزمائش! اسے ہنس کر گزارنا ہے۔ سعادت نے یہ کہتے ہوئے جیبیں ٹٹولیں تو دس کا نوٹ ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے وہ نوٹ مسرور بابا کی ٹشٹی میں دریا۔

”یہ ایک نوٹ نکلا ہے بابا! ایک روٹی تو آجائے گی۔“ مسرور بابا کے اشکوں میں روائی آ گئی۔

”اللہ تجھے مالالام کرے پتر! تیرے ٹھوڑے رزق میں کروٹوں کی برکت دے۔“ وہ دعائیں دیتا روتا ہوا رخصت ہو گیا۔ سعادت اندر آیا تو بچے اپنے کمرے میں لیٹ چکے تھے۔ قدسیہ بھی کمرے میں لیٹی پھت پر نظر پڑا۔ سوچ میں گم تھی۔ وہ بھی خاموشی سے بیٹ گیا۔ جیب خالی ہو تو بائیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ خالی جیب تو خیالی پلاؤ پکاتا بھی اچھا نہیں لگتا۔ اپنی اپنی سوچوں میں گم دونوں کی آنکھ لگ گئی۔



عصر کا وقت ہو گا جب ایک بار پھر گھٹی بجی۔ سعادت کی آنکھ یوں کھلی جیسے وہ سویا ہی نہ تھا۔ بچوں کی بے آرامی کے خیال سے وہ خود ہی اٹھ کر دروازے پر گیا۔ قدسیہ اسی طرح کسلندی سے پڑی رہی۔ جھونپڑی کے غریبوں سے زیادہ مفلس بچے مکان والے سفید پوش ہوتے ہیں، جن کے خونی رشتے بھی ان کے قریب سے سر جھکا کر یوں گزرتے ہیں جیسے جانتے نہ ہوں۔ ایسے میں کسی مہمان کی کیا توقع ہوتی۔ اس پریشانی سے وہ لوگ آزاد تھے لیکن باہر سے آتی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

قیمت	موضوع	کتاب کا نام
500/-	آمنہ دہش	بہا ناول
1000/-	راحت چیمیں	ذرا دوسرا
500/-	رہبانہ گارہمان	دعائی اک روشنی
200/-	رہبانہ گارہمان	خوشبو کا کوئی کمر نہیں
500/-	شادی چھری	شہر دل کے دروازے
250/-	شادی چھری	حیرے نام کی شہریت
450/-	آسیہ مرزا	دل ایک شہر جوں
500/-	فاخرہ افکار	آئینوں کا شہر
600/-	فاخرہ افکار	ہول سہلاں حیرتیں لگیاں
250/-	فاخرہ افکار	پھلاں دے دے گدگد کالے
300/-	فاخرہ افکار	یہ لگیاں یہ چہارے
200/-	غزالہ عزیز	مین سے عورت
350/-	آسیہ مدانی	دل اُسے دھڑکلا
200/-	آسیہ مدانی	بکھرنا چاہیں خواب
250/-	فوزیہ یاسین	دھم کو دھم کی مہمانی سے
400/-	ایم سلیمانہ عمر	شام آرزو

اساس ہے۔
ہاتھ بھیج کر استعمال کرتے چارپانچ دن نکل گئے۔
رب کا کرم یہ تھا کہ وہ لوگ بھوکے بھی نہ سوئے۔
آوے پیٹ ہی سہی وہ مالک انہیں کچھ نہ کچھ کھلاتا
ضرور تھا۔ پانچویں دن مصطفیٰ ایک بار پھر آیا اور سلمان
کو بھی بیٹھک میں بلا لیا۔

”دیکھ سعادت، تیرے پاس کپڑے کے کاروبار کا
تجربہ ہے، مجھے میری صدر والی دکان کے لیے میجر
چاہیے۔ تو وہ سنبھال لے۔ سلمان پترو تیری شروانی
دکان پر سیلزمین لگ جا۔“

سعادت خوشی سے بے حال ہو گیا لیکن سلمان کا
چہرہ اتر گیا۔ مصطفیٰ نے صاف محسوس کیا۔

”مصطفیٰ، یہ پڑھنا چاہتا ہے، اس نے صرف انٹریا
ہے۔“ مصطفیٰ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور
بولے۔

”پڑھ لیتا، پرائیویٹ پڑھ لینا پتر۔ تو بڑا ہے تجھے
قربانی دینی پڑے گی۔ چھوٹے بن بھائی کو اچھا پڑھانے
کے لیے تجھے پرائیویٹ پڑھنا پڑے گا۔ دل چھوٹا نہ
کر۔“

مصطفیٰ کی بات حق تھی۔ سلمان حقیقت پسند باپ
کا حقیقت پسند بیٹا تھا۔ رزق گھر چل کر آیا تھا۔ لات مار
کر ناشکری کیوں کرتا۔ ایک دس کے نوٹ نے باپ
بیٹے کو برسوں روزگار کر دیا تھا۔ پانچ سو روپیہ مسرور بابا کو
دینے کے لیے جاتے وقت دل میں کئی بار خیال آیا کہ دو
سو اسے دے کر تین سو جیب میں ڈال لے، لیکن
تربیت آڑے آگئی۔ نوٹ بابا کو پکڑاتے وقت بھی اس
کا دل گھٹ رہا تھا لیکن مسرور بابا اور اس کی بیوی نے
جب جھولی اٹھا کر دعا میں دیں تو وہ شرمندہ ہو گیا۔ یہ
پانچ سو دس روپے کی کرامات اس کے سامنے تھیں۔
اس نے تہیہ کیا کہ اپنی تنخواہ میں وہ مسرور بابا کو حصے دار
بنائے گا۔

میں شفت ہو گیا تھا تو میل جول چھوٹ گیا تھا۔ کئی
سال بعد اس نے اس پرانے محلے کا چکر لگایا تو سعادت
کی یاد آئی۔ قدسیہ نے لال شہرت کی بوش اٹھائی۔
پینڈے میں ذرا سا لگا تھا۔ اس نے پانی میں چینی گھول کر
وہ ذرا سا شہرت اٹھایا اور برف ڈال کر سلمان کے
ہاتھوں بیٹھک میں بھیج دیا۔ فقط ایک گلاس مصطفیٰ
نے شہرت کو غور سے دیکھا پھر گھونٹ بھرا۔ شہرت کی
رنگت اور ذائقے نے صاف بتا دیا کہ اسے چینی سے
میٹھا کیا گیا ہے۔ سعادت کے خوبو چرے پر پڑی
پریشانی کی لکیریں باقی حال بیان کر رہی تھیں۔ اس نے
چند سوالات کیے جن کے سعادت نے ڈھکے چھپے
جوابات دے دیے۔ یوں کہ بھر بھی رہ جائے اور پیغام
بھی نہ پہنچ جائے۔ مصطفیٰ کو بے حد دکھ ہوا۔ جاتے
ہوئے اس نے ملاقات کے بہانے بچوں کو بلوایا، ان
سے ملا چھوٹے چھوٹے سوالات کیے اور دس سالہ
رانیہ کے ہاتھ پر ہزار کانوٹ رکھ کر نکل گیا۔

گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب کے چہرے
چمک اٹھے۔ سعادت نے فوراً؟ جا کر ضروری سودا
سلف خریدا، سودا قدسیہ کو تھمایا اور پانچ سو کانوٹ
سلمان کو دیا۔

”یہ جا کر مسرور بابا کو دے آؤ۔“ سلمان کا منہ کھل
گیا۔ تین چار سو کا سودا وہ لے آیا تھا، پانچ سو بابا مسرور کو
بھجوا رہا تھا تو جیب میں کیا بچتا تھا۔

”پر ابو انہوں نے تو بس دو سو روپے مانگے تھے۔“ وہ
کے بغیر نہ رہ سکا۔ سعادت مسکرایا اور بولا۔

”اس کو دس روپے دیے تو یہ ہزار کانوٹ رب نے
اسی کے صدقے دیا۔ پھر بتاؤ وہ برابر کا حصہ دار نہ ہوا؟
جیب میں اٹھنی بھی ہوتا تو غریب کو دینے سے گریز نہ
کرتا۔ جو اٹھنی تمہارے لیے پچاس پیسے ہیں وہ غریب
کے لیے پچاس روپے کی حیثیت رکھتی ہے۔“

سلمان سر ہلاتا ہوا نوٹ جیب میں ڈال کر باہر نکل
گیا۔ سعادت کو اطمینان تھا کہ بچوں کو دولت دے سکا
یا نہ دے سکا مگر قناعت، شکرگزاری اور فراخ دلی ان
کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہی انسانیت کی



فلاوین

جیائاری

بہارِ انتظار ہے



بادل بھی جھوم اٹھے تھے۔ ہلکی ہوا کے ساتھ ٹھنکی ٹھنکی
 دم جھم بھی شروع ہوئی تو وہ سب باقاعدہ ٹاپنے لگے۔
 ”آؤ وہاں ... وہاں ... وہاں چلیں ... آؤ
 وہاں۔“ وہ بے حد سریلی آواز میں گنگنائی تھی۔
 ”آؤ وہاں وہاں وہاں چلیں“ بچے
 ایک زبان ہو کر اس کے ارد گرد جھومتے ہوئے
 چلائے تھے۔

”اوئے ٹھہر جاؤ ذرا گلوٹے موسیقارو، آج تم
 سب کی چڑی اڑھرتا ہوں۔“ دور سے رعب دار
 مردانہ آواز پکاری تھی۔
 ”چا چا آگئے۔“ سب سے پہلے مخالف سمت
 دوڑ لگانے والی گلائی تھی۔ جس کا سبز آچل دہیں
 سرسوں کے پھولوں پر جا پھیلا تھا وہ البتہ بے خبر تھی۔

☆☆☆

حویلی کا اندرونی دروازہ بہت زور سے بند کیا
 گیا تھا، اس قدر زور سے کہ ساتھ والے بھی کمردن
 کے گھر کی دروازے بج اٹھے تھے۔
 ”اللہ خیر۔“ کا کی نے دلی کردل پر ہاتھ رکھا تھا۔
 ”سبا عون (پشتو میں سباؤن کہتے ہیں) رکھا تھا
 میں نے اس کا نام یہ سوچ کر کہ صبح کی روشنی کی طرح
 ہی ٹھنڈے مزاج والا ہوگا بر سکون، نرم مزاج لیکن
 اس کے تیور تو جولائی کی گرمی کو بھی مات دے جاتے
 ہیں۔“ زمان خان نے مسکراتے ہوئے اخبار ایک
 ساندچ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”اتنا غصہ تو تب ہی کرتا ہے جب گلائی نے
 کچھ کہا ہو“ وہ پریشان ہوئیں۔

”امی بابا۔“ سبا عون آدازیں دیتا قریب
 آ رہا تھا، آواز سے بھی غصہ صاف جھلک رہا تھا۔

”میں ہوں نہ، تم فکر مت کرو۔“ انہوں نے
 تسلی دی، سبا عون پچھلی طرف بنے چھوٹے سے
 برآمدے میں آچکا تھا۔ وہ دنیوں یوں بن گئے جیسے
 اب تک ان کو اس کی کوئی خبر نہ تھی۔

”بابا“ تیز لہجے میں پکارا زمان خان نے چونکے
 کی خوب اداکاری کی۔

جی۔۔۔ بھی بھئی جو ہمیں اپنے معیار سے نیچے لگتا
 ہے، وقت دکھا دیتا ہے کہ اصل میں وہ ہمارے معیار
 سے کس قدر اونچا تھا۔“ اس نے دروازے پر نگاہ کی
 تھی۔ ٹھکے ہارے پرندے دن ڈھلتے ہی اپنے
 گھونسلوں کی طرف رواں تھا۔ اور دھند اترنے لگی تھی
 ۔ وہ شاید اپنے ہی گھر کا پتا بھول چکا تھا۔

☆☆☆

وہ سب گئے کے کھیت میں چھپ کر بیٹھے تھے۔
 ان سب کی نظریں ان سے کچھ دور ذرا اونچی پگڈنڈی
 پہ لیٹے وجود کی طرف مرکوز تھیں جس کے صرف ملائم
 تنکے حیر صاف نظر آرہے تھے۔ تبھی پگڈنڈی کے
 دوسری طرف موجود سرسوں کے کھیت میں ذرا سی
 حرکت ہوئی تھی، راستے پہ لینا وجود لیٹے لیٹے ہی ذرا
 ساتن گیا۔ وہ سب چونکے ہو گئے۔ اور پھر اچانک ہی
 اس وجود نے کسی ماہر اٹھلیٹ کی طرح فلاچی بھری تھی
 اور اگلے لمحے ایک زرد دار چیخ ابھری تھی۔

گئے کے کھیت سے بچوں کی فوج برآمد ہوئی
 تھی۔ وہ سب پگڈنڈی پر چڑھ آئے تھے۔ آدھے
 پورے کپڑے پہنے گورے کالے موٹے پتلے بچے بھی
 اب دوسری طرف اس وجود کو تلاش کر رہے تھے۔ جو
 ایک اور فاتحانہ چیخ مارتا اور پریا تھا۔

سبز آچل کی ٹھنکی نے سبزے کی تازگی کو بھی
 جیسے شکست دی تھی۔ کٹورا غلابی آٹھوں اور گلابی
 ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ چل رہی تھی۔

”کیا ہوا گلائی؟“ ایک بچہ مبرا ہوا،
 یہ عمر میں باقی سارے بچوں سے بڑا تھا۔

”بھاگ گیا؟؟“ ایک چھوٹے سے بچے کو
 تاسف نے گھیرا

”یہ دیکھو“ اس پری پیکر نے چلا کر اپنے ہاتھ
 ان کے سامنے کیے تھے، نرم ملائم روٹی جیسا سفید
 خرگوش اس کے ہاتھوں کی قید میں جیسے بے فکری سے
 آنکھیں پٹپٹاے جا رہا تھا۔

”یا ہوا!“ سب بچوں نے خوشی سے زبردست
 نعرہ لگایا تھا۔ تبھی جیسے ان کی خوشی سے مست ہو کر

”ہاں، کیا ہوا؟ خیریت۔“ اداکاری کچھ ادور ہو گئی۔
 ”خیریت...؟“ گلائی کے ہوتے ہوئے ایسے ممکن ہے بھلا۔“ اس کی خوب صورت کھڑی ناک سرخ پڑنے لگی تھی، مطلب غصہ بے حد شدید تھا۔
 ”کیا کر دیا پھر اس نے؟“ کاکی نے منہ بناتے ہوئے پوچھا۔
 ”یہ دیکھیں۔“ سبز ریشمی آنچل رنگ برنگی خوبصورت چالمبا کی پراچھا لالگیا۔
 ”چاچا فانی نے دیا ہے مجھے۔“ کاکی کا تو منہ کھل گیا، زمان کے چہرے پہ البتہ مسکراہٹ بکھر گئی۔
 ”وہاں کیا کر رہا تھا یہ دوپٹا... یہ تو گلائی کا ہے اور فانی چاچا کا گھر تو یہاں سے بہت دور ہے“ کاکی کی سمجھ میں معاملہ نہ آیا تو حیران پریشان ہوتی گئیں۔
 ”اس کے پیر نکل آئے تھے، دوڑتا ہوا گیا تھا۔“ سباعون کو مزید غصہ آ گیا۔
 ”واقعہ...؟“ حیرت زدہ سوال، اور زمان کا قہقہہ جاندا تھا۔

”آپ کی لاڈلی چھوڑ کر آئی ہے فانی چاچا کے کھیتوں میں۔“ لب کاٹتے ہوئے اس نے ان کی حیرت دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن حیرت سے ان کا منہ مزید کھل گیا تھا۔
 ”تو اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ کھیل کھیل میں بھول گئی ہوگی۔“ زمان نے بالآخر کہہ ہی دیا، اور اب کی بار حیرت سے گنگ ہونے کی باری سباعون کی تھی۔
 ”کھیل کھیل میں بابا۔“ اسے جیسے شدید صدمہ ہوا تھا، وہ سر ہلا گئے۔
 ”وہ چند روز سال کی سفیدے کے درخت جتنی لمبی لڑکی آپ کو کھیل کھینے والی بچی نظر آتی ہے۔“ وہ صدمے سے غڑ حال تھا۔
 ”تم سے تو ذرا کم ہی قد ہے اس سفیدے کا۔“ زمان خان کی زبان بھی لڑکھرائی۔ ”میرا مطلب ہے گلائی کا۔“ فوراً صبح کی گئی۔

”جذبہ بابا۔“ لہجے میں مزید تاسف گھلنے لگا۔
 ”کبھی کبھی مجھے لگتا ہے آپ اس کے ماں باپ ہیں اور میں یتیم ہوں۔“ وہ دکھ بھرے لہجے میں کہتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔
 ”یہ اس نے کیا کہہ دیا۔“ کاکی نے ایک مرتبہ پھر حیرت سے کہا۔
 ”ڈائلاگ مارا ہے اور کہا۔؟“ زمان نے بے فکری سے کہتے ہوئے اخبار دوبارہ اٹھالیا۔ اور ان کی توقع کی عین مطابق سباعون واپس پلٹ آیا تھا۔
 ”بابا۔“ اور زمان نے ہنستے ہوئے اس کی چوڑی کمر کے گردنوں بازوؤں کا مضبوط حصار باندھ دیا تھا۔ کاکی بھی مسکرا دی تھیں۔
 ☆ ☆ ☆
 جیسے ہی دوپہریں لمبی ہوئی تھیں۔ اس کا وقت گزرتا محال ہو گیا تھا۔ گاؤں میں سب ہی چھوٹے بڑے پتی دوپہروں میں نیند کا مزا لیتے اور وہ اکیلے کسی بدروح کی طرح ادھر اسے ادھر گھومتی رہتی۔
 ابھی بھی کاکا، کاکی کے سو جانے کے بعد حویلی کے پچھلی طرف والی نہر کے پاس چلی آئی۔ یہ نہر حویلی کا حصہ نہیں تھی۔ لیکن جب سے پچھلے سیلاب میں حویلی کی پچھلی دیوار کا ایک حصہ گرا تھا اسے یہ نہر اپنے گھر کا ایک حصہ ہی معلوم ہونے لگی تھی، اور جب سب لوگ خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے وہ آرام سے اپنی کتابیں لیے ٹالی کے درخت کے نیچے آ بیٹھتی۔

”کوئی نئی کتاب نہیں ہے کہ پڑھ لیتی۔“ ٹالی کے تنے سے ٹیک لگائے ہوئے اس نے اداسی سے سوچا تھا۔ تب ہی اس کی نظر نہر کے اس پار آم کے درخت سے ٹیک لگائے اس لڑکے پہ پڑی تھی، جو مزے سے کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔
 اس کا رخ دوسری طرف تھا تب ہی شاید اس کی نگاہ گلائی پہ نہ پڑی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور بھاگی ہوئی ایک طرف درخت کے بڑے سے تنے سے بنائے گئے ٹیل کو پار کر گئی، چند ہی لمحوں بعد وہ اس لڑکے کے

”کون سی بھی۔ جو اردو میں لکھی ہو۔ اس میں کہانیاں ہوں، خیال ہوں، نظمیں ہوں، معلومات ہوں۔ اور بہت کچھ ہو۔“ وہ جب بولنے لگی تو اسے لگا وہ اس کی ساری خواہشیں اس کی گہری نیلی آنکھوں میں بولنے لگتی تھیں۔ ”اللہ نے اسے کس قدر پیارا بنایا تھا۔ وہ اٹھ گئی تھی۔

”سنو“ وہ کچھ دور ہی گئی تھی۔ جب اس نے دوبارہ پکار لیا گلائی مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بھاگتا ہوا اس کے قریب آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔

”تم یہ رکھ لو۔ پڑھ کر مجھے واپس کر دینا۔“ گلائی نے اس کے بڑھے ہاتھ کی طرف ایک نظر دیکھا وہ اشفاق احمد کی ”زادیہ“ پر تھی۔ اس کی آنکھیں پک لخت چمک اٹھی تھیں۔ اس نے بلا جیل و جنت وہ کتاب چھپٹ لی تھی اور تیزی سے واپسی کے لیے پلٹ گئی تھی۔ وہ اس کے غائب ہونے تک اسے دیکھتا رہا تھا۔ اسے امید نہ تھی کہ وہ لڑکی یہ کتاب بھی بخوشی لے سکتی تھی۔

☆☆☆

سابعون نے شہر کی سب سے اچھی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ جب سے وہ شہر گیا تھا۔ گلائی نے اطمینان کی سانس لی تھی، ورنہ تو اسے لگتا جیسے سبعون کی دوکانی کالی آنکھیں ہر دقت صرف اسے ہی تاڑے رہتیں ہیں کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ کا کا اور کا کی البتہ اسے ڈانٹتا تو درکنار تو کتنا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ سوا ب اس کا سارا وقت گاؤں کے بچوں کے ساتھ مستی کرتے یا کتاہیں بڑھتے مگر جاتا۔ اچھی بھی وہ نہر کی طرف کرکٹ کھیل کر کھلی ہاری واپس آئی تو کا کی نے فوراً اٹھ کر پر آمدے کا پکھلا لکا کیا۔

”کیسے پسینے پسینے ہو رہی ہے۔ کتنی بار منع کیا ہے کہ گرمی میں اس دقت کم از کم کھیل بند کر دیا کر مگر نہ۔“ کا کی ناراض ہوتے ہوئے دوپٹے سے اس کا پسینہ خشک کرتے ہوئے بولیں۔

”کل سے بند۔“ اس نے سکون سے آنکھیں

سائنسے کھڑی تھی۔ لڑکا مطالعے میں اس قدر محو تھا کہ اس کی آمد سے بے خبر ہی رہا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ کچھ دیر اس کے ہاتھ میں پکڑی کتاب کو یوں دیکھتی رہی جیسے جھوکا شیر اپنے شکار کو اور اگلے ہی پل اس نے کتاب اس کے ہاتھ سے چھپٹ لی تھی۔ وہ اس اچانک افتاد پہ گھبرا سا گیا۔ اب وہ مزے سے اس کتاب کے ادراک الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ لڑکا البتہ یوں اچانک اس قدر پیاری لڑکی دیکھ کر ابھی تک شاکد تھا۔ وہ ابھی بھی کتاب دیکھے جا رہی تھی۔ اور پھر چند لمحوں بعد ہی اس نے اس خوب صورت چہرے پہ مایوسی پھیلتے دیکھی تھی۔

”یہ کیسی کتاب ہے؟“ مایوسی بھرا لہجہ۔ لڑکا اب سنبھل چکا تھا۔

”اس میں تو بس انگریزی اور کپڑے کوڑے بنے ہیں۔ میری تو آنکھیں چکر اٹکیں۔“ وہ اب دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مل رہی تھی۔ اس کی معصوم سی حرکت یہ وہ مسکرا دیا۔ مطلب وہ بھی گاؤں کی کئی لڑکیوں کی طرح ان پڑھ تھی۔

”یہ تھس کی بک ہے۔“ اس نے بتایا۔

”یہ تھس؟“ وہ سوچنے لگی۔

”حساب؟“ اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔

”میں نے بھی پڑھا ہے حساب۔ وہ تو ایسا نہیں تھا۔“ اس نے منہ بتایا۔

”کون سی کلاس میں؟“

”پانچویں میں۔“

”وہ اس سے بہت مختلف تھا۔“

”شاید۔“ وہ ذہین تھی تب ہی سمجھ گئی۔ وہ اٹھنے لگی۔

”سنو“ اس نے پکار لیا گلائی نے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں کون سی کتابیں چاہئیں تھیں۔“ سنہری آنکھیں اس کے خوب صورت چہرے پر جماتے اس نے پوچھا تھا۔

”میں نہیں۔“
 ”کل کہے گی پرسوں سے۔“ کا کی نے منہ بتایا
 ”نہیں کہوں گی۔“ وہ لاڈ سے ان کی گود میں سر
 چھپا گئی۔
 ”گلائی بیٹا۔ شہر سے تمہاری کتابیں آگئیں۔“
 اسی وقت زمان نے اسے پیار سے پکارا۔ وہ جھٹکے
 سے اٹھ بیٹھی۔ کا کا کے ہاتھ میں تین چار کتابوں کا
 بڈل تھا۔ اس نے تیزی سے وہ کتابیں لے لیں۔
 ”کتنّا انتظار کیا میں نے اس دفعہ۔“ وہ رپہر
 اتارنے لگی۔

”اب پڑھنے مت بیٹھ جانا، پہلے کھانا کھا لو۔
 کچھ دیر آرام کر لو پھر اٹھ کر شروع کرنا۔“ کا کی اماں
 اٹھتے ہوئے اسے تاکید کر گئیں۔ وہ سر ہلاتے ہوئے
 باری باری ان کی فہرست چیک کرنے لگی۔
 زمان اسے بغور دیکھ رہے تھے۔
 ”میرے خیال میں اب تمہیں دوبارہ تعلیم کا
 سلسلہ جوڑ لینا چاہیے۔“

انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے اسے کہا۔ وہ چونکی۔
 ”آپ جانتے ہیں کا کا، اس گاؤں میں ہائی
 اسکول ہے ہی نہیں۔ اور ساتھ والے گاؤں میں مجھے
 نہیں جانا۔ پھر اب میری عمر بھی کتنی بری لگوں
 گی میں خود سے چار سال چھوٹی بچیوں میں بیٹھ کر سبق
 یاد کرتی۔“ وہ جیسے خیل میں ہی خود کو کلاس میں دیکھ رہی
 تھی۔ اس لیے چہرے کے زاویے بدل رہے تھے۔
 ”علم حاصل کرنے میں بھلا کیسی شرمندگی۔“
 کا کا مسکرائے۔

”علم حاصل کر تو رہی ہوں۔“ اس نے چاروں
 کتابیں ہاتھوں میں بھر کر ان کے سامنے کیں۔
 ”یہ تو وقت گزاری ہے بیٹا۔ اصل علم تو وہی ہے
 جو درس گاہ سے حاصل ہو، وہاں جا کر ہی تم کند بنو
 گی۔ تمہاری منزل کا تعین آسان ہوگا۔ اور کچھ بن سکو
 گی۔“

”میں ان سے یہ سب سیکھ رہی ہوں۔ میں کچھ
 بن جاؤں گی کا کا۔“ اس نے اتنی مصحومیت سے

جواب دیا کہ زمان خان بے اختیار ہنس دیے۔
 ”بغیر ڈگری کے کوئی کچھ نہیں بن سکتا بیٹا جی۔“
 ”ایک اچھا انسان تو بن سکتا ہے نا۔“ وہ چپ
 ہو گئے تھے۔ وہ بچپن سے ہی ایسی تھی۔ حاضر جواب
 اور ذہین، اور اس لیے زمان کی خواہش تھی کہ وہ بھی
 سامعوں کی طرح اچھی تعلیم حاصل کرے۔ لیکن مسئلہ
 یہ تھا کہ ان کے گاؤں میں صرف پرائمری تک ہی تعلیم
 تھی، آگے پڑھنے کے لیے گلائی لوگاؤں سے باہر جانا
 تھا، لیکن کا کا کا کی سر توڑ کوشش کے باوجود بھی وہ
 اس کے لیے راضی نہ ہوئی تھی۔

”میرے لیے یہ کتابیں کافی ہیں کا کا۔ آپ
 پریشان نہ ہوں لیکن میں آپ سب سے دور نہیں رہ
 سکتی۔“ وہ چار پائی سے اتر کر ان کے قدموں میں
 جا کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے دست
 شفقت اس کے سر پر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

گرمیاں جو بن رہ تھیں۔ کڑکتی دوپہر میں چرند
 پرند بھی حوصلہ ہار کے گھونسلوں درختوں میں جا چھپتے۔
 اور وہ سب کے سونے کے بعد کوئی نہ کوئی کتاب لیے
 پہلے نہر پر آ جاتی۔ اس نے ”زاویہ“ ختم کر لی تھی اور
 اب اس کے مالک کو واپس لوٹانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ
 لڑکا اسے دوبارہ نظر نہیں آیا تھا، وہ روز یہاں آتے
 ہوئے کتاب ساتھ لے آتی تاکہ جیسے ہی اس سے
 ملاقات ہو، وہ کتاب اسے واپس کر دے۔

جامن کے بیڑ کی چھاؤں گھنی اور ٹھنڈی تھی۔
 وہ گھر کی دیوار کی ساتھ بیٹھنے کے بجائے آج نہر کے
 کنارے لگے جامن کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی،
 پاؤں نہر کے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیے، مسکون لُس
 لُس میں اترنے لگا۔ وہ پاؤں ہلاتے کتاب کھول کے
 پڑھنے لگی، تب ہی نہر کے دوسری طرف خامی دور
 اس نے سائیکل کی گھنٹی بجتی سنی تھی، اس نے بے
 اختیار اس طرف دیکھا۔ وہ اس دن والا لڑکا تھا۔
 بکریوں کے روڑ میں سے گزرنے سے اسے مشکل
 ہو رہی تھی، گلائی تیزی سے انھی، ساتھ پڑی ”زاویہ“

جھپٹ کر اور تیزی سے نہر کے دوسری طرف بھاگی، اس سے پہلے کہ وہ لڑکا بکریوں کے ریوڑ سے نکلنے میں کامیاب ہوتا وہ اس تک پہنچ چکی تھی۔

”شکر ہے تم مل گئے۔“ ہانپتے ہوئے کمر پر ہاتھ جمائے وہ یوں تو وہ حیران سا مسکرا دیا۔

”اتنے دن میں تمہیں نہر کے اس طرف ڈھونڈتی رہی، تم دوبارہ آئے ہی نہیں۔“ نیلی آنکھیں سحر پھونک رہی تھیں۔ وہ مفتوح ٹھہرا تھا۔

”تم مجھے یاد کر رہی تھیں؟“ گلابی مونڈوں کا کٹناؤ ٹیکھا ہوا تھا۔

”میں تمہیں یاد کیوں کروں گی؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”کیونکہ میں تمہیں یاد کرتا رہا تھا۔“ اس نے اپنی عادت کے مطابق صاف گوئی سے کام لیا تھا۔ نیلی آنکھوں میں حیرانگی مزید بڑھ گئی۔

”لیکن تم تو مجھے جانتے بھی نہیں۔“ گلابی کے ابرو اٹھے۔

”کچھ لوگوں کا جانا اہم نہیں رہتا۔ ان سے ملنے ہی رشتہ بن جاتا ہے۔“ اس نے سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کر دی۔ اور دونوں بازو سینے پہ باندھتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ جس نے چند بل اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کی پھر سر جھٹک دیا۔

”یہ کتاب دینی بھی تمہیں۔“ اس نے زاویہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں نے پڑھ لی تھی، تم رکھ لو۔“ اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

”نہیں۔ تم لے لو۔“ وہ بغد ہوئی۔ ”اور.....“

”وہ شاید کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔“

”اور کیا...؟“ وہ چونکا۔

”اگر اور کتابیں ہیں ایسی تو مجھے دے دو وہ میں واپس کر دوں گی۔“ اس نے جھجکتے ہوئے کہہ ہی دیا، وہ مسکرا دیا، اور سائیکل پر رکھے بیگ میں سے کچھ نکالنے لگا، تھوڑی دیر بعد اس نے دو کتابیں اسے تھما دیں، اور ”زاویہ“ لے لی گلابی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ اسے یاد آیا۔

”گلابی اور تمہارا؟“ گلابی نے فوراً جواب دیا تھا۔

”درون“ وہ مسکرایا۔

”میں شہر پڑھنے جاتا ہوں اس لیے کئی ہفتوں بعد گاؤں کا چکر لگتا ہے۔ تم پریشان نہ ہوا کرو، میں جب بھی آؤں آرام سے پڑھ کر کتابیں دے دیا کرنا، میں بھی جب اور کتابیں لاؤں گا تو تمہیں دے دیا کروں گا۔“

”شکریہ۔“ وہ مسکرائی درون نے آنکھیں بند کر لیں۔ یوں جیسے پلکوں نے لمبی جھپک لی ہو، وہ پلٹ گئی درون دین کھڑا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے پیدل چل دیا۔

☆☆☆

”سبا عون آگیا ہے شہر سے۔“ وہ گھر آئی تو کاکی فوراً اس کا ہاتھ تھامے کمرے میں لے آئیں، اطلاع سننے ہی برا سامنہ بنایا گیا۔

”اب کچھ دن جو بھی کرنا ہے اس کمرے میں کیا کرو۔ کھیل، پڑھائی سب۔ ہمیں تمہاری شکایت نہیں ملنی چاہیے۔“ وہ اسے پیار سے سمجھا رہی تھیں۔

”میں کوئی غلط کام نہیں کرتی۔“ وہ ایسے ہی میری شکایت کرتے ہیں۔“ اس نے نم ہوئی آنکھوں کو چھپانے کے لیے رخ پھیرا۔

اور یہ واقعی حقیقت تھی کہ وہ گاؤں کی لڑکیوں کی نسبت جس قدر بچکانا عادتوں کی حامل تھی اسی قدر سمجھ دار بھی سب سے زیادہ تھی۔ اس کا رکھ رکھاؤ، بول چال سب کسی بڑھی لکھی اچھی تعلیم یافتہ لڑکی کی طرح تھا۔ اسے دیکھ کر واقعی یہ ماننا مشکل تھا کہ وہ ایک پرائمری پاس لڑکی تھی۔

”اسی لیے تو میں اور خان تم سے اس قدر پیار کرتے ہیں کہ تم ہماری سمجھ دار بنی ہو۔“ انہوں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ ناراض سی بیٹھی رہی۔

”لیکن اب تم بڑی ہو گئی ہو گلابی اور لڑکیاں

”جس قدر سنجیدہ اور سمجھ دار ہوں اچھی لگتی ہیں۔ میں اور خان تو تمہیں کچھ نہیں کہتے لیکن سباعون۔ اس کی بات اور ہے بیٹا اس کا اور تمہارا رشتہ اور ہے۔“ وہ اس عمر میں بھی جب لڑکیاں آسانی سے خود سے کسی رشتے کو با آسانی جوڑ لیتی ہیں، اور وہ بھی چاہتی تھیں کہ انہوں نے سباعون اور گلائی کے لیے جو کچھ بھی سوچ رکھا تھا، وہ مکمل ہو اور ان دونوں کی زندگی خوش گوار ہی رہے اور اس کے لیے ابھی سے گلائی کی شخصیت کو سباعون کے خیالات کے مطابق ڈھالنا بے حد ضروری تھا۔ وہ جس قدر سنجیدہ اور کم گو تھا، گلائی اس قدر چلبلی اور باتونی تھی۔

”جانتی ہوں۔ وہ ان سے لپٹ گئی۔“ آپ دونوں تو میرے کا کا کا کی ہوا، کٹر ٹریل سا منہ بنایا گیا۔“ وہ میرے سرنیل سے رشتے دار۔“ اس کے بے زار سے انداز پر وہ بے اختیار ہنس دیں۔

”میری بات“ گلائی ”ان کے ٹوٹنے پر وہ بھی کھلکھلا دی اور کا کی کے گرد پہلے بازو مزید تھمتی سے باندھ لیے۔

☆☆☆
وہ بیڈ پر لیٹی کتاب میں گم تھی، جب کمرے کا دروازہ اتنے زور سے کھلا تھا کہ وہ ڈر کے مارے بیڈ سے نیچے گرتے گرتے پڑی تھی۔ اس نے دھک دھک کرتے دل پر ہاتھ رکھا جو سامنے دیکھنے پر مزید باہر نکلنے کی سعی کرنے لگا تھا۔

”آ۔۔۔ آ۔۔۔ آپ“ وہ بھلا گئی سباعون چند قدم آگے آیا گلائی جھٹکے سے سیدھی کھڑی ہوئی۔

”تم میرے کمرے میں کئی تھیں؟“ بڑی بڑی کالی آنکھیں اس کے چہرے پر جم گئیں، اس کی ہتھیلیاں تک اپنے میں جھینکے لگیں۔ ”بتاؤ“ وہ اور قریب آیا وہ پیچھے ہٹی۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔“
”کس لیے؟“ ماتھے پر پڑے بل مزید گہرے ہو گئے۔

”کا کی نے کہا تھا کہ صفائی کروں۔“

”اور تم نے صفایا کرو یا؟“ وہ بھی وہ شاید اس کی صفائی کی تعریف کر رہا ہے۔ بھی صفائی کا ذکر استعمال کر رہا ہے اس کے لبوں پر فخر پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”جی۔۔۔ سباعون زندگی میں پہلی بار اس کی تعریف کر رہا تھا، دل عجیب ہی دھڑکا۔ چہرے پر مسکراہٹ جم چکی تھی۔

”ڈھٹ ہو تو کوئی تمہاری طرح۔“ اس نے گلائی کی کلائی پکڑی تھی وہ سبھل نہ سکی تھی، حیران پریشان سی سباعون کا چہرہ دیکھ گئی جس نے اسے جھٹکے سے اپنے قریب کر لیا تھا۔ ”کیا کیا اٹھایا تھا وہاں سے۔“ گرفت اس قدر شدید ہوئی کہ اس کا بازو درد کرنے لگا، اس کی نیلی آنکھیں جھینکے لگیں۔

”بتاؤ۔“ وہ چلا اٹھا۔

”ایک کتاب اٹھائی تھی۔“ اس کی آواز بھی ڈبڈبانی لگتی تھی۔

”کیوں۔“ میری اجازت کے بغیر میری کتاب کیوں اٹھائی تھی۔“ وہ مزید پیش میں آیا۔

”سباعون“ کا کی اچانک ہی وہاں آئی تھیں۔

”ایک کتاب ہی تو تھی۔“ گلائی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ صرف ایک کتاب کے لیے اس کے ساتھ اس طرح پیش آ رہا تھا۔

”سباعون۔“ چھوڑ واس کا ہاتھ دیکھو اسے درد ہو رہا ہے۔“ کا کی نے گلائی کا ہاتھ سباعون کے ہاتھ سے چھڑوانا چاہا۔ لیکن گلائی سمجھ نہ سکی۔ درد ہاتھ میں زیادہ ہو رہا تھا یا دل میں، کچھ دیر پہلے دل میں پھینکنے والی خوشبو بد بو میں بدلنے لگی تھی۔

”ایک کتاب تھی۔“ سباعون اس کے جملے پر اٹک گیا۔ ”میرے کمرے سے بلا اجازت کتاب لیتی ہو اور کہتی ہو کہ صرف ایک کتاب تھی“ غصے سے وہ کاٹنے لگا۔ ”ابھی بتانا ہوں تمہیں کہ کیسے لگتا ہے“ اس نے جھٹکے سے گلائی کا بازو چھوڑا وہ بستر پر گر گئی اور اس کی کمرے کے چاروں طرف بنی نازک سی بک شیلف سے مختلف کتابیں اٹھانے لگا۔

”سباعون۔“ چھوڑو۔ پاگل ہو گئے ہو،“ کا کی

پر اور اکثر ایسا ہوتا وہ کوئی کہانی پڑھتی اور کوئی کردار اسے اپنا مسافر بنا لیتا اور بعد میں وہ اس کہانی میں وہ کردار ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک جاتی، لیکن نہ ملتا۔۔۔

”تو وہ کون تھا؟“ وہ سوچے جاتی۔
وہ بدل گئی تھی، سباعون گھر ہوتا نہ ہوتا وہ کمرے سے کم ہی باہر نکلتی کا کاٹنے سباعون کی ٹھیک ٹھاک خبر لی تھی اس کی کتابیں سزا کے طور پر سباعون سے ہی دوبارہ منگوائی تھیں وہ ان کے سامنے کچھ نہیں بول پایا تھا صرف بڑبڑاتا رہا گیا۔ لیکن اس سب نے بھی گلائی کے من کا لالہ کم نہ کیا تھا، سباعون کسی بھی رشتے کی صورت اس کے دل سے مکمل اتر گیا تھا، وہ اب اس کے لیے مکمل اجنبی تھا جسے گلائی کے وجود سے خواہ خواہ کی چیز تھی۔ اور اس سوچ کے تحت اس نے سباعون کے سامنے جانا ختم کر دیا تھا سباعون کو بھی اس چیز سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ لیکن اس واقعے نے گلائی کی سوچ یکسر بدل دی تھی۔

وہ تنہائی پسند ہو گئی تھی اور اسے خود بھی حیرت ہونے لگی تھی جب اس نے تنہائی میں بھی کئی بولیاں سنی تھیں۔ اس کا دل کرتا وہ یہ باتیں سنتی رہے اور اپنی ڈائری میں اتارتی رہے اور اس نے ایسا ہی کرنا شروع کر دیا تھا۔۔۔ خاموش منظر، خیال اور کردار سب لفظ بنتے گئے۔

☆☆☆

وقت کے سب سے نہیں ہوتے پر ہوتے ہیں، ہم لاکھ اسے قیام پذیر سمجھیں، پر اڑتا رہتا ہے اور ہمیں اس بات کا اس سفر مسلسل کا اس وقت احساس ہوتا ہے۔ جب منظر، اوقات، حیثیت، کردار سب بدل جاتے ہیں وہ سب بھی وقت کی اس اڑان سے بے خبر اپنے تئیں ایک بہت سست اور خاموش زندگی جی رہے تھے۔

سباعون پہلے بھی شہر جاتا تھا۔ لیکن جلدی جلدی گاؤں کے چکر لگایا کرتا تھا اب اسے مہینوں لگ جاتے تھے حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نے پارٹ ٹائم جاب بھی کر لی تھی۔ اسے پیسوں کی کمی ہرگز نہ تھی

سے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا، جب بالکل بے بس ہو گئیں تو تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئیں اس وقت صورت حال صرف خان ہی سنبھال سکتے تھے، سباعون نے مختلف کتابیں دونوں ہاتھوں کی گود بنا کر اس میں بھر دیں اور لمبے ڈگ بھر تاہر نکل گیا۔ توڑی ویر بعد ہی گلائی نے سامنے والی کھڑکی میں دھواں اٹھتے دیکھا تھا۔ صرف چند لمحوں بعد ہی وہ واپس پلٹا تھا۔

”بہ سستی ہمیشہ یاد رکھنا اب آئندہ میری چیزوں کو چھونے کی غلطی مت کرنا۔“ شہادت کی انگلی سے اسے وارن کرتا وہ باہر نکلا تھا۔ گلائی نے پاس پڑی سباعون کی کتاب اٹھائی اور بھاگ کر دروازے میں آنکھریں۔ آنسوؤں کی وہند میں بھی سباعون کی چوڑی پشت واضح تھی اس نے منہج کے کتاب اسے دے ماری تھی کتاب اس کی کمر میں لگی تھی وہ بلبلال کے مڑا تھا۔

”تیری تو۔۔۔۔۔“ وہ کف اڑاتا اس کی طرف آیا تھا گلائی نے تیزی سے دروازہ بند کر کے کٹدی لگائی۔ سباعون نے زور کی لات دروازے پر دے ماری تھی۔

”سباعون۔“ زمان خان کی تیز بھاری آواز نے اسے مزید کچھ بھی کرنے سے فی الحال روک دیا تھا۔ دروازے کے پیچھے گلائی ہچکچوں میں رو دی تھی۔

☆☆☆

جو کتابیں سباعون نے جلا دیں تھیں ان میں بہت سی کتابیں ایسی تھیں جو اسے خود سے بھی زیادہ عزیز تھیں، یہ مختلف ملکوں کی فیری ٹیلز اور مختلف دیسوں کی لوک کہانیاں تھیں اسے ان کہانیوں سے عجیب سی خوشی حاصل ہوتی تھی وہ جب بھی ان کہانیوں کو پڑھتی اسے اپنا آپ اس دور کا باسی لگتا سب کچھ اس کے سامنے ہونے لگتا۔

”وہ سب تھے ابھی یہاں میں نے خود سب کو بولتا، ہنستا، روتا محسوس کیا ہے،“
بھی وہ خود بھی چونک جاتی تھی اپنی حالت

۔ مین وہ ان لوگوں میں سے ہی نہیں تھا جو پر محسوس کی
کمانی پر گزارہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کے کئی
خواب تھے۔ اسے اپنے بل بوتے پر آگے بڑھنا تھا
ایک نام بنانا تھا دنیا میں ایک پہچان بنانا اس کا خواب تھا
۔ اس کے سب ہی راستے بے حد واضح تھے اور منزل
بے حد قریب روپے پیسے، سرمایہ کی اسے کمی نہ تھی،
تجربہ کی ضرورت تھی ایک کامیاب بزنس مین بننے
کے لیے، اور اس لیے اس نے یہ پارٹ ٹائم جاب
کر لی تھی۔

کا کا، کا کی دونوں مطمئن تھے، خوبصورت محنتی
بیٹا، اور مسکراتی کم گو سنجیدہ سی رہنے والی ہر وقت بہو
کے روپ میں نظر آنے لگائی۔۔۔

اور حقیقتوں کو اپنے اندر جذب کرتی لیکن ان
سے کوسوں دور کا فاصلہ رکھنے والی، خوابوں، جگنوؤں
اور ہواؤں کی ہمسفر کو مل سی گلائی۔۔۔ اس کا جنون
بھی اس کا ہم عمر رہا، ہم زاد رہا۔ وہ پہلے صرف پڑھتی
تھی۔ اب سب کچھ پڑھتی تھی۔۔۔

ڈائجسٹ، رسالے، اخبار، کتابیں۔۔۔ پہلے
صرف اردو پھر اردو نے اس کی ذہانت دیکھ کر اسے
انگلش کی ہلکی چھلکی کتابیں بھی لاکر دیں تھیں اسے
انگلش سے جان پہچان تھی وہ ذہین بھی تھی اور پھر
پڑھنے کا جنون بھی۔ تب ہی وہ دو ادیبوں کے لٹریچر تک
پڑھ لیتی۔

گھر میں کوئی مشین آتی یا الیکٹرانک کا کوئی نیا
سامان۔۔۔ ڈبے کے باہر سے لے کر اندر تک سارا
چھپا مواد پڑھ لیتی۔۔۔ کا کا، کا کی شاپنگ کے لیے شہر
لے جاتے تو وہ صرف دیواریں پڑھتی رہ جاتی کا کا،
کا کی خوبی پسند کر لیتے اس کے لیے چیزیں اور وہ
جلتے بجھتے سائن بورڈز، مختلف برانڈز کے ایڈز اور ہر
چیز پر لگے ٹیگ یوں پڑھتی جیسے وہ ان سب پر کوئی
ریسرچ کرنے وہاں آئی ہو۔۔۔

لیکن اب اس کا وطیرہ بدلنے لگا تھا۔ جنون نے
جمال کا رنگ رنگ اوڑھا۔ اور وہ لکھنے لگی اس نے
سب سے پہلے ایک کالے رنگ کی ڈائری پر لکھنا

شروع کر لیا، یہ ڈائری اسے کا کا نے نئے سال پہ محنتاً
دی تھی۔۔۔

جب بھی دل کرتا وہ اس ڈائری پر تحریر کر
دیتی۔۔۔
وہ صرف الفاظ کا مجموعہ نہ تھا۔۔۔ وہ کچھ مناظر
تھے جو بند کمرے میں اس پر اجاگر ہو جاتے تھے۔۔۔
کچھ کردار تھے جنہیں وہ نہیں جانتی تھی لیکن نہ جانے
کیسے ان سے تعارف تھا اس کا۔۔۔ کچھ حقیقتیں تھیں،
جن کا سامنا اسے بھی نہ ہوا تھا، پھر بھی اس نے مکمل
جزئیات کے ساتھ محسوس کی تھیں۔۔۔

”کچھ ہے۔۔۔ کچھ تو ہے۔۔۔“ کئی دفعہ اپنی
کیفیت سے گھبرا کے وہ کہہ جاتی۔ ”ضرور کچھ نہ کچھ
ہے جو میں نہیں جانتی۔“ وہ اعتراف کرتی۔

☆☆☆

درون تعلیم کے آخری مراحل میں تھا، تب ہی
آج کل کم ہی گاؤں آتا تھا، ان بندرہ مہینوں میں
گلائی سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی، اسے یہ
کول سی، نرم جذبات والی لڑکی بے حد عزیز تھی، وہ
اس کے لیے اب بھی کتابیں لاتا تھا، خوبصورت قلم
اور خالی کاغذوں کے بنڈل بھی دے جاتا۔

”جب بھی اندر سے آوازیں محسوس کرو، انہیں
اتار لیا کرو۔“ وہ اکثر اس سے کہتا۔

”اندر کی آوازیں؟“ وہ حیران ہوتی،
”ہاں۔“ آم کے پیڑ کے نیچے، گھنٹوں تک
پانچے چڑھائے، نہر میں پیڑ ڈبوئے وہ سوچتے ہوئے
جواب دیتا۔

”جب انسان کے باہر خاموشی چھا جائے تو
اندر کی آوازیں بے حد صاف ہو جاتی ہیں“ وہ اس کی
باتوں میں کھوسی جاتی تھی۔ اور اگر ان آوازوں کو نظر
انداز کر دی تو یہ چیخا شروع کر دیتی ہیں پھر بہت درد
ہوتا ہے، سب کچھ ہاتھ سے نکل جاتا ہے، تو بہتر یہ
ہے کہ ان کو غور سے سنا جائے اور اندر کی باتیں کاغذ پر
اتار دو تو اور بھی سکون ملتا ہے۔ اور گلائی کو تو اس سے
بات کر کے ہی سکون مل جاتا تھا۔ لیکن وہ اپنی کیفیت

کو سمجھ ہی نہیں پاتی تھی۔ وہ اٹھ کر جانے لگا تھا۔
 ”سنو“ پانی میں پاؤں مارتے ہوئے گلانی
 نے اسے نکارا، وہ رک کر مڑا۔ ”تم نہر کے اس طرف
 کیوں نہیں آتے؟“ وہ پوچھ بیٹھی درون دھیرے سے
 مسکرا دیا۔

”ابھی اس قابل نہیں ہوا نہ۔“ بھاری لہجے میں
 کہتا وہ واپس مڑ جاتا۔ گلانی اسے دیکھ جاتی۔

☆☆☆

اس کی ڈائری مکمل ہو گئی تھی پورے ڈیڑھ سال
 اس کے ساتھ ایک کردار نے چلتے چلتے آج دم توڑ دیا
 تھا، وہ کتنی ہی دیر کمرے میں بیٹھی روٹی رہی جب
 تھک گئی تو ڈائری سینے سے لگاے نہر کی طرف آگئی،
 ہیری کے درخت سے لگے جھولے پر بیٹھتے رہی اس
 کے آنکھیں پھر بھگنے لگیں۔۔۔

”وہ کیوں مر گیا۔؟“ اس نے پاؤں زمین پر
 مارتے ہوئے ننھا سا جھولا لیا تھا۔

”کیونکہ تم نے مار دیا۔۔“ اندر سے آواز آئی۔
 ”میں اس سے اتنی محبت کرتی ہوں۔۔۔ میں
 اسے کیوں کر مار سکتی ہوں“ وہ رونے لگ گئی۔ وہ کتنا
 پیارا تھا۔۔ کتنا پیارا بولتا تھا، مجھے جانتا تھا۔۔ میں
 اسے جانتی تھی۔۔ اسے سمجھتی تھی۔۔ پھر بھی آخر میں
 وہ۔۔۔“ وہ خود کلام تھی۔

”تم نے تو بس میرا دل ہی توڑ دیا،“ اس نے
 دل ہی دل میں اس کردار سے شکوہ کیا۔

”گلانی۔“ کسی نے دور سے اسے نکارا، اس
 نے چونک کر دیکھا، نہر کے اس پار درون کھڑا تھا،
 اس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں، وہ ڈائری تھا اسے اٹھ
 کر وہیں چلی آئی،

”میں واپس جا رہا تھا، سوچا یہ کچھ کتابیں تمہیں
 دے دوں،“ اس نے کتابیں اس کی طرف بڑھائیں
 ، گلانی نے تمام لیں،

”اس بار جلدی لوٹا دوں گی،“ وہ اداسی سے
 بولی۔

”مجھے جلدی آنے کا کہہ رہی ہو؟“ وہ مسکرایا۔

نئی آنکھوں نے اس کی طرف دیکھا، وہ ہمیشہ کی
 طرح جلدی سے نظریں پھیر گیا، وہ قبول کریتا تھا ان
 آنکھوں کی تاب لانے کی جرأت اس میں نہ تھی۔۔۔
 بالکل بھی نہیں۔

”گلانی۔“ کوئی دھاڑا تھا، گلانی کا پی اور اس
 کے ہاتھ سے ساری کتابیں چھوٹ کے زمین پر گر
 پڑیں۔ اس سے پہلے کہ درون کچھ سمجھتا، سباعون
 دوڑتا ہوا ان دونوں کے قریب آیا تھا۔

”بے غیرت انسان۔“ سباعون پاگلوں کی
 طرح درون پر بل پڑا تھا وہ جو بالکل ہی انجان تھا، ا
 س اچانک اتفاق سے نہ سنبھل سکا تھا، اور زمین پر گر
 پڑا تھا۔ سباعون اسے کمر میں لائیں رسید کرنے لگا،
 گلانی میں ایک دم سے ہی بجلی سی دھڑی تھی، سارا
 خوف، سارا ڈر جھاک کی طرح بیٹھ گیا تھا، اس نے
 سباعون کے قریب آ ساتھ لگتے ہوئے اسے درون
 سے پرے دھکیلا تھا۔

”درون۔ جاؤ تم یہاں سے،“ وہ چلائی۔
 ”میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں“ سباعون پھر اس کی
 طرف لپکا تھا، گلانی سے اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔
 ”سباعون۔“ وہ زور سے چلائی تھی، اور ایک
 زمانے دار پتھر اس کے منہ پر دے مارا تھا، سب ہی
 ساکت ہوئے تھے، خود گلانی دونوں ہاتھ منہ پر رکھے
 جبرنگی سے اسے دیکھ رہی تھی، جو گال پر ہاتھ رکھے
 جلتی آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا، درون کپڑے
 جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں صرف گلانی
 کے لیے لکڑھی۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ سباعون نے گلانی کا
 ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتے ہوئے نہر کے اس پار لے
 گیا۔

”سباعون۔ چھوڑو مجھے پلیز“ وہ کہتی رہ گئی
 درون نے غم آنکھوں سے نیچے گریں کتابوں کو دیکھا
 اور ایک ایک کر کے اٹھائے لگا، جب ہی اس کی نظر کالی
 ڈائری پر پڑی تھی، اس نے کچھ سوچتے ہوئے وہ
 ڈائری بھی اٹھالی اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

دیکھا۔ پھر کھڑکی کی طرف جا کر پردے ہٹا دیے اور کھڑکی کے دونوں ہت کھول دیے روٹی اور ٹھنڈی ہوانے تاریکی اور جس کو مات دے دی تھی، وہ مڑ کر گلائی کے پاس بیٹھ پرآ کے بیٹھ گئے۔

”میرے خیال میں ردنا کسی بھی مسئلے کا حل نہیں۔“ دونوں ہاتھ چھڑی پر جمائے وہ اسے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”اور خاص کر بات آپ کی عزت نفس کی ہے۔ تب تو ہر گز نہیں۔“ وہ سر جھکائے ردنی رہی ”درون آ گیا تھا آج“ انہوں نے سوچا وہ ضرور چونکے گی لیکن وہ اس طرح ردنی رہی۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، وہ میرے سامنے آ سکتا ہے“ وہ مزید بتانے لگے۔

”کیونکہ میرے مطابق وہ ضرور شرمندہ ہوگا۔ اور کیونکہ وہ ہمارے ایک مزارعے کا بیٹا ہے تو شاید خوف زدہ بھی۔“ وہ چھڑی کو گھما رہے تھے۔ ”لیکن نہ وہ شرمندہ تھا اور نہ ہی خوف زدہ۔“ چھڑی رک گئی تھی ”وہ تمہارے لیے کتابیں لاتا ہے بلکہ اپنی کتابیں تمہیں دیتا ہے اور پھر جب بھی واپس آتا ہے۔ کتابیں لے لیتا ہے۔“ گلائی رد رہی تھی۔ ”کتابوں کے علاوہ تمہاری کوئی بات نہیں ہونی اور نہ ہی کبھی تم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کبھی کوئی لمبی چوڑی گفتگو کی ہے تمہیں کتابوں کا جنون ہے اور تم اس جنون میں اس کے پاس بھاگ کر پہنچتی تھیں۔ اور ہم سب گواہ ہیں کہ کتاب واقعی تمہارا جنون ہے“ وہ بولتے گئے۔ ”یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن مجھے اس کی صرف ایک بات نے متاثر کیا۔“ گلائی کا سسکنا کم ہو چکا تھا۔ غبار چھٹنے ہی والا تھا۔

”اس نے جاتے جاتے مڑ کر کہا تھا کہ اگر بات صرف اس کی ذات تک ہوتی تو وہ کبھی اپنے کردار کی وضاحت دینے نہ آتا لیکن بات گلائی کے کردار کی تھی، جب ہی وہ وہاں آیا اور وضاحت دی۔“ وہ اٹھ کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگے۔ ”وہ تو چلا گیا اور میں۔“ وہ واپس مڑے تھے۔

”میں صرف یہ سوچتا رہا کہ ایک باہر کے آدمی کو تمہارے کردار کے لیے وضاحت دینی پڑی

سباغون کا غصہ آج آسمان کو چھو رہا تھا کا کا، کا کی دونوں ہی گھر پر نہیں تھے۔ اس نے گلائی کو اس کے کمرے میں روک کر دیا تھا اور ملازموں کو بھی اس کو کچھ بھی دینے سے منع کر دیا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان دونوں کو گولی مارو تیز مان خان واپس آئے تو اس کی زبانی سارا ماجرہ سن کر چند لمحے کو بالکل بول ہی نہ سکے۔

”میں یہ نہیں مان سکتی“ کا کی نے تو صاف رو کر دیا۔ ”یہ ہی۔۔ یہ ہی باتیں ہیں آپ کی جس نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ خاندان کی عزت تک نیلام کرنے پر آگئی ہے وہ۔“ سباغون بھڑک اٹھا۔

”آواز پنی رکھو سباغون۔“ زمان نے کھڑے ہوتے ہوئے، دلی زبان میں چیخے ہوئے اسے حکم دیا۔ ”باد رکھو۔“ بھی بھی معاملہ اتنا بڑا نہیں ہوتا جتنا ہم سمجھ لیتے ہیں اور جذباتیت سے اسے بڑھا دیتے ہیں۔“ انہوں نے سباغون کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے سمجھایا، وہ خاموش رہا۔

”گلائی میری ذمہ داری ہے ابھی میں زندہ ہوں، تم اس معاملے میں نہ پریشان ہو اور نہ ہی اپنی عجلت پسند طبیعت کے ہاتھوں اس معاملے کو مزید بگاڑو۔ مجھ پورا یقین ہے گلائی میری تربیت کو شرمندہ نہیں کرے گی۔“ ان کی بات پر وہ سر ہلا گیا۔

☆☆☆

کمرے میں اندھیرے کا راج تھا، کھڑکیوں پر لگے گہرے رنگ والے پردے سورج کی ننھی سی کرن کو بھی اندر نہیں آنے دے رہے تھے، سب لائٹس آف تھیں، جب ہی دن میں رات کا گمان ہونے لگا تھا۔

ہلکی سی آواز کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا تو ایک لخت سارا کمرہ روشنی سے بھر گیا، بستر پر بیٹھی گھٹنوں میں سرویلے اس نے سر اٹھا کر آنے والے کو دیکھنے کی زحمت نہ کی تھی، زمان خان کی بانس کی چھڑی کی آواز ان کے آنے کا پتا خوب دے رہی تھی انہوں نے ذرا دیر رک کر ہلکے سے کھاتے اس وجود کو

ہمارے لیے اس منظر میں کوئی دل کشی نہ ہو، ہماری نظر کو بس وہ ہی سب سے حسین لگتا ہے۔ اس وقت سباعون آفریدی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اسے یوں نہیں مکتا چاہ رہا تھا۔ لیکن نظریں پلٹنے سے انکاری تھیں۔

”مجھے تمہارے بارے میں شاید ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”شاید نہیں۔ یقیناً آپ کو میرے بارے میں ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔“ اب کی بار اس نے بھی سباعون کی طرف دیکھا تھا، میلی ردی جیسی عمرانی بھی سباعون کی آنکھوں سے، ٹھنڈی میٹھی سی روشنی۔۔۔ مڑ جانے اس کے اندر کیسا سکون سرایت کرنے لگا وہ سر جھٹک کے رخ پھیر گیا۔

”کیا ہم یہ بات بھول سکتے ہیں۔“ ٹھہرا ہماری لہجہ۔ ”کیا آپ شرمندہ ہیں؟“ وہ دوبارہ نہر کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”شاید۔“ وہ اٹھ کر چند قدم آگے جا کر رک گیا، گلابی کی نظریں اب اس کی چوڑی پشت پر جمی تھیں۔ ابھی ابھی ایک چھوٹا سا اعتراف غلطی کی غلطی کم کر دیتی ہے۔“ وہ بھی اٹھ کھڑی اور حویلی کے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

”گلابی۔“ سباعون کی تیز پکار پر وہ رکی لیکن مڑی نہیں وہ تیز قدم اٹھاتا اس کے قریب آ گیا، حویلی کی دیوار کی بنیاد میں لگے اتار کے درخت پر پھول آچکے تھے اس نے ہاتھ بڑھا کر کئی پھول ایک ساتھ اتار لیے اور گلابی کے سامنے آ گیا اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور گلابی کا ہاتھ تمام لیا پھر دوسرے ہاتھ سے سارے پھول اس کی کھلی تھیلی پر پھیلا دیے بے اختیار ہی اس نے سارے پھولوں کو سینے کے لئے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنالیا۔

”آتم سوری“ وہ مسکراتا تھا اور پھر لمبے ڈگ بھرتا حویلی کے اندر غائب ہو گیا، گلابی دیر تک ان ادھ کھلے پھولوں کو دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

اور وہ دے بھی گیا تو ہم گھر کے لوگ تم سے وضاحت لینے والے کون ہوتے ہیں۔“ وہ اس کے قریب آ کر رک گئے۔ ”وضاحت تب ضروری ہوتی ہے جب رشتوں سے اعتبار اٹھ جائے اور میں خود سے زیادہ تم پر اعتبار کرتا ہوں مجھے وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں نہ ہی سوال جواب کی، تم جانتی ہو نہ گلابی۔“ انہوں نے محبت سے پکارا تھا۔ گلابی نے سر اٹھا کر لال نگاہوں سے ان کو دیکھا تھا، پھر ان سے لپٹ کے رودی بھی زمان نے اپنا دایاں ہاتھ اس کے گرد پھیلاتے ہوئے اسے تحفظ فراہم کیا تھا۔

☆☆☆

دن ڈھل رہا تھا۔۔۔ شام پر پھیلا رہی تھی۔۔۔ سورج کی تاریخی کرین ستاروں کی طرح قطار در قطار جھلجھلائی نہر کے پانی کو عجب سی چمک بخش رہی تھیں۔۔۔ وہ نہر سے کافی فاصلے پر رکے سگی تخت پر بیٹھی محویت سے غروب ہوتے سورج کی کرنوں کی لپک جھپک دیکھ رہی تھی، کہ کوئی اس کے بے حد قریب آ بیٹھا تھا ”بولے“ کی مہکتی خوشبو نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا اسے رخ پھیر کر اس شخص کو دیکھنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔۔۔ وہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔۔۔

وہ بھی خاموش رہا۔۔۔ پھر ذرا سا جھکا۔۔۔ نیچے بڑے کچھ پتھر گھاس میں سے چنے اور پھر سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”میں نہیں جانتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟“ اس نے ایک پتھر نہر کی طرف اچھالتے ہوئے خاموش بیٹھے پانی کے ساتھ ساتھ اپنی خاموشی بھی توڑی تھی۔

”آپ ہمیشہ نہیں جانتے کہ آپ کیوں کرتے ہو ایسا۔“ وہ ابھی بھی نہر کو ہی دیکھ رہی تھی، سباعون نے ایک گہری نگاہ اس کے سر پر پڑائی تھی۔ سی گرین کاٹن کے سادہ سے سوٹ پر جار جٹ کا سرخ دوپٹا، اس کے خوب صورت چہرے کو عجب سی دل کشی عطا کر رہے تھے، وہ بلا ارادہ ہی دیکھے گیا۔ اور زندگی میں کئی بار ہوتا ہے ایسا کہ نگاہ پلٹنا ہی نہیں چاہتی،

کچھ سوچنے لگا۔ پھر اچانک ہی خیال سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں، تھوڑی دیر بعد ہی وہ فیس بک پر ایک نیا جج بنا رہا تھا، ”کل آفریدی رائٹر“ وہ ڈائری میں سے کچھ اہم اقتباس نکالنے لگا جو اسے جلدی سے تصویری شکل میں ڈھال کر گروپ اور جج پر پوسٹ کرنے تھے اس نئی رائٹر کو متعارف کروانے کے لیے۔۔۔

☆☆☆

وہ حیرت سے اس خاکی لفافے کو نکلے جا رہی تھی جس پر اس کا نام لکھا تھا۔ ”کل آفریدی“۔ یہ کس نے بھیجا تھا اور کیوں؟

اس نے نیچے پڑے ان چند ہزار کے نوٹوں کو بھی اسی حیرت سے دیکھا تھا کسی نے اسے پیسے بجوائے تھے، ساتھ ہی رسید پڑی تھی۔۔۔ اس نے وہ رسید اٹھالی۔

”ماہنامہ ”جہاں“ کی طرف سے آپ کے ناول کا اعزاز یہ۔۔۔ 5000 روپے“ پڑھ کے حیرت اور کئی گنا بڑھ گئی۔

اس نے تیزی سے خاکی لفافہ کھولا اور اندر سے رسالے نکال لیے، ماہنامہ ”جہاں“ اس کے سامنے تھا اس نے فہرست نکالی۔۔۔ اور تیز تیز نظر ڈالے گئی اور پھر ایک جگہ آکر اس کا ہاتھ جیسے جم گیا۔ مکمل ناول۔۔۔ کل آفریدی۔

وہ دیکھے گئی۔۔۔ دیکھتی رہی۔۔۔ پھر تیزی سے صفحے پلٹتی اپنے مطلوبہ صفحے پر پہنچی۔۔۔ شاید کوئی اور ہو۔۔۔ شاید کچھ اور لکھا ہو۔۔۔ وہ تیز تیز پڑھنے لگی اور یہ سالہ اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا وہ اس کی ہی تحریر تھی، وہ بھلا اپنے لفظ کیسے بھول سکتی تھی وہ اس کا اپنا اندازہ ہی تو تھا مگر یہ سب کس نے کیا۔۔۔؟

سباغون۔۔۔؟ خیال آیا۔

”بکشی نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکتا۔“ دل و دماغ دونوں نے نفی کی، ”تو پھر۔۔۔؟“ وہ سوچے گئی اور اچانک ہی اسے یاد آیا کہ وہ یہ سب لفظ کہاں چھوڑ کے آئی تھی۔۔۔ نہر کے پار گری اس کی کالی ڈائری

دو پہر بس گھٹنے ملی تھیں، کمری ستم ہوتے ہی گاؤں کی رونق بھی بڑھنے لگی تھی، دن چڑھتے ہی گلیوں میں چھا جانے والا سناٹا اب بچوں کی چکاروں نے ختم کر ڈالا تھا، گیلی مٹی سے لپ کیے گئے صاف سحرے کئے محن کے پتوں بیچ برگد کے بیڑ کے نیچے بنے پتھر تلے تخت پر بیٹھی ہاتھ میں پین رجسٹر لیے وہ تیزی سے نہ جانے کیا لکھے جا رہی تھی۔ اس کے لکھنے کی اسپید بھی اس قدر تیز تھی جس قدر بڑھنے کی۔۔۔

”گھلائی۔۔۔ تم نے کسی کو نمبر دیا تھا اور گھر کا ایڈریس۔“ کا کا کی حیران آواز پر وہ چونکی تھی، نظر اٹھا کر دیکھا ان کے ہاتھ میں کچھ تھا۔

”نہیں کا کا۔“ وہ فنی میں سر ہلا گئی۔

”کیا ہوا ہے؟“ نہ جانے کیوں اس کا دل دھڑک اٹھا۔

”شہر سے تمہارے لیے کچھ آیا ہے۔“ انہوں نے پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ شاکدہ رہ گئی تھی۔

☆☆☆

شام سے رات ہوئی اور رات سے فجر۔۔۔ اسے خبر تک نہ ہوئی تھی وقت کی۔۔۔ ڈائری کب شروع ہوئی کب ختم۔۔۔ کچھ پتا نہ تھا، لفظوں اور کرداروں کا ایک سحر تھا، جس نے اسے جکڑ لیا تھا، وہ خود بچپن سے کہانیوں کا دلدادہ تھا، کس ملک کا ادب تھا جس سے وہ ناواقف تھا۔ تاریخ سے لے کر فکشن تک کی ہر کتاب پڑھتا جیسے اس پر فرض تھا، تمام تر تہمت ترین اسٹڈی شیڈول کے باوجود اس کا یہ شوق نہیں مر پایا تھا، بلکہ اس نے سوشل میڈیا پر اپنے پسندیدہ رسالوں کے گروپ اور پیجز بھی بنالئے تھے، کہانی کو اس سے اچھا بھلا کون سمجھ سکتا تھا۔

اور یہ کہانی۔۔۔۔ اس نے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ ”کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ مسودہ ایک ان پڑھ لڑکی نے لکھا ہے۔ جو صرف اپنے جنون کی تسکین کرتی رہی اور جنون کب تکمیل اور جمال کو پہنچا شاید اسے خود بھی خبر نہ ہو۔“ وہ مسکرا دیا تھا۔

اس نے ڈائری بند کر کے تھوڑی سے لگائی اور

۔۔۔ جسے نہ جانے کتنی بار میں نے وہاں جا کر ڈھونڈا تھا وہ رسالے اور پیسے اٹھانے لگی۔
 ”میں تمہارا کون کون سا احسان چکاؤں گی درون۔۔۔“؛ خود کلامی کرتے ہوئے وہ کا کا کو حقیقت بتانے چل دی تھی۔

☆☆☆

سباعون کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ وہ شہر میں اپنا کاروبار شروع کرنا چاہتا تھا۔ ان چند ماہ میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ سباعون اور گلائی میں کافی دوستی ہو چکی تھی، اور انہوں نے جانا تھا کہ کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہوتا، ہر دفعہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ مفاہمت کرنی پڑتی ہے۔ جب ہی زندگی نارمل رہتی ہے اور خوب صورت۔۔۔

گلائی اب بھی لکھتی تھی، پڑھتی تھی لیکن اب وہ باقاعدہ کا کا کی اور ایڈیٹر کی حوصلہ افزائی کی بدولت خود کہانیاں بھجوانے بھی لگی تھی۔ اور ایڈیٹر کی زبانی ہی اسے پتا چلا تھا کہ اس کی کہانی اس کی کسی دوست نے ان تک پہنچائی تھی، خاص طور پر پڑھنے کے لیے کہ یہ ایک بہت خاص چیز تھی اور انہوں نے بھی اس کی کہانی کو خاص ہی پایا تھا۔ بھی فوراً شائع بھی کر دی تھی، قارئین نے اس کہانی کو اس قدر پسند کیا تھا کہ ایڈیٹر اب اس سے باقاعدہ فون کر کے کہانی منگوا لیا کرتی تھیں۔

درون کہاں سے آیا تھا کیوں آیا تھا اس کی زندگی میں، کہاں اور کیوں چلا گیا تھا، اس نے سب اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔

”اگر میری زندگی میں اس کا کوئی کردار ہے تو وہ ضرور واپس آئے گا۔“ وہ اکثر خود سے کہتی۔۔۔
 ”بھئی پڑھتی رہتی ہو بھئی لکھتی رہتی ہو، کیا ہوتم یار۔“ وہ چھپت پڑھتی لکھ رہی تھی جب سباعون اس کے قریب آ کے بیٹھ گیا۔

”ایسے ہی کاغذ کالے کرتی رہتی ہوں۔“ وہ مسکرائی، وہ اس کے دھنک رنگ مکان میں کھوسا گیا۔

”کاش کچھ تعلیم حاصل کر لی ہوتی۔ تو یہ کالے

صفحے تمہاری پہچان بن جاتے۔“ سباعون کے لہجے میں تاسف بھر گیا۔ وہ خاموش رہی۔ ”کچھ تو بن جاتیں۔ مستقبل بن جاتا۔“
 ”پہچان کالے صفحاتوں سے نہیں بنتی۔ پہچان خود کو کھونے اور اپنے اندر سے مضبوط تعلق سے بنتی ہے۔“
 تو یہ ہے باتیں تو فلاسفر کی طرح کرتی ہو۔“ وہ دونوں ہاتھ پیچھے لے کر جا کر ان کے سہارے ٹیک لگا کر تقریر پالیٹ گیا۔

تلاش کر کے حاصل کیے گئے علم سے بندہ فلاسفر ہی بنتا ہے۔ ورنہ آپ کی ڈگری والے تو ڈاکٹر، انجینئر یا کچھ اور۔۔۔“ وہ ذہین اور حاضر جواب تھی، سباعون نے اعتراف کیا۔

”پھر بھی اگر تم نے معیاری تعلیم حاصل کی ہوتی تو یقیناً مستقبل میں بہت آگے جاسکتی تھیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا، گلائی نے چونک کر اسے دیکھا پھر اپنے کاغذ سمیٹتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آنے والے دنوں کے لیے سوچا ضرور کرتے ہیں۔ مگر پریشان نہیں ہوا کرتے۔ اللہ یہ چھوڑ دینا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ وہ سب اچھا کرتا ہے۔“ مسکرا کر کہتے ہوئے وہ میز ہیوں کی طرف بڑھ گئی۔ سباعون کی نظریں اس کے کھلے لمبے سیاہ بالوں سے الجھ کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

”گلائی بہت بدل گئی ہے نا۔ سیانی ہو گئی ہے کافی۔“ خشک سبز جانے سے شہنیاں چپتے ہوئے کا کی نے زمان آفریدی کو مخاطب کیا تھا۔

”نہیں۔ سباعون بدل گیا ہے۔ کافی سمجھ دار ہو گیا ہے۔“ لیٹے لیٹے ہی انہوں نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔
 ”جو بھی ہے۔ اچھا ہے۔“ انہوں نے صاف کی ہوئیں چٹاں اٹھتے پانی میں ڈال دیں۔

”ایک دوسرے کو سمجھنے لگے ہیں۔ ہمارا خواب لگتا ہے جلد تعبیر پانے والا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے

”ان شاء اللہ۔۔۔ ان شاء اللہ!“ کا کی نے

فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

”بس ایک مرتبہ سبامون شہر میں اپنا بزنس شروع کرنے والا خواب پورا کرے۔ تو خوشیاں اس گھر کا مقدر بن جائیں گی۔“

”آپ کو دیے سبامون سے اس بارے میں بات کرنی چاہیے تھی۔“ قہرہ ان کو تھماتے ہوئے کاکی نے صلاح دی۔

”فی الحال تو وہ بالکل بھی نہیں مانے گا، اسے شہر میں سیٹل ہو جانے دو دیے بھی میں اس کی طرف سے بے فکر ہوں، کسی لڑکی کو پسند کرتا تو اب تک بتا چکا ہوتا میرے خیال میں تو اسے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“ انہوں نے اندازہ لگایا۔

”نیا در رہے خان، آج کل کے بچوں کا کچھ پتا نہیں چلتا۔“ کاکی نے کہا تو وہ سر ہلا گئے۔

”پھر بھی جس طرح سے وہ اب گلابی کا خیال رکھنے لگا ہے، میرے خیال میں یہ ہی اس کی پسندیدگی کا اظہار ہے۔“

”میں تو یہ ہی کہوں گی کہ اس سے بات کر لیں۔ گلابی کے لیے پوری برادری سے بڑے اچھے رشتے آرہے ہیں۔ ایسا نہ ہو بے خبری میں مارے ہی جائیں ہم۔“ ان کی بات میں وزن تھا۔

”اس بار رہنے دو۔ اگلی بار آئے گا تو بات کر لوں گا۔“ انہوں نے بات ختم کر دی تھی، کھڑکی کے قریب بیٹھی گلابی اس نئے حوالے کو سوچے جا رہی تھی۔۔۔ اور اس کے اندر جیسے واقعی خوشی کے پھول کھلنے لگے تھے، وہ اپنی کیفیت سمجھ نہیں پا رہی تھی۔۔۔

☆☆☆

رات جس قدر سیاہ تھی، ستاروں کی ٹٹمٹماہٹ اسی قدر تیز اور چمک دار، آج آسمان صاف تھا اور چاند ستاروں کی ہموائی میں بے حد خوب صورت۔۔۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے نہ جانے کب سے ان کو دیکھنے میں مگن تھی، جب سبامون کے آنے پر اسے چونکا دیا۔

”تم انچر سے کتنی محبت کرتی ہوتا۔“ چھت کی

نقصی دیوار سے ٹپک لگاتے ہوئے اس نے پاؤں کی قینچی بنائی تھی۔ اور دونوں ہاتھ پیچھے موڑ کے دیوار پر لٹکا دیے تھے۔ گلابی نے ایک گہری نظر اس کے سر پر ڈالی تھی ملائی جیسی سفید رنگت، صاف اور فیر اسکن، ہمیشہ کی طرح ذرا سی بڑھی شیو، کھڑی ناک اور بڑی بڑی کالی آنکھیں۔۔۔ وہ کس قدر خوب صورت تھا۔۔۔ وہ اسے دیکھے گی۔

”اگر مونچھ نہ ہو تو بالکل کوئی ہیرہ لگے“ دل میں خیال آتے ہی وہ خود بخود مسکرا دی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو۔۔۔“ سبامون نے اسے چپ چاپ گھڑے دیکھا تو پوچھ لیا،

”بھئی کہ آپ کس قدر خوب صورت ہیں۔“ وہ صاف گٹھلی خور اُبتا دیا، سبامون کا قہقہہ جاندار تھا۔

”شاید۔۔۔ میں نے اتنا خوب صورت مرد نہ دیکھا نہ سوچا۔“ گلابی نے اعتراف کیا۔

”دردن بھی نہیں“ گلابی کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔ وہ جواب نہ دے پائی تھی۔

”میں مذاق کر رہا تھا۔“ وہ مسکرایا۔ ”اچھا ٹھہر دو تمہیں ایک چیز دکھانا ہوں“ اسے اچانک جیسے کچھ یاد آیا تھا۔ وہ اپنی جینز کی پائکس میں کچھ تلاش کر رہا تھا،

گلابی بد دل سی اسے دیکھے گی نہ جانے کیوں اس کا دل ایک دم سے ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔

دردن کا اس کی زندگی میں کوئی کردار تھا یا نہیں لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ اسے اس کی خود کی تلاش کا سرا بردردن نے ہی پکڑا تھا۔ اپنی ذات سے آگاہی

بھی ایک نعمت ہے اور یہ نعمت دردن کی ہی بدولت اسے حاصل ہوئی تھی، جو کچھ اپنے اندر اتنے سالوں سے وہ ذخیرہ کرتی رہی اسے باہر کا راستہ دردن نے

ہی دکھایا تھا، اللہ جب بھی کسی انسان کی مدد کرتا ہے، کن کہہ دیتا ہے یا وسیلے بنا دیتا ہے دردن اس کے لیے ایسا ہی ایک وسیلہ تھا لیکن وہ اسے بھول کیسے گئی تھی، اسے خود پر غصہ آنے لگا تھا۔

”یہ دیکھو“ وہ چونکی اس کے ہاتھ میں بے حد خوب صورت پین تھا۔ ”یہ میں تمہارے لیے لایا تھا

119 نومبر 2017

دینا ہی بھول گیا۔“ ہمیں ساؤلڈن پنن بے حد خوب صورت تھا۔ اس نے نرمی سے وہ پنن تمام لیا۔“ اور یہ بھی تمہارے لیے،“ سونے کا خوب صورت نازک بریسلیٹ اس نے اتنی اچانک اور تیزی سے اس کے دائیں ہاتھ میں ڈالا تھا کہ وہ ساکت کھڑی رہ گئی، سنہری بریسلیٹ مرمریں کلائی پر جیسے جھپکنے لگا تھا، گلائٹی کی آنکھوں میں ستائش کے رنگ ابھرے تھے۔
 ”داؤ، تمہارے ہاتھ بہت خوب صورت ہیں،“ سباعون کہے بنا نہ رہ سکا تھا۔ وہ خاموشی سے بریسلیٹ کو دیکھنے لگی۔

”تمہیں پسند آیا میرا گفٹ۔“ اس نے پوچھا۔
 گلائٹی سر ہلائی۔

”میں نے سوچا تھا تم تعریف کر دو گی۔“ وہ پھر سے سینے پر ہاتھ باندھ گیا۔

”شاید میں حیران بہت ہوں، تب ہی۔۔۔ آپ نے کبھی کچھ گفٹ کیا بھی تو نہیں۔“ اس کی بات پر وہ ہنس دیا۔

”چلو اب نیچے جا کر سو جاؤ، کافی رات ہو گئی ہے۔“ سباعون نے کہا تو وہ سر ہلا کر نیچے کی طرف بڑھ گئی۔

”اس گفٹ کو کچھ اور نہ سمجھ لینا۔ تم میری کزن ہو بس اس لیے دل کیا کہ تمہیں کوئی تحفہ دوں۔“
 ”میں جانتی ہوں۔“ وہ کہہ کر نیچے سیزہیاں اتر گئی، وہ وہیں کھڑا نہ جانے کسے تلاش ہا۔۔۔

☆☆☆

سردیاں اس بار بہت دیر سے آئی تھیں، لیکن پورے جون سے سرشام دھند اترتی تو اگلے دن ددپہر کے قریب جا کر کہیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوتا انسان۔

موسم کوئی بھی ہو اس کی کمزوری رہا تھا گرمی کی طویل ددپہر، تپتی دھوپ سے نبرد آزما اونچے نیچے درخت اور چھاؤں تلے رکھے برتنوں سے پانی پیتے بے تاب پرندے۔۔۔ وہ گرما کے حسن کی دل دادہ ہو جاتی۔

خزاں میں جب ہر طرف خشک، سوکھے پتوں کی برسات ہوتی تو وہ دیر تک نیچے پاؤں چلتی، پتوں کی چرچاہٹ سے جیسے خزاں کے حسن کو سلامی دیا کرتی ہمارے آتے ہی ایک ایک پودے کو دیدارہ سے زندگی پاتے اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور چھوٹی۔ اور سر ہا۔۔۔ جس دھند میں ٹریفک تک معطل ہو جاتی اس دھند میں نہ جانے وہ کیسے کیسے انوکھے رنگ دیکھ لیا کرتی، پتوں کی ٹھنڈی اور شاخوں سے چمٹا کٹہرا اسے پریوں کا مسکن لگنے لگتا۔ جو صرف چند دنوں کے لیے دہاں بنایا گیا تھا۔ بخشنی قندوں سے بنا گھر۔

ابھی بھی کافی دھندھی لیکن منظر صاف ہونے لگے تھے۔ وہ چادر لیے نہر کی طرف آگئی، ٹالی کے درخت کے تنے سے ٹپک لگا کر اس نے نہر کے اس پار دیکھا کتنے ہی منظر واضح ہونے لگے تھے۔ وہ دردن کی کتابیں چیک کر رہی تھی اور وہ مسکرا رہا تھا۔ بکریوں کے ریوڑ میں پھنسی یعنی دردن کی سائیکل اور بکریوں کو ادھر ادھر کرنی آگے بڑھتی وہ خود۔۔۔ اس کے لب مسکرا دیے۔

”اتنی سردی میں یہاں کیا کر رہی ہو۔“ سوچوں میں غرق گلائٹی کو خبر تک نہ ہوئی تھی کہ سباعون کب دہاں چلا آیا تھا۔

”میں یہاں آتے وقت موسم کا خیال کبھی نہیں کرتی۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کے مسکرائی۔ ”مجھے یہاں سے نہر کے اس پار کا منظر بہت پیارا لگتا ہے“ وہ اب ایک مرتبہ پھر سامنے دیکھ رہی تھی۔ نہر کے پار۔

وہ تمہیں اتنا یاد آتا ہے۔“ سباعون کی آواز بھاری سی لگی اسے۔
 ”کون“ وہ واقعی نہیں سمجھ پائی تھی۔
 ”دردن۔“ گلائٹی نے دیکھا اس کی آنکھیں

سرخ ہو رہی تھیں۔
 ”مجھ تو لگتا ہے وہ آپ کو بہت یاد آتا ہے۔“ وہ کھلکھلائی۔

”مجھے تو اکثر یاد آ جاتا ہے۔ خاص کر تمہیں ان جگہوں پر اس طرح گھویا ہوا دیکھ کر۔“

ہم نے ساری تیاری مکمل کر رکھی ہے، انہوں نے نفی دی۔
 ”لیکن میں ابھی دینی طور پر شادی کے لیے تیار
 نہیں، پھر ابھی۔۔۔“ وہ ڈنڈا رکھا۔

”صاف بات کرو بر خوردار۔۔۔“ زمان کی تیز
 نظریں اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”میرا مطلب ہے بابا ابھی میں اپنے شوق کی
 تکمیل کرنا چاہ رہا ہوں اور پھر ابھی میں نے یہ بھی
 ڈیسیائیڈ نہیں کیا کہ میں شادی کس سے کروں گا۔“

”شوق تکمیل کے قریب ہی ہے اور رہی بات
 لڑکی کی تو یہ فیصلہ کب کا ہو چکا۔ تمہیں اس کے لیے فکر
 مند ہونے کی ضرورت نہیں یہ انہوں نے حتیٰ فیصلہ سنایا۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ پھر حیران ہوا۔

”تمہاری اور گلائی کی بات بچپن سے طے ہے
 اس وقت سے جب تمہارے چاچا اور دادا زندہ تھے۔
 اور یہ ان کا فیصلہ تھا۔“

”کیا یہ؟“ وہ چلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”اس میں اتنا اچھلنے والی کیا بات ہے، گلائی
 اس گھر کی بیٹی ہے۔ نیک ہے شریف ہے، خوب صورت
 ہے۔“

”لیکن گلائی میرے قایل نہیں ہے بابا؟“ اس
 نے زمان کی بات کاٹ دی تھی لمبے برآمدے سے
 متصل بچن سے باہر آتی گلائی ساکت ہوئی تھی۔
 ”مطلب کیا ہے تمہارا سباعون۔۔۔؟“ زمان کو
 طیش آ گیا۔

مطلب بہت صاف ہے بابا آپ نہیں سمجھنا
 چاہتے تو اور بات ہے۔“ وہ نظریں جھکا گیا۔
 ”تو تم مجھے سمجھا دو۔“ زمان ضبط سے لب
 کھلنے لگے۔

”بابا۔ میں نے یہ اعلیٰ تعلیم اس لیے حاصل نہیں کی
 کہ ساری عمر ایک گنوار عورت کے ساتھ گزار دوں۔

میں مانتا ہوں کہ گلائی ابھی لڑکی ہے خوب
 صورت ہے لیکن پھر بھی اس کے پاس ایسا کچھ نہیں
 کہ وہ میرے ساتھ چل سکے۔ میں شہر میں بزنس
 سٹارٹ کر رہا ہوں، کل میرا ایک نام ہوگا، ایک

”میں ہمیشہ ایسی ہی رہتی ہوں ان جگہوں میں
 سو آپ میرے بہانے درون کو یاد کرنا چھوڑ دیں۔“
 وہ ناراض لہجے میں بولی اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔
 ”وہیے ایک بات کہوں۔ اگر تم کہو تو میں درون
 کے لیے بابا کو منا سکتا ہوں۔“ وہ اسے آزار ہا تھا یا
 واقعی ہمدردی جتا رہا تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر پائی۔

”اگر ابھی اس کی ضرورت پڑی تا تو یقین کر میں
 بابا کو درون کے لیے میں خود منالوں گی۔ مجھے اس کام
 کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔“ تیز لہجے میں
 کہہ کر وہ رکی نہیں۔ تیز قدم اٹھائی اندر چلی گئی تھی،
 سباعون نہر کے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”میں نے شاید پھر ناراض کر دیا اسے۔“ دل
 فکر مند سا ہوا۔
 ”ڈونٹ کیئر“ اس نے سر جھٹکا۔

☆☆☆☆

”گلائی۔ بیٹا آج تو اپنے ہاتھ کی کھیر بنا کر
 کھلاؤ، بیٹھے کے لیے بہت دل کر رہا ہے“ رات کے
 کھانے کے بعد زمان نے گلائی سے فرمائش کی۔ تو
 وہ خوش ہوتی تیزی سے بچن کی طرف چلی گئی،
 سباعون بھی اٹھا۔

”تم بیٹھو، زمان نے سباعون سے کہا“ تم سے
 بات کرنی ہے۔“ وہ واپس بیٹھ گیا تو انہوں نے بات
 شروع کی۔

”میرے خیال میں اب جبکہ تمہاری تعلیم بھی
 مکمل ہو چکی ہے اور تم سیٹ بھی ہو چکے ہو نہ صرف
 بزنس میں بلکہ جلد رہائش کا بھی بندوبست ہو جائے
 گا۔ ان شاء اللہ مگر فی الوقت ہم نے تمہاری شادی کا
 فیصلہ کیا ہے۔“

”شادی؟“ وہ اچھل پڑا۔ ”کیا مطلب بابا؟“
 ”تمہیں اب شادی کا مطلب بھی سمجھنا پڑے
 گا۔“ انہوں نے مونچھوں کو تان دیا۔

لیکن میں ابھی شادی کے لیے تیار نہیں۔“ وہ انکار
 کر گیا۔ ”تمہیں کسی تیاری کی ضرورت بھی نہیں ہے،

ایٹیس ہوگا اور ایسے میں ایک پرائمری پاس لڑی میرے ساتھ کھڑے ہونے کا کیسے سوچ سکتی ہے۔ بابا۔

”کسی کے بھی شانہ بہ شانہ چلنے کے لیے تعلیم ضروری نہیں ہوتی۔ اخلاق، سادگی اور نفاست پہلے درجے پر آتا ہے۔ دنیاوی تعلیم ثانوی ہے پھر مل جی کسی سے کم نہیں ہے۔ اس کی شخصیت سے کوئی بھی اس کے پرائمری پاس ہونے کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔“

”اندازہ اور حقیقت میں بہت فرق ہے بابا۔ لوگ تو مجھ سے پوچھیں گے، اس سے بات کریں گے، کس کس سے جھوٹ بولیں گے ہم، بتائیں“ وہ اپنے فیصلے میں اٹل تھا، اس کا لہجہ بتا رہا تھا۔

”تو تم گلائی سے شادی نہیں کرو گے؟“ انہوں نے آخری بار پوچھا تھا۔

”بالکل بھی نہیں میں نے کہا نہ وہ میرے معیار کی نہیں ہے۔“ صاف جواب آیا۔

”تمہاری مرضی لیکن ایک بات یاد رکھنا سباعون۔“ بابا نے کہا تو وہ ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”غور کا کوئی درجہ نہیں، یہ بے بنیاد ہے۔۔۔ وہ بے متقی چیز جو انسان بڑی خوبی سے اپناتا ہے۔۔۔ میری دعا ہے جب یہ غور ٹوٹے تو تمہیں زیادہ تکلیف نہ ہو۔“ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے گلائی اپنے کمرے میں آگئی اسے سباعون کے ہاتھوں روہونے کی وجہ سے رونا کیوں آ رہا تھا، تکلیف کیوں ہو رہی تھی۔۔۔ وہ نہیں سمجھ پاتی تھی۔

☆☆☆

بابا اور اماں اس سے ناراض تھے، وہ شہر نہیں جا سکا تھا۔۔۔ ان کو منائے بغیر وہ اپنا نیا پروجیکٹ بھلا شروع بھی کیسے کر سکتا تھا، لیکن وہ دونوں اس سے مکمل بے نیاز ہو گئے تھے بات چیت بھی ضروری کام تک محدود رہ گئی تھی۔ بالآخر وہ اس کی مدد لینے اس کے کمرے میں آیا تھا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے اتنے دن سے تم سے بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور میڈم ہیں کہ ملتی ہی

نہیں۔“ کمرے میں آتے ہی وہ اس پر برس پڑا تھا۔

”ایک کروار نے الجھا رکھا ہے بس اسی کو واضح کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔“ وہ بیڈ پر بیٹھی اپنے سامنے رکھے جسٹر پرائزمی ترجمی لکیریں لگا رہی تھی۔

”یار پہلے میری زندگی سلجھاؤ بعد میں سلجھا لیتا یہ سارے فرضی کردار۔“ اس نے گلائی کے سامنے سے وہ جسٹر اٹھا لیا۔

”یہ فرضی کردار نہیں ہوتے، کچھ بھی فرضی نہیں ہوتا جو محسوس ہوتا ہے وہ حقیقت ہو جاتا ہے چاہے صرف احساس ہی کیوں نہ ہو کروار تو پھر جسم ہے۔“ وہ بہت مشکل زبان بولتی تھی سباعون نے دل میں اعتراف کیا۔

”تمہیں غالب کے دور میں پیدا ہونا چاہیے تھا، یہ تو تشریح پڑھنے والوں کا دور ہے۔“ سباعون نے تبصرہ کیا۔

”کیا کام تھا آپ کو۔“ وہ اپنی کتابوں کو ترتیب سے رکھنے لگی۔

”یار، امی بابا کا خیال ہے کہ مجھے تم سے شادی کر لینی چاہیے۔“ اس کے ہاتھوں سے کتاب چھوٹے پتی۔

”لیکن تم جانتی ہو میں تم سے شادی نہیں کر سکتا کہاں میں ایم بی اے ٹا پر اور تم پرائمری پاس۔۔۔“ وہ ٹیگٹ رکھا تھا گلائی کی آنکھیں جلنے لگی تھیں وہ رخ پھیرے کتابیں ترتیب دیتی رہی۔

”میں تمہیں حقیر نہیں جان رہا بس تمہارے اور اپنے بچ کے تعلق بات کر رہا ہوں تم سمجھ رہی ہونہ۔“ گلائی کو کندھے سے تھام کر اس نے اسے باقی کتابیں رکھنے سے روک دیا تھا وہ اسے دیکھنے لگی۔

”میں غلط کہہ رہا ہوں۔“ نیلی آنکھوں میں جھانکا گیا اور پھر نظر بھی لی گئی۔

”بالکل نہیں۔“ وہ ہمیشہ کی طرح فوراً سنبل چکی تھی۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، پھر یہ آپ کا حق ہے۔“ اس کی بات پر وہ مکمل کے منکر اویا تھا۔

”اور مجھے بھی۔۔۔“ وہ مزید بولی تھی، سباعون چونکا تھا۔

کر لی وہ لوگ گاؤں آنے کی ضد کرنے لگے۔
 ”میرے خیال میں اس میں کوئی قباحت
 نہیں۔“ اس نے کا کا کو بتایا تو انہیں بے حد خوشی
 ہوئی۔ ”تم انہیں حوٹلی میں ہی بلا لو۔“ انہوں نے
 مشورہ دیا وہ سر ہلا گئی۔ ”میری بیٹی گھر بیٹھے مشہور
 ہو گئی۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے
 فخریہ لہجے میں کہا وہ بس مسکرا کر رہ گئی۔

اور پھر اگلے چند ماہ میں اس نے یکے بعد
 دیگرے نئے پردجیکٹ سائن کر لیے تھے۔ لکھنا بڑھنا
 اس کا جنون تھا اور اوڑھنا پھونچنا بھی، سوا سے کوئی
 وقت نہ تھی۔

☆☆☆

وہ شہر آچکا تھا۔ اس نے دن رات محنت کر کے
 قابل ترین لڑکوں کی ایک بہترین ٹیم بنالی تھی ان
 سب لڑکوں کا تعلق غریب اور اوسط گھرانے سے تھا
 اس کا ماننا تھا کہ ایسے لڑکوں میں آگے بڑھنے اور جلد
 سے جلد کچھ کر گزرنے کا جذبہ ان لڑکوں کی نسبت
 کہیں زیادہ ہوتا ہے جو ایک آرام دہ اور پر آسائش
 زندگی گزارتے ہیں۔۔۔ ان سب لڑکوں کا تعلیمی
 ریکارڈ بھی شان دار تھا اور سلیکٹ ہونے کے چند ماہ
 کے اندر ہی انہوں نے ثابت کیا تھا کہ سباعون کا ان
 پر بھروسہ ہرگز غلط نہ تھا اس نے ان سب لڑکوں کا
 انتخاب کر کے ایک بہترین فیصلہ لیا تھا۔

اس کے علاوہ اس نے ان لوگوں کو بھی ڈھونڈا
 تھا جو کئی سال مختلف کمپنیوں کی ترقی میں اہم کردار ادا
 کرنے کے بعد اب گھروں میں آرام کے دن گزار
 رہے تھے۔ ایسے لوگ تجربہ کے ذخائر رکھتے تھے اپنے
 اندر، اور اس کے بزنس کے لیے بہترین ستون ثابت
 ہو سکتے تھے جس جس شخص تک اس نے رجوع کیا تھا
 انہوں اسے خوش آمدید کہا تھا کیونکہ عمر کے اچھے
 خاصے حصے میں ہونے کے باوجود ان کے ذہن ابھی
 زرخیز تھے اور وہ اس کے بزنس کی ترقی میں بہترین
 کردار ادا کر سکتے تھے۔
 ”سباعون نے بہت تیزی سے نام بنایا تھا،

”میں خود بھی منع کرنا چاہ رہی تھی کا کا کا کو
 آپ بے فکر ہیں۔“ گلائی کہہ کر اس کے پاس سے
 گزر کر باہر جانے لگی سباعون نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”کون ہے وہ؟“ نیلی آنکھوں میں جھانکا۔
 ”کون۔۔۔؟“ وہ حیران ہوئی۔
 ”جس کے لیے تم کا کی، کا کا کو میرے لیے منع
 کرنے جا رہی تھیں۔“

”اچھا پھر وہ کون ہے؟“ وہ مسکرائی۔
 ”کون؟“ اب کی بار حیران ہونے کی باری
 سباعون کی تھی۔

”جس کے لیے آپ مجھے اپنانے سے انکاری
 ہیں۔“ اس کا لہجہ پراعتما تھا۔

”میں تو ایسے ہی۔۔۔“ وہ بول نہ سکا۔ اس کا ہاتھ
 چھوڑ دیا۔

”میں بھی ایسے ہی۔۔۔“ وہ بول گئی اور آگے
 بڑھ گئی۔

”مگر میں جانتا ہوں۔۔۔ وہ درون ہے۔“ وہ بڑ
 بڑا ہاتھ لیکن اس کی آواز گلائی نے بھی سن لی تھی، اس
 کی آنکھیں جھپکے لگی تھیں۔

☆☆☆

سباعون چلا گیا تھا، اس کی دنیا ایک مرتبہ پھر قلم
 کاغذ اور کتاب تک سب گئی تھی اس کے لیے کالز آتی
 اس قدر زیادہ ہو گئیں تھیں کہ کا کا نے اسے اپنا الگ
 موبائل لے دیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے خاکی لفافے اور
 پیسے وصول کرتے کہ یہ اس کی کہانیوں کا اعزاز یہ ہے
 لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا کھتی ہے اور اس کا
 کتنا نام بن گیا ہے۔

گلائی اب مزید رسالوں میں بھی لکھنے لگی تھی
 اس کے دوستوں میں بھی دھیرے دھیرے اضافہ ہوا
 تھا، ملک کی نامور لکھاری خواتین اس کی دوست تھیں،
 ان ہی دنوں اسے ایک ٹی وی چینل سے کال موصول
 ہوئی تھی، وہ اس سے مل کر اس کی کچھ کہانیوں پر
 ڈسکشن کرنا چاہتے تھے، تاکہ ڈرامہ کے لیے کوئی
 آئیڈیا چنا جاسکے اس نے وہاں آنے سے معذرت

نظر حویلی کی بیرونی دیوار کے اس پار کے منظر پر جم گئی۔

ٹالی کا درخت اداس تھا۔۔۔ دہ اتنے دنوں سے اب وہاں جاتی جو نہیں تھی۔ آم کے درخت سے پھل پتے سب غائب ہو چکے تھے۔ کچھ دن پہلے ہی تو بابائے اس کی کٹائی کر دائی تھی، تاکہ شاخیں زیادہ مضبوط ہو سکیں۔ جامن کا درخت بھی نہیں دامان تھا۔۔۔ نہ جانے کیوں وہ بھی اسے اداس سا لگا۔ تب ہی اس کی نظر منہر کے پار کی اور اس جگہ پر ٹھہر گئی جہاں وردن پہلی بار اسے ملا تھا۔

”ادو تو میرے اندر کا موسم اداس ہے اس لیے مجھے سب کچھ۔۔۔ ہر منظر اداس نظر آ رہا ہے“ وہ اداسی سے مسکرا دی۔

”درون۔“ اس نے دھیرے سے پکارا۔ پھر ہنس دی۔

”مجھے آج تمہاری بات سمجھ آئی۔“ وہ کھڑکی کے مزید قریب چلی آئی ”تمہارے دل کا رشتہ اس قدر سچا ہے کہ اس کی خوشبو میرے دل سے بھی لپٹ سی گئی ہے۔“ باہر بارش شروع ہو چکی تھی، ”اور مجھے آج یہ کہنے میں کوئی شرم نہیں کہ مجھے بھی تم یاد آنے لگے ہو۔“ دوسری طرف کھڑکی کا شیشہ بھیجنے لگا تھا اور اس طرف اس کی نیلی ساحر آنکھیں۔۔۔۔

☆☆☆

بارش کی وجہ سے سردی مزید بڑھ گئی تھی۔ اور سخت ٹھیکہ وجود میں سردی مزید درو بھرنے لگی تھی۔ لیکن اسے ابھی گھر نہیں جانا تھا، لمبا کالا اور در کوٹ پہنے وہ بارش سے بچتا اس بک شاپ پر پہنچا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی اس کی مطلوبہ چیز اس کے ہاتھ میں تھی یہ ایک مقامی اخبار تھا جس کے فرنٹ پیج پر آل پاکستان افسانہ مقابلہ کے نتائج چھپے تھے اور پہلے نام کو دیکھتے ہی اس کی ساری ممکن زائل ہو گئی تھی اس کی خوب صورت سنہری آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ تیزی سے پیسے ادا کر کے باہر نکل گیا تھا۔

سب اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ خوش نہ تھا، اندر کہیں کوئی کسک سی تھی۔ تیز ہوا سے کھڑکی کھلی تھی، اس کے سامنے بھرے کاغذ اڑنے لگے تھے وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا تھا، بارش ہونے والی تھی شاید، ہوا تیز تھی اور موسم خوش گوار۔ ”وہ بھی اس وقت ضرور کھڑکی میں کھڑی ہوگی۔“ وہ مسکرایا تھا اور دل۔۔۔۔ دل نہ جانے کیوں ڈوبا تھا، دور کچنار کے درخت کے پاس پھول چنچتی گلابی نہ جانے اسے کیوں اتنی صاف نظر آ رہی تھی جبکہ وہ جانتا تھا وہ یہاں کہیں نہیں تھی۔

☆☆☆

اس کے سامنے مختلف قسم کے کاغذ بکھرے ہوئے تھے ہاتھ سے لکھے خطوط ٹائپ لیے گئے خطوط، ہاتھ سے ڈرائنگ کیے ہوئے کارڈز اور نہ جانے کیا کچھ۔۔۔ ان میں ایڈیٹرز کی طرف سے بھیجے جانے والے اس کے فین قارئین کے لمبے خطوط، ٹی وی ڈراموں کا آن لائن ملنے والے ریویوز کے پرنٹس، اس کے نئے پرانے دن لائٹس اور تحفے بھیجے جانے والے کارڈز۔۔۔ اس کے علاوہ کچھ دعوت نامے بھی تھے اس کے سپر ہٹ ڈرامے سے متعلق شو میں اس کی خصوصی شرکت کی استدعا لیے دعوت نامہ۔۔۔۔۔ کچھ دوسرے شوز میں ان کا انٹرویو لینے کی درخواست اور ایک دعوت نامہ آل پاکستان افسانہ مقابلہ میں حصہ لینے کا بھی تھا، یہ ملک کی ایک بہت بڑی پبلشنگ ایجنسی منعقد کردار تھی۔ قواعد و ضوابط بہترین تھے اور انعامات بھی۔۔۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی مراعات تھیں۔ ملک کی نامور لکھاری خواتین اس مقابلہ میں حصہ لے رہی تھیں، اس نے وہ دعوت نامہ اٹھا لیا۔ جس کے اوپر سنہری حروف میں اس کا نام جگمگا رہا تھا۔

”کل آفریدی“ وہ دھیرے دھیرے چلتی کھڑکی کے پاس آئی شیشے کی دوسری طرف ہوا سے جھومتے پوے اسے صاف نظر آ رہے تھے آسمان کالے بادلوں سے مکمل طور پر ڈھک چکا تھا۔ اس کی

”اس کی آنکھیں بھی خوب مسورت تھیں۔“ وہ کنار
نے اس کے باہر نکلے ہی حیرت سے خود کلامی کی تھی۔

☆☆☆

”میں نے سوچا تھا۔ میری آواز سنتے ہی تم
پہچان جاؤ گی۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔
”سباغون۔“ اس نے واضح طور پر گلائی کی
آواز میں خوشی گھلتی محسوس کی تھی۔ وہ خوش ہو گیا۔
”اتنی دفعہ کال کرتا ہوں بابا کو تم بات کیوں نہیں
کرتیں؟“ اس نے گلہ کیا۔
”مصرف ہوتی ہوں نہ۔“ دوسری طرف شاید
وہ مسکرا رہی تھی وہ مطمئن ہو کر صوفے کی پشت سے
ٹیک لگا گیا۔
”اچھا۔ ایسا کیا کرتی ہو تم؟“ وہ ہنسا۔
”آپ جانتے ہو میری مصروفیت۔“ وہ
مسکرائی تھی۔
”وہی لکھنا پڑھا۔۔۔ اودہ مائی گاڈ ابھی تک۔“
وہ حیران ہوا۔ وہ اس بار خاموش رہی۔
”مجھے امی کو سمجھانا پڑے گا۔ جلد از جلد کوئی اچھا
سلا لڑکا ڈھونڈ کر تمہارا بندوبست کریں۔“ وہ اٹھ کر
بیٹھ گیا۔
”کامیابی تو بندوبست کرتے کرتے تھک گئی
ہیں۔ میں بھی نہیں مان کر دی۔“ وہ ہنسی بھل
ترنگ سی ہنسی۔ وہ کھوسا گیا۔
”اب تو کا کا کا صاف کہہ دیا ہے، میری
زندگی کا یہ فیصلہ تب ہی ہوگا جب میں چاہوں گی۔“
وہ اتر رہی تھی۔
”اچھا۔“ وہ مسکرایا۔ ”تو تم نے کہا فیصلہ کیا؟“
تجسس اٹھا۔
”ابھی تو میں خود بھی نہیں جانتی۔ بس آنے
والے دنوں کے لیے منتظر ضرور ہوں۔“
وہ
اسے کرید رہا تھا۔
”میری منزل تو کبھی صاف نہیں رہی زندگی
میں جو کچھ بھی ہوا میں نے بھی نہ سوچا تھا اور جو کچھ
ہونے والا ہے اسے سوچ کے خواہ مخواہ پریشان ہونے

وہ کارڈ دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا
تھا۔ وہ آل پاکستان افسانہ مقابلہ جیت گئی تھی۔ اس
کی پلکیں پکھلنے لگی تھیں۔ کارڈ ہاتھ میں لیے وہ روتی
ہوئی سب سے پہلے اس جگہ پہنچی جہاں درون اس
سے ملا تھا وہ کچھ دیر یونہی کھڑی رہی اس کی پلکیں
پکھلنے لگی تھیں وہ دوز انوز میں پر بیٹھ گئی۔ ”دیکھو درون
تم نے جس گل آفریدی سے میرا تعارف کروایا تھا وہ
آج کہاں پہنچ گئی ایک پرائمری پاس لڑکی کہاں پہنچ
گئی۔“ وہ کارڈ زمین پر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رو
دی تھی۔

☆☆☆

”وہ آج کل بزنس ٹور کے سلسلے میں انگلینڈ آیا
ہوا تھا وہ روز شام کو کھرفون کیا کرتا بابا اور اماں سے تو
بات ہو جاتی تھی لیکن گلائی سے بات کرنے میں وہ
کامیاب نہ ہو پاتا اور یہ بات اسے بے طرح اداس
کرواتی تھی اس کا دل ہر چیز سے اداس ہونے لگتا۔
”میں تمہیں اس کا بھروسہ دیتا ہوں“ اس دن
اس کے اصرار پر بابا نے کہا تو وہ حیران رہ گیا۔
”گلائی نے اپنا نمبر کب لے لیا؟“ اس نے
حیرانگی سے سوچا۔ ”اسے بھلا فون کی کیا ضرورت؟“ وہ
سوچ گیا۔

”درون“ کوئی کیڑا سا دماغ میں کلبلایا تھا۔
بائیں طرف کپٹی میں درو کی شدید لہر اٹھی تھی، اس نے
چند لمحے موبائل اسکرین پر اس کے چمکتے نام کو دیکھا
تھا پھر کال کو کچھ کر دیا۔ بیل جاری تھی۔۔۔
”ہیلو“ کال پک ہوئی ہی وہ تیزی سے بولا
تھا۔

”السلام علیکم!“ یہ ٹھہرا سا دم لہجہ۔ وہ ایسے ہی
تو بولی تھی۔ شام کے وقت رک رک کے ہنسی سربلی
آواز پیدا کرتی لہروں کے جھپسی۔۔۔ وہ کھوسا گیا۔

سے فائدہ۔ سب اچھا ہی ہوگا۔“ وہ پرامید تھی۔

”اچھا میں رہتی ہوں۔ دوسری کال آ رہی ہے۔“ کال ختم کر دی گئی تھی۔ وہ تو اس سے مزید بات کرنا چاہتا تھا۔

”وردن کی ہی کال ہوگی۔“ وہ موبائل کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔

”وہ شاید اس کے متعلق مجھے بتانا نہیں چاہتی۔“ کچھ دیر پہلے غائب ہونے والا تاسف پھر سے اسے جکڑنے لگا تھا۔

☆☆☆

”اس سال بہترین ڈرامہ کے لیے دو دو بڑے چینلوں کے ایوارڈ کے لیے نامزد ہوئی تھی، اس نے ایوارڈ شو کا پاس حاصل کر لیا تھا۔ یہ اس کے لیے مشکل نہ تھا۔ مشکل تھا تو بس اس دن کا انتظار۔۔۔ جب اتنے عرصے بعد وہ گلائی کو اپنے سامنے دیکھتا۔۔۔ پری پیکر جو اس لیے عرصے میں اس کی آنکھوں میں اپنی لودیتارہا تھا۔ اس آواز کو سنتا۔۔۔ جو اسے دنیا کی سب آوازیں سے سربلی اور با مقصد لگا کرتی تھی۔ جو کچھ وہ اس کی نیلی آنکھوں میں پڑھتا تھا۔۔۔ بالاسانی پڑھ لیتا تھا، جو کچھ بھی وہ اپنے اندر چھپائے پھرتی تھی۔

”اس نے سب سے آخری رو کا پاس لیا تھا۔ تاکہ وہ اسے نہ دیکھ سکے۔ نہ پہچان سکے۔ لیکن وہ اسے بالاسانی دیکھ سکے۔“ ہمیشہ کی طرح بیسٹ آف لک گلائے۔ وہ مسکرایا تھا۔

☆☆☆

”یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“ اس نے ایوارڈ کی تقریب میں جانے سے انکار کر دیا۔ کا کا، کا کا دونوں ناراض ہونے لگے۔

”اللہ نے اتنی عزت دی ہے تیری دن رات کی محنت کا انعام ملنے لگا ہے تو تم منکر ہو رہی ہو۔“ کا کا اسے سمجھانے لگے۔

”میں تو سمجھتی تھی، تم بس ایسے ہی اتنے صفحے کالے کر کر کے بھیج دیتی ہو اور وہ نمائے (ایڈیٹرز)

تمہیں یہ ہرے ہرے نوٹ بھیج دیتے ہیں۔ میں تو دل میں ان پاگلوں پر خوب ہنسا کرتی تھی۔ مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا، میری بیٹی ہیرا ہے ہیرا۔ پورا پاکستان جاننے لگا ہے میری بیٹی کو اور تمہاری بیٹی وجہ سے ہمارے سارے خاندان کا نام روشنی ہوا ہے۔“ کا کا کی مارے تشکر کے بہنے والے آنسوؤں کو دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے بولیں تو وہ ان کی سادہ لوحی پردل سے مسکرا دی

”بالکل۔ اور تب دیکھنا جب میری بیٹی کو بولتا ساری دنیا دیکھے گی اور سنے گی۔“ کا کا فخر سے بولے ”لیکن کا کا۔ میں بھی گھر سے باہر نہیں گئی کسی بھی تقریب میں پھر ملک کے ایک بڑے سے شہر میں گاؤں سے دور اتنی بڑی تقریب میں، اتنے زیادہ لوگوں کے سامنے میں بھلا میں کیسے۔؟“ وہ خوف زدہ تھی۔

”سب کچھ ہو سکتا ہے پتر۔۔۔“ کا کا نے اسے اپنے قریب بٹھالیا۔ وہ انگلیاں مردڑے گئی۔ ”یہ سب بھی تو مشکل تھا۔۔۔ یاد ہے تمہیں میں نے، سیاحون نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ آگے پڑھ لو۔ لیکن تم نے صرف دوسرے گاؤں میں اسکول ہونے کی وجہ سے میری بات نہ مانی، اس وقت مجھے امید تھی کہ میری بیٹی بھی نہ بھی راضی ضرور ہوگی۔ لیکن تم نہ مانیں اور اب، اتنی بڑی کامیابی کی طرح بہہ گیا ہے، ایک سرخوشی ہے کہ سب کچھ ممکن ہے۔ میرا یقین کرو بیٹا یہ سب بھی بہت آسان ہوگا۔“ کا کا نرم لہجے میں اسے سمجھا رہے تھے۔ مگر وہ اب بھی متذبذب تھی۔

”میری بیٹی بی بی وی پر آئے گی وہ بھی ایک خلیق کار کی حیثیت سے میرا تو سر فخر سے بلند ہو جائے گا پھر تمہارے لیے بھی نئی راہیں کھل جائیں گی۔“ گلائی نے کا کا کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر سچی خوشی کھلی تھی۔ ”میری خاطر بیٹا۔“ انہوں نے کمزور پوڑھے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے جیسے گزارش کی تھی۔ وہ ہارنے لگی تھی۔

”ٹھیک ہے کا۔“ مرمیرے لیے دوا بھیجے گا۔“
ان کو خوش چھوڑ کر وہ کمرے میں چلی آئی گھڑی کی
طرف دیکھا رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

”کیا اس بارے میں سباعون کو بتاؤں؟“ اس
نے خود سے مشورہ مانگا۔ ”وہ بھلا کہاں یقین کرے گا
۔“ اس نے سوچتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ”الٹا ہنسنا
شروع کر دے گا، مذاق اڑائے گا۔“ وہ خود کو ڈرینک
ٹیبلیں کے قد آور آئینے میں دیکھتے ہوئے سوچنے لگی
کہ یگانہ منظر بدلنے لگے تھے وہ گھبرا کے دو قدم
پیچھے ہٹی تھی۔

وہ سباعون تھا۔۔۔

وہ اس کی کتابیں جلا رہا تھا۔۔۔ گلائی کا چہرہ
اس آگ کی تپش سے جلنے لگا تھا۔
منظر پھر بدل گیا تھا۔

درون زمین پر لیٹا تھا اور سباعون لاقوتوں سے
اسے پیٹ رہا تھا۔ گلائی کے دل میں دروکی شدید لہر
اٹھی تھی، سباعون اب اسے ہاتھ سے پکڑے کمرے
میں صبح کے لا رہا تھا۔ اب وہ دروازہ لاک کر رہا تھا

۔۔۔

”آتم ساری“ دروازہ ساسم ہوا۔ ”تم درون
کو یاد کرتی ہو نہ۔“ اس کی کالی آنکھیں سرخ ہوئی
تھیں۔ گلائی مزید پیچھے ہوئی تھی۔

”وہ درون ہے نہ؟“ جیسے سوالات۔۔۔

”کا کا نظر رکھا کریں۔ لڑکی ذات ہے۔ نہ
جانے کیا لکھ کے بھیجتی ہے کیا لکھا واپس آتا ہے“ وہ
اس کے لیے آنے والا خاکی پارسل چیک کر رہا تھا

۔۔۔

”گلائی اچھی لڑکی ہے، خوب صورت ہے پھر
بھی اس کے پاس ایسا کچھ نہیں کہ وہ میرے ساتھ
چل سکے۔“ منظر صاف ہو گیا تھا اس نے کبھی سانس
لے کر خود کو نازل کیا تھا

”نہیں۔ میں اس قابل نہیں کہ سباعون میرے
ساتھ چلے میری وجہ سے اسے شاید مزید شرمندگی ہو۔“
اس نے سوچا یا پھر غصہ ہو جائے اور جانے سے منع

ہی کروے۔“ وہ بڑبڑاتی میری لوچڑی میر ہے
مجھے خود بھی کوئی شوق نہیں جانے کا لیکن کا کا کی وہ
دونوں کس قدر خوش ہیں۔“ وہ سوچے گئی۔ ”نہیں۔
میں اسے نہیں بتاؤں گی۔“ اس نے موبائل آف کر دیا۔
”درون“ اس نے آنکھیں میچ لیں۔
”تم ہوتے تو میں تمہیں ضرور بتاتی۔“ وہ
دھیرے سے مسکرا دی تھی۔

☆☆☆

”اس کا فیورٹ چیمبل آن تھا، کوئی ایوارڈ شو
آ رہا تھا۔ وہ اوپن پن میں اپنے لیے نوڈلز بنا رہا تھا
ٹی وی کی آواز اس قدر اونچی تھی کہ آواز اس تک پہنچ
رہی تھی گا ہے بگا ہے وہ ذرا رخ موڑ کر اسکرین کی
طرف بھی دیکھ لیتا تھا نوڈلز بن چکے تھے وہ انہیں
باؤل میں انڈیلنے لگا۔

”تشریف لا رہی آپ سب کی بھرپور تالیوں
میں عائشہ پذیر۔“ ڈراموں کی نوٹیز شروع ہو چکی
تھیں ایوارڈ دینے کے لیے مشہور اداکارہ کو دعوت دی
گئی تالیوں کی گونج میں سب ہی نامزد لکھاریوں کے
نام و ہارائے جانے لگے۔

”گل آفریدی۔“ اس کی پسندیدہ رائٹر کا نام
بھی شامل تھی۔ وہ مسکرایا۔ اور گا جرسش کرنے لگا۔
اسے ہمیشہ سے نوڈلز کے ساتھ کش کی گئیں کا جریں
بے حد اچھی لگتی تھیں۔

”اور اس دفعہ بہترین رائٹر کا ایوارڈ جاتا ہے گل
آفریدی کو“ تالیاں گونج اٹھی تھیں۔

”میں جانتا تھا یہ“ وہ گا جریں نوڈلز پر ڈالنے لگا۔
”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ سکوت سا چھایا تھا
سباعون کے چلتے ہاتھ ایک دم رک سے گئے تھے۔

”سب سے پہلے اللہ پاک کا شکر ہے اور میرے
کا کا کی کا، اور ان قارئین کا جنہوں نے مجھے بتایا
کہ میں یہاں تک آسکتی ہوں۔ صاف انگلش میں
بولتی وہ آواز۔۔۔ سباعون مڑنے تک کی سکت کھو چکا تھا
جیسے ”اور اس دوست کا۔۔۔ جس نے مجھے میری
ذات کا سرا تھا یا اور جس کی وجہ سے آج میں یہاں

”اب آپ سب سے درمیان موجود ہیں۔ وہ دھیرے دھیرے مڑا تھا۔ پھر بھاگ کر نئی دی کے نزدیک آیا۔“
 ”اور آخر میں بس اتنا کہ انسان کچھ بھی نہیں ہوتا لیکن اس کو مکمل اور نکھارتی اس کی محنت ہے۔ اپنے باہر کو سمجھیں، جانیں اور اپنے اندر کو سنیں۔ یقین کریں یہی انسان کی کاملیت ہے اور آپ کی ذات کا جمال بہت شکریہ۔“

سادہ سفید چادر میں ڈھکا وہ نازک سا جو کبلا شہر گلائی ہی تھی وہ اب وارڈ وصول کرنے کے بعد تالیوں کے شور کی گونج میں آج سے نیچے جا رہی تھی۔ اور ایک چھوٹے سے گاؤں کی اس لڑکی کی مزید ہمت افزائی کے لیے سارا ہال تالیاں بجاتا کھڑا ہوا تھا۔ باوقار سی مسکراہٹ لیے گلائی اس کے آنسوؤں کی دھند نے اس سے چھپائی تھی۔
 ”وہ آج سے نیچے اتر کے پچھلی لائنز میں بیٹھے کا کا کی طرف آئی تھی۔ لوگ کھڑے ہو کر اس کے لیے تالیاں بجا رہے تھے اور وہ آنسو بہاتی کا کا کے سینے سے جا لگی تھی۔ انہوں نے محبت سے اس کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔“

☆☆☆

”درون“ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس قدر قریب کہ وہ اسے ہاتھ بڑھا کے چھو سکتی تھی۔ کا کا ہوں میں آرام کر رہے تھے رات کی فلائٹ سے انہیں واپس اسلام آباد جانا تھا اور پھر وہاں سے گاؤں اسی لیے وہ درون سے ملنے یہاں آئی تھی ہوں کے پچھلی طرف بنے چھوٹے سے ہرے سرسبز پارک میں۔
 ”مجھے یقین تھا، تم ایک دن اسی منزل پہ ملو گی۔“ وہ مسکرایا اس کی خوبصورت آنکھیں بھی۔

”میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔“ وہ زندگی میں دوسری بار اسے بتا رہا تھا۔ ”اور تم جانتی ہو کہ اس کے لیے مجھے تمہیں جاننے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں تمہیں اچھی طرح جان گئی ہوں۔“ وہ بھی ادا سی سے مسکرا دی۔ ”آج مجھے بھی تم سے کہنا ہے کہ۔۔۔“ وہ ذرا رکی اور رخ پھیر کر دوسری طرف سڑک پر چلتی گاڑیوں کو دیکھنے لگی، درون خاموش کھڑا اس کے اگلے جلے کا منتظر رہا۔

”اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا
 ”یہ گلائی کیسے ہو سکتی ہے۔“ وہ پریشان ہو گیا۔
 ”ایک پرائمری پاس لڑکی۔۔۔ اور اس کی

تقریب جاری تھی لوگ دوبارہ سامنے کی طرف متوجہ ہو چکے تھے کہ اچانک ہی اس کی نظر اٹھی تھی اور جیسے پلٹتا بھول گئی تھی بالکل آخری رو میں مسکرائی آنکھوں سے اسے دیکھے جانے والا وہ شخص وہ اسے بھلا کیسے بھول سکتی تھی وہ فوراً اس کی طرف بڑھی تھی کہ اس نے مسکراتے ہوئے اسے رکنے کا اشارہ کیا تھا اور واپس جانے کا بھی وہ اس کی بات سمجھ گئی تھی تب ہی خاموشی سے واپس اپنی سیٹ پر جا بیٹھی تھی البتہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ پیچھے مڑ کر اس کی موجودگی کا اطمینان ضرور کر لیتی تھی۔

☆☆☆

اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا
 ”یہ گلائی کیسے ہو سکتی ہے۔“ وہ پریشان ہو گیا۔
 ”ایک پرائمری پاس لڑکی۔۔۔ اور اس کی

”میں نے بھی نہیں بہت یاد کیا۔“ اس نے اعتراف کیا تھا اور آنکھیں موند لیں، آنسو گالوں پر لڑکھائے۔

”وہ پلٹ آئے گا۔“ بالآخر انہوں نے لب کھولے۔ گلائی کی نظر جھک گئی ”میں نے اس کی آنکھوں میں بھی تمہارے ہی عکس دیکھے ہیں وہ نا سمجھ ہے۔ جب سمجھ جائے گا۔ لوٹ آئے گا۔“ ان کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

”میں ان کے قابل نہیں ہوں گا کا۔“ وہ نم لہجے میں بولی زمان خان کے اندر جیسے سب کچھ ٹوٹ کر بکھرا تھا۔

”وہ اب سب سمجھ بھی جائیں تو میں خود کو ان کے قابل کبھی نہیں سمجھ سکتی۔ مجھے اس الجھن میں نہ الجھائیں گا کا کہ ساری زندگی ہی سلجھانے میں گزر جائے۔ آپ خود بتائیں گا کا کسی نرم کرم موسم کا طویل انتظار کرنے کے بجائے میں اس بہار کا ہاتھ کیوں نہ تھا م لوں۔ جو خود میری منتظر ہے۔“ وہ امید بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ ساری بات صاف ہو گئی تھی زمان خان نے سر ہلاتے شفقت سے ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا تھا۔ ”اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ آمین۔“ وہ ان کے گھٹنوں پر سر رکھے رو دی تھی۔

”میں نے بھی نہیں بہت یاد کیا۔“ اس نے اعتراف کیا تھا اور آنکھیں موند لیں، آنسو گالوں پر لڑکھائے۔

”میں تمہارا ہر لفظ اپنے اندر اتار رہا۔ میری سانسیں چلتی رہیں۔“ وہ دو قدم قریب آیا تھا۔

”میں نے ہر لفظ لکھتے وقت تمہیں یاد کیا تھا میں مانتی ہوں میں نے دیر کر دنی تھی لیکن بالآخر میں نے اپنے اندر کی پکار سن لی تھی۔“ وہ اس کی طرف مڑی۔

”میں مانتی ہوں کہ گلائی۔۔۔ درون کے بغیر ادھوری ہے اس بار مجھے اکیلے چھوڑ کر میت جانا درون۔“ اس کی نیلی آنکھوں نے گواہی دی تھی، گزارش کی تھی۔ جبکہ لب خاموش رہے تھے۔

”وعدہ رہا۔“ سنہری آنکھوں نے وعدہ کر لیا تھا۔

”میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں گا کا۔“ وہ ان کے کمرے میں آئی تو وہ جو کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے چونک پڑے۔ گلائی کو دیکھ کر ان کے چہرے پر نرم سی مسکان ابھری۔

”میں جانتا ہوں۔ جو میری بیٹی مجھ سے کہنے آئی ہے۔“ گلائی حیرانگی سے ان کو دیکھنے لگی۔ ”لیکن میں بھی تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے اس

ایک میں
اور ایک تم



تزیلہ ریاض
قیمت - 350/- روپے

اُجالوں کی بستی



فاخرہ جنیں
قیمت - 400/- روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میونہ خورشید علی
قیمت - 350/- روپے

میرے خواب
لوٹا دو



گہمت عبداللہ
قیمت - 400/- روپے

فون نمبر
32735021

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

مکتبہ
کابل

نے اسے اتارے بغیر ہی چوڑیاں پہننا شروع کر دیں۔

”اسے اتار دو۔“ وہ جو دروازے میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا پاس چلا آیا وہ چونکی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”سابعون“

”تم نے تو حد ہی کر دی بدلہ لینے میں گلائی۔“

”میں نے تو بس دل کی مانی میں بدلہ لینے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

”تو وہ درون ہی تھا۔“ وہ اب بھی بدظن تھا۔

گلائی کو انوس ہوا۔

”نہیں تھا۔ مگر اب ہے۔“ وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا دی تھی۔

”کچھ دیر تو انتظار کر لیتیں۔“ اس کی غم نظریں گلائی کے خوبصورت چہرے پر جمی تھیں۔

”بہار منتظر ہو تو انتظار نہیں کرایا کرتے۔“ اس نے پلٹ کر باقی چوڑیاں اٹھائیں ”اور ہاں۔ یہ تحفہ تمہارا ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔“ اس نے پریسلٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اور ڈپٹا لیے باہر نکل گئی۔ وہ بھی کمرے سے باہر نکل آیا۔

شام وصل رہی تھی۔۔۔

پرندے قطار در قطار اپنے ٹھکانوں کی طرف رواں تھے۔ اور دریا کنارے کیلی ریت پہ ننگے پاؤں چلتا سابعون بے نشان منزل کی طرف رواں دواں۔۔۔

اس سے ذرا دور حویلی کے اندر شادیاں بچ رہے تھے۔ سرخ کا مدار سوٹ میں دلہن بنی مسکراتی گلائی، سوہری شخصیت والے درون کے ہمراہ اس نئے سفر پہ نکلنے کے لیے قدم بڑھا رہی تھی، جس کی راہ پر بہار اس کی منتظر تھی خزاں کے ڈوختے سورج نے تاریخی شعاعوں والے ہاتھ پھیلا کر اس کی خوشیوں کی دعا کی تھی۔

☆☆

”تم نے دیر کر دی سابعون۔“ ان کی آنکھوں میں جلن سی اترنے لگی وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سابعون اس قدر جلدی پلٹ آئے گا ورنہ وہ ضرور گلائی کو مزید منانے کی کوشش کرتے۔ لیکن وہ اس وقت پلٹا تھا جب درون اور گلائی کی شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو چکی تھیں۔

”ایسا نہ کہیں بابا میں سمجھ نہ سکا ورنہ میرا دل تو اس کو اپنا کہتا رہا میں اس سے دور جا کر بھی دور نہ رہا اسے روک کرنے کے بعد بھی میں اس کا طلب گار ہی رہا۔“ وہ سرخ آنکھوں سے جیسے ان کو اپنی حالت سمجھا رہا تھا۔

”لیکن تمہیں اس بات کا احساس ہوتے ہوئے بہت دیر ہو گئی سابعون اب میں تم سے گزارش کرتا ہوں اس مرتبہ اسے تکلیف نہ دینا۔“ اور لب کاٹا سابعون کچھ بول بھی نہ پایا تھا۔ وہ اٹھ کر جانے لگا کہ بابا کی آواز نے اس کے قدم روک دیئے وہ اٹھ کر اس کے قریب آئے اور ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

”بھئی بھئی جو ہمیں اپنے معیار سے نیچے لگتا ہے وقت دکھا دیتا ہے کہ وہ ہمارے معیار سے کس قدر اونچا تھا۔“ ہماری پہنچ سے کافی دور چلا جاتا ہے وہ۔ ہمارے فیصلے لاکھ سخت سہی، وقت کا فیصلہ سخت ترین ہوتا ہے۔“ اس نے آنسو روکنے کے لیے زور سے آنکھیں بند کی تھیں۔

”میں اس کے لیے تب اتنا داس نہ تھا جب تم نے اسے رو کیا تھا لیکن میں تمہارے لیے فکر مند ضرور ہوں سابعون تم نے بہت قیمتی شخص کو کھو دیا۔“ وحشیہ لہجے میں کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے وہ وہیں کھڑا آنسو بہاتا رہا۔

☆☆☆

مہندی کے ہرے زرد سوٹ میں وہ اس قدر دلکش لگ رہی تھی کہ نظر بھر کے دیکھنا مشکل ہو رہا تھا وہ مسکراتے ہوئے خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے ہری چوڑیاں پہننے لگی کہ نظر سنہری پریسلٹ سے الجھ گئی اس

راپنزل

قمر کو کمائیاں سننے کا بے حد شوق ہے اسکول کے فنیس ڈریس شو میں وہ شہزادی راپنزل کا کردار ادا کر رہی ہے اس لیے اس نے اپنے پیپا سے خاص طور پر شہزادی راپنزل کی کمائی سنائے کی فرمائش کی۔ کمائی سناتے ہوئے اسے کوئی یاد آ جاتا ہے جسے وہ راپنزل کہہ کر آتا تھا۔

نینا اپنے باپ سے ناراضی کی وجہ سے اپنے خرچے مختلف ٹیوشن پڑھا کر پورے کرتی ہے۔ اس کی بہن زری ٹیلی فون پر کسی لڑکے سے باتیں کرتی ہے۔ نینا کی سلیم سے بہت دوستی ہے۔ سلیم کی محلے میں چھوٹی سی دکان تھی۔ ایک ایکسپنڈنٹ کی وجہ سے وہ ایک ٹانگ سے معذور ہو جاتا ہے۔ سلیم نے پرائیویٹ انٹر کیا ہے اور اتر بن غریب احمد علی کے نام سے ایک اہلی جریدے میں شائع ہوتی ہے۔

سیح اور شہرین نے خدا کر کے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف جا کر شادی کی ہے، لیکن شہرین اپنے والدین کی ناراضی کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔ سیح اور شہرین دونوں اپنی بیٹی ایمین کی طرف سے بہت لاپرواہی اور افسوس نے گھر کی دیکھ بھال کے لیے دور کی رشتہ دار اماں رضیہ کو بلا لیا ہے۔

صوفیہ کا تعلق ایک متوسط گھر سے تھا صوفیہ کی شادی کا شرف بٹار سے ہوتی ہے جو رجحان کا اعلا شاہکار بھی تھا۔ شادی کے بعد صوفیہ کو بے کاشتف کا غیر عورتوں سے بے تکلفی سے ملنا پسند نہیں آتا اور وہ شک کا اظہار کرتی ہے۔ ایمین کا کشف کاروبار کا نقصان ہے کہہ کر اس کو مطمئن کر دیتا ہے۔ صوفیہ کو کاشف کے دوست مجید کی بیوی حبیبہ بہت بڑی سچی سے یونکہ وہ کاشف سے بہت بے تکلف ہے۔ صوفیہ کی ایک بیٹی پیدا ہوتی ہے۔ زرین۔

چھبیسویں اور آخری قسط



DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM



کاشف نے گاڑی پارک کی بھی اور پھر موبائل وغیرہ سمیٹ کر وہ گاڑی سے باہر نکلے۔ گھر کی طرف جانے کا دروازہ آگے کی طرف تھا۔ وہ گاڑی گودام کے باہر پارک کرتے تھے جس کا بڑا سا گیٹ بازار والے حصے کی طرف تھا۔ وہ دروڑ سے چلتے گھر والے حصے کی جانب بڑھے تھے جب انہیں خیال آیا کہ انہیں کچھ لے جانا چاہیے۔ زری کی وجہ سے اظفر روز ہی کھانا ان کی طرف کھاتا تھا۔ صوفیہ اہتمام تو کرتی تھیں لیکن انہوں نے سوچا کہ وہ کئے کباب وغیرہ لے جاتے ہیں۔ شوروم سے نکلتے ہوئے صوفیہ کو فون کیا تھا تو انہوں نے بتایا تھا زری کی فرمائش پر مٹر پلاؤ بنایا ہوا ہے۔

"مٹر پلاؤ کے ساتھ چلی کباب اچھے لگیں گے" انہوں نے سوچا اور واپسی کے لیے مڑے۔ خالصتا لاہوری ہونے کی وجہ سے باہر کے اشتہا انگیز مرغن کھانے انہیں بھی پسند تھے لیکن اظفر کی وجہ سے وہ آج کل روز ہی کچھ نا کچھ لے جاتے تھے۔ سڑک کے بالکل آخری کنارے پر ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا جہاں کے چلی کباب انہیں کافی پسند تھے سو اس کا ارادہ کر کے وہ چل پڑے تھے۔ وہاں بھی کافی رش تھا۔ انہیں کافی دیر لگ گئی لیکن وہ خوش تھے کہ انہوں نے بیٹی کی پسند کی چیز لے لی تھی۔

واپسی پر وہ گودام کے قریب سے گزرے تاکہ آگے گھر کے دروازے کی طرف جا سکیں تو انہیں وہاں ایک گاڑی نظر آئی تھی۔ یہ گاڑی ان کی نہیں تھی۔ یہ گاڑی اظفر کی بھی نہیں تھی۔ وہ کچھ حیران ہوئے کہ اس وقت ان کے گھر کون آ گیا تھا کیونکہ یہاں گاڑی ان کا کوئی رشتہ دار ہی پارک کر سکتا تھا۔ وہ ذرا سا آگے ہوئے لیکن پھر پیچھے ہٹ گئے۔ گاڑی میں اظفر تھا اور اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی۔ اظفر نے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اس لڑکی کا میک اپ کافی گہرا تھا اور اس کے انداز بھی کاشف، کو کچھ عجیب سے لگے۔ وہ مزید پیچھے کی جانب پلٹے تھے کہ کہیں اظفر کی نظر ان پر پڑنا جائے۔ انہیں وہاں پر کیا مناسب نالگا۔ وہ دوبارہ سے آگے کی سمت ہو کر گھر کی سیڑھیوں کی طرف آگئے لیکن ان کے اندر کھد بند سیڑھی لگی تھی۔

"آپ نے بڑی دیر کر دی۔۔۔ مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔ زری نے بھی آپ لوگوں کے انتظار میں کچھ نہیں کھایا اب تک" صوفیہ نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ زری بھی آج لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ بچی کی کاٹ بھی وہیں رہی ہوئی تھی لیکن کاشف کو کسی میں بھی دلچسپی محسوس نہ ہوئی۔

"اظفر نہیں آیا؟" انہوں نے زری کو دیکھ کر پوچھا تھا اور ساتھ ہی اس کا چہرہ بغور دیکھا تھا "بس آنے والا ہے۔۔۔ ابھی آپ کے آنے سے دو منٹ پہلے ہی اسے فون کیا تھا۔۔۔ کہہ رہا تھا کہ آفس سے نکلا ہی ہے ابھی ایک کولیگ کے ساتھ۔۔۔ بس بیس بجیں منٹ میں پہنچ جائے گا" اس نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ کاشف نے ہنسا رہا تھا۔ ان کی تسلی نہ ہوئی تھی زری کے جواب سے

"لڑکیاں بھی ہیں اظفر کے آفس میں۔۔۔؟" یہ بات انہوں نے بلا ارادہ ہی پوچھ لی تھی۔ اظفر نے چہرہ پہلے جاب تبدیل کی تھی۔ زری نے ذرا چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔ کاشف کو لگا وہ اس سوال پر توقع سے کچھ زیادہ حیران ہوئی ہے۔

"ہاں نہیں ابا۔۔۔ میں نے کبھی پوچھا نہیں۔۔۔ شاید ہوں۔۔۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں" وہ حیران ہوئی تھی۔

"وہ دراصل ایک دوست اپنی بیٹی کی نوکری کے لیے کچھ پریشان تھے۔۔۔ اس لیے پوچھا میں نے کہ شاید اظفر کو کوئی مدد کر سکے" انہوں نے بات بتائی تھی۔

"مجھے کوئی آئیڈیا نہیں ہے ابا۔۔۔ لڑکیاں شاید نہیں ہیں اس کے آفس میں۔۔۔ آپ کو بتایا تھا کہ اس کی فرم تو فریلا نر اور پی سی سائیڈ زیر اڈکس کے ساتھ ڈیل کرتی ہے۔۔۔ فو میلشن وغیرہ ٹائپ کے کاسٹریکٹس لیتی

ہے۔ یہ تو کام ہی مردوں والا ہے لیکن پھر بھی پوچھ لیجیے گا۔۔۔ اظفر کے کافی کانٹیلیٹس ہیں ادھر ادھر۔۔۔ اس نے تسلی سے جواب دیا تھا۔ کاشف کو بھر کوچپ سے رہ گئے پھر بولے۔

"یہ کیا بات ہوئی۔۔۔ خیر خبر رکھا کرو ایسی باتوں کی۔۔۔ شوہر کے ہر معاملے کی خبر رکھنا اچھی بیوی کا فرض ہوتا ہے" پھر انہیں احساس ہوا کہ زری کی نگاہوں کا تاثر کچھ مشکوک سا ہوا ہے تو سر جھٹک کر بولے۔

"ذرا پھر سے کال کر لو نا۔۔۔ کدھر تک پہنچا ہے۔۔۔ ابھی تاخیر ہے اس کے آنے میں تو تم کچھ کھا لو۔۔۔ کب تک بھوک پیٹی رہو گی۔"

انہوں نے بات برائے بات کی تھی۔ ان کا ذہن اظفر اور اس کے ساتھ نظر آنے والی لڑکی میں اٹکا تھا۔ اب یہ کوئی اتنی انہونی بات تو نا تھی لیکن اس لڑکی کے انداز اور اظفر کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ۔۔۔ انہیں سب کچھ سخت نا مناسب سا لگ رہا تھا۔

"جی ابا۔۔۔ میں فون کرتی ہوں اسے" زری نے سعادت مندی سے کہتے ہوئے اپنا موبائل فون اٹھالیا تھا۔ کاشف اٹھ کر ہاتھ روم کی جانب چل دیے۔ وہ دس منٹ بعد واپس آئے تھے لیکن تب تک بھی اظفر نہیں آیا تھا۔ انہوں نے دیوان پر بیٹھے ہوئے زری کی جانب پھر سے سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"ابا آج ٹریفک بہت ہے۔ بس آنے والا ہے وہ۔ آپ کھانا کھالیں۔۔۔۔۔" زری نے شرمندہ سی ہو کر کہا تھا۔ کاشف عموماً اپنے کمرے میں کھانا کھانے کے عادی تھے لیکن آج کل چونکہ اظفر بھی آجاتا تھا تو وہ لاؤنج میں سب کے ساتھ بیٹھ جایا کرتے تھے۔ کاشف نے بیٹی کی تجویز پر فقط سر ہلاتا تھا پھر وہ اٹھ کر دوبارہ اپنے کمرے میں آگئے۔ وہاں ایک کھڑکی گودام والی سمت میں تھلتی تھی۔ انہوں نے وہی کھڑکی کھول کر دیکھی تھی۔ وہ گاڑی ابھی تک وہیں موجود تھی۔

وہ سخت آگ بگولا ہو کر واپس آئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ زری سے کچھ کہتے اظفر سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ گیا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔" زری نے اسے دیکھتے ہی سلامتی کی دعا بھیجی تھی۔

"کہاں رہ گئے تھے برخوردار۔۔۔ کب سے انتظار ہو رہا ہے تمہارا۔۔۔ ہم سب بھوکے بیٹھے ہیں۔۔۔ زری نے بھی اب تک کچھ نہیں کھایا۔۔۔" انہوں نے بمشکل لہجے کو معتدل رکھا تھا اظفر کے چہرے کا رنگ بدلا۔

"میں نے تو کہا تھا اس کو کہ کھانا کھالے۔۔۔ میں ذرا لیٹ ہو جاؤں گا۔ ٹریفک بہت رہنے لگا ہے آج کل" اس نے ناک سے کھسی اڑانے والے انداز میں کہا۔ کاشف کو اس کا انداز ذرا اچھانا لگا۔ وہ جھوٹ کیوں بول رہا تھا۔ جھوٹ تو وہیں بولے جاتے ہیں جہاں پردہ واری کا احتمال ہو۔ کوئی بات صیغہ راز میں رکھنا مقصود ہو۔۔۔

"امی۔۔۔ ٹینگ لے آئیں۔۔۔ اظفر آ گیا ہے" زری نے آواز دی تھی۔ اظفر نے ناک چڑھایا

"مجھے نہیں پتا وہ پلاشرٹ۔۔۔ روز انٹی بنا کر لے آئی ہیں وٹامن سی سیرپ" اس کے انداز میں نخوت تھی۔ زری نے قہقہہ لگایا حالانکہ اس بات پر تو کاشف کو ہنسی بھی نا آتی تھی۔

"امی اظفر کے لیے پیپسی لے آئیں۔۔۔ ٹینگ مت لائیے گا" اس نے پھر وہیں بیٹھے بیٹھے آواز لگائی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شوہر کے سامنے اپنا دل نکال کر رکھ دے۔ کاشف کو بہت برا لگا۔ وہ اپنی خدمت تو کروا رہی تھی اپنی ماں سے لیکن ساتھ ساتھ اپنے شوہر کی خدمتیں بھی کروانا چاہتی تھی۔ جبکہ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ کاشف کا استفسار کرنا اسے برا لگ گیا ہے ☆☆☆

"ایمن نے کھانا کھالیا۔؟" سمجھنے پر پوچھا تھا۔ وہ آج کالی دن کے بعد گھر میں کھانا کھا رہا تھا۔ نینا نے اس کو دیکھتے ہی روٹی موجود ہونے کے باوجود دوبارہ سے تازی روٹی بنائی تھی۔ سلاد کا تھرا اور پودینے کی چٹنی بنائی تھی حالانکہ خود اس نے دودھ کے گلاس کے ساتھ ایک سلاٹس کھالیا تھا لیکن سمجھ کے لیے اہتمام کرنا ضروری سمجھا تھا اس نے۔ وہ تقریباً دس دن بعد اس وقت گھر میں کھانا کھا رہا تھا اور ذرا فرصت میں بھی لگتا تھا۔

"جی۔۔ ایمن تو سو بھی چلی۔۔" اس نے جواب دیا۔ سمجھ نے سر ہلایا پھر اس کی جانب دیکھا۔

"آپ نے کھانا کھالیا۔؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ نینا اپنا پیٹ بھر چکی تھی لیکن اس خیال سے کہ وہ اسے یہاں سے جانے کو تا کہہ دے نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"نہیں۔۔ ابھی تو نہیں۔۔۔۔۔"

"کھانا کھالیں آپ بھی۔۔" سمجھ نے کہا تھا۔ وہ فوراً اس کے سامنے والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی پھر کھانا تو خاموشی سے ہی کھایا گیا کہ کرنے لائق کوئی بات بھی ہی نہیں۔ شہرین کی کنڈیشن اس قدر خراب تھی کہ ان سب کو اس کے علاوہ کچھ نہ جھتا ہی نہیں تھا۔

"آپ اگر مصروف نہیں ہیں کوئین تو دس منٹ بعد ذرا بیڈروم میں آئے گا۔ مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" سمجھ نے اپنا کھانا ختم کرتے ہوئے کہا تھا۔ نینا نے چونک کر اس کی شکل دیکھی پھر اس نے سر ہلایا تھا۔ پھر اس سے لمحہ بھر انتظارنا ہوا تھا۔ کھانے کے برتن لپک چھپ کر سمیٹے ہوئے وہ یہی سوچتی رہی کہ اسے کیا کہنا ہوگا۔ وہ ٹھیک دس منٹ بعد اس کے کمرے میں موجود تھی۔

"آئیں۔۔ آپ بس دو منٹ دیں مجھے۔۔ میں تو تھو برش کر لوں ذرا" سمجھ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ آرام وہ لباس میں بیڈروراز تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کا ہاسٹل واپس جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ اس کو دیکھ کر اٹھا تھا اور ہاتھ دروم کی جانب چل دیا تھا۔ نینا نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے کچھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کہاں بیٹھے پھر وہ کچھ سوچ کر کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ وہ بہت ہمت کر کے آئی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

سمجھ نے "ضروری بات" کا حوالہ نہ دیا ہوتا تو وہ اس کے انداز کو سرسری مٹی مگر اب اسے نا صرف اس کا انداز کچھ انوکھا سا لگا تھا بلکہ اس کے لہجے میں موجود نرم سا تاثر بھی اسے بے چمن سا کر رہا تھا۔ اس انداز میں تو کبھی اس نے اس سے بات نہ کی تھی۔ وہ پہلے بھی اس بیڈروم میں جانے کی نئی بار آئی تھی۔ وہ اس بیڈروم میں سو بھی جاتی تھی لیکن سمجھ نے پہلے بھی اسے اس طرح بیڈروم میں مدعو تو نہیں کیا تھا۔

"خدا جانے۔۔ کیا کہنے والے ہیں؟ کیا پتا نہیں کہ کوئین تم بہت اچھی ہو۔۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے" وہ سمجھ کے متعلق ہمیشہ ہی ایسے بے ڈھنگے باتیں سے سوچتی تھی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی۔

"ہائے اللہ۔ کیا وائی۔؟" وہ ایسی باتیں سوچتی رہی۔ اس کا ذہن کسی ایک نقطے پر مرکوز نہیں ہو پارہا تھا۔

ان کے درمیان "ضروری باتیں" تو ہوتی رہتی تھیں۔ یونیٹی یلز، ایمن کی فیس، شہرین کی ادویات۔۔۔ یہ سب معاملات نینا ہی دیکھتی تھی اور سمجھ کی ہدایات کے بعد ہی کرتی تھی لیکن یہ سب باتیں کرنے کے لیے وہ اسے بالخصوص کمرے میں تو بھی نہیں بلواتا تھا۔۔۔ وہ بہت کنفیوزڈ ہو رہی تھی۔ اسی دوران سمجھ ہاتھ دروم سے نکل آیا تھا۔

"آپ مصروف تو نہیں تھیں نا۔؟" اس نے میز پر پڑے ٹشو پیپر کے ڈبے سے ایک ٹشو پیپر لیتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

نینا نے نفی میں گردن ہلائی۔ سمجھ نے راکنگ چیر کھینچی اور کاؤچ کے بالکل قریب اس کے سامنے کر لی۔ نینا کو لگا وہ اب تو وہ کاؤچ پر سے گر ہی جائے گی۔ وہ بالکل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ اس کے اتنے قریب

پائے خواہوں میں کوئی بنا ہوا تھا اور بتا دیا جائے کیا یہ جو وہ کر رہا تھا۔ والا تھا میں ہی یہ تھا کہ مینا کا دھل دھل کر تادل معاملے کو بلا وجہ سمجھ کر کیے جا رہا تھا۔ مینا کو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا چہرہ یقیناً سرخ ہو چکا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" اب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ مینا نے دو تین گہری سانسیں بھر لیں ورنہ شاید وہ بول ہی نہ پاتی۔

"جی۔۔۔ ٹھیک۔۔۔؟" وہ ایک نظر اسے دیکھتی تھی اور پھر کٹینوز ڈھو کر اپنی انگلیوں کی جانب دیکھنے لگتی تھی۔ "آپ کے گھر میں سب کیسے ہیں؟" یہ دوسرا سوال تھا جس نے مینا کو مزید کسی قدر حواس باختہ کر دیا تھا۔ یہ سوال تو سمجھنے سے بھی نہیں پوچھا تھا۔

"ٹھیک" وہ بھجکت بھجکت اتنا ہی بولی جیسے جتنا چاہ رہی ہو کہ اب کر لو "ضروری بات" ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔

"اور۔۔۔ آپ کی بہن۔۔۔؟ ان کا بے بی۔۔۔؟" وہ پوچھتا چلا جا رہا تھا اور مینا بس حیران ہوتی جا رہی تھی۔ "سب ٹھیک تھا کہ ہیں۔۔۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔۔۔ سب خیریت ہے نا۔۔۔" اس نے اس کی جانب دیکھے بنا کہا تھا۔ اس کے اعتماد کی بحالی کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ کچھ بولتی۔

"آپ کو بچے پسند ہیں۔۔۔؟" سمجھنے کے بالکل عام سے انداز میں اگلا سوال کیا تھا لیکن وہ دیکھ اسی کی جانب رہا تھا۔ مینا کو لگا اس کی آنکھیں اس سوال پر پھٹ سی گئی ہیں۔ اسے لگا وہ اب کچھ بول نہیں پائے گی۔ یہ ایک اضطرابی سائل تھا۔ اسے اگر سچ پرندہ حاد اسے محبت نہا ہوتی تو وہ اس سوال کا کوئی کرک سا جواب دیتی لیکن اب تو جیسے اسے اس سوال پر شرم ہی آگئی تھی۔ اس سے چند لمبے کچھ بولایا نہ گیا۔ وہ اس سوال کا جواب کیا دیتی۔ اسے بچے پہلے بھی پسند نہیں رہے تھے۔ مہر کے بعد ایمن ہی مگی جو اسے اچھی لگتی تھی یا پھر ہر وہ انسان جو اسے اپنے جیسا محروم محبت نظر آتا تھا، بھا جاتا تھا۔ تیسری زری کی بیٹی مگی جس کو پہلی نظر دیکھتے ہی اس کا خون جوش مارنے لگا تھا لیکن یہ مگی سچ تھا کہ وہ اگر کبھی اپنے مستقبل کے متعلق خواب دیکھتی تھی تو اس میں ایمن اور سمجھ کے علاوہ ایک مزید بچے کے متعلق ضرور سوچتی تھی اور یہ تب سے ہونا شروع ہوا تھا جب سے ایمن نے اس سے اپنی فریڈ کے نو مولود بھائی کا ذکر کرتے ہوئے یہ خواہش کی تھی کہ اسے بھی بے بی چاہیے۔

"بچے کسی کو نا پسند نہیں ہوتے۔۔۔ انسان کی پہچان اس کے بچوں سے ہی ہوتی ہے۔۔۔ اور میں سمجھ سکتا ہوں کہ بحیثیت ایک خاتون ہونے کے آپ کو بھی بچے کی خواہش ضرور ہوگی۔" سمجھ نے کہا شروع کیا تھا۔ مینا نے اس سے ایسی باتیں بھی نہیں کی تھیں۔ اسے اب بھی یہ سب باتیں سننا اچھا نا لگ رہا تھا۔ یہ سب سننے ہوئے اسے شرم آ رہی تھی اور وہ اعتماد سے بات نہ کر پا رہی تھی۔ سمجھ نے شاید یہ محسوس کر لیا تھا۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹ کر بیٹھا اور بیچڑکی پشت سے ٹیک لگا لی پھر چند لمبے سوچنے کے بعد اس نے کہا شروع کیا تھا۔

"مجھے اور شہرین کو بچے بہت پسند تھے لیکن جب ہماری شادی ہوئی تو ہر چیز بدل سی گئی۔۔۔ میرے والدین اور شہرین کے والدین۔۔۔ دونوں ہی اس شادی پر دل سے خوش نہیں تھے۔۔۔ مجھے تو اس بات سے فرق نہیں پڑتا تھا لیکن شہرین کے لیے یہ باتیں ہماری خوشی سے کہیں زیادہ اہم تھیں۔۔۔ اس کی اوے اور اس کی بہنیں اسے بہت ڈنکی نارچہ کرتی تھیں اور یہی حال میری امی کا بھی تھا۔ میرے سمجھانے کے باوجود وہ بہت پریشان رہتی تھی۔۔۔ ضرورت سے زیادہ ایک ہی بات کے متعلق سوچتے رہنے کے باعث وہ ایٹمی ڈپریشنٹ بھی لیا کرتی تھی۔۔۔ ایمن انہی حالات میں پیدا ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔" وہ چپ ہوا۔

"ہمیں۔۔۔ یعنی مجھے اور شہرین دونوں کو دوسرے بچے کی حاجت نہیں تھی" اس نے ایک ہی نملہ بولا اور

پھر چپ ہو گیا۔ اب کی بار نینا اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ ذرا سا آگے ہوا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ نینا کو کرنٹ سا لگا تھا۔

"ابھی بھی نہیں ہے" اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے وہ مزید بولا تھا۔ اس کی نگاہوں کا مرکز نینا کا چہرہ تھا۔ نینا کو لگا اب کی بار تو ضرور ہی اس کی سانس رُک جائے گی۔ اس کا دل چاہا وہ کسی فلمی ہیروئن کی طرح اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑوائے اور "ہائے اللہ" کہتی ہوئی کمرے سے فرار ہو جائے جبکہ وہ اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے مزید کہہ رہا تھا۔

"کوئین کچھ مرد تو حید کے اتنے قائل ہوتے ہیں کہ ان کے لیے پہلی محبت ہی آخری ہوتی ہے۔۔۔ ان کی زندگی میں دوسری عورت کی گنجائش کبھی نہیں نکلتی۔۔۔ مجھے پتا ہے ایسے مرد اچھے نہیں ہوتے۔۔۔ آپ ایسے مردوں کو مضبوط لکھو اس بھی کہہ سکتی ہیں۔۔۔ لیکن بس میں ایسا ہی ہوں۔۔۔" وہ ایک بار پھر خجب ہو گیا تھا۔ نینا کا دل اب کی بار ایک اور ہی انداز میں دھڑکا۔ وہ کیا کہنے والا تھا۔ اس کا انداز ایک دم بے حد لائق سا ہو گیا تھا۔

"میری زندگی میں کسی دوسری عورت کی گنجائش کبھی پیدا نہیں ہوگی۔" اس نے انتہائی مستحکم لہجے میں کہا تھا جیسے اسے باور کروا رہا ہو کہ میرے متعلق سوچنا چھوڑ دو۔

"شہرین کی بیماری نے اسے ہی ایب نارل نہیں کیا بلکہ مجھے بھی نارل نہیں رہنے دیا۔۔۔ میں اندر سے اتنا مردہ ہو چکا ہوں کہ کسی کو کوئی خوشی نہیں دے سکتا۔۔۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں الگ ہو جانا چاہیے۔" اب کی بار اس کا لہجہ بے حد لاچار نظر آتا تھا۔ نینا نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑوانا چاہا تھا لیکن سمجھنے سے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت ہلکی ناکر گئی۔

"آپ بہت اچھی ہیں کوئین۔۔۔ آپ نے میرے اور میرے گھر کے لیے میری بچی کے لیے جو بھی کیا ہے۔۔۔ میں تو مرتے دم تک اس کا احسان نہیں اتار سکتا۔۔۔ لیکن بے بھی سچ ہے کوئین کہ میں آپ کو کوئی خوشی بھی نہیں دے سکتا۔۔۔ بھلا ایب نارل لوگ کب کسی کا احسان اتار سکتے ہیں۔۔۔ میں تو کچھ نہیں دے سکتا آپ کو۔۔۔ اور آپ تو بہت کچھ ڈیڑھ رو کر رہی ہیں۔۔۔ ایک اچھا لائف پارٹنر۔۔۔ گھریا۔۔۔ اولاد۔۔۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو زندگی کی ہر وہ خوشی دے جس کی آپ کو خواہش ہے" وہ چپ نہیں ہوا تھا لیکن نینا نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے چھڑوا لیا تھا۔

"مجھے آپ کی خواہش ہے۔۔۔ اتنا کچھ سمجھ سکتے ہیں آپ۔۔۔ بڑی بڑی باتیں کر سکتے ہیں آپ۔۔۔ یہ کیوں سمجھ میں نہیں آتا آپ کو کہ آپ کی ہی خواہش ہے مجھے۔۔۔ بس آپ کی خواہش" وہ چلائی تھی اور پھر ناچاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ اس کا دل اب مزید تیز دھڑک رہا تھا لیکن اب کی بار اس دھڑکنے کی نوعیت مختلف تھی۔ پہلے حیا نے ٹھہر رکھا تھا جبکہ اب حقیقی اور ڈھکے دل کو بوجھل کر دیا تھا۔

"محبت کرنی ہوں میں آپ سے۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے اتنی نہیں کرنی ہوں گی جتنی شہرین کو تھی آپ سے۔" اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کیں پھر مزید بولی۔

"لیکن اتنی ضرور کرنی ہوں کہ صبح آٹھ بجے پر صرف آپ کا چہرہ دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔۔۔ آپ کا چہرہ دیکھے بنا نیند نہیں آتی ہے۔۔۔ آپ کو تو بھی پتا نہیں چلا لیکن آپ جب تک گھر نہیں آ جاتے۔۔۔ مجھ سے کھانا بھی نہیں کھایا جاتا۔۔۔ اور جب آپ گھر آ جاتے ہیں تو بلا وجہ آپ کے آس پاس گھومتی رہتی ہوں کہ شاید کسی لمحے تو آپ مجھے دیکھیں گے۔۔۔ آپ کی ایک نظر کی خاطر رات کو اٹھ اٹھ کر آپ کو دیکھنے آتی ہوں۔۔۔" وہ رو رہی تھی اور بول رہی تھی۔

"آپ آفس کے لیے نکلتے ہیں تو آپ پر دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہتی ہوں۔۔۔ آپ کھانا نہیں کھاتے

تو مجھ سے بھی ایک قلم نہیں لیا جاتا۔۔۔ ایسی نہیں تھی کوئین۔۔۔ بخدا ایسی نہیں تھی۔۔۔ آپ نے بنا دیا ہے مجھے ایسا۔۔۔ اور آپ کہتے ہیں کہ مجھے کچھ نہیں دے سکتے۔۔۔ آپ چاہتے ہیں مجھے اچھا لائف پارٹنر مل جائے۔۔۔ اتنی ہی فکر ہے آپ کو میری تو آپ خود کیوں نہیں بن جاتے۔۔۔ "اچھے"۔۔۔ "وہ بلک رہی تھی۔۔۔ سچ چیمبر پر بیٹھا مسلسل اس کی جانب دیکھ رہا تھا پھر اس نے تھکے ہوئے انداز میں چیمبر کی پشت سے فیک لگائی تھی وہ مسلسل رو رہی تھی۔۔۔ سچ کا لالچ اس انداز سے مزید ڈکھ دے رہا تھا۔ وہ کیسے پتھر ہو کر بیٹھا تھا۔ وہ روئی چلی جا رہی تھی۔

"کیوں ڈکھ دے رہی ہیں مجھے۔۔۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ کے آنسو کیا کر رہے ہیں میرے ساتھ۔۔۔" وہ لجاجت بھرے انداز میں بنا اس کی جانب دیکھے بولا تھا۔ نینا نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کیں پھر ناک صاف کی اور گلو کیر لہجے میں ترخ کر بولی۔

"کچھ نہیں کر رہے میرے آنسو۔۔۔ آپ کے ساتھ۔۔۔ آپ بالکل پتھر ہیں۔۔۔ کچھ نہیں پتا چلتا آپ کو۔۔۔ ورنہ میری محبت بھی تو محسوس ہوتی آپ کو۔۔۔ آپ کے پاس مجھے دینے کو بس ایک ہی چیز ہے۔۔۔" وہ لہجہ بھر کوڑی پھر آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"کوئین۔۔۔ آپ فی الفور اپنی چیزیں لیں۔۔۔ اماں رضیہ سے اپنا حساب کتاب کلیم کر لیں اور میرے گھر سے چلی جائیں۔۔۔ مجھے آپ کی سرزد کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ میں دوبارہ آپ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا اپنے گھر میں۔۔۔ ہر ہفتے دو ہفتے بعد بس یہی کہہ سکتے ہیں آپ مجھے۔۔۔ میں جانتی ہوں۔۔۔ آپ کو نفرت ہے مجھ سے۔۔۔ آپ کو میری محبت کی ضرورت ہے نا مجھ سے کوئی سروکار۔۔۔ میں آپ کے لیے ذرا سی بھی اہم نہیں ہوں۔۔۔ ذرا سی بھی نہیں۔۔۔ شاید میں بھی کسی کے لیے اہم نہیں ہو سکتی۔۔۔" وہ بلکنے لگی تھی، سچ چو کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"ایسے بی ہیو مت کریں کوئین۔۔۔ خدا را مرے ہوئے کو مزید مت ماریں۔۔۔ میں بچہ نہیں ہوں۔۔۔ میں سمجھ سکتا ہوں سب۔۔۔ سب نظر آتا ہے مجھے۔۔۔ آپ کی آنکھیں جب میرے ارد گرد گھومتی رہتی ہیں۔۔۔ مجھے سب محسوس ہوتا ہے۔۔۔ اور جتنا محسوس ہوتا ہے اتنا ہی ڈکھ ہوتا ہے۔۔۔ بے حد ڈکھ ہوتا ہے۔۔۔ میں نے کب چاہا تھا کہ زندگی میں کسی کو اتنے ڈکھ دوں گا۔۔۔ لیکن پہلے شہرین اور اب آپ۔۔۔ میں کسی کے لیے بھی خوشی کا باعث نہیں بن سکتا۔۔۔ میں نے کہا نا میں بھی ایب نارٹل ہو چکا ہوں۔۔۔ میں جس کے ساتھ رہوں گا اسے بھی ایب نارٹل کر دوں گا۔۔۔ اوے سچ کہتی ہیں۔۔۔ میں واقعی محسوس ہوں۔۔۔ میری زندگی میں جو بھی شامل ہوا۔۔۔ اس کو تکلیف ہی ملی ہے مجھ سے۔۔۔ آپ تو محسن ہیں میری۔۔۔ اب آپ کو بھی تکلیف دوں کیا۔۔۔ آپ کو دکھ نہیں دینا چاہتا۔۔۔ بہت احسان ہیں آپ کے میرے سر۔۔۔ آپ کو دکھ دیا تو میرا اللہ مزید خفا ہو جائے گا مجھ سے۔۔۔ پھر ایمن کے آگے آئے گا سب۔۔۔ اپنی بچی کو آنسو نہیں دے سکتا میں۔۔۔ اس لیے جہاں اتنے احسان کیے ہیں آپ نے۔۔۔ وہاں یہ بھی کریں۔۔۔ چھوڑ دیں ہمیں۔۔۔ اپنے متعلق سوچیں۔۔۔ اپنی زندگی جنیں۔۔۔ آپ اپنا سامان پیک کر لیں۔۔۔ ایمن کے اسکول جانے کے بعد ڈرائیور آپ کو چھوڑ آئے گا" وہ اتنے دو ٹوک انداز میں بولا اور پھر اٹھ کر دوبارہ سے ہاتھ روم میں چلا گیا۔

کوئین سے وہاں زکا ہی نا گیا۔ اس سے زیادہ کیا بے عزتی سہتی وہ۔۔۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی باہر نکل گئی تھی۔

سب ختم ہو گیا تھا۔

کبڑی جاو و گرنی نے رہنزل کو ہی دکھا نہیں دیا تھا۔ اس شہزادے کو بھی اندھا کر ڈالا تھا جس کی خاطر

رہنزل نے اپنے اوپے لیے چھ لٹری لٹری سے چھٹا لٹری لٹری
اب اندھا شہزادہ رہنزل کو زندگی بھر نہیں پہچان سکتا تھا۔

☆☆☆

"صوفیہ۔۔۔" کاشف نے پکارا تھا۔ وہ سوئی تو نہیں تھیں لیکن غنودگی ذہن پر مکمل طور پر طاری ہوئی جا رہی تھی۔ ان کا دل نہیں چاہا کہ وہ کوئی جواب دیں سو وہ چپ چاپ بیٹھی رہیں
"صوفیہ۔۔۔ سوئی ہو گیا" انہوں نے پھر پکارا تھا اور ساتھ ہی صوفیہ کو کندھے پر ان کا لیس بھی محسوس ہوا۔ انہیں کروٹ بدلتی پڑی۔

"بس یہی سمجھیں۔۔۔ اگر آپ دومنٹ کے لیے بھی خاموش ہوئے تو میں نیند کی وادی میں اتر جاؤں گی" وہ نیم خوابیدہ لہجے میں بولی تھیں۔ کاشف سر ہانے کو بیڈ کے کراؤں سے لگائے بیٹھے تھے۔ چہرے پر کچھ الجھن سی تھی صوفیہ کو ذرا حیرت بھی ہوئی۔ وہ جاگ رہے ہوئے تھے تو بیوی یا موبائل میں مصروف ہوتے تھے۔ اس طرح کسی بھی پریشانی میں کم بیٹھے رہنا ان کی عادت نا تھی۔ صوفیہ کی نیند اڑی گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"کیا بات ہے۔۔۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔۔۔؟ دل گھبرا رہا ہے کیا؟" وہ پریشانی بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔ کثرت تبہا کو کوئی کی وجہ سے ان کی طبیعت اکثر خراب ہو جایا کرتی تھی۔
"صوفیہ! یہ اظفر کیسا لڑکا ہے۔۔۔؟" انہوں نے بتان کی جانب دیکھے سوال کیا تھا۔ صوفیہ کو ان کے سوال پر بھی حیرت ہوئی۔

"یہ کیسا سوال ہے۔۔۔ وہ آپ کی بیٹی کا شوہر، آپ کا داماد ہے۔۔۔ آپ کو نہیں پتا وہ کیسا لڑکا ہے؟" صوفیہ نے جواب دیا تھا۔

"تم سو جاؤ صوفیہ۔۔۔ رات کے اس وقت طنز کرنے سے بہتر ہے تم سو ہی جاؤ" کاشف نے ایک نظران کی جانب دیکھا تھا اور چوکر کہا تھا۔ صوفیہ کو اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

"میں طنز نہیں کر رہی۔۔۔ میں تو حیران ہو رہی ہوں کہ آپ کو یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں پڑی۔۔۔ وہ گھر کا بچہ ہے۔۔۔ داماد ہے ہمارا اچھا لڑکا ہے ظاہر ہے تب ہی تو آپ نے اپنی بیٹی کا ہاتھ دیا اس کے ہاتھ میں۔۔۔ میز دار بھی ہے۔۔۔ کھانا کھاتا بھی اچھا ہے۔۔۔ ہماری بیٹی کا دم بھرتا ہے۔۔۔ ہماری عزت بھی کرتا ہے۔۔۔ میں تو یہی کہوں گی کہ بہت اچھا لڑکا ہے" صوفیہ نے لہجے کو معتدل رکھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ جس طرح خفا ہو کر بولے تھے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ پریشانی میں مبتلا ہیں۔ کاشف نے اپنا رخ ذرا سا ان کی جانب موڑا

"صوفیہ تمہیں نہیں لگتا کہ اظفر ہر وقت موبائل استعمال کرتا رہتا ہے۔۔۔ بہت زیادہ استعمال۔۔۔ جب دیکھو موبائل میں مگن رہے گا۔۔۔ نگاہیں ہمیشہ موبائل کی اسکرین پر مرکوز رکھے گا۔۔۔ چاہے بات کر رہا ہو یا کھانا کھا رہا ہو۔" صوفیہ کے چہرے پر پہلی بار طنز سی مسکراہٹ چمکی تھی۔

"کاشف صاحب۔۔۔ یہ تو گھر گھر کی کہانی ہے۔۔۔ آج کل تو ہر شخص ہی یہی کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔۔۔ کچھ دن ہوئے آیا آئی ہوئی تھیں۔۔۔ وہ بھی اپنے بیٹوں کی یہی شکایت کر رہی تھیں کہ موبائل سے نظریں نہیں ہٹتیں ان کے بیٹوں کی۔۔۔ ہر وقت بس موبائل رہتا ہے ہاتھوں میں۔۔۔ اور پھر۔۔۔ آپ خود بھی تو خوب کھیلتے ہیں اس کھلونے کے ساتھ" صوفیہ کا مقصد انہیں سلی دلانا تھا کہ یہ عام سی بات ہے لہذا لہجے کو شوخ بنا کر بولی تھیں مگر آنکھوں میں چھپا طنز یہ سن کر مکمل طور پر عیاں تھا۔

"میں تو کیم کھیلتا ہوں۔۔۔ گولیاں نافیاں توڑتا رہتا ہوں۔۔۔ اور کوئی مصروفیت بھی تو نہیں ہے اس عمر

میں۔۔۔ وہ چوکر بولے تھے۔

"اظفر بھی گیم ہی کھیلتا ہوگا۔ اور وہ کیا لوگوں کے بچے اغوا کرتا رہتا ہے موبائل پر۔۔۔ عجیب باتیں کرتے ہیں آپ۔۔۔ آپ کا مشغلہ۔۔۔ اس کا گناہ "صوفیہ بھی اب کی بار ان کے لہجے سے زچ ہو کر بولی تھیں

"تم سمجھ ہی نہیں رہی ہو میری بات۔۔۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ کہیں۔۔۔" وہ کہتے کہتے لمحہ بھر کو چپ ہوئے پھر گہری سانس بھر کر بولے۔

"مجھے اس لڑکے کے رنگ ڈھنگ ٹھیک نہیں لگتے۔۔۔ کچھ رنگین مزاج سا ہے۔۔۔ لا پرواہی۔۔۔ زری کا خیال بھی نہیں رکھتا "کاشف نے دوبارہ سے کراؤن سے ٹیک لگائی تھی۔ وہ اپنی بات سمجھا نہیں پا رہے تھے۔ صوفیہ کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ چمکی لیکن وہ بولی شرارتی لہجے میں تھیں۔

"وہ تو آپ بھی ہیں۔۔۔ رنگین مزاج۔۔۔ اس عمر میں بھی بائیکے جیلے بنے پھرتے ہیں۔۔۔ وہ تو پھر جوان بچہ ہے کاشف صاحب۔" ان کے چہرے پر بے انتہا حلقی نمایاں ہوئی تھی۔

"ایک تو تم مجھے ہر بات میں تھسٹ لیا کرو۔۔۔ غضب خدا کا میں اپنی پریشانی کا اظہار کر رہا ہوں اور تمہیں یہاں طنز و مزاح سے فرصت نہیں مل رہی۔۔۔ میری بیٹی کا ذرا خیال نہیں ہے اس شخص کو۔۔۔ وہ اس کی وجہ سے بھوکے پیٹھی رہتی ہے اور پھر محترم جانے کہاں کہاں گھومتے رہتے ہیں۔۔۔" وہ ناراض لہجے میں بولے تھے۔ وہ چاہ کر بھی صوفیہ کے سامنے ٹھل کر اپنے خدشات کا اظہار نہیں کر پا رہے تھے۔ انہیں اس درجہ سنجیدہ دیکھ کر صوفیہ بھی سنجیدہ ہوئیں پھر اپنی جگہ پر لیٹی ہوئی بولیں۔

"آپ سو جائیں کاشف۔ خواہ خواہ میں پریشان ہو رہے ہیں۔۔۔ جیسا آپ سوچ رہے ہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔ وہ جوان بچہ ہے۔ اس عمر میں ایسے ہی ہوتے ہیں لڑکے۔۔۔ پچاس سال والی ذمہ داری اب ستائیس اٹھائیس میں تو نہیں آئے گی نا۔۔۔ آپ باپ ہیں زری کے۔۔۔ جیسا خیال آپ رکھتے ہیں۔۔۔ ویسا وہ تو نہیں رکھ سکتا نا۔ آپ کو زری سے زیادہ ہی محبت ہے۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ آپ بلا وجہ وہی ہو جاتے ہیں "صوفیہ نے انہیں سمجھایا تھا اور ساتھ ہی کروٹ بدل لی تھی۔ کاشف چند لمحوں کی پشت کی طرف دیکھتے رہے پھر انہوں نے سر جھٹکا تھا۔

"نہیں صوفیہ۔۔۔ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔۔۔ میری آنکھوں نے جو دیکھا وہ وہم نہیں ہو سکتا "انہوں نے سوچا تھا۔ آج کی رات انہیں نیند نہیں آنے والی تھی۔

☆☆☆

"اپنے متعلق سوچیں۔۔۔ اپنی زندگی جنیں "اس کا لہجہ کتنا سپاٹ تھا۔ نینا کا دل جل کر خا کستر ہو چکا تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی لیکن پللیں ہر پانچ منٹ بعد بھاری ہو جاتی تھیں۔ آنسوؤں کا بوجھ سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا پھر وہ نا چاہتے ہوئے بھی رونے لگتی تھی۔ پانچ منٹ رو لیتی تھی تو پھر غصہ آنے لگتا تھا۔ بیڈروم سے نکل کر آتی تھی تو انداز ایسا تھا کہ ساری دنیا کو آگ لگا کر سبج رندھاوا کو بھی اس میں جھونک دے گی اور خود پاس بیٹھ کر تماشا دیکھے گی لیکن دس منٹ ایمن کے کمرے میں بیٹھ کر جلنے کڑھنے کے بعد اس پر عقدہ ٹھٹھا تھا کہ وہ یہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سبج رندھاوا کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

"اپنی زندگی جنیں۔۔۔ کیسے جنموں اپنی زندگی۔۔۔ آپ کے نام کا زنگ لگ چکا ہے میری زندگی کو۔۔۔ اور زنگ اترتے ہیں بھلا "وہ جلے بھنے انداز میں سوچتی تھی۔ سبج کے تاثرات یاد آتے تھے تو دل چاہتا تھا کہ ابھی سب کچھ چھوڑ چھاڑیہاں سے بھاگ جائے لیکن دل میں اس کا جو مقام تھا وہ یہ بھی نہیں کرنے دے رہا تھا۔

"اپنی زندگی جنیں۔۔۔ اونہ اتنا آسان ہے کیا اپنی زندگی جینا۔۔۔ اور اگر جی سکتی اپنی زندگی تو آپ کے حکم کا انتظار تھوڑی کر رہی ہوتی۔۔۔ عرصہ پہلے سب چھوڑ چھوڑ آپ کی اس سلطنت کو ٹھوکر مار کر جا چکی ہوتی۔۔۔ لیکن قسمت خراب۔۔۔ ایسا کر نہیں سکتی۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ کیا اپنی گناہ گارہوں میں کہ مجھے ہر جگہ سے اسی طرح دھکا مارا جائے گا۔۔۔ ماں باپ ہیں تو وہ بھی شکل دیکھتے پر راضی نہیں۔۔۔ اور یہ جو آپ نے شوہر دیا ہے۔۔۔ (گہری سانس۔۔۔ ایک ساعت کا وقفہ) ہاں ٹھیک ہے میں نے ضد کر کے لیا تھا اس بدتمیز انسان کو۔۔۔ لیکن یا اللہ اب میں محبت کرنی ہوں اس سے۔۔۔ اس کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔۔۔ (ایک اور گہری سانس۔۔۔ ایک مزید ساعت کا وقفہ) ہاں ٹھیک ہے پیارے اللہ! آپ کی خاطر تو کبھی کچھ نہیں کیا میں نے۔۔۔ لیکن آپ کے ساتھ کوئی سودے بازی تو نہیں ہو سکتی نا۔۔۔ آپ کی محبت تو ہر شرط سے بالاتر ہے۔۔۔ تو پھر پلیز میری خاطر اس احمق شخص کو تھوڑی عقل دلائیں۔۔۔ ایسے کون چھوڑتا ہے اپنی بیوی کو۔۔۔ کیسے کہہ رہے تھے پہلا سامنے بنا کر۔۔۔ میں واقعی منحوس ہوں۔۔۔ اونہ۔۔۔ منحوس نہیں جناب! کم محصل ہیں آپ۔۔۔"

بستر پر لیٹے لیٹے وہ جلتے جگھے انداز میں بڑبڑاتی جا رہی تھی۔ اس کا ذہن اتلا چار تھا کہ سوچیں بھی تر جرسی ہوئی جا رہی تھیں۔

اگلا لمحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔۔۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کشتیاں اتنی بُری طرح جل چکی تھیں کہ واپس پلٹنا بھی مشکل تھا اور واپس پلٹنے کی خواہش بھی کسے تھی۔

"یا اللہ۔۔۔ میں نے کیا غلط کیا۔۔۔ شادی ہی تو کی تھی۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ ضد کر کے کی تھی لیکن آپ سے بہتر کوئی نہیں جانتا کہ یہ شادی کس لیے کی تھی میں نے۔۔۔ اچھا میں مانتی ہوں کہ میری جذباتیت میرے اس فیصلے کا سب سے بڑا محرک تھی۔۔۔ اور ایمن ہے تو میں واقعی مخلص رہی ہوں یا اللہ!۔۔۔ لیکن یہ فضول شخص جو اتنا مغرور بنا پھر رہا ہے۔۔۔ اس کی خاطر تو نہیں کی تھی نا۔۔۔ لیکن میں اس شادی کو پچانا اسی شخص کی خاطر چاہتی ہوں۔۔۔ آپ گواہ ہیں یا اللہ میں نے اس کے علاوہ کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔۔۔ اور اس سے بھی تب کی جب میرا نکاح ہو چکا تھا اس سے۔۔۔ کچھ غلط تو نہیں کیا۔۔۔ تو پھر مجھے تو انعام ملنا چاہیے۔۔۔ سزا کی حق دار تو نہیں ہوں میں۔۔۔ بس مجھے نہیں پتا یا اللہ۔۔۔ مجھے اس مشکل سے نکالیں۔۔۔ اس شخص کو سمجھائیں کہ مجھے کھونا مسکے سمجھ کر ہی سہی لیکن اپنی زندگی سے نکال باہر مت کر۔۔۔"

اس کو احساس دلائیں اس کی بے عقلی کا یا اللہ۔۔۔ یہ تو کوئی بات نا ہوئی۔۔۔ بس مجھے نہیں پتا۔۔۔ میں نہیں جاؤں گی اس گھر سے۔۔۔ میں نہیں جاؤں گی۔۔۔ کیا کیا نہیں کیا اس کی خاطر میں نے۔۔۔ کھانا پکانا، صفائیاں کرنا، کپڑے دھونا، اور سب سے بڑھ کر پنچپ رہنا۔۔۔ تمیز سے بولنا۔۔۔ ہر بات کے جواب میں "جی" "جی" کرنا۔۔۔ ورنہ کوئین تو پنچپ رہنا جانتی تھی نا۔۔۔ بس اسی لیے سر چڑھ گئے ہیں محترم سیاح صاحب۔۔۔ اسی بات کا انعام دے دیں مجھے یا اللہ کہ میں نے بدتمیزی کرنا چھوڑ دی ہے۔۔۔ اب تو سب کی عزت کرنے لگی ہوں۔۔۔ آپ کو تو پتا ہے میرا یا اللہ۔۔۔ مجھے نہیں پتا بس۔۔۔ مجھے کچھ نہیں پتا "اس کا دعائیں مانگنے کا بھی اپنا ہی انداز تھا۔ اسی طرح بڑبڑاتے بڑبڑاتے جانے کب آنکھ لگ گئی تھی صبح معمول کے مطابق الارم پر ہی آنکھ مل گئی۔

وہ آنکھ کر بٹھ گئی تھی۔ ایک منٹ میں ہی رات والی سب باتیں یاد آ گئی تھیں۔ دل پھر سے بوجھل ہونے لگا وضو کرتے ہوئے بھی سیاح کا چہرہ اور الفاظ آنکھوں اور سامعوں میں گھومتے رہے۔ ایک عرصے بعد نماز اس نے بہت ہی خشوع و خضوع سے ادا کی تھی۔

"یا اللہ۔۔۔ میں کیا میری اوقات کیا۔۔۔ پہلے بھی مجھ گناہ گار کو آپ ہی نے سنبھالا ہے اور اب بھی میں پوری کی پوری آپ کے حوالے۔۔۔ آپ کو میرے لیے جو مناسب لگے، مجھے بس اُسی پر راضی کر دیجیے۔۔۔ اگر

تو میرے چلے جانے سے کوئی بھلائی مقصود ہے تو مجھے جانے کی ہمت عطا کیجیے۔۔۔ ورنہ مجھے کوئی ایسی راہ سمجھا دیں جو میری مشکلات کو حل کر دیں۔۔۔ آمین ثناء آمین۔۔۔ یارب العالمین۔۔۔"

ایسے دعا تو اس نے پہلے کبھی نہ مانا تھی۔ دل کو ایسا سکون ملا جو شاید پہلے کبھی نہ ملا تھا۔ اس نے جانے نماز کی تہ لگائی اور اطمینان سے امین کو جگانے لگی۔ ذہن میں گردش بھی لیکن دل پرسکون تھا۔ وہ سارا معاملہ اب اللہ کے حوالے کر چکی تھی۔ اب جو بھی ہو جاتا اسے منظور تھا۔ امین کا ہاتھ منہ ڈھلا کر اسے یونین فارم پہناتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کودتا تھا۔

"امین۔۔۔ آج آپ اسکول سے گھر نہیں آؤ گی۔۔۔ بلکہ نانو کے گھر آؤ گی۔۔۔ میں نے ڈرائیور انکل کو سمجھا دیا ہے۔۔۔ ہم کچھ دن ان کے گھر رہیں گے۔۔۔ زری خالہ کے بے بی کے پاس۔۔۔ ادا کے" اس نے اسے سمجھایا تھا۔ امین نے اس کا چہرہ دیکھا تھا اور پھر سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

"تمہیں آگئی بہن کی یاد۔۔۔؟" زری نے اس کو دیکھتے ہی کہا تھا۔ وہ اپنا اور امین کا کچھ سایان جس میں کپڑے اور امین کی کتابیں وغیرہ شامل تھیں لے کر امین کے اسکول سے آنے سے پہلے وہاں آگئی تھی۔ ڈرائیور کو اس نے کہہ دیا تھا کہ آج امین کو اسکول سے میری امی کے گھر لے آنا اور کل سے پھر روزانہ پک اپنڈ ڈراپ وہیں سے کیا کرنا۔ اماں رضیہ کو اس نے بس یہی بتایا تھا کہ زری کی وجہ سے کچھ دن وہ اپنی امی کے گھر رہے گی۔ گھر سے نکلتے ہوئے بھی اس کا دل پرسکون ہی تھا

"پہلے بھی جو کچھ ہوا، اس پر میرا اختیار کب تھا۔۔۔ اور آئندہ بھی جو ہوگا۔ میرے اختیار میں کب ہے۔۔۔ میں اب بس اپنی اوقات میں رہوں گی۔۔۔ رب جانے اور اس کے کام"

گھر کے گیٹ سے نکلتے ہوئے اس نے ایک نظر اوپر اس کمرے کی بڑی سی کھڑکی پر ضرور ڈالی تھی جو صبح کے کمرے میں چلتی تھی۔ اس کے دل سے بس یہی صدا نکلتی تھی۔ اسی لیے جب وہ امی کے گھر پہنچی تو اس حالت میں نہیں تھی جس حالت میں وہ رات سوئی تھی۔ اس نے راستے سے زری کا پسندیدہ جاکلیٹ بج کی لیا تھا۔ اس کی بیٹی کے لیے شاپنگ کی تھی۔ اس کے پورے وجود سے اطمینان نکلنے لگا تھا۔ زری کا طعنہ بھی اسے طعنہ نہیں لگا تھا۔

"یاد تو مرنے والوں کو کیا جاتا ہے۔ تم تو ابھی تک زندہ ہو" اس نے بشارت بھرے انداز میں جواب دیا تھا حالانکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ امی اسے بغور دیکھ رہی ہیں۔

"امین کی ماں ایسی ہے۔۔۔ کچھ بہتر ہوئی حالت۔۔۔ میں نے آنا تھا اسے دیکھنے۔ لیکن زری کی وجہ سے گھر سے نکلنا ہی نہیں ہوتا۔۔۔ اب تم آگئی ہو تو تمہارے ساتھ جاؤں گی ہاسپٹل" انہوں نے جیسے اس کے گھکھوہ کرنے سے پہلے ہی وضاحت کر دی تھی۔

غیرت نے ان کی بات کے جواب میں بھی فقط سر ہی ہلا دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے بہت عرصے بعد ایک دعا اتنے خلوص سے مانگی تھی جو فوراً قبول ہو گئی تھی۔ زندگی دہی تھی، حالات اور مسائل ویسے ہی تھے جیسے رات تھے۔ لیکن خدا نے اس کے دل کو سکون کی دولت بخش دی تھی۔ اس نے خلل کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اپنے خالق کے ہاتھ میں سونپ دیا تھا جس کی بنا پر اس کا وجود بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ اب کوئی کچھ بھی کہتا یا کرتا اسے پردا نہیں تھی۔

"میں امین کے لیے کیا بناؤں۔۔۔ نوڈلز بنا دوں؟" امی اس کے چپ رہنے پر دوبارہ بولی تھیں۔

"نہیں نہیں۔۔۔ آپ آرام کریں۔۔۔ میں خود بنا لوں گی بلکہ مجھے بتائیں زری کے لیے کیا بنانا ہے۔۔۔ میں اس کے غرے اٹھانے ہی تو آئی ہوں" وہ مسکرا کر بولی۔ امی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ارے یار۔۔۔ تم اس مصیبت کو بھی لے آئی ہو ساتھ۔۔۔ اسے تو وہیں چھوڑ آتی۔۔۔ رہے اپنے باپ کے ساتھ۔۔۔ ایک تو میں تمہارے اس ڈم چھلے سے بڑی عاجز ہوں" زری چوگر بولی تھی۔ نینا نے اس کی جانب دیکھا۔ ایمن کے معاملے میں وہ ابھی بھی جذباتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ زری کو اس طرح کہنے پر ٹوکتی۔ امی بولی تھیں۔

"زری تم کب عقل بیکھو گی۔۔۔ وہ ایک چھوٹی بچی ہے۔۔۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہی رہے گی اور نینا اس کی ماں ہی ہے اب۔۔۔ تم جانتی ہی ہو وہ نینا کے بغیر نہیں رہتی۔۔۔ اب نینا تمہاری خاطر یہاں آئی ہے تو بچی کو بینک میں تو جمع نہیں کروا کر آسکتی۔۔۔ اور خبردار اس کے سامنے کچھ بھی الٹا سیدھا مت بولنا۔۔۔ تم خود بھی اب ایک بیٹی کی ماں ہو۔۔۔ سوچ کچھ کر بولنا سیکھو۔"

امی نے اسے گھر کا تھا۔ اسے نہ اتنا لگا مگر چپ ہو گئی، وہ اپنے گزشتہ بار کے رویے کی وجہ سے شرمندہ تھی اس لیے نینا کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اسے ایمن بھی پسند نہیں رہی تھی لیکن وہ نینا کے آنے سے خوش تھی۔ اس نے بھی آتے ہی زری کے کافی کام سنبھال لیے تھے۔ اسکول کے بعد ایمن بھی وہیں آگئی تھی تو گھر میں مزید رونق ہو گئی۔ وہ زری کی بیٹی کو دیکھ کر بے تحاشا خوش تھی۔ اس کی بار بار تعریفیں کر رہی تھی کہ زری کا مزاج مزید اچھا ہو گیا۔ ابا کے آنے کے بعد نینا اپنے کمرے میں ہی محدود رہی تھی لیکن پھر بھی پہلا دن اطمینان سے گزر گیا تھا۔ اس سب کے دوران اس کا وھیان مسلسل اپنے موبائل فون کی جانب لگا رہا تھا کہ شاید مسج فون کر کے اسے ڈانسنے لگا کہ وہ ایمن کو کیوں لے کر گئی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

"ایک فون تو کر ہی لیتا ہے انسان۔۔۔ اور اللہ پاک کیسے شخص سے محبت کروادی آپ نے مجھے۔ انہیں تو اپنی بیٹی کا بھی احساس نہیں ہے۔"

یہ نینا مشغلہ ہاتھ لگا اس کے۔۔۔ ساری زندگی دنیا بھر سے لڑتی جھگڑتی رہی تھی۔۔۔ ذرا ذرا سی بات پر چلا کر آسمان سر پر اٹھا لیتا اس کی عادت رہی تھی لیکن اب جا کر سمجھ میں آیا تھا کہ فرسٹریشن نکالنے کا سب سے بہتر طریقہ تو یہ تھا کہ ساری شکایتیں اللہ کے پاس رجسٹر کروادو۔۔۔

"دعا سے بہتر انتقام کوئی نہیں ہو سکتا۔۔۔ میں اللہ سے دعائیں کر کر کے دراصل آپ سے انتقام لے رہی ہوں مسج رندھا" اس رات امی کے گھر اپنے بستر پر ایمن کے ساتھ سوتے ہوئے اس نے مسکراتے ہوئے سوچا تھا۔ یہ اچھا انتقام تھا جس میں اسے مزا آ رہا تھا

☆☆☆

"یہ ہے کون۔۔۔؟" مقبول حسن نے ان سے پوچھا تھا۔ انہوں نے اپنے اس دیرینہ کسٹمر کو اظفر کے متعلق کچھ معلومات اکٹھی کرنے کی درخواست کی تھی۔ مقبول حسن نے زندگی کا بڑا حصہ پولیس ڈپارٹمنٹ میں گزارا تھی۔ ان کی کافی تعلقات تھے اوہراوہر۔۔۔ وہ ان کے شوروم سے اپنے گھر کے لیے کافی ابلانسز وغیرہ لیتے رہتے تھے۔ ان کی بیٹی کا جہیز بھی سارا ان ہی کے شوروم سے گیا تھا۔ کاشف ٹاکروا نے ہی داماد کے متعلق انکو آڑی کرنے کے لیے وہی ایک بہتر شخص نظر آئے کہ ان کی آپس میں کوئی رشتہ داری نہ تھی۔ وہ ان کی بات کو صیغہ راز میں رکھ سکتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے ان سے درخواست کی تھی۔

دراصل یہ میرے ایک بہت عزیز دوست کے داماد ہیں۔۔۔ وہ کچھ کلکوک کا شکار ہیں۔۔۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اس لڑکے کے متعلق معلومات اکٹھی کر دوں۔۔۔ مجھے آپ اس کام کے لیے بہترین نظر آتے ہیں۔۔۔ ایسے کام اب انسان ہر ایرے غیرے سے نہیں کہہ سکتا۔۔۔ معاملہ ذرا نازک ہے۔۔۔ آپ یوں سمجھیں میرے گھر کا معاملہ ہے۔۔۔ یہ کام کر دیں پلیز۔۔۔ میرے دوست کافی پریشان ہیں" انہوں نے درخواست کی

ہی۔ رشتہ کرتے وقت تو انہوں نے ہر بات کا دھیان رکھا تھا۔ جاہ، کھربار، دوست احباب سب معلومات حاصل کی تھیں لیکن یہ خیال تو ذہن میں نہیں آیا تھا۔ ان کے لیے تو اتنا کافی تھا کہ ان کی حسین و جمیل بیٹی اس شخص کو پسند کرتی تھی۔ اور وہ دیکھنے میں کافی خوش حال اور خوش شکل تھا لیکن اب انہیں لگ رہا تھا کہ انہوں نے غلت کا مظاہرہ کیا۔ مقبول حسن نے انہیں سلی دی تھی۔

"کاشف صاحب۔۔۔ آپ مجھے بس اس کا فون نمبر دے دیں۔۔۔ باقی میں جانوں اور میرا کام۔۔۔ آپ مجھ پر چھوڑ دیں یہ معاملہ۔۔۔ دو دن میں سب پتا کر دوں گا آپ کو"

دو دن بعد جب وہ دوبارہ ملے تھے تو مقبول صاحب کی رپورٹ کافی اطمینان بخش تھی۔

"اچھا لڑکا ہے کاشف صاحب۔۔۔ دیانت دار ہے۔۔۔ ذمہ داری سے کام کرتا ہے۔۔۔ کسی نے کوئی شکایت نہیں کی۔۔۔ رویہ بھی دوستانہ سا ہے۔۔۔ مل جل کر رہنے والا انسان ہے۔۔۔ حلقہ احباب کافی وسیع ہے۔۔۔ دوستوں کا دوست ہے۔۔۔ میں نے اس کے آفس سے سب معلومات نکل والی ہیں۔۔۔ کوئی پولیس ریکارڈ وغیرہ بھی نہیں ہے۔۔۔ اپنے دوست کو بولیں بلا وجہ ہم کا شکار نا ہوں۔۔۔۔۔ سب ٹھیک ہے" وہ عام سے انداز میں بولے تھے۔

"کاشف چند لمحے ان کا چہرہ دیکھتے رہے پھر دھیمی سی آواز میں بولے۔

"سنا ہے آفس کی خواتین میں بہت مقبول ہے؟" مقبول حسن ہنسے تھے۔

"ارے یہ تو اچھی بات ہے نا۔۔۔ جو خواتین میں مقبول ہوتا ہے۔۔۔ وہ تو بہترین انسان ہوتا ہے۔۔۔ کوئی کسی قابل ہوتا ہے تو اس کی تعریف ہوتی ہے۔۔۔ جب ہی وہ مقبول ہوتا ہے۔۔۔ اور پھر عورت کسی مرد کی تعریف کر دے تو اس سے تو مرد کی شان بڑھتی ہے" انہوں نے کاشف کی بات کو بخندگی سے نہیں سنا تھا۔

"نہیں۔۔۔ میرا مطلب تھا کوئی انجیر وغیرہ تو نہیں۔۔۔ سنا ہے کافی دل پھینک ہیں حضرت" کاشف نے بالا آخر کھڑا لایا تھا۔ مقبول حسن نے ہتھ پہ لگایا۔

"وہ تو میں بھی ہوں۔۔۔ آپ نہیں ہیں کیا۔۔۔؟" کاشف غار کے چہرے کا رنگ اڑ سا گیا تھا۔ مقبول حسین مذاق کر رہے تھے۔

"جوان بچہ ہے۔۔۔ اس عمر میں انجیر نہیں ہوگا تو کس عمر میں انجیر ہوگا۔۔۔ وہ تو آج کل سب مردوں کے ہوتے ہیں۔۔۔ آپ کا کوئی انجیر نہیں ہے کیا۔۔۔؟" وہ ہنستے ہوئے انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹٹول رہے تھے۔ کاشف چپ سے رہ گئے۔ ایک سال ہی تو گزرا تھا ان کے گزشتہ انجیر کو۔۔۔ اچھا بھلا ان کی کزن ان پر مہربان تھیں۔ صوفیہ کے مشکوک ہونے کے باوجود ان کا وقت اچھا گزر رہا تھا مگر پھر نیکم (وہ انہیں پیار سے نیکم ہی بلاتے تھے) نے ان سے شادی کی فرمائشیں شروع کر دی تھیں۔۔۔ نا صرف شادی کی بلکہ وہ کسی پوش علاقے میں ذاتی گھر کا بھی مطالبہ کرنے لگی تھیں۔ روز روز کی فرمائشوں سے تنگ آ کر کاشف نے ان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ یہ زیادہ پرانی بات تو نہیں تھی۔

"اپنے دوست کو سمجھائیں ایسی باتوں پر پریشان نہیں ہوتے۔ اگر تو یہ لڑکا ان کی بیٹی کو خوش رکھ رہا ہے۔۔۔ بچی اپنے گھر سکون سے رہ رہی ہے تو اس کا گھر برباد نا کریں۔۔۔ اچھے رشتے روز روز نہیں ملتے۔۔۔ اور ویسے بھی آج کل "گرل فرینڈ" کوئی مسئلہ نہیں بلکہ گھر کی پریشانیوں سے دور رہنے کا نسخہ ہے۔۔۔ سوشل میڈیا پر لاکھوں ایسے نسخے دستیاب ہیں۔۔۔ ایک آدھ گرل فرینڈ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔ آپ نے میں نے بھی تو جوانی ایسے ہی گزاری ہے۔۔۔ ایسی ذرا ذرا سی بات پر کون طلاق لیتا ہے" مقبول حسن نے ناک سے کبھی اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ کاشف غار کو لگا کسی نے ان کے منہ پر پھینک دے مارا ہے۔

وہ بھی تو ایسی ہی باتیں اسی انداز میں کیا کرتے تھے۔ صوفیہ کو کتنی ہی بار یہ کہہ کر مطمئن کیا تھا انہوں نے

کہ۔۔۔ ایسی "ذرا ذرا" سی بات پر گھر برباد نہیں کرنا چاہیے لیکن اب جب اپنی بیٹی کا معاملہ درپیش تھا تو ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اظفر کو ایک کی چار سنا ڈالیں۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ رشتہ ہی ایسا تھا کہ چاہتے ہوئے بھی وہ فوراً کچھ نہیں کر پار ہے تھے مگر ان کا دل بے حد بے چین تھا۔

☆☆☆

"تم واقعی جاری ہو؟" اس نے زری سے پوچھا تھا جو نہایت نزاکت سے اپنا سامان سمیٹنے میں مگن تھی۔ اس کے آپریشن کو بیس دن گزر چکے تھے۔ اسے ابھی جھک کر کام کرنے میں کافی مشکل کا سامنا تھا۔ منال (بچی) کو اکیلے سنبھالنا بھی اس کیلی گئے بس کا روگ نہیں تھا لیکن اس نے واپس اپنے گھر جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ بہت رہ لیا امی کے گھر۔۔۔ اظفر کہتا ہے بس اب واپس آ جاؤ۔۔۔ میں بہت ادا اس ہو گیا ہوں"

وہ قطعیت سے بولی تھی۔

"ابھی کچھ دن اور رہ لو زری۔۔۔ تم سے نہیں سنبھالا جائے گا سب۔۔۔ بہت مشکل ہے یہ سب" اس نے رسائیت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اس کی جانب دیکھے بنا اپنے کام میں مگن رہی۔

"اوہو۔۔۔ تم لوگوں نے کیا مشکل مشکل کی رٹ لگا رکھی ہے۔۔۔ امی بھی یہی کہتی چلی جا رہی ہیں۔۔۔ اتنا بھی مشکل نہیں ہوتا اب۔۔۔ اور پھر سب ہی کر لیتی ہیں۔۔۔ میں بھی کر لوں گی۔۔۔ اظفر کہتا ہے۔۔۔ آئی کو بلوالیں گے" نینا اس کی پشت کی جانب دیکھتی رہی۔ وہ بہت خمدی ہو گئی تھی۔ ہر بات سے انکار کرنے کا ہر بات میں تنقید کرنے کا ایک نیا ہی پہلو نکالنے لگی تھی وہ۔۔۔ امی نے اسے سمجھانے کی کافی کوشش کی تھی لیکن وہ تہیہ کر چکی تھی کہ اسے واپس جانا ہے اور اب وہ کسی کی بات سننے کو تیار نہیں تھی۔

"اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔۔۔ اور شاوی کے بعد ماں باپ کا گھر بھی اپنا نہیں ہوتا۔۔۔ امی کا رویہ دیکھ رہی ہوں تم۔۔۔ بیس دن نہیں سنبھال سکیں بیٹی کو۔۔۔ وہ ہر وقت مجھ سے اور اظفر سے اکتائی رہتی ہیں۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے گھر واپس جانا ہی بہتر ہے" وہ سابقہ انداز میں بولی تھی۔

نینا نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ خفا سی لگتی تھی۔

"ایسا نہیں ہے زری۔۔۔ وہ اکتائی ہوئی نہیں رہیں۔۔۔ بس ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے ذرا خفا جلدی ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ ان کی عمر کا تقاضا ہے۔۔۔ تم کیوں محسوس کرتی ہو" اس نے اسے محبت سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"تم تو ایسے ہی کہو گی نینا۔۔۔ کیونکہ تمہارے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا ہے۔۔۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم امیر ہو۔۔۔ بہت پیسہ ہے تمہارے شوہر کے پاس۔۔۔ آج کل رشتے بس روپے پیسے کے محتاج ہیں۔۔۔ امی مجھے اہمیت دیتیں ہیں نا اظفر کو۔۔۔ کیونکہ ہمارے پاس اتنی دولت نہیں ہے جتنی تمہارے پاس ہے" وہ چوکر بولی تھی۔

نینا چپ کی چپ رہ گئی۔ زری غلط سوچ رہی تھی۔

اس کی اور امی کی اب بہت نوک جھوک رہنے لگی تھی حالانکہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ زری کی شخصیت میں بہت تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ وہ بلاوجہ ہر بات میں ناراضی کا پہلو تلاش کر رہی رہتی تھی۔ ہر بات میں مین میکے نکالنا، ہر چیز کو نا پسند کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہو چلا تھا۔ اس کو امی کی اور امی کو اس کی ہر بات پر اعتراض رہنے لگا تھا۔ امی اگر اس کے لیے کچھ بناتی تھیں تو وہ اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

"یہ کیا بنا لیا ہے آپ نے۔۔۔ آلو منر۔۔۔ یہ کون بنا تا ہے امی۔۔۔ اس سالن کی تو شکل دیکھ کر ہی انسان خود کو غریب سمجھنے لگتا ہے۔ تو اب اظفر کے سامنے مت رکھ دیجیے گا یہ غریب مسکین سی ڈش" وہ چوکر کہتی تھی تو امی کو برا لگ جاتا تھا لیکن وہ خاموش رہتی تھیں۔

اس کے علاوہ امی منال کے لیے کچھ لانی تھیں تو وہ اس میں بھی کپڑے نکال دیا کرتی تھی۔

"آف ف۔۔۔ یہ دو سو روپے کا فراک کیوں لے آئیں۔۔۔ اتنا زرف کپڑا ہے اس کا۔۔۔ پنھننے والا۔۔۔ منال کی اسکن تو پہلے ہی اتنی حساس ہے۔ نشان پڑ جائیں گے اس کے جسم پر۔۔۔ ایسے کپڑے میں اپنے گھر لے کر گئی تو اظفر نے اٹھا کر ہر پھینک دیئے ہیں۔۔۔ امی آپ کو کیوں سمجھ میں نہیں آتیں ایسی باتیں" وہ چیزوں کو ان کی قیمت کے حساب سے جا چنتی رہتی رہتی تھی۔ اس کی اپنی پسند ناپسند جیسے بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ جو اظفر کو پسند تھا وہی اسے پسند تھا۔ اور جو اظفر کو ناپسند تھا، وہ اسے بھی ناپسند تھا۔ امی کو یہ باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں اور گزشتہ بیس دنوں میں وہ کئی بار نینا کے سامنے زری کی ان عادات پر پریشانی کا اظہار کر چکی تھیں "یہ تمہاری بہن کا وماغ آٹ چکا ہے۔۔۔ اس کو دس روپے کا آزار بند اٹھا کر دے دو اور کہو کہ دو ہزار روپے کا میٹرو (مال) سے لائے ہیں تو یہ اسے سینے سے لگا کر رکھ لیں گی۔۔۔ اور دو ہزار کا فراک یہ پیچھے کٹی میں فاروق بے بی یار سے لا دو تو کہے گی۔۔۔ اٹھا کر پھینک لو اس غلیظ چیز کو۔۔۔ غضب خدا کا اب کیا ہر چیز روپے پیسے سے تو لا کرے گی یہ لڑکی" وہ ناراض سی ہو جاتی تھیں۔ اسی لیے دونوں کی نوک جھوک بھی زیادہ ہو جاتی تھی جبکہ نینا نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس سے خوش رہتی تھیں۔ انہوں نے اشاروں اشاروں میں اس کی اس احساسِ ذمہ داری کی تعریف بھی کی تھی۔ نینا نے آتے ہی سب کچھ بہت خوش اسلوبی سے سنبھال بھی لیا تھا جو کہ اس کی عادت کے بالکل برخلاف تھا۔

وہ روزانہ زری کا انٹریل سا ناشتا پاتی تھی پھر ایمن کو اسکول کے لیے تیار کر کے بھیجتی تھی۔ امی ابا کے لیے ناشتا بھی بنا۔ ان کے کپے بنا دیتی تھی۔ زری کے لیے مخصوص قسم کے کھانے، اس کی بچی کا خیال رکھنا۔۔۔ اس کے کپڑے دھونا۔ رات کو اس کے رونے کی آواز سن کر اٹھ کر اس کے جھولے کو کھلتا ہے ہوئے سلا دیتا۔ وہ ہر کام ایسے کر رہی تھی جیسے یہ سب اس کا ہی فرض ہو۔ ان سب کاموں کے درمیان بس وہ خلوص دل سے دعائیں کرنا نا بھولتی تھی کیونکہ ایک ہفتے میں اس کی توقع کے باوجود سبچ نے اسے ایک بار بھی کابل نہیں کی تھی۔ وہ اس کا گھر چھوڑتے ہوئے اس کے کپڑوں کی الماری بے ترتیب کر آتی تھی، ساری پر نفوم کی شیشیاں غائب کر آتی تھی، موزے جو جوڑوں کی شکل میں سلیٹے سے جھا کر دراز میں رکھے ہوتے تھے ان سب کو بے ترتیب کر کے رکھ آتی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے اس کے کمرے میں موجود ہمیر برش بھی چھپا کر رکھ دیا تھا۔ اسی وجہ سے اسے امید تھی کہ سبچ ایک ہی دن میں اس کو یاد کرتے ہوئے کال ضرور کرے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس شخص کو تو اپنی بیٹی کی یاد بھی نہیں آتی تھی۔ دوسری جانب اس کی امی کے گھر میں حالات کافی بہتر ہو گئے تھے۔ اس کا ادرا می کارشتہ پہلے کی نسبت مضبوط ہونے لگا تھا۔

قسمت مہربان ہونے لگتی ہے، مقدر بدلنے لگا ہے، مشکلیں آسان ہو جایا کرتی ہیں اور نصیب روشن ہونے لگتے ہیں لیکن تب تک دل کی "طلب" بدل چکی ہوتی ہے۔

نینا کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ اسے ہمیشہ یہی آس رہتی تھی کہ امی کا رویہ اس کے ساتھ ایسا ہی ہو جائے جیسا کہ ان کا زری کے ساتھ ہے۔ وہ ان کے ساتھ جھگڑے کرنا چھوڑ دے۔ ابا کی نفرت میں ان کو حصہ دار بنانا چھوڑ دے۔ لیکن پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اب ایسا ہو رہا تھا۔ لیکن اب اسے بے چینی تھی تو بس یہ کہ وہ شخص جسے وہ چاہتی تھی، اس کا نصیب بنا رہے۔

اس کا دن گزر جایا کرتا تھا لیکن رات کو فراغت میں اسے یہی خدشہ ستا رہا تھا کہ سبچ اسے چھوڑنا دے "سبچ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے نا۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا۔۔۔ کتنے بد نیز آدمی ثابت ہو رہے ہیں سبچ۔۔۔" وہ اللہ سے خود کلامیاں کرتی رہتی تھیں اور پرسکون رہتی تھی۔

"دیش ناٹ فیمیر یا اللہ۔۔۔ سچ کو میرا خیال ہی نہیں آتا۔۔۔ اس کے باوجود مجھے ان کا خیال رہتا ہے۔۔۔ دیش ناٹ فیمیر یا اللہ۔۔۔ دیش ناٹ فیمیر۔۔۔ وہ مجھے ایک کال بھی نا کریں اور یہاں میرا دل بے چین ہوا جا رہا ہے۔۔۔ اگر انہوں نے مجھے آج بھی کال نا کی تو میں خود کال کر لوں گی۔۔۔" وہ رات کو نیکے میں منہ دیے بس اللہ سے باتیں کرتی تھی۔

"یا اللہ یہ اچھی بات نہیں ہے۔۔۔ اتنا مغرور بھی نہیں ہونا چاہیے اب انسان کو۔۔۔ سچ نے آج بھی کال نہیں کی۔۔۔ بڑے ہی بدتمیز انسان سے محبت کی ہے میں نے۔۔۔ یا اللہ آپ میرا دل بدل دیں بس۔۔۔ یہ تو کوئی بات نا ہوئی۔۔۔ میں کیوں خوار ہوئی رہوں ایسے۔۔۔ بس آپ میرا دل بدل دیں۔۔۔ میری دعائیں کب قبول ہوں گی" وہ روز دعا کرتی تھی۔ اسے خبر بھی نہیں تھی کہ اس کی دعائیں کیسے قبول ہو رہی تھیں۔ ایسا پہلے کب ہوا تھا کہ امی نے زری پر اسے ترجیح دی ہو۔ اس کی تعریف کی ہو لیکن اب ایسا ہو رہا تھا۔

وہ اپنی "ذات" میں اتنی مکن رہنے لگی تھی کہ اسے احساس نہیں ہوا تھا کہ زری کے بدلتے رویے کا اصل محرک کچھ "اور" بھی ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

روشنی یکدم اس کے چہرے پر پڑی تھی۔ اسے لگا اس کا پورا چہرہ جیسے روشنی کی وجہ سے زرد ہو گیا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولنی چاہی تھیں لیکن روشنی اتنی زیادہ تھی کہ اس سے آنکھیں کھولی نا سکتیں۔ اس نے اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی تھی کہ وہ آنکھیں پھپھنا کر ہی سہی لیکن ایک بار ضرور کھولے۔ وہ دنیا کا چہرہ دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔۔۔ لیکن بھرپور کوشش کے باوجود اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس سے اپنی پللیں ایک سینکڑ کے لیے بھی اوپر کی جانب اٹھانی نا جاتی تھیں۔

اسے یہ بھی احساس ہوا کہ اس کے پاس بہت سے لوگ ہیں، وہ انہیں ان کی آوازوں سے پہچان رہی تھی۔ وہاں اوڑھے تھیں۔۔۔ بابا ان کے ساتھ بیٹھے تھے۔۔۔ کل مینے نہیں بائیں جانب کھڑی مسلسل اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہاں اس کے بھائی بھی تھے۔ ان کے پہلو میں اس کی بھابھیاں بھی تھیں۔ اسے ان سب کو وہاں محسوس کر کے اچھا لگا۔ وہ جانتی تھی وہاں سچ بھی ہے۔۔۔ جو ان سب کی موجودگی کی وجہ سے چپ ہے لیکن وہ جانتی تھی جب سب چلے جائیں گے تو وہ اس سے باتیں کرنے لگے گا۔ اس سے پہلے بھی وہ اکثر اس کے ہاتھوں کے لمس کو اپنے چہرے پر محسوس کرتی تھی۔ وہ سب اس کے پیارے تھے۔ اسے محسوس ہوتا تھا وہ سب اسے مسلسل بلاتے ہیں، جگاتے ہیں، اسے پکارتے ہیں اور اسے پلٹ آنے کی مثالیں کرتے ہیں۔ وہ انہیں دیکھتی تھی اور اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ وہ انہیں سمجھنا چاہتی تھی لیکن اس سے اپنے کسی عضو کو حرکت نا دی جاتی تھی۔ وہ چیخ کر ان سے مخاطب ہونا چاہتی تھی لیکن زبان ہلانا تو دور کی بات ہے وہ تو سانس کی نالی کو بھی ٹھیک سے استعمال نا کر پار رہی تھی۔ سانس لینے کی کوشش کرتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے حلق میں پہاڑ جتنے بڑے بڑے پتھر ایک جگے ہیں۔ وہ بولنے کی کوشش کرتی تھی تو لگتا تھا جیسے اس کے سینے پر کسی نے وبا ڈال رکھا ہو۔ وہ بولنا چاہتی تھی، اٹھ کر بیٹھنا چاہتی تھی، ان سب سے مخاطب ہونا چاہتی تھی۔

انہیں بتانا چاہتی تھی کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔۔۔ اب اسے درد نہیں ہو رہا۔ لیکن یہ سب وہ کہہ نہیں پاتی تھی اور اگر ہمت کر کے وہ ڈونے پھوٹے الفاظ میں کچھ بتاتی بھی تھی تو کوئی سمجھ نا پاتا تھا۔ اس نے چند ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھا تھا مگر اس کی پللیں اور ہاتھیں نہیں نا ہی اس کی زبان میں جنبش ہوتی تھی۔ اس نے تھک بار کر یہ کوشش ترک کر دی تھی پھر اس نے اپنی سانسیں آنے والی آوازوں کی جانب مڈول کر لی تھیں۔ وہ سب بائیں کرتے جا رہے تھے۔ وہ ان سب کو ان کی آوازوں کی وجہ سے شناخت کر رہی تھی لیکن جس آواز کو وہ سننا چاہتی تھی

وہ اسے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے اپنی ساری ہمت کر کے سنتا چاہا کہ کیا وہ وہاں موجود ہے۔ میں اسے مطلوبہ آواز سنائی نا دی تھی۔ وہ ایک دم بے چین ہوا تھی۔۔۔
 "کوئین۔۔ کہاں ہو تم۔۔ تم یہاں کیوں نہیں ہو میرے پاس۔۔ اور اگر تم یہاں نہیں ہو تو میری ایمین کہاں ہے۔۔ میری ایمین کو کہاں چھوڑ دیا ہے تم نے۔۔ کوئین۔۔"

☆☆☆

"باجی! صاحب نے بولا ہے ایمین بیٹا کو آج واپسی پر گھر لے کر آنا ہے" ڈرائیور جب ایمین کو اسکول کے لیے لینے آیا تو اس نے نینا کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
 "ایمین کو۔۔؟" اس نے ایمین کو گاڑی میں بٹھایا اور پھر اس کی جانب دیکھ کر پوچھا تھا کہ شاید سبج نے کوئی اور پیغام بھی دیا ہو۔ اس نے سر ہلایا۔ نینا کے دل کو شدید دھچکا لگا تھا۔
 "انہوں نے صرف ایمین کو لانے کے لیے بولا؟" اس نے بدقت یہ جملہ ادا کیا تھا۔ ڈرائیور نے اک دفعہ پھر سر ہلایا اور گاڑی اشارت کر دی تھی۔ نینا کا دل ابھی ایک دھچکے سے نہیں سنبھلا تھا کہ وہ مزید بولا۔
 "وہ دراصل باجی۔۔ شہرین باجی کی طبیعت کا کافی خراب ہے نا۔۔ ڈاکٹرز نے جواب دے دیا ہے۔۔" اس نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اسے اطلاع دی تھی۔ نینا کو یہ بات سن کر بھی ڈھکے ہوا لیکن یہ بات تو ڈاکٹر بہت پہلے ہی بتا چکے تھے۔ وہ سب ذہنی طور پر تیار تھے لیکن نینا کو اس بات کا بھی ڈھکے تھا کہ سبج اسے بھی شہرین سے ملنے کے لیے تو بلوا سکتا تھا۔ حالات اتنے متعین تھے، کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ ایک بار بھی شہرین کو دیکھنے نا جا سکتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ ایک بار ضرور جائے لیکن جانے کیوں اب اسے وہاں جاتے ہوئے بھی خوف آتا تھا۔ شہرین کی اوسے اس کے بستر کے پاس بیٹھ کر نینا کو جمو لی بھر بھر کر بد دعائیں دیتی تھیں۔ اس سے ان بد دعاؤں کا بوجھ سنبھالنا نا جاتا تھا۔

"میری قسمت ہی خراب ہے۔۔ اور ہمیشہ خراب ہی رہے گی" اس نے بیڑھیاں چڑھتے ہوئے سوچا تھا۔ آنسو آنکھوں سے نکلنے لگے تھے۔

دل شہرین کے لیے بھی پریشان تھا اور یہ سوچ کر مزید بوجھل ہوا جا رہا تھا کہ اگر سبج کو ان حالات میں اس کی ضرورت نہیں تھی تو پھر اس کی ضرورت کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔
 "وہ ان جا ہی تھی اور اسے ان جا پانی رہنا تھا" اس نے بشکل بیڑھیاں عبور کی تھیں اور اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ زری ایک دن پہلے ہی واپس گئی تھی۔ ابانے اسے روکنا چاہا تھا، امی کو اس کے سامنے ان کے روئے پر ڈانٹا تھا اور اسے مزید کچھ دن رہنے کے لیے بھی کہا تھا لیکن اس نے ان کی بات بھی نہیں مانی تھی اور واپس چلی گئی تھی۔ اس وجہ سے گھر کے حالات کچھ کشیدہ تھے اور دل کی حالت کشیدہ ترین تھی۔ وہ جب چاہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ شہرین کو دیکھنا چاہتی تھی، گھر واپس جانا چاہتی تھی لیکن اسے ہنک بھی محسوس ہوتی تھی۔ وہ شخص اگر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دروازے سے نکال باہر کرنا تو کیا عزت رہ جاتی۔

"محبت کی ہے آپ سے۔۔ کوئی کاروبار تو نہیں کہ تذلیل کر دو اگر بھی کچھ حاصل ہونے کی خوشی ہو" اس نے سوچا تھا۔ آنکھیں مسلسل بہہ رہی تھیں۔

"ایمین کا کیا قصور ہے کہ اس بچی کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا جائے۔۔ کیا پتا اس کی ماں کی کتنی خواہش ہو اپنی بچی کو دیکھنے کی۔۔ میں اسے واپس بھیج دوں گی۔۔ بچی ہے کچھ دن روئے گی۔۔ پھر سنبھل جائے گی۔۔ سب ہی سنبھل جایا کرتے ہیں۔۔ میں بھی سنبھل جاؤں گی۔۔ یہاں واقعی سب ہی سنبھل جایا

کرتے ہیں۔۔۔ سب ہی۔۔۔ آپ کی مرضی اللہ پاک۔۔۔ آپ سے بڑھ کر اپنا اچھا نہیں سوچ سکتی میں۔۔۔ آپ نے میرے لیے اچھا ہی سوچا ہوگا۔۔۔ بے شک۔۔۔ وہ خود کلامی تو کر رہی تھی مگر آنکھوں سے بے تحاشا آنسو ٹپک رہے تھے۔
اس نے ایمن کی چیزیں سمیٹنی شروع کر دی تھیں۔

☆☆☆

"ہماری وجہ سے کچھ رونق تھی۔۔۔ اب تو بالکل سناٹا ہو گیا ہے گھر میں۔۔۔" اس روز زری نے کہا تھا وہ ایک ہفتہ اپنے گھر رہنے کے بعد دوبارہ ویک اینڈ پر منال کو امی ابا سے ملوانے لائی تھی۔ نینا نے سہراٹھا کرا سے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ زری بہت کمزور ہو گئی تھی۔ وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی اور اب سامنے بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ ایمن کو واپس گئے آٹھ دن اور چھ گھنٹے ہو چکے تھے اور اس دوران سمجھنے سے اسے ایک بار بھی کال کی گئی تھی اس ان کی جانب سے کوئی دوسری اطلاع موصول ہوئی تھی۔

"اتنی غور کیا اب بھی بہت خاموش رہنے لگے ہیں۔۔۔" زری نے منال کو کچھ دیر پہلے ہی سلایا تھا اور اب جیسے وہ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ نینا نے ایک دفعہ پھر اس کی جانب دیکھا۔ اس کا بات کرنے کا بالکل بھی دل نہیں تھا لیکن بہن کی خاطر اس نے سر ہلا کر اس کی بات میں دلچسپی لی تھی۔

"تم اتنی چپ کیوں ہو۔۔۔؟ واپس کب جاؤ گی؟" زری نے پوچھا تھا۔ نینا کا دل چاہا اس کے شانوں پر سر رکھے اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔ ایک یہ کام تھا جو اس نے کبھی کسی کے سامنے نہیں کیا تھا۔
"نینا تم میری بہن ہو۔ ایک مشورہ ضرور دوں گی کہ تمہیں کہ اتنے اتنے دن اپنا گھر چھوڑ کر امی کی طرف مت رہا کرو۔۔۔ گھر ٹوٹ جاتے ہیں ایسے۔۔۔" وہ ہنسنے لگی تھی۔ نینا نے اس کی جملے میں جیسے اصل مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

"مرد کو اکیلا چھوڑنا عورت کی سب سے بڑی بے وقوفی ہوتی ہے۔۔۔ مرد تو ویسے بھی پرندہ ہوتا ہے۔۔۔ اسے جگہ جگہ اڑنے اور ادھر ادھر چوچ مارنے کی عادت ہوتی ہے۔ گھر میں بیوی ناہو تو وہ زیادہ فخر بے مہار ہو جاتے ہیں۔۔۔"

زری کا لہجہ بالکل ٹوٹا ہوا تھا۔ اس سے بات بھی مکمل نا کی گئی تھی۔ نینا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ پہلے بھی اسے نصیحتیں کیا کرتی تھی لیکن ایسا ٹوٹا ہوا لہجہ تو پہلے کبھی نہ سنا تھا اس کا نینا نے۔۔۔ بہن کے لیے متا بھری ساری حیات جیسے جاگتی تھیں اس کی۔

"کیا ہوا زری۔۔۔ سب ٹھیک ہے نا۔ اتنی اداس کیوں لگ رہی ہو۔۔۔" اس نے پوچھا تھا۔ زری نے اثبات میں سر ہلایا۔

"سب ٹھیک ہی ہوتا ہے نینا۔ خراب تو بس انسان ہو جایا کرتے ہیں" وہ کھوئی کھوئی سی تھی۔ نینا تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے پاس آئی تھی۔

"کیوں پریشان ہو۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔" ظفر نے کچھ کہا ہے؟" نینا کا دھیان اسی جانب گیا تھا۔ زری کچھ نہیں بولی لیکن نینا کی سوالیہ نظروں کی تاب نا لاکر اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا تھا۔ اس نے اسے ہاتھ کی پشت سے صاف کیا تھا لیکن بولی کچھ نہیں۔ نینا اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"بتاؤ نا زری۔۔۔ کیا پرالیم ہے۔۔۔؟" اس نے دوبارہ پوچھا تھا۔
"نینا! ظفر کی زندگی میں کوئی اور بھی ہے۔۔۔ یا شاید۔۔۔" نہایت ہی سی کیفیت میں لگتی تھی جیسے کچھ بتانا بھی چاہتی ہو اور نام بھی بتانا چاہتی ہو۔ نینا نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ زری کو بس اتنے سے بس

کی ضرورت تھی۔ وہ اس کے گلے لگ گئی اور پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ نینا کو زیادہ حیرت نا ہوئی۔ اس کا اور اظفر کا رشتہ عجیب سا تھا۔ وہ اسے بہت کم مخاطب کرتی تھی۔ اس کے گمان میں اظفر کے متعلق یہ خدشہ ہمیشہ ہی رہتا تھا کہ وہ زری کے ساتھ مخلص نہیں ہو سکتا لیکن اس کے باوجود اسے زری کے منہ سے یہ سب سن کر ڈھک ہوا۔ اس نے زری کے شانے پہلا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی مگر وہ الفاظ کی سخت کمی کا شکار تھی۔ اس نے خاموش رہ کر زری کو سننا بہتر سمجھا۔

"اظفر کی زندگی میں بہت ساری لڑکیاں ہیں۔۔۔ وہ سب سے انتہائی بے تکلف ہے۔۔۔ لیکن ایک لڑکی کے ساتھ وہ ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہے۔۔۔ اس سے ہر قسم کی بات کرتا رہتا ہے۔۔۔ میں تو کئی ہوں تو وہ بُرا مان جاتا ہے۔۔۔ وہ کہتا ہے وہ صرف فرینڈز ہیں۔۔۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں کنٹرولیوٹیو ہوں۔۔۔ چھوٹے ذہن کی ہوں۔۔۔ اس لیے الٹا سیدھا سوچتی رہتی ہوں۔۔۔ لیکن نینا فرینڈز کو گندے گندے میسج کون بھیجتا ہے۔۔۔ وہ اگر صرف فرینڈز ہیں تو مجھ سے موبائل چھپا کر رکھنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔۔۔ اور پھر ساری ساری رات بیوی کو چھوڑ کر "صرف فرینڈ" سے باتیں کون کرتا ہے۔۔۔؟" وہ بہت ڈھکی چھکی بات کم کر رہی تھی اور روز زیادہ رہی تھی۔

"زری تم ایسے مت سوچو۔ کیا پتا وہ واقعی فرینڈز ہوں۔۔۔ تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ اس کی کافی کلاس فیلوز وغیرہ ابھی تک اس کے ان چٹ ہیں۔۔۔ کیا پتا تم زیادہ وہی ہو کر سوچ رہی ہو؟" اس نے زری کو تسلی دینے کی ایک بودی سی کوشش کی تھی۔ وہ خود جانتی تھی کہ اظفر کس قسم کا انسان ہے مگر بہن کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے جھوٹی تسلی دینی چاہتی تھی۔

"نینا۔۔۔ وہ میرا شوہر ہے، شوہر کے لیے تو ساری عورتیں وہی ہوتی ہیں لیکن یہ میرا وہم نہیں ہے۔۔۔ میں اظفر آنکھ کی جنبش سے اس کے دل کا حال جان سکتی ہوں۔۔۔ اس کا بدلتا ہوا رویہ مجھ سے چھپا ہوا کیسے رہ سکتا ہے" وہ لا چاری بھرے انداز میں بولی۔

"تم پریشان مت ہو۔۔۔ تم کہو تو میں اس سے بات کروں؟" نینا نے بہت سوچنے کے بعد کہا تھا۔ اظفر سے اس موضوع تو کیا کسی بھی موضوع پر بات کرنا اسے پسند نہیں تھا لیکن بہن کی خاطر وہ یہ بھی کر سکتی تھی۔ زری نے گہری لمبی سانس بھری پھر اپنے گال پر ہاتھ پھیرا تھا کہ آنسوؤں کی کمی کو صاف کر سکے۔

"نینا کیا بات کرو گی تم۔۔۔ بات تو میں کر چکی ہوں۔۔۔ منال کے بعد سے ہمارے درمیان باتیں ہوتی ہی اسی موضوع پر ہیں۔۔۔؟"

"کیا کہتا ہے وہ۔۔۔ تم نے اسے کہا کہ تم یہ سب برداشت نہیں کر سکتی" نینا نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا تھا۔ "اس کے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں ہے نینا۔۔۔ میں نے تمہیں بتایا تھا وہ سمجھتا ہے میں کنٹرولیوٹیو ہوں اور اس کے اتنے اچھے سرکل آف فرینڈز سے جیلس ہوں۔۔۔ میں جب بھی اس موضوع پر اسے ٹوکنے کی کوشش کرتی ہوں تو وہ کہہ دیتا ہے کہ اپنی جگہانہ سوچ کو بدل لو زری۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے۔۔۔ بس یہی گردان کرتا رہتا ہے۔۔۔ وہ یہی کہہ دیتا ہے کہ میرا لائف اسٹائل تو پہلے بھی یہی تھا، میں پہلے بھی تمہیں اپنی فرینڈز کی باتیں بتاتا تھا لیکن تب تمہیں برا نہیں لگتا تھا، اب تم خواہ مخواہ جیلس ہو جاتی ہو اور برا مان جاتی ہو۔۔۔

لیکن نینا میں کیا کروں مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔۔۔ مجھے غصہ آنے لگتا ہے میں جب اسے ہر وقت سیل فون پر مصروف دیکھتی ہوں۔ ہمارے درمیان کشیدگی بڑھنے لگی ہے حالانکہ میں کوشش کرتی ہوں کہ ایسا نا ہو۔۔۔ میں اسی لیے اپنی حالت کو نظر انداز کر کے اتنی جلدی امی کے گھر سے واپس چلی گئی تھی لیکن پھر بھی صورتحال نہیں بدلی۔۔۔ بلکہ پہلے سے زیادہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ اب تو وہ ناراض ہونے لگا ہے اس روز روز کی بحث سے۔۔۔ وہ کہتا ہے میں اس پر شک کر کے اس کی انسلٹ کرتی ہوں۔۔۔"

نا راس ہوتا ہے تو ہونے دو۔۔۔ آخر یہ تمہارا حق ہے کہ اس موضوع پر اچھے طریقے سے بات کی جائے۔۔۔ پتا تو چلنا چاہیے نا کہ وہ چاہتا کیا ہے؟" نینا کو ساری باتیں سن کر اب غصہ آنے لگا تھا۔

"وہ مجھے چاہتا ہے۔۔۔ یہ بات تو وہ برملا کہتا ہے۔۔۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے دل میں میری بہت ایشیئل جگہ ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اسی لیے تو اس نے مجھ سے شادی کی ہے اور مجھ کوں نینا وہ میرا خیال بھی رکھتا ہے، روپیہ پیسہ بھی خرچتا ہے، منال سے بھی بہت پیار کرتا ہے، میری ذرا سی تکلیف پر پریشان ہو جاتا ہے لیکن اپنی روش نہیں بدلتا" زری کے چہرے پر بے انتہالا چاری تھی۔ نینا مزید چوگئی۔

"یہ کیسی محبت ہے۔۔۔ تمہیں اتنی ذہنی اذیت دے کر وہ دعا کرتا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔۔۔؟" چھوڑ دو اسے زری۔۔۔ اتنی اذیت ناقابل برداشت ہے۔۔۔ ایسے مرد کے ساتھ ساری زندگی گھٹ گھٹ کر جینے سے بہتر ہے، پہلے ہی اپنی راہیں الگ کر لی جائیں "اس نے اپنی جانب سے انتہائی پر خلوص مشورہ دیا تھا۔ زری نے قطعیت سے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ ناممکن ہے نینا۔۔۔ میں مر کر بھی اظفر کو چھوڑ نہیں سکتی۔۔۔ میں مر جاؤں گی اسے چھوڑ کر۔۔۔ میں محبت کرتی ہوں اس سے۔۔۔ مسئلہ یہ ہے ہی نہیں۔۔۔ میں جانتی ہوں ہم دونوں کو محبت ہے ایک دوسرے سے۔" نینا نے اس کی بات کاٹی۔

"لعنت ہو ایسی محبت پر۔۔۔ جو محبت اتنا تڑپائے، زلائے ایسی محبت سے تو موت بہتر ہے۔ تم کیوں ہر روز نقطہ نقطہ کر کے مرنا چاہتی ہو ادھنہ۔ محبت۔۔۔ اسے کہتے ہیں محبت۔۔۔؟" وہ غرا کر بولی تھی۔ زری نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا پھر سابقہ انداز میں بولی۔

"اسے ہی کہتے ہیں محبت نینا۔ اب تو مان لو کہ اسے ہی کہتے ہیں۔۔۔ تم خود بتاؤ مسیح رندھاوا نے تمہاری زندگی کو کون سا جنت بنا رکھا ہے، اس کی جانب سے کون سا سکون مل رہا ہے تمہیں لیکن پھر بھی محبت کرنی ہونا اس سے۔۔۔ تب ہی تو برداشت کر رہی ہو یہ سب۔۔۔ میں اگر تم سے کہوں کہ چھوڑ دو اس شخص کو تو چھوڑ پاؤ گی۔۔۔ نہیں نا۔۔۔؟ بس یہی بات ہے نینا۔ میں بھی نہیں چھوڑ سکتی اظفر کو۔۔۔ میں محبت کرتی ہوں اس سے۔"

نینا نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ اس کے دل کی حالت اس کے چہرے سے اس قدر عیاں رہنے لگی ہے کہ اس کی بہن تک کو اس کی ساری کشمکش کی خبر ہو چکی ہے۔ ایک لمحے کے لیے تو اسے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"میں تمہیں طعنہ نہیں دے رہی نینا۔۔۔ تم میری بات کا نہ انا ماننا۔۔۔ میں تو صرف یہی کہنا چاہ رہی ہوں کہ یہ اذیت جو ہم دونوں سہہ رہے ہیں، یہ ہماری قسمت میں ہمارے پیدا ہونے سے بھی پہلے سے لکھ دی گئی تھی۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے نصیب روشن نہیں ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے باپ نے جو بویا ہے۔۔۔ ہمیں وہ کاٹنا ہی ہے۔۔۔ ابا نے جانے کتنی عورتوں کو خون کے آنسو زلا پایا ہے۔۔۔ کتنی عورتوں کے دل توڑے ہیں، کتنے ارمانوں کا خون کیا ہے۔ وہ بد دعا میں جو جھولی بھر بھر کر آیا کوئی ہیں۔ اس کی بھر پائی ہمیں ہی تو کرنی ہے۔۔۔ یہی مکافات عمل ہے۔۔۔" وہ بولتے بولتے بھی رو پڑی تھی۔ نینا کی آنکھوں سے بھی آنسو جھلکنے لگے تھے۔ دونوں ہمیشہ کچھ دیر اسی طرح بے آواز روئی رہیں پھر نینا نے خود کو سنبھالا تھا۔

"زری! ایسا نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ اللہ پاک ایسا نہیں کر سکتے ہمارے ساتھ۔ وہ تو ہم سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتے ہیں ہم نے ایسی کون سی غلطیاں کی ہیں کہ ہمیں اتنی سخت سزا ملے۔ میں بات کروں گی اظفر سے۔۔۔ ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔۔۔ میں سمجھاؤں گی اسے۔" وہ کہہ رہی تھی کہ زری نے اس

کی بات کاٹ دی۔

"نہیں بننا۔۔۔ پلیز۔۔۔ تم کسی سے کوئی بات نہیں کرو گی۔۔۔ اظفر کو برا لگے گا اگر اسے پتا چلے گا کہ میں نے یہ سب باتیں یہاں اپنے میکے میں کسی سے کی ہیں۔۔۔ مرد اسے اپنی ہچک تصور کرتے ہیں۔۔۔ وہ تو پہلے ہی کہتا ہے کہ میں بلا وجہ اپنی سیدھی باتیں سوچ سوچ کر اپنے رشتے کو کمزور کر رہی ہوں۔۔۔ اس لیے تم اس سے کوئی بات نہیں کرو گی۔۔۔ اور میں تم سے درخواست کرتی ہوں۔۔۔ پلیز ابا سے اس بات پر کوئی بحث نہ کرنا۔۔۔ انہیں کوئی طعنہ مت دینا۔۔۔ انہیں اس بات کی ذرا سی بھی بھینک نہیں پڑنی چاہیے۔۔۔ وہ بہت محبت کرتے ہیں مجھ سے۔۔۔ میری ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہیں۔۔۔ انہیں یہ سب پتا چلے گا تو انہیں بہت اذیت ہوگی۔۔۔ میں ابا کو اذیت نہیں دے سکتی بننا۔۔۔ اس لیے مجھ سے وعدہ کرو کہ تم ابا سے اس متعلق کوئی بات نہیں کرو گی۔"

وہ التجا کر رہی تھی۔ بننا اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ وہ سوچتی تھی کہ زری پہلے سے کتنی بدل گئی ہے، بلا وجہ لڑنا جھگڑنا، طعنہ زنی اس کی عادت بن چکی تھی۔ اب اسے احساس ہوا تھا کہ وہ تو ایک الگ ہی ذہنی تکلیف سے گزر رہی تھی۔ پانی کا تیز بہاؤ ایک جانب سے روکو تو وہ دوسری طرف سے راستہ بنا لیتا ہے۔۔۔ زری جب اپنے شوہر پر اپنا ذہنی غبار نہیں نکال پاتی تھی تو گھر میں ان سب کو ٹوک ٹوک کر اپنا آپ ہلکان کرتی رہتی تھی۔ بننا کی آنکھوں سے مزید کئی آنسو ایک ساتھ ٹپکے تھے۔ وہ خود اتنی تکلیف سے گزر رہی تھی کہ اسے پتا ہی نہ چلا تھا کہ اس کی بہن کے ساتھ کیا کچھ ہو گیا تھا۔ اس نے اسے دوبارہ سے گلے لگا لیا۔

"اللہ تمہاری تمام مشکلیں آسان کرے زری۔۔۔ آمین" اس نے خلوص دل سے دعا کی تھی۔ زری نے بھی "آمین" کہا تھا۔ ان دونوں کو پتا نہیں چلا تھا کہ کمرے کے باہر بہت دیر سے کھڑے ایک اور شخص نے بھی اس دعا پر انتہائی ڈھک اور خلوص کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ "آمین" کہا تھا

☆☆☆

"وہ آج کل کیوں نہیں آتیں جو پہلے روز شام کو ان کو دیکھنے آیا کرتی تھیں؟" ہیڈ نرس نعیمہ ڈی سوزا نے ڈرب میں سرج۔ کے ذریعہ دو منتقل کر کے شہرین کا لحاف درست کیا تھا پھر اس کے پانچ سے لگ کر بیٹھے اس کے شوہر کو تاسف بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ سرطان کی مریضہ ہونے کی حیثیت سے شہرین اس ہسپتال کی منتقل رہا تھی۔ اس کا یہاں آنا جانا لگایا رہتا تھا۔ اس کے آپریشن قہر ایجنز، ریڈی ایشن سب یہیں ہوتی رہی تھیں۔ وہ اب کی بار چوٹی بار کو مائیں گئی تھی اور چوٹی ہی بار کی نرسیں اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔

یہ مرض ہی ایسا ہے کہ اس میں اسپتال کے اسٹاف کو کوئی مریض کے چہرے سے ہی واقفیت نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ ان کے خاندان کے سب افراد سے واقف ہو جایا کرتی تھیں۔ انہیں دن رات نئے نئے چہروں اور رویوں کو پرکھنے کا موقع ملا کرتا تھا۔

کو ما کے بعض مریض تو ایسے ہوتے تھے کہ ان کے چاہنے والے ہمہ وقت ان کے بستر کے پاس موجود رہنا چاہتے تھے اور بعض کو وہ اکیلے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مہرتے بھی دیکھ چکی تھیں۔

شہرین سرج اول الذکر مریضوں ہی مریضہ تھی۔ اس کے وجود میں زندگی فقط پانچ سے دس فیصد ہی باقی رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر زنی بار اس کی آخری سانس کی پیش گوئی کر چکے تھے۔ اس کی موت کے خدشے کا اظہار بھی کئی بار کیا گیا تھا لیکن وہ موت کی دہلیز سے ہٹ کر آ جاتی تھی۔ اس کی حالت اگرچہ بالکل خدوش ہو چکی تھی۔ مشینوں نے اس کا وجود اپنی بری طرح ڈھک رکھا تھا کہ وہ ان میں بھی ہوئی نظر بھی نہ آتی تھی۔

اس کا جسم بستر پر پڑا رہنے کے باعث اتنا کل چکا تھا کہ اس کے جسم پر جو آبلے پڑے تھے، ان میں سے

بدلو آنے لگی تھی۔ اس کے رشتہ دار اب اس سے بیٹھے کے لیے آتے تھے تو قریب نہیں آتے تھے بلکہ دور دور سے اسے دیکھتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ ایک اس کا شوہر تھا جو روز آتا تھا، اس کے قریب بیٹھ جاتا تھا اور بس چپ چاپ اس کے قطرہ قطرہ پھلتے جسم کو دیکھتا رہتا تھا۔ ہیڈ نرس نیرہ کو اس پر ترس بھی آتا تھا۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ کچھ دیر اس شخص کے قریب بیٹھ کر اسے سمجھائیں کہ

"اس کے قدموں میں مت بیٹھا کرو۔۔۔ ہو سکتا ہے اس کی پرواز تمہاری وجہ سے معطل ہو رہی ہو۔ تم اس کی رواجی کو اس کے لیے کیوں مشکل بناتے ہو"

وہ سوچتی تھیں مگر کہتے ہوئے جھجک سی جاتی تھیں۔ بعض اوقات اس قسم کے مریضوں کے رشتہ دار ان کی ہمدردی کا بُرا بھی مان جاتے تھے۔ انہیں آتی سی یو کا تیرہ سیال کا تجربہ تھا۔ گزشتہ پانچ سالوں سے وہ اس برائیویٹ اسپتال کے نیورولوجی یونٹ میں پارٹ ٹائم کر رہی تھیں۔ کئی لوگ ان کے ہاتھوں میں دم توڑ چکے تھے۔ انہیں مریتے ہوئے لوگوں کے چروں میں چھپی المناک ان گنت کہانیاں بڑھنے کا گہرا تجربہ تھا۔

وہ جانتی تھی شہرین کے وجود میں کچھ نہیں بچا لیکن کچھ ہے جو اسے روک لیتا ہے، کچھ ہے جو اسے اتنا بے چین کرتا ہے کہ وہ جاتے جاتے رک جاتی ہے۔۔۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ مرتا ہوا وجود کی کا منتظر ہے۔ وہ چاہتی تھیں وہ اس کے جانے میں مدد کر دیں، اس کی مشکل کو آسان کر دیں مگر کچھ سوچ کر چپ رہ جاتی تھیں۔ اس روز سب کو خالی خالی آنکھوں سے اس کے وجود کے قریب بیٹھے دیکھ کر وہ پوچھے بتا رہا تھا نا پانی نہیں۔ سب نے ایک دم سے ان کی جانب دیکھا۔ اسے ان کا سوال سمجھ نا آیا تھا، ہیڈ نرس نیرہ نے بہت چالاکانہ وہ نہایت پانی نہیں۔ وہ اس شخص کے ذرا قریب ہوئی تھیں پھر انہوں نے عیادت کے لیے آنے والوں کے لیے جو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں ان میں سے ایک کرسی چھنی بھی اور اس پر بیٹھ گئی تھیں۔

"میں آپ کا کچھ وقت لے سکتی ہوں۔۔۔؟" انہوں نے اس سے پوچھا پھر جواب کا انتظار کیے بنا پولیس "آپ مسلمان ہیں۔ میں تو نہیں ہوں لیکن مذہب کی بحث میں پڑے بنا بحیثیت انسان ہم دونوں جانتے ہیں کہ موت کا وقت مقرر ہوتا ہے، معین ہوتا ہے۔ موت اپنے وقت پر آتی ہے لیکن یقین کریں مرتے ہوئے انسان کی آسانی کی دعا کر کے ہم اس وقت کو بہل بنا سکتے ہیں۔۔۔ ان کے لیے آسانی اور راحت کی دعا کریں۔۔۔ بڑی تکلیف میں ہیں یہ۔۔۔ مت روکیں انہیں" وہ زکیں اور ایک نظر شہرین کے وجود پر ڈالی پھر اس کی جانب دیکھا اور بولیں۔

"آپ مجھے وقیا لوسی بھی کہہ سکتے ہیں اور تو ہم پرست بھی۔۔۔ بے حس اور بے عقل بھی۔۔۔ لیکن میں نے جو محسوس کیا ہے وہ میں کہہ کر ہی رہوں گی۔۔۔" انہوں نے بات کی ابتدا ازرازی سے کی تھی لیکن ان کا لہجہ بالکل ٹھوس تھا جیسے انہیں اپنے موقف پر مکمل یقین ہو۔

"یہ جانا چاہتی ہیں۔۔۔ انہیں آپ میں یا اس دنیا میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔۔۔ ان کا معاملہ دنیا سے ختم ہونا چاہتا ہے لیکن آپ انہیں جانے نہیں دے رہے۔ روز ان کے قدموں میں آکر بیٹھ جاتے ہیں۔۔۔ روز آنسو بہا کر انہیں تکلیف دیتے ہیں۔۔۔ وہ جانے کی ہمت کرتی ہوں گی لیکن آپ کو دیکھ کر پھر وہیں ٹھہر جاتی ہیں۔۔۔ کسی مرتے ہوئے انسان کو تکلیف دینا کوئی اچھی بات ہے کیا؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھیں، سب کے چہرے پر لکھا تھا کہ اسے ان کی بے سرو پا بات سمجھ میں نہیں آتی۔

"ان کی رواجی کو آسان بنا میں سب صحاب۔۔۔ وہ مشکل جوان کی پرواز میں حائل ہے۔ اس مشکل کو دور کر دیں۔۔۔ خدا سے ان کی زندگی مت مانگیں۔۔۔ زندگی ان کو دروہتی ہے۔۔۔ خدا سے ان کے لیے درد مت مانگیں" انہوں نے اپنا موقف اپنی مرضی سے مکمل کیا تھا اور پھر سب کو اس کے دکھ میں تڑپا چھوڑ کر باہر نکل

کئی تھیں۔ سچ کی آنکھوں سے لگا تار کی آنسو پکے تھے۔
 "تمہارے لیے درد کیسے مانگ سکتا ہوں شہرین۔۔۔ مرکز بھی نہیں"

☆☆☆

"یہ اذیت جو ہم دونوں سہہ رہے ہیں، یہ ہماری قسمت میں ہمارے پیدا ہونے سے بھی پہلے سے لکھ دی گئی تھی۔۔۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے نصیب روشن نہیں ہیں۔۔۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے باپ نے جو بویا ہے۔۔۔ ہمیں وہ کاٹنا ہی ہے۔۔۔ ابا نے جانے کتنی عورتوں کو خون کے آنسوڑ لایا ہے۔۔۔ کتنی عورتوں کے دل توڑے ہیں، کتنے ارمانوں کا خون کیا ہے۔۔۔ وہ بد دعائیں جو جھولی بھر بھر کر ابا کو ملی ہیں۔۔۔ اس کی بھر پائی ہمیں ہی تو کرنی ہے۔۔۔ یہی مکافاتِ عمل ہے۔۔۔"

یہ زری کی سسکتی ہوئی آواز نہیں تھی۔ یہ پھٹرتا جو کاشفِ ثار کے منہ پر پڑا تھا۔ انہیں لگا وہ اوہ موائے ہو گئے ہیں۔ اس رات کے بعد سے انہیں کسی رات سکون سے نیند نہیں آئی تھی۔ وہ ہر روز رات کو بس خالی آنکھوں سے چھت کو ہٹا کرتے تھے۔ یہ کیسی اذیت تھی جو ان کا مقدر بن گئی تھی۔ انہیں کوئی بیماری نہیں تھی لیکن وہ خود کو برسوں کا بیمار سمجھنے لگے تھے۔

اس روز رات کو اپنی بیٹیوں کے کمرے کے باہر سے گزرتے ہوئے ان کے قدم جیسے کسی مقناطیس نے جکڑ لیے تھے۔

"انظرف کی زندگی میں بہت ساری لڑکیاں ہیں" زری نے کہا تھا۔ یہ بات ان کے لیے کوئی انکشاف نہیں تھا۔ انکشاف یہ تھا کہ زری جاتی تھی کہ اس کا شوہر کس قسم کی حرکات میں ملوث تھا۔ وہ وہیں گھڑے ہو کر اس کی باتیں سننے لگے تھے۔

ان کا دل چاہتا تھا کہ اندر کمرے میں جا کر بیٹی کو سننے سے لگائیں اور اسے احساسِ ولایت ملے کہ "وہ اس کے ساتھ ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کوئی ان کی بیٹی کو دکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔۔۔ وہ اسے تسلی دیں کہ ان کے گھر کے دروازے اپنی بیٹی کے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔۔۔ ان کی بیٹی جب چاہے اس شخص کے منہ پر تھوک کر ان کے گھر واپس آ جائے۔۔۔ وہ اسے سنبھال لیں گے۔۔۔"

یہ سب کہنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ انہوں نے سنان کی بیٹی، ان کی چیمٹی بیٹی، ان کی خلیج جگر کہہ رہی تھی۔ "یہ اذیت جو ہم دونوں سہہ رہے ہیں، یہ ہماری قسمت میں ہمارے پیدا ہونے سے بھی پہلے سے لکھ دی گئی تھی۔۔۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے نصیب روشن نہیں ہیں۔۔۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے باپ نے جو بویا ہے۔۔۔ ہمیں وہ کاٹنا ہی ہے۔۔۔ ابا نے جانے کتنی عورتوں کو خون کے آنسوڑ لایا ہے۔۔۔ کتنی عورتوں کے دل توڑے ہیں، کتنے ارمانوں کا خون کیا ہے۔۔۔ وہ بد دعائیں جو جھولی بھر بھر کر ابا کو ملی ہیں۔۔۔ اس کی بھر پائی ہمیں ہی تو کرنی ہے۔۔۔ یہی مکافاتِ عمل ہے۔۔۔"

کاشفِ ثار نے یہ سب سنا تھا اور وہ اپنا سامنہ لے کر رہ گئے تھے۔

آپ کا کبیرہ گناہ کبھی چھپتا ہے نا دیتا ہے نا بھی مرتا ہے۔۔۔ وہ پلٹ کر کسی نا کسی روپ میں آپ کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔۔۔ اور پھر آپ ہوتے ہیں اور آپ کا گناہ ہوتا ہے۔۔۔ جیسے بندار اور ڈگڈگی۔۔۔

اس رات سے کاشفِ ثار بندر کی طرح بس اچھل رہے تھے لیکن ان کا اچھلنا کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اذیت سہہ رہے تھے لیکن کسی کو کہہ نہیں سکتے تھے، وہ درد رہے تھے لیکن ان کی آنکھ سے آنسو نہیں نکلتے تھے۔ انہیں نیند نہیں آئی تھی لیکن وہ آنکھیں بند کر کے سوتے بنے رہتے تھے۔ کبھی رشتی، کبھی شہابہ، کبھی نیلم، کبھی سونیا، کبھی ان کو مٹی آنکھوں کے خواب میں کبھی حبیبہ نظر آتی تھی، کبھی رشتی، کبھی شہابہ، کبھی نیلم، کبھی سونیا، کبھی

شہابانہ۔۔۔ لاتعداد نام تھے، لاتعداد کھونے تھے جو ان کے چہرے پر ہر لمحہ پڑتے تھے اور وہ کسی کو بتانا پاتے تھے۔ زندگی ان کے لیے اذیت کا دوسرا نام بن چکی تھی اور وہ اسے گزارنے پر مجبور تھے۔
 "مکافات عمل ایک حقیقت ہے۔۔۔ ایک اہل حقیقت۔۔۔ اللہ دکھا دیتا ہے دنیا میں ہی آپ کے ہر عمل کا رد عمل۔۔۔"

☆☆☆

"یا اللہ۔۔۔ تو مجھ سے واقف ہے۔۔۔ تو جانتا ہے میں نے کبھی اس عورت کو ڈکھ دینے کے متعلق سوچا تک نہیں جسے تو نے میری شریک حیات بنایا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ غلوں سے مکمل سچائی سے اس کے نام کیا ہے۔ اس کی بھلائی کے لیے اس کی بہتری کے لیے ہر وہ کام کرنے کی کوشش کی جو جائز تھی، حلال تھی۔۔۔ تیرے حکم کے مطابق ہم نے اپنا بستر ہی نہیں بائنا، بلکہ عزت و محبت، دولت ہر چیز ایک دوسرے کے ساتھ بانٹی ہے۔۔۔"

جو میرا تھا، وہ اس کا تھا۔۔۔ اور جو اس کا تھا، وہ میرا بھی تھا۔۔۔ لیکن ایک درد ہے جو ہم ایک دوسرے کے ساتھ نہیں بانٹ پائے۔۔۔ وہ لاچار تکلیف میں پڑی ہے اور میں اسے تڑپا دیکھ رہا ہوں، کب سے دیکھ رہا ہوں اور اس کی آسانی کی دعا نہیں کر رہا۔۔۔ میں بس تجھ سے اس کی زندگی کی دعا میں مانگتا چلا جا رہا ہوں۔۔۔ یہ سوچے سمجھے بنا کہ میری دعا میں اسے اذیت دے رہی ہیں۔۔۔ یا اللہ میں آج تجھ سے اس کی زندگی کی نہیں بلکہ آسانی کی دعا کرتا ہوں"

صبح نے اپنے ہاتھ تورب کے سامنے دعا کی صورت اٹھا رکھے تھے لیکن اس کا ذہن وہیں کہیں اسپتال کے بستر پر پڑی شہرین کے گرد گھوم رہا تھا۔ اس کا تالیوں میں جکڑا بدن جیسے اس کی آنکھوں کے پردے سے چپکا ہوا تھا۔
 "یا اللہ! آج پہلی بار تجھ سے اس کی آسانی طلب کرتا ہوں۔ اس کے ہر اس درد کو ختم کر دے جسے میں چاہ کر بھی بانٹ نہیں پایا۔۔۔ ہر وہ اذیت جس نے اس کے وجود کو لاچار کر رکھا ہے، اس اذیت کو ختم کر دے یا اللہ۔۔۔ بس اسے آسانی دے دے۔۔۔ اسے راحت عطا فرما مولا۔۔۔ میری شہرین کے ہر درد کو ختم کر دے مالک۔۔۔ میں تجھ سے اپنی خوشی نہیں بلکہ اپنی شہرین کی آسانی چاہتا ہوں یا اللہ۔۔۔ اس کی روگائی میں جو بھی رکاوٹ ہے۔۔۔ اس رکاوٹ کو دور کر دے یا رب العالمین!۔۔۔ وہ میری جان ہے۔۔۔ میری جان پر آسانی ہوگی تو مجھ پر آسانی ہوگی۔۔۔ یا اللہ ہم دونوں پر آسانی ہوگی۔ یا اللہ ہم دونوں کو آسانی عطا کر دے۔ آمین یا رب العالمین۔۔۔ آمین یا رب العالمین۔ آمین یا رب العالمین۔"

وہ روتا جا رہا تھا اور بس سسک سسک کر دعا مانگتا جا رہا تھا۔ اسی دوران اس کے سیل فون میں ارتعاش پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک دم سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ رات کے اس پہر تو اسپتال سے ہی فون آسکتا تھا۔ اس نے آگے ہو کر فون کی جانب دیکھا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی کے باعث اسے فون کی اسکرین پر نمایاں نام واضح نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے فون کان سے لگایا۔

"صبح۔۔۔ پہلی صبح اس کے نام کی ہی ہوئی تھی۔"

"کونین۔۔۔ آپ۔۔۔؟" اس نے پھیلی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی لیکن اس کے سسکنے کی آوازیں صبح کو صاف موصول ہو رہی تھیں۔

"آپ برا تو نہیں مانیں گے۔۔۔ اگر میں ایک بار شہرین کو دیکھنے ہا اسپتال جاؤں؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ اس کی کال کا اس وقت آنا صبح کے لیے حیران کن تھا۔ وہ رتب سے آسانی مانگ رہا تھا اور اسی لمحے کونین نے اپنے ہونے کا احساس دلادیا تھا۔

وہ جب رُب کو اسی حد وید سے یاد کر رہا تھا، نوئی اسے اسی ہی حد سے یاد کر رہا تھا۔۔۔ وہ جب رُب سے انجی آسانی طلب کرنے میں مگن تھا، کوئی اسے رُب سے طلب کرنے میں مگن تھا۔
بعض فیصلے بس اچانک ہی کرتے ہیں۔۔۔ وہ فیصلہ بھی بس اچانک ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"اپنا اسم کارڈ نکال کر فون بند کر دیں" سمج نے اس کے پاس بیٹھے ہوئے کہا تھا۔ ایمن اس کے ساتھ دوسری کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"کیوں۔۔۔؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔
"اس لیے کہ وہاں یہ کام نہیں کرے گا۔۔۔ وہاں دوسرا اسم کارڈ لینا پڑے گا نا۔۔۔" سمج نے وضاحت کی تھی۔

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔۔۔ وہاں تو یہ ڈی ایکٹیویٹ ہو جائے گا" اس نے سر ہلایا تھا۔
"ماشاء اللہ بڑی ذہین ہیں آپ۔۔۔ بہت جلدی سمجھ میں آگئی یہ بات آپ کو" سمج نے مسکراتے ہوئے اسے چاہا تھا۔

کوئین کی اچھی بات یہ تھی کہ وہ اس کی ہر بات فوراً مان لیتی تھی۔
"آپ نے جانے سے پہلے کسی کو پھول بھجوانے تھے نا۔۔۔ بھول تو نہیں گئیں؟" سمج کو اس کی سب ضروری باتیں یاد رہتی تھیں۔

"جی جی۔۔۔ بھجوا دیے تھے۔۔۔ میرے ایک بہت اچھے دوست کی شادی ہے کل۔۔۔ مہر ہے نا۔۔۔ میری بھانجی۔۔۔ اس کے چاچو کی شادی ہے۔۔۔ میں نے بتایا تھا نا آپ کو اس کے متعلق۔۔۔ اس کے بڑے احسان ہیں مجھ پر۔۔۔ اسی کو بھجوانے تھے پھول اور مبارک باد کا پیغام۔۔۔ میں نے بھجوا دیے تھے پھول اور کارڈ بھی" اس نے جواب دیا تھا۔

"اچھی بات ہے۔۔۔ آپ اپنے سب دوستوں کے کاٹیکٹ نمبرز ڈیوائس میں محفوظ کر لیں۔۔۔ تاکہ وہاں جا کر آپ کو سب کے ساتھ رابطہ کرنے میں آسانی ہو" سمج نے اسے مشورہ دیا تھا۔
"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ میرا رابطہ آپ سے شروع ہو کر بس آپ پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔۔۔ میرے لیے بس ایک ہی کاٹیکٹ اہم ہے۔۔۔ سمج رندھاوا۔۔۔ میرے سارے کاٹیکٹس بس آپ سے شروع ہو کر آپ پر ہی ختم ہو جاتے ہیں"۔

وہ ڈالر بھرے لہجے میں بولی تھی اور ساتھ ہی اس کے کندھے میں اپنا بازو جمائل کیا تھا۔ سمج مسکرایا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ اس کے ساتھ اپنی محبت کا ہر لمحہ اتنا مکمل کر اظہار کرتی تھی کہ بعض اوقات سمج اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنے لگتا تھا۔ زندگی میں دوبارہ سے مسکرانے میں اس لڑکی کا کردار بے حد اہم تھا۔ اس نے اسے بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس روز رات کو کوئین کو خود جا کر اس کے گھر سے واپس لایا تھا اور اس کے تین دن بعد شہرین نے خاموشی سے دم توڑ دیا تھا۔

یہ بات اذیت ناک تھی لیکن وہ سب جیسے اس دھچکے کے لیے تیار تھے۔ وقت گزرنے لگا تھا۔ زندگی اپنے مقام پر واپس آنے لگی تھی۔ سمج کو نارمل ہونے کا کافی وقت لگ گیا تھا لیکن کوئین نے اس دوران بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ہر مقام پر اس کے ساتھ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب سمج نے کینیڈا کی امیگریشن لینے کا فیصلہ کیا تو بھی اس نے اس کا ساتھ دیا تھا۔

"میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔۔۔ میں یہاں سے چلے جانا چاہتا ہوں۔۔۔ چاہے چند سالوں کے لیے ہی

بھی میں اس سارے دائرے سے لگتا جانتا ہوں۔ مجھے یہاں رہنے میں اذیت ہوئی ہے۔" کوئین نے ایک بار بھی نہیں کہا تھا کہ میں ایسا نہیں چاہتی۔ اس نے سمجھ کے اس فیصلے پر بھی لبیک کہا تھا۔ اس سارے عمل میں کافی مہینے لگ گئے تھے اور آج وہ دونوں ایمین کے ساتھ ایئر پورٹ کے ڈیپارچر لائن میں بیٹھے تھے۔ ایمین ساتھ بیٹھے بچوں کے ساتھ پھیلنے میں مگن ہو گئی تھی۔

"کوئین بہت بولتی ہیں آپ۔۔۔ اور یہ ایر پورٹ ہے۔۔۔ آپ کا بیڈروم نہیں ہے۔۔۔ ذرا ٹھیک ہو کر بیٹھیں۔" سمجھ نے بنجیدہ رہنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے ٹوکا تھا۔ وہ مزید اس کے قریب ہوئی پھر ناگ چڑھا کر بولی۔ "میں زیادہ اس لیے بولتی ہوں تاکہ توازن قائم رہے۔۔۔ آپ اتنا کم بولتے ہیں۔۔۔ تو، مجھے خدشہ رہتا ہے کہ لوگ ہمیں گونگنا سمجھ لیں۔۔۔ اچھا تو نہیں لگتا کہ یہاں بیٹھیں لوگ سمجھیں کہ یہ پہل جاتا خوب صورت ہے۔۔۔ اور لڑکی یعنی کہ میں جو کہ بہت ہی خوب صورت ہے۔۔۔ گوئنے ہیں۔۔۔ اسی لیے زیادہ بول رہی ہوں میں۔" وہ ایسی ہی بے سرو پا باتیں کرتی تھی لیکن سمجھ کو اس کی زندگی سے بھرپور باتیں اچھی لگتی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی ذات کے اندر جو سنائے ہیں، کوئین کی باتیں اس سنائے کو ختم کر دیتی ہیں۔ اس وقت بھی سمجھ کو یہی آگئی۔ اس نے اس کے دوسرے ہاتھ میں موجود سیل فون پکڑا تھا۔

"اچھا تو آپ بہت خوب صورت ہیں۔۔۔؟" وہ اسے چڑاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ اس نے سر ہلایا "اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ میں بہت خوب صورت ہوں لیکن آپ کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی گی کیونکہ آپ نے بھی مجھے غور سے نہیں دیکھا۔" وہ لاپرواہی سے بولی تھی۔ "یہ کس نے کہا کہ میں نے آپ کو غور سے نہیں دیکھا۔۔۔ جناب میں نے تو آپ کے پہلی ملاقات میں ہی بہت غور سے دیکھ لیا تھا؟" وہ بات برائے بات کر رہا تھا۔

"اچھا واقعی۔۔۔ پھر آپ تو مر مٹے ہوں گے مجھ پر۔۔۔ آپ نے سوچا ہو گا کہ کتنی حسین لڑکی ہے یہ؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ سمجھ مسلسل مسکرا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کے موبائل میں محفوظ نمبر کو ڈائل کر رہا تھا۔ "ہاں۔۔۔ یہی سوچا تھا میں نے کہ کتنی خوب صورت لڑکی ہے۔۔۔ لیکن اللہ نے اسے عقل کتنی کم دی ہے۔۔۔ کاش ذرا سی عقل دی ہوتی تو مجھ غریب کا بھلا ہو جاتا۔" وہ بائیں اس سے کر رہا تھا لیکن توجہ موبائل کی جانب تھی۔

"آپ پہلے دن سے مجھ پر فدا تھے نا۔۔۔ مجھے پہلے ہی شک تھا آپ پر۔۔۔ کہ یہ بندہ عقل سے ہی گھنا مینا لگتا ہے۔" وہ اسے چڑا رہی تھی۔

"اچھا اب ذرا خاموش رہیں ایک منٹ۔۔۔ ایک ضروری کال کرنی ہے مجھے۔" وہ اسے ٹوک کر بولا تھا۔ دوسری جانب کال مل گئی تھی۔ سمجھ بات کرنے لگا تھا۔ اسے بات کرتا دیکھ کر وہ بالکل چپ ہو گئی تھی کیونکہ اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ کس سے بات کر رہا ہے۔ ایک منٹ میں اپنی علیک سلیک مکمل کر کے سمجھ نے اسے فون تھما نا چاہا تھا۔ وہ متذبذب تھی۔ سمجھ نے فون کی اسکرین کو ہاتھ سے چھایا تھا تاکہ دوسری جانب آواز نا جاسکے۔ "میری خاطر۔۔۔ پلیز۔۔۔" وہ بہت محبت بھرے لہجے میں بولا تھا۔ کوئین نے فون تھام لیا تھا۔

"جی ابا۔۔۔ ٹھیک ہوں۔۔۔ جی بالکل۔۔۔ ہاں جی ابا۔۔۔ ایمین بھی ٹھیک ہے۔۔۔ ہاں جی ابا۔۔۔ جاتے ہی نمبر بھجوا دوں گی ابا۔۔۔ آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا ابا۔۔۔ دو وقت پر لیتے رہے گا۔" اس نے رپورٹ کی طرح بات کی تھی لیکن کر لی تھی۔ فون بند کر کے اس نے اپنا فون دوبارہ سے سمجھ کو پکڑا دیا تھا۔ ان دونوں نے اس موضوع پر کوئی بات نا کی۔ سمجھ جانتا تھا کہ کوئین کے تعلقات اپنے ابا سے واجبی نوعیت کے ہیں لیکن وہ پھر بھی دھیان رکھتا تھا کہ وہ ان سے رابطے میں رہے۔ اسی طرح وہ بھی سمجھ کے والدین کے ساتھ رابطے میں رہتی

تھی۔ وہ اکثر ایمین کی اپنی نانوادے اور خالوں سے بھی بات کروادیا کرتی تھی۔ سبج نے فون بند کر کے اس کے بیک کی زپ کھولی تھی اور فون اس میں رکھ دیا تھا۔

"تھینک یو" سبج نے کہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر سادہ سے انداز میں بولی۔
 "آپ کی خاطر مر بھی سکتی ہوں۔۔۔ یہ تو بس ایک فون کال تھی" سبج نے سر ہلایا پھر ایک بار پھر سر اٹھنے والے انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

"تھینک یو سو مچ۔۔۔" اس نے ناگ چڑھائی اور منہ بنا کر بولی۔
 "تھینک یو سو مچ۔۔۔ اونہ۔۔۔ ارے بندہ خدا! ایسی باتوں کے جواب میں "آئی لویو" کہتے ہیں "سبج کو ہنسی آگئی۔

"واقعی۔۔۔؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔
 "لیکن میں ایسی باتوں کے جواب میں "آئی لویو" نہیں کہتا" کوئین نے پھر اسے گھورا تھا اور طنزیہ انداز میں بولی۔

"اچھا۔۔۔؟ تو آپ ایسی باتوں کے جواب میں کیا کہتے ہیں؟" سبج چند لمحے مسکرا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کی ناک کو ہلکا سا چھوتے ہوئے ذومعنی انداز میں بولا۔
 "وہ میں آپ کو گھر جا کر بتاؤں گا۔ اب ہر بات کا جواب انٹر یورٹ پر بھی نہیں دیا جاسکتا" کوئین اس کی بات میں چھپی شرارت کو سمجھ کر جھینپ کر مسکراتے ہوئے ایمین کو دیکھنے لگی تھی۔ اس کی بازو ابھی بھی سبج کے بازو کے گرد لپٹا تھا۔ اس کا ہاتھ سبج کی بازو پر دھرا تھا۔ سبج نے اس کے اسی ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور اطمینان سے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا تھا۔

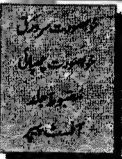
☆☆☆

پھر اس کے قدموں نے کسی سطح کو چھوا تھا۔ اسے لگا اس کا پورا وجود اوپر سے نیچے تل گیا ہے۔۔۔ ایسے جیسے غلاء باز خلا میں قلابازی کھاتے ہیں۔۔۔ اس نے بھی دھیرے دھیرے ایسی ہی قلابازی کھائی تھی۔۔۔ اور پھر وہ اپنی ٹانگیں اپنے پیٹ سے چپکا کر پرسکون ہو کر لیٹ گئی تھی۔۔۔ ایسے جیسے اپنی ماں کے رحم میں ان کے رحم و کرم پر ہو۔



شائع ہوئے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول



☆ تنلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 250 روپے
 ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
 ☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

مشاورت: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

وہ لیکچر

ہے۔ اس کے علاوہ خاندان میں اماں جی ہیں جن کو ہر ماں کی طرح اپنی اولاد نکھی لگتی ہے۔ یہ تھا ہمارے خاندان کا مختصر سا تعارف اب میں سونے لگی ہوں بائے بائے۔



صبح کا آغاز ہمیشہ کی طرح پانی سے ہوا۔ پینے والے پانی سے نہیں بلکہ اس فریج کے اس ٹھنڈے پانی سے جو اماں نے ہمیں غفلت کی نیند سے جگانے کی غرض سے میرے منہ پر پھینکا تھا اور اس کے کچھ مہینے ہنہ کے چہرے پر پڑے تھے جو خواب میں عمر اکمل کے ساتھ شاید ساؤتھ افریقہ کے ٹور پر نکلی تھی۔ ہنہ کے بارے میں دو باتیں ذہن نشین کر لیں نمبر ایک ہنہ کو کرکٹ کا جنون ہے نمبر دو ہنہ ہر بات میں کسی نہ کسی شعر کا غلط حوالہ ضرور دیتی ہے۔

”ٹھہ جاؤ نکھیوں نماز کا نام جارہا ہے۔“ اماں کی آواز ساتھ والا محلہ بھی سن سکتا تھا۔ مجھے اماں کی اعلیٰ کارروائی کا پتا تھا اس لیے میں نے جلدی سے بستر چھوڑ دیا۔ ہنہ ابھی تک آؤ می نیند میں تھی۔

”کیا ہے اماں سونے ویں پورا دن تو آپ کام کرواتی ہیں کبھی تو یہ بھی کہہ دیا کریں سو جاؤ میری لاڈلیوں۔“ بقول شاعر ”یک بار کو میں تیری ہوں۔“

ہنہ کو شاید یاد نہیں تھا کہ اماں نے کل ہی ایک نئی چپل خریدی، جو پولیس والوں کے چھتر جیسی ہے اس لیے اگلے لمحے میں اس کی چیخ مجھے وضو کرتے ہوئے سنائی دی اور میری روح تک سیراب ہو گئی۔ نماز پڑھنے

جس طرح ڈگری ڈگری ہوتی ہے چاہے اصلی ہو یا نقلی اسی طرح گھر تو گھر ہوتا ہے چاہے جس کا ہو۔ دین محمد دودھی کا گھر تھا، مگر بقول اماں جی اولاد نے اسے ہنگامہ خانہ بنا دیا تھا۔ تو حضرات آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر یہ پڑ پڑ بولتی زبان کس کی ہے، کہیں ناشتے میں کو اتو نہیں کھالیا اس لڑکی نے۔ نہیں جی بالکل بھی ایسی بات نہیں بولتے رہنا ہماری بچپن کی عادت ہے اور عادت کب بدلتی ہے۔ جس طرح عوام کو سیاست والوں کا ہر سچا جھوٹا بیان سیاسی بیان لگتا ہے اسی طرح میرے بولتے رہنے کو اماں جی بکواس ہی کہتی ہیں۔ ارے یار میں بھی کن باتوں میں لگ گئی۔ میں ذرا اپنا تعارف کروالوں۔ میرا نام فریدہ ہے اور میں لاہور کے ایک خوب صورت محلے کی رہائشی ہوں۔ ہمارا گھر چھوٹا سا مگر خوب صورت ہے۔ والد محترم کا نام دین محمد ہے اور اپنے دودھ کے کاروبار کی وجہ سے دودھی کہلائے جاتے ہیں۔ اباجی کے اباجی یعنی میرے دادا کے زمانے سے یہ ہمارا خاندانی کاروبار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اباجی اس کاروبار میں ایڈجسٹمنٹ کے قابل ہیں۔ ایڈجسٹمنٹ یعنی چار کلو دودھ میں سے دو کلو نکال کر اسے دوبارہ چار کلو بنا دینا۔ بانی تسمی خود سیانے ہو۔ میرے علاوہ ہمارے خاندان میں میری چھوٹی بہن ہنہ ہے جو اٹھارہ سال کی ہے اور مجھ سے چار سال چھوٹی ہے۔ اس حساب سے میری عمر ہو گئی ایڈجسٹمنٹ کر کے صرف بیس سال ہے نا؟۔ تیرے نمبر پر میرا لاڈلا بھائی احتشام ہے جس کو لمبی غصہ آئے نکلا اسی پہ



پٹکانے لگا۔

”ہر اس میں پڑھنے جارہی ہوں۔“ فنی کی گھورتی نظروں کو میں نے ایسے نظر انداز کیا جیسے سفارشی کھلاڑیوں کی کارکردگی کو کرکٹ بورڈ والے کرتے ہیں اور لا سیرری کی طرف چل دی۔

☆☆☆

گھر کی چھت پر پتنگ بازی عروج پر تھی۔ میری پتنگ نے جیسے ہی احتشام کی پتنگ کو کاٹا میری منہ سے خوشی کے بارے ناقابل فہم آوازیں نکلیں۔ ”یا ہودود“ میرا عروس کرینے لگی۔ ”اے امان کی آواز آئی۔“

”نی تیرے لبا کی شادی ہے جو چھین مار رہی ہے۔“

”اے امان جی! ابا اب ایک بار سبق سیکھ چکے ہیں دو سری غلطی نہیں کریں گے بقول شاعر اب کے تجدید شادی کا نہیں امکان امان“ میرے حصے کا جواب ہنسنے دیا۔

”تو جا کے اپنے کچھ لگتے عمر اکمل کو دیکھ وڈی آئی احمد فراز۔“ امان کا جواب سن کر ہنسنے کے ساتھ مجھے بھی یاد آیا کہ آج تو پاکستان کا میچ ہے۔ میں چھت سے اترنے ہی والی تھی کہ سامنے نظر پڑی۔

”اوہ! تو یہ ہیں ڈاکٹر صاحب! بات تو فنی کی بیچ ہے ہینڈ سم تو رہا ہے۔“ میں نے سادہ سے کپڑوں میں ملبوس خالہ کے گھر کی چھت پر بیٹھے اس شخص کو غور سے دیکھا۔ ”خیر رسالوں کی۔“

میچ دیکھتے ہوئے بھی میرا رویاں بار بار اس کی طرف جا رہا تھا۔ میں سب چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میری منگنی سولہ سال کی عمر میں محسن سے ہوئی تھی۔ محسن ہمارا رشتے دار تو ہمیں تھا، مگر لابی کی بوسہ پسند تھا۔ محسن پچھلے سال جاب کے سلسلے میں انگلینڈ چلا گیا تھا۔ محسن کا رنگ سانولا تھا، مگر چہرے کے نقوش پرارے تھے اس کے باوجود بے چارہ اکثر میرے مذاق کا نشانہ بنتا۔ باضی کی درپچوں میں کھوئی نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

ایک روز سے جان چھوٹنے ہی گھر کے کام گئے

لے بعد کچھ دیر آرام لیا پھر تاسیتا کالج آئی۔ آج کل ایگزامز کی تیاری عروج پر تھی اور تو اور نمبرین عرف مس ایک چڑھی بھی فیشن چھوڑ کے نوٹس ڈسکس کر رہی تھی۔

”لوئے فری ابوہر دفع ہو۔“ یہ فہمیدہ تھی جو ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔

”کیا ہے فنی بھی تو پڑھ بھی لیا کر دیکھ سارے ایگزامز کے لیے رٹنا رہی ہیں تو بھی کچھ کر لے۔“

”چھوڑ سب کو، ایک واما کے وارنوز ہے میرے پاس۔“

”کیا؟“

”ہماری پچھلی گلی میں آج جانے کتنے دنوں کے بعد چاند نکلا۔“ اس نے لہک کے گلے کی کوشش کی مگر میڈم نور جہاں کی جگہ عدین سمج جیسی آواز سن کر اپنا ارادہ بدل لیا۔

”اصل بات جتنا کہ اس نہ کر۔“

”آج وہ آیا ہے۔“ اس نے شرمانے کی ناکام کوشش کی۔

”کون تیرا بھائی جو پچھلے سال انگلینڈ گیا تھا۔“ مجھے محسن کی یاد آئی۔

”نظمی منہ بھائی نے عید پر آنا ہے ویسے اس کا برا انتظار ہے؟“

”اور نہیں تو کیا آخر میرا مکیتر ہے چاہے کالی بھیئس سے کچھ زیادہ کالا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”چل چھوڑ مجھے تو اس میں خامیاں ہی نظر آتی ہیں“

میں نے یہ بتانے کے لیے بلایا ہوا ہمارے گھر سے پچھلے والے گھر میں خالہ رہتی ہیں جن کو کرائے پر گھر دینا تھا وہاں ایک ہینڈ سم اور خوب صورت نوجوان آیا ہے۔ سنا ہے محلے کے اکلوتے اسپتال کا اکلوتا ڈاکٹر ہے۔ میں تو ایک جھلک دیکھ کر ہی قربان ہو گئی۔ ”فنی نے شرمانے کی ایک اور ناکام کوشش کی۔“

”جھا تو پھر میں کیا کروں۔“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں بس کسی طرح میری اس سے بات کرو وے۔“ فنی کا لہجہ ہمیشہ کی طرح کام پڑنے پر شہد

خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے مقبول ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
وہ جھپٹی سی دیوانی	آسیہ سلیم قریشی	600/-
آرزو ٹھہر آئی	آسیہ سلیم قریشی	500/-
تھوڑی دور ساتھ چلو	آسیہ سلیم قریشی	400/-
ایمان، امید اور محبت	عمیرہ احمد	300/-
امر تبیل	عمیرہ احمد	600/-
لا حاصل	عمیرہ احمد	300/-
ریگ زائر تینا	ماہا ملک	600/-
اک دیا جلانے رکھنا	ماہا ملک	350/-
میرے خواب ریزہ ریزہ	ماہا ملک	350/-
جو چلے تو جاں سے گزر گئے	ماہا ملک	250/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
نکلے داتا شا	شازیہ چوہدری	250/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
میرے چارہ گر	رخسانہ نگار عدنان	400/-
کوئی دھپک ہو	رخسانہ نگار عدنان	350/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	600/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	500/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	300/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	400/-
ستاروں کا آئین	نسیم سحر قریشی	450/-
تو شریک سفر رہا	نسیم سحر قریشی	400/-

نے جیسے گھیر لیا ہو۔ اماں جی بھی اب مجھ سے کم بات کرتیں۔ احتشام اور ہنی بھی دور دور رہتے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ اس دن سب نیچے تھے اور میں چھت پر چلی آئی۔ غیر ارادی طور پر سامنے والی چھت پر دیکھا تو وہ دکھائی دیا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ دور سے ہاتھ ہلا کر وہ قریب چلا آیا۔

”کیسی طبیعت ہے آپ کی فریدہ۔“
”ٹھیک ہوں ڈاکٹر صاحب“ اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا، یہ سوچتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کے بولا۔

”ہارون نام ہے میرا ڈاکٹر صرف اسپتال میں ہوتا ہوں یہاں انہیں ہوں۔“ یہ مسکراہٹ شاید اس کے چہرے کا حصہ تھی۔
”تو ڈاکٹر کیا انسان نہیں ہوتے۔“

”جی ہوتے ہیں مگر لوگ ڈاکٹر کے نام سے ایسے ڈرتے ہیں جیسے چڑھتا ہو۔“
”میں تو نہیں ڈرتی۔“

”اس لیے آئے دن اسپتال کا چکر کاٹنا پڑتا ہے۔“
”کیا! میں صرف ایک بار گئی ہوں۔“
”ہاں مگر ہر وقت دکھائی دیتی ہو۔“ اس کے لہجے میں ایسی کوئی بات تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ یہ کہہ کر چلا گیا اور میں اس کو دیکھتی رہی ”تو کیا وہ بھی؟“



اواسی کا یہ پھر طویل ہوتا چلا گیا۔ پھر اکثر جب چھت پر کوئی نہ ہوتا تو وہ چلا آتا نہ جانے کب وہ میرے لیے لازم ہو گیا۔ اس کی باتیں، اس کی عادتیں اور سب سے بڑھ کر اس کی مسکراہٹ یوں لگتا جیسے میری زندگی کے سب سے خوب صورت لمحے اس کے ساتھ ہیں۔ ہم نے اظہار نہیں کیا تھا مگر اپنے اپنے دل کی حالت سے خوب واقف تھے۔ کبھی کبھی وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتا تو اس کا لمس دل میں خوب صورت احساس جگانے لگتا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی مگر خوشی کا یہ وقت بہت مختصر تھا۔

پڑ گئے۔ سارا دن کام کر کے تھکن سے برا حال ہو جاتا۔ اس دن موسم نے اثر دکھایا اور زکام کے ساتھ بخار نے گھیر لیا۔ احتشام اور ابو گھر نہیں تھے اماں جی نے نرسوں کے بچے کو بھیج کر عیسیٰ منگوائی اور مجھے لے کر اسپتال آ گئیں۔ ڈاکٹر چیک کرنے آیا تو دیکھا ”اے یہ تو بڑوس والا ہینڈ سم ہے“ اس مغرور نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ بس چپ چاپ چیک اپ کے بعد میڈسن تجویز کرنے لگا۔
”بیٹا تم وہی ہو نا جو سسکی کے گھر رہتے ہو۔“ اماں نے پہچانے مانے کی کوشش کی۔

”جی خالہ وہی ہوں اور یہ محترمہ موسم کی پروا کیے بغیر پتنگ اڑائیں گی تو بخار تو ہو گا۔“ لیوں پر ہلکی مسکراہٹ لیے اس نے شرارتی لہجے میں جب یہ بات کی تو بے اختیار اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ دل دھڑکنا بھول گیا۔ مسکراہٹ اس کے چہرے پہ ج رہی تھی۔ چہرے پہ نرمی کا تاثر اور عام سرکاری اسپتال کے ڈاکٹروں کے برعکس وہ ذرا بھی تھکا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ میڈسن لے کر گھر واپس آتے ہوئے اس کا مسکرا نا چہرہ جتنا بھلانے کی کوشش کرتی اتنا زیادہ یاد آتا۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ آرام کر کے تھک گئی تو چھت پر کرسی ڈال کر بیٹھ گئی۔ اس دوران احتشام اور ہنیہ اوپر آ گئے۔

”کیا بات ہے آپ کی کن خیالوں میں گم ہو۔“ احتشام قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔
”کچھ نہیں۔“

”لگتا ہے باہمی کو جناب کا انتظار ہے جو پرانے دہس میں بیٹھا ہے بقول شاعر وہ عشق جو انگینہ بیٹھ گیا۔“ ہنیہ عادت سے مجبور تھی۔

”کیا ہنیہ ہر وقت ایک ہی بات خدا کے لیے کبھی محسن کا ذکر نہ بھی کیا کرو۔“ میرا لہجہ نہ جانے کیوں سخت ہو گیا۔ ہنیہ اور احتشام حیران رہ گئے۔ میں اٹھ کر نیچے جانے لگی تو پیچھے سے احتشام کی آواز سنائی دی۔
”یہ آپ کی کو کیا ہوا ہے۔“ بخار تو اتر گیا مگر علاج کرنے والا عجیب طرح کا احساس دے گیا۔ چڑچڑاہٹ

”کیا شرط ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”کتابے شعروں کے حوالے نہ دیا کر۔“ مجھے ہنسی آگئی۔ مجھے ہستادیکہ کردہ دونوں بھی خوش ہو گئے۔ آج جانے کتنے دنوں کے بعد ہم یوں مل کر بیٹھے تھے۔ ان سے باتیں کرنے کے دوران میرے نگاہوں کے سامنے ہنسی، اشتیاق اور اماں کے چہرے گھومتے تو کبھی ڈاکٹر ہارون کی مسکراہٹ اور باتیں ذہن میں گھومنے لگتیں۔ آخر میں ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔



گھر سے رخصتی کا وقت ہر لڑکی کی طرح میری آنکھیں بھی بھگو رہا تھا۔ اماں جی سے لپٹی ہنسی اور اشتیاق سے گلے ملنے اور ابا جی سے ڈھیر ساری محبتیں لے کر آج مجھے پرانے گھر جانا تھا۔ جہاں ایک شخص میرے لیے ڈھیروں محبتیں لے کر بیٹھا تھا۔ زندگی کی وہ رات مجھے بھول ہی نہیں سکتی جب ڈاکٹر ہارون کے کہنے پر میں اپنے تھوڑے سے کپڑے لے کر اس کمرے میں پہنچی تھی جہاں وہ رہتا تھا۔ اس نے مجھے دوسری رات کو نکلنے کا کہا تھا کہ یہ سوچ کر آگئی کہ آج موقعہ اچھا ہے سب جلدی سو گئے ہیں ہم چلے جائیں گے سب سے دور۔ مگر ہارون کے کمرے کا دروازہ کھول کر سامنے جو منظر نظر آیا وہ میری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھا۔ ہارون کے ساتھ مکان مالکن خالہ سلمیٰ کی اکلونی بنی شرم ناک حالت میں موجود تھی۔ میں نے یہ دیکھ کر اپنی چیخ مشکل سے روکی۔ ہارون کی محبت ایک سینکڑن میں ختم ہو گئی اور میں واپس اپنے کمرے لوٹ آئی۔ میں خدا کی ذات کا جتنی بار شکر کروں کم ہے جس نے میری اور میرے والدین کی عزت رکھ لی۔ شاید اماں کی دعاؤں کا اثر تھا۔

محسن کے گھر وداع ہوتے ہوئے یہ سب باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی سوچ لیا تھا میں اس گھر کو جنت بناؤں گی کیونکہ اس گھر کا مالک مجھے پوری عزت کے ساتھ پیاہ لایا تھا۔

اس شام غمی نے بتایا کہ محسن آ رہا ہے۔ میں نے ہارون کو اپنے بارے میں سب بتا کر کھا تھا۔ جب اسے یہ بتایا کہ محسن واپس آ رہا ہے تو وہ بھی پریشان نظر آنے لگا۔

”اب کیا ہو گا فری میرا تو آپ کے بغیر ایک پل بھی گزارا نہیں ہوتا۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں ہارون۔“ اماں جی نے محسن کے آتے ہی میری تارخ طے کر دینی ہے اور شاید ایک ماہ کے اندر شادی ہو جائے۔“

”فری میری بات مانو گی۔“

”کیا۔“ اس کی بات سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ ”مگر ہارون! میں کیسے کر سکتی ہوں یہ۔“
 ”کیوں نہیں کر سکتی تم اپنا اچھا برا سوچ سکتی ہو اگر نہیں کر سکتی تو میں سمجھوں گا میری اور تمہاری محبت بس ناٹم پاس تھی۔“ وہ یہ کہہ کر چلا گیا لیکن میرے لیے سوچوں کا ایک نیا باب چھوڑ گیا۔

”کیا میں ہارون کے لیے اماں بھائی ابا اور ہنسی سب کو چھوڑ دوں گی؟ کیا میں بے حس بن کر اپنے باپ کی عزت سے کھیل سکتی ہوں؟ کیا میں گھر سے بھاگ سکتی ہوں ایک ایسے شخص کے ساتھ جس کا اور میرا ساتھ صرف ایک پیاہ اور کچھ دن کا ہے۔“ دل اور دل غ کی یہ جنگ جاری تھی۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھی بے دھیانی میں کھڑکی سے باہر دیکھتا اور اشتیاق کی لڑائی دیکھ رہی تھی۔ شاید اشتیاق کی فیورٹ ٹیم جیت گئی تھی اس لیے ہنپہا، بیہوش کی طرح ہارون کی بجائے بحث پھرتی ہوئی تھی۔

”ہنپہا، اشتیاق ادھر آؤ۔“ میں نے انہیں بلایا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا میں ان کے پاس بہت تھوڑے دن ہوں۔

”آئی دیکھیں ہنسی آج پھر مار گئی ہے اور پھر بھی میری شرط پوری نہیں کر رہی۔“ اشتیاق نے آتے ہی شکایت جڑ دی۔

”آئی اس کی شرط تو سنیں ذرا بقول شاعر پوری کریں تو مر نہ جائیں۔“

مصباح علی سید

ہیر و گمشدہ

از میر اور مریم آسٹریلیا کے شہر کنوریہ میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی روائیہ شادی کے گیارہ سال بعد پیدا ہوئی۔ غیر معمولی خوب صورت اور معصوم روائیہ کی سالگرہ جندب نے وہاں کے مشہور ہسپتال گرین فورسٹ میں ارتجی کی۔ جندب از میر کے پرانے دوست رضا حیات کا بیٹا ہے۔ جو آسٹریلیا میں پڑھ رہا ہے، جندب اور روائیہ کی پر خلوص دوستی ہے۔ جندب اسے پسند بھی کرتا ہے مگر اظہار نہیں کرتا۔

میرز کا فیصل آباد کے نواحی گاؤں میں مانے ہوئے زمیندار اور اہم سیاسی شخصیت ہیں۔ بیوی وفات پا چکی ہے۔ ان کے دو بیٹے خیام زکا، حبیل زکا ہیں۔ خیام کی دو بچے اعمال اور اذلان ہیں۔ ان کی بیوی آمنہ روایتی زمیندارتی اور حویلی پر حکمران ہیں۔ میرز کا کی والدہ ماں جان فاج کی مریضہ ہیں۔

زہب حویلی میں جدی پشتی خدمت گزار ہے، لیکن حبیل کی پرکشش شخصیت کے سحر میں بری طرح جکڑی ہے اسی لیے اپنے ہر آنے والے رشتے کو ٹھکراتی رہتی ہے۔

شہر زکمال ایک اکھڑ داغ شخص ہے۔ دولت مند ہونے کے ساتھ رنگین مزاج بھی ہے۔ سپرینڈ سے پسند کی شادی کرنے کے باوجود اس سے اکٹایا رہتا ہے۔ وجہ چار بیٹیوں کی اوپر تلے پیدائش ہے اور وہ بیٹے کا تمنائی ہے۔



اماں جان کی طبیعت شدید خراب ہوتی ہے وہ اپنے بیٹے از میر سے ملنے کی خواہش رکھتی ہیں۔ جب کہ میرز کا کی ان سے ناراضی چل رہی ہے کیوں کہ از میر نے ان کی سالی کو طلاق دے کر آسٹریلیا میں کرسچن لڑکی مریم سے شادی کی تھی، لیکن اب ماں کے اصرار پر حنبلی زکا از میر کو پاکستان بلانے کے لیے قائل کر لیتا ہے۔
 رضا حیات کی بیٹی ماہم کی منگنی ہے انہیں پتا چلتا ہے از میر پاکستان آ رہا ہے وہ شرکت کی دعوت دے دیتے ہیں۔
 از میر مریم دونوں پاکستان آتے ہیں۔ کچھ ناراضی کے اظہار کے بعد میرز کا نے انہیں محاف کر دیا روایتیہ کو نہ لانے پر خفگی کا اظہار بھی کیا۔

آنکھوں قسط

مکمل ناول



ازمیر اور مریم ہفتے بعد ماہم کی منگنی اینڈ کرنے اسلام آباد جا رہے تھے راستے میں ہی ایر کرش میں ان کی وفات ہو جاتی

شہر و کمال کے طعنے اور رنجیں عروج پر ہے جس سے سبیرینہ ہر وقت پریشان ہے۔ آئمہ کی بہن سلویٰ سبیرینہ کی خالہ زاد ہونے کے ساتھ گہری سبیل ہے اور اس کا دکھ اپنی تسلی سے کم کرتی رہتی ہے۔

مال باپ کی وفات پر روائیہ پاکستان آتی ہے۔ سب اس سے پہلی بار ملتے ہیں۔ اس کی اداسی کے سبب سب ہمدرد ہیں۔ کچھ عرصے بعد وہ واپسی کا تقاضا کرتی ہے تو میرزا کا اسے روکنے کے لیے اس کی شادی کے ورے ہیں اور ازلان کا رشتہ پیش کرتے ہیں۔ یہ رشتہ ماں جان کو پسند نہیں وجہ پرانی رنجش ہے۔ از میر نے آئمہ کی پھوپھو باجرہ کو طلاق دی تھی۔ باجرہ سبیرینہ کی والدہ تھیں جو اب مرحومہ ہیں۔ ماں جان حبیل کا رشتہ روائیہ کے لیے قبول کرتی ہیں۔ سلویٰ حبیل کی بچپن کی سنجیدگی اپنی منگنی ٹوٹنے پر بہت دل برداشتہ ہے۔ جناب بھی اس رشتے سے بری طرح ٹوٹا ہے۔ میرزین اور اسمتہ ان دونوں کے دوست ہیں اور دونوں کو سمجھاتے ہیں۔

روائیہ اور حبیل کی مرضی کے بغیر طے پانے والی شادی کچھ ہی عرصے اور واقعات کے بعد محبت میں بدل جاتی ہے۔ شوخ چٹل ازلان اپنی چاچی سے بہت محبت کرتا ہے، ہم عمر ہونے کے سبب بہت فری ہے۔ جب کہ حبیل بڑی عمر کا ہونے کے سبب سبور۔

جرمنی میں نیا کاروبار شروع کرنے کی غرض سے حبیل شادی کے چار ماہ بعد ہی جرمنی چلا گیا ہے۔ روائیہ اس کی غیر موجودگی میں بے حد اداس ہے اور ازلان اس کی اداسی دور کرنے کے لیے اکثر اپنے کسی کام میں اٹھائے رکھتا ہے۔

ازلان رات کو صحن میں بالٹری بجا رہا تھا۔ روائیہ سننے کے لیے باہر آ جاتی ہے۔ حبیل کا فون آنے کے سبب اسے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آنا پڑتا ہے۔ فون سنتے ہوئے اسے کمرے سے باہر کسی کے ہونے کا گمان ہے۔ پھر دروازہ پر

دستک شروع ہو جاتی ہے۔ وہ فون بند کر کے دروازہ کھولتی ہے۔

تفریحی ٹور فوراً کینسل کر کے پاکستان کی ایمر جنسی سیٹ ریز رو کر دیا تھی۔

☆☆☆

جہاز اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ اک فرحت بخش احساس نے اسے اپنے گھرے میں لے لیا لکٹی باتیں تھیں جو ان دس ماہ میں اکٹھی ہو چکی تھیں۔ جیسے جیسے فاصلہ سمٹ رہا تھا اس کی بے قراری بڑھ رہی تھی۔ پچھلے چند ہفتوں میں جانے کیوں اسے ایسے لگنے لگا تھا شاید وہ بھی پاکستان نہیں جاسکے۔ مگاریوں کہ پاکستانی منسٹری تک جرمنی کے قانون کے آگے نا کام ہو چکی تھی۔ وہاں کی حکومت نے اس مقدمے کو انٹرنیشنل دہشت گردی کے قوانین میں درج کیا تھا۔ ظہیر لقی تو قاتل ثابت ہو چکا تھا البتہ حبیل ذکا کو سہولت کار کے زمرے میں رکھ کر انویسٹی گیشن کی جارہی تھی۔ وہ ہر طرح سے بے قصور ثابت ہو چکا تھا مگر ظہیر لقی سے رابطہ ان ہی دنوں ہونا اسے بری طرح پھنسا گیا۔ ظہیر لقی کا ملنا اتنا

بوسوں ریاضتوں کا نتیجہ اس کے سامنے موجود تھا۔ جانے وہ کون سی دعا بھی یا عمل جس کے صلے میں مراد بر آئی۔ اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلی تھیں پانی کسی دریا کی لہری کی طرح کرکٹیں بدل رہا تھا۔ اسے قطعاً "یقین نہیں تھا وہ اس عہد پر بر فائز ہو سکتی ہے، بار بار اس کے چہرے کو چھو کر دیکھتی اس کے ہاتھ پاؤں چومتے سینے میں بہت سی ٹیمیں بیک وقت اٹھیں۔ بیٹے ماہ و سال کا ایک ایک لمحہ شہروز کمال کے کہے لفظ روح پر چاٹنے کی طرح بڑتے وہ سکپاں لیتی اس بچے پر جھک گئی۔ گول کوٹھنے سے روٹی کے گالے کو اپنے سینے میں دبوچ لیا۔ اک سمندر تھا جو خاموشی سے اٹھتا آ رہا تھا۔ اس نے ٹوٹے دل سے بار بار لڑکا چاہا تھا اور اس کی یہ چاہت پوری ہوئی شادی کے چودہ سال بعد وہ ایک وارث کی ماں کہلانے کے قابل ہو چکی تھی۔ شہروز کمال جو سوائے حبہ کے کسی بچی کو دیکھنے نہیں آیا تھا۔ جیسے ہی بیٹے کی پیدائش کی اطلاع ملی۔ حیران سا حیران تھا۔ اپنا

آسان نہ تھا جس طرح سے وہ روپوش ہو چکا تھا۔ اس رات صہبل کے ساتھ ڈنر کرنے کے بعد صہبل نے اسے اس کے بتائے پتے پر ڈراپ کیا تھا۔ وہ بہت دیر سڑکوں کی خاک چھانتا رہا پھر اس کے دماغ نے ایک ہی کام کیا کہ وہ اپنے گھر جائے اور ضروری سامان سمیٹ کر رات کے اندھیرے میں نکلے۔ وہ اپنے گھر میں داخل ہوا تب اس کے میل فون پر ایک اجنبی نمبر سے فون آیا۔ اس نے فوراً اٹھالیا تھا۔ دوسری جانب مارٹین کی بیوی بات کر رہی تھی۔ اس نے جتنے ہی پوچھا تھا۔

”مارٹین گھر نہیں پہنچا، کہاں ہے۔ فون بھی ریسپونڈ نہیں کر رہا۔“ ایک بار تو ظہیر تقی کا دماغ گھوم گیا پھر سہجیل کر بولا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم.... وہ میرے پاس نہیں آیا۔“ اس کی بیوی کو حیرت سی حیرت تھی۔ وہ صاف اسے ظہیر تقی کی طبیعت کا بتا کر گھر سے نکلا تھا۔ اس کے بار بار اصرار پر وہ بگڑ کر بولا

”میں نے کہا ناں۔ میں نہیں جانتا.... اور میں نے اسے کوئی فون نہیں کیا، بلانے کے لیے.... بلکہ میں تو اپنے پارٹر صہبل کے ساتھ تھا آج سارا دن اس کے ساتھ رہا ابھی ابھی ہم ہاٹ ران سے ڈنر کر کے آرہے ہیں۔ تم کسی سے بھی پتا کر سکتی ہو۔“ اس نے اپنا فون فوراً آف کر دیا تھا اور ضروری سامان سمیٹا جس میں اس کی چیک بک شامل تھی اور گھر سے نکلا اس کا ارادہ آج رات کسی ہوٹل میں گزارنے کا تھا اور پھر جرمنی چھوڑنے کا۔ ہوٹل جانے سے پہلے اس نے تین اسے بی ایم کیمن سے رقم نکلوانی ایک مخصوص رقم نکل جانے کے بعد بھی اس کے اکاؤنٹ میں خاصی رقم تھی جو اس نے صبح ہونے تک ملتوی کر دی تھی۔ تقریباً دس بجے کا وقت تھا۔ اس کا ارادہ سب سے پہلے بینک سے اپنی رقم نکلوانا اور پھر یہ شہر چھوڑنے کا تھا۔ وہ ہوٹل ریسپشن پر چیک آؤٹ کے لیے آ رہا تھا نگاہ سامنے چلتی بڑی سی ایل ای ڈی پر گئی وہاں فورس کے مارٹین کے قتل کی خبر نشر کی جا رہی

تھی۔ مارٹین کی بیوی نے ظہیر تقی کا فون کاٹ دیئے کے بعد ٹیلی کام سسٹم آفس سے رابطہ کیا تھا۔ مارٹین کے نمبر پر کال کرنے سے اس کی لوکیشن ڈیٹیکٹر نے واضح کر دی۔ تلاش پر ظہیر تقی کے گھر سے ڈیڈ باڈی برآمد ہوئی۔ اسی کے بتانے پر فورسز نے صہبل ڈکا کو ہاٹ ران ہوٹل کے سی سی وی کی وی کے ذریعے ٹریس کیا۔ ظہیر تقی کی تلاش ہوئی رہی۔ کہیں کہیں سی سی وی میں اس کے گزرنے کا معمولی گمان ضرور ہوا تھا مگر واضح نہیں تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ اسے اپنے جرم کا پتا تھا وہ خود کو قدرے چھپا کر چل رہا تھا۔ ریسپشن پر خبر سننے ہی وہ واپس کمرے میں گیا۔ لائنگ کوٹ، گلووز پہننے کے ساتھ ہیٹ اور مظہر ایسے سیٹ کیا تھا۔ جیسے قتل کا مریض ہو اور جلدی سے چیک آؤٹ کر کے وہاں سے نکلنے کی کوشش کی۔ بینک کا ارادہ وہ ملتوی کر چکا تھا۔ اب اسے کسی محفوظ مقام پر پہنچنا تھا۔ اس کا ایک پرانا جانے والا ہاگ برگ کے فوجی علاقے میں رہتا تھا۔ ظہیر ٹرین کے ذریعے اس علاقے تک پہنچا۔ ایک چور کو، چور ہی بہتر پناہ دے سکتا ہے، اسی طرح ظہیر تقی کا دوست اس کے کام آیا تھا۔ اس کے خاندان والوں کو اس کی خیریت کی اطلاع دینا اور مارٹین کے قتل کے سلسلے میں ہونے والی پیش رفت لمحہ لمحہ اس تک پہنچانا رہا۔ اتنا لمبا عرصہ اگر صہبل نے مصیبت کی طرح کاٹا تھا تو مطمئن ظہیر تقی بھی نہیں تھا۔ ایک رات ظہیر تقی کے دوست کی طبیعت اچانک خراب ہوئی۔ اسے فوری طبی امداد کے لیے قریبی اسپتال میں لے جانا پڑا۔ اس کی بیوی بھی نگاہ سے ظہیر کو دیکھتے کہہ رہی تھی ”اس وقت رقم نہیں ہے، اگر زیادہ ضرورت پڑے گی تو....“

”آپ فکر نہیں کریں سرکاری طور پر سب ہو جائے گا اور ویسے بھی میرے پاس ہیں۔“ وہ دونوں میاں بیوی کو اسپتال چھوڑ کر خود گھر جانے سے پہلے کچھ رقم اس کی بیوی کو تھا گیا۔ اگر ضرورت پڑی تو یہ استعمال کر لیتا۔ اسی شام کو وہ اس رقم سے چند ڈالر لے کر کینیڈین پرگٹی تھی۔ کھانے پینے کے سامان کی ادائیگی کرتے وقت میز مین نے اچانک ہی ڈالر پر

آپ کے مشورے سے ہمارا بڑی بہت اچھا سیٹ ہو گیا ہے..... آپ تو اب خیر مستقل جیل میں سیٹ رہیں گے۔“ وہ سخت سے اسے گھورتا باہر چلا گیا۔

☆☆☆

ایک ناقابل یقین خوش فہم نر پرائز، ہلکے سے کپڑے میں لیے صحت مند بچے کو وہ دیکھے جا رہا تھا اس کی آنکھوں اور رخساروں پر عرصہ دراز بعد بھری نہ نے خوشی دیکھی تھی۔ اس کی ہر آنے والی سانس میں نرمی اور محبت چھپتی تھی۔ کب ہوا، کس وقت ہوا، کیسے اسپتال تک آئیں یا کس کے ساتھ یہ سب باتیں اب اس کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ کانوں میں اپنے ابا کے سنے لفظ گردش کر رہے تھے۔

”بیٹیاں تو عذاب ہوتی ہیں، پہلے پالو، پوسو، تربیت کرو، اگر دماغ میں خناس بھر جائے باپ کی ہکڑی روند کر چلتی بیتی ہیں، چاہے بعد میں خود ساری زندگی رگیدی جائیں۔ اس سے بہتر ہے بیٹا ہو جائے، اس پر کسی نے انگلی اٹھانی ہے۔“ شہر و زکمال کی پھوپھی نے بھی اپنی مرضی سے شادی کی تھی اور خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔ برسوں بعد آئی تو شکل سے بے شکل ہو چکی تھی جو کچھ اس کے ساتھ میاں نے کیا وہ گھر والوں کو بتانے سے بھی گریز کرتی تھی۔ باپ نے اسے قبول تو کر لیا تھا، مگر حیثیت ملازماؤں سے بھی کم تھی۔ اس کے بچے کی پرورش گھر کے بے کار سامان کی طرح ہوئی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ بیٹا جوان ہو گیا۔ جو کچھ شہر و زکمال کی پھوپھی نے کیا تھا۔ وہ ہی سب بیٹی (شہر و زکمال کی بہن) نے کیا۔ فرق صرف اتنا تھا وہ پھوپھی کے بیٹے کے ساتھ گھر چھوڑتے ہوئے پھوپھی کو ساتھ لے گئی تھی اور تاحیات واپس نہیں آئی۔ باپ کے آنکھوں کی نفرت شہر و زکمال کے خون میں رچ بس گئی تھی۔ بس نہیں چلتا تھا بیٹی پیدا ہوتے ہی مادریں اور بیوی وجہ تھی وہ چھوٹی سی حبیہ کو کڑے تیوروں سے دیکھتا تھا۔ اپنی بہن بیٹی کا بدلہ دوسرے کی بہن بیٹی کو نیچا دکھا کر اپنی روندی انا کو تسکین پہنچانے کا سبب بنا رکھا تھا۔ اب اللہ نے بیٹا

درج سیریل چیک کی تو چونک گیا۔ دو دن پہلے ہی ایک شخص کسی کیس کی تفتیش کے سلسلے میں بات کر رہا تھا کہ یلزم نے وقوعہ کی رات تین اے ٹی ایم سے رقم نکلوائی تھی جن کی سیریل اس نے اپنے والٹ میں سے اسے دکھاتے ہوئے کہا تھا۔

”اگر یہ بندہ پکڑا جائے، گورنمنٹ کی جانب سے معقول الاؤنس مل سکتا ہے۔“ اس شخص کے بتانے میں حسرت فیک رہی تھی جیسے آج ہی ایسے وہ یلزم ملے تو پکڑ کر الاؤنس حاصل کرے۔ کینیڈین کے یلزم مین کو بھی لالچ آپاس نے وہ سیریل لکھ کر رکھ لی تھی کہ شاید اس سیریل نمبر کے ذریعے وہ یلزم پکڑا جائے۔ وہ کل سے ہر آنے والے ڈالر کو غور سے دیکھ کر پکڑتا اور اب اس عورت سے ڈالر پکڑتے ہوئے اس کی آنکھیں پوری طرح پھیلیں۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے عورت کو کاؤنٹر پر روکے رکھا اور جو سیریل کے ساتھ کاٹیکٹ دیے تھے اس پر رابطہ کیا۔ ”یہ لیں.....“ پھر اس نے اس کا سامان ایک شاپر میں ڈال کر اس عورت کو تھمتے ہمدردی میں پوچھا تھا ”آپ بہت پریشان ہیں، خیریت.....“ ”میرے میاں کو ہارٹ ایک آیا ہے..... میں واقعی پریشان ہوں۔“ اس نے متاسف چہرے کی گہائیوں میں وہ..... میرے لائق کوئی خدمت..... تو پلیر بتائیں۔“ وہ اس سے معلومات لینا چاہتا تھا اور وہ پریشانی میں اتنی گھری تھی۔ آہستہ آہستہ سب بتانے لگی کس طرح سے میاں کو اسپتال تک پہنچایا۔ فورس نے اس شخص کی نشاندہی پر ریڈی کی اور ظہیر کی برآمد کر لیا تھا اور جیل کی جان خلاصی ہوئی۔ وہ پاکستان آنے سے پہلے ظہیر کی سے ایک بار جیل میں مل گیا تھا۔

”تم نے کیا سمجھا تھا، یہ پاکستان ہے، جو آسانی سے چھپ سکو گے..... یہ انگریز تمہیں زمین کے چھٹ پیچے سے بھی نکال لیتے.....“ وہ کہہ کر جانے لگا پھر کچھ یاد آنے پر مڑا ”ایک بات یاد رکھنا ظہیر صاحب! خون بھی چھپتا نہیں ہے، اس کا رنگ بہت گہرا ہوتا ہے، آسانی سے نہیں دھلتا..... خیر

عطا کر دیا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ جب، عشا اچک اچک کر بھائی کو دیکھ رہی تھیں۔ شہروز اسے بے بی کاٹ میں لیٹاتے ہوئے سبرینہ سے کہہ رہا تھا۔
 ”میں ڈاکٹرز سے بات کرتا ہوں، ابھی ڈسچارج کر دیں۔۔۔۔۔ اسپتال میں بہت جرمز (جراثیم) ہوتے ہیں، عدن چھوٹا سا ہے، کوئی مسئلہ ناپن جائے۔“ سبرینہ نے نگاہ اٹھا کر شہروز کو دیکھا، یعنی اس کا نام بھی شہروز نے عدن رکھ دیا۔ چلو، جو اس کی مریضی..... مگر وہ مزید ایک دو دن اسپتال رہنا چاہتی تھی اس کا سیزرین ہوا تھا، ڈرپس انجکشن چل رہے تھے، لیکن شہروز نہیں مانا ”میں نرس اریج کر دوں گا..... پھر کیا مسئلہ ہے۔“

☆☆☆

پیزا ہٹ کے باہر حسب معمول بہت رش تھا۔ تمام ٹیبلو بھرتے، خالی ہوتے، پھر اور لوگ ان پر آ کر آرڈر دینے لگتے۔ پچھلے کئی ویک اینڈ کی طرح یہ ویک اینڈ بھی بہت اچھا گیا تھا۔ آمدن کے حساب سے۔ وہ ڈش میں رکھ کر پیزا، کوئلڈ ڈرنک اور سائیز لے کر جاتی، گاہکوں کو دینے کے بعد پلٹ آتی۔ کاؤنٹر پر کھڑا اسمتھ اسے مسلسل گھور رہا تھا آج اس کی نگاہوں میں سچ والا غصہ تھا۔ وہ ہٹ کی ٹائمنگ ختم ہونے کے انتظار میں تھا۔ آج اس نے میرڈین کی اچھی خاصی کلاس لیٹا تھی۔ اس کی نگاہوں کی تندہ سے اسے بھی اندازہ ہو چکا تھا اور وہ بہت سے جملے ترتیب دے چکی تھی جو اسے یکے بعد دیگرے اپنے دفاع میں بولنے ہیں۔ شولڈر کٹ گولڈن بالوں کو چوڑی پٹی بینڈ میں جکڑے، گرے شارٹ اسکرٹ، چوڑی ہیل کا سینڈل پہننے وہ پیشہ دارانہ انداز میں پوری لگن سے کام کرتی رہی تھی، لیکن جیسے جیسے آف کی ٹائمنگ قریب آ رہی تھی اسمتھ نے محسوس کیا اس کے چہرے پر نفقہ ہاتھ اتر آئی اور چال ڈھیلی، باہر کھڑے کا سان لگا کر اس نے ٹرے بہت زور سے کاؤنٹر پر رکھی تھکاوت بھری سانس کھینچتے ہوئے اپرن کی ڈوری کھینچی۔ پٹی بینڈ اتارتے بے زاریت سے بولی تھی۔

بچوں کے لئے

چھوٹی چھوٹی کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 1 مارک مفت

قیمت 300/- روپے

ڈاک خرچ 50/- روپے

بندوبست ڈاک بھجوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

چوری نہیں کی.... بلکہ معمولی سی سٹری پر تہاری مدد کر رہی ہوں اور تم مجھ پر شک کر رہے ہو۔“ اپنی کلائی چھڑوا کر اپہر ان اس کے منہ پر مارا۔ ”پکڑو اسے اور کوئی مدد نہیں کرنا تمہاری، تم ایسے دوست ہی نہیں ہو جس کی خاطر میں اپنا وقت برباد کروں.....“ اس نے آواز میں خود ساختہ کی پیدا کی۔

”مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی، کیا ہوا اگر میں نے چند گاہکوں کی پے منٹ رکھ لی.... تم تو حیا لینے پر آ گئے.... ایسے ہوتے ہیں دوست، یہ تھی تمہاری محبت....“ وہ آنکھیں پھاڑے اسے تنگے جا رہا تھا۔

”صرف چند گاہکوں کی....! وہ حیرانگی سے بولا“ تمیں گاہکوں کی پے منٹ میڈم..... نہیں اور ٹوکس بچا اس تھے آج.....“ میری ڈن نے خشکی سے گردن جھنجھکی، ہنوز ناراضی کا اظہار کرتی رہی۔ ”اور کون سی محبت..... مائی ڈیر! پیز ایٹ میں صرف برنس ہے، محبت اس سے باہر ہے..... سمجھیں۔ تم نے پھلے پڑنے بھی یہ حرکت کی تھی.... تب معاف کر دیا تھا، اب نہیں کروں گا.... نکالو میس....“ اس کے قطعیت سے کہنے پر اس کی آنکھیں پھیل گئیں یعنی کہ اب تم مجھ سے پیسے نکلاؤ گے.... میں نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا، جو تے ٹوٹ گئے تمہارے گاہکوں کے آگے پیچھے پھرنے سے، کپڑے پھٹ رہے ہیں اگر اس سب کے لیے کچھ رکھ لیا تو تم.....“

”اوہ جھوٹی....“ اس نے اپہر ان اسی کے منہ پر مارا۔ ”سہلا پیزا ہمیشہ تم کھاتی ہو اور آج بھی کھایا تھا۔“ شیشے کے دروازے پر ٹکڑوں کا سائن دیکھ کر دروازہ کھول کر سائن پلٹ کر جذب اندر داخل ہو گیا تھا ان دونوں کو بچوں کی طرح دھواں دھار لڑتا دیکھ کر کچھ دیر تو لطف اندوز ہوتا رہا پھر سینے پر لپٹے ہاتھ کھول کر پیٹ کی جیب میں ڈالتا ان کی جانب بڑھا۔ اسٹھ اسے دیکھ چکا تھا اس کے دیکھنے کو ہی محسوس کرتے میری ڈن نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے نجات کا ذریعہ ملا اس نے فوراً بات بدلی ”تم.... تم

”اسٹھ میں بہت تھک گئی، میں جا رہی ہوں، کل ملیں گے۔“ وہ اس کی ساری ادائیں دیکھ رہا تھا۔ لمبے میں اس کی کلائی پکڑ کر زور سے اپنی جانب کھینچی ”کدھر جا رہی ہو، ذرا یہاں بیٹھ کر حساب دو....“ کیسا حساب.....؟“ اس نے اتنے تعجب سے دیکھا تھا جیسے اس نے کوئی انوکھی بات کر دی ہو حالانکہ آج اسے ہٹ آتے ہی اندازہ ہو چکا تھا۔ اسٹھ خاصا برہم ہے۔ اسٹھ کے ڈاکٹر والد نے اس کے تعلیمی اخراجات مزید اٹھانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اگر وہ اسے اخراجات اٹھا سکتا ہے تو جتنا چاہے پڑے اور اگر نہیں تو مرضی ہے اسے زندہ رہنے کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں چلانا ہوں گے۔ وہ چند دن پریشان ہوا تھا۔ اچھی معمولی عیش کی زندگی میں مزوری خاصا مشکل لگ رہا تھا۔ جذب سے مشورہ کیا اس نے اپنی فیکٹری میں آنے کا کہا تھا۔ دوسرے دن ہی اس کی فیکٹری لیجر سے لڑائی ہوئی۔ تب میری ڈن نے مشورہ دیا تھا۔

”تم کسی کے انڈر کام نہیں کر سکتے، اپنا برنس کرو.....“ اس نے چند ماہ کا شیف کورس کیا اور میری ڈن سے اتنی سی مدد مانگی۔ ”تم صرف سرو کر دینا میٹرل لانا، بنانا، کاؤنٹر سنبھالنا میرا کام.....“ اس مدد پر وہ آدھے منافع کی شریک بنی گئی۔ اسٹھ کو قبول تھا۔ آدھے تک تو ٹھیک تھا مگر پورے کا پورا۔ اسٹھ اس کی جان لے لیتا۔ اپنا بجٹ خراب ہوتا دیکھ کر رات وہ بہت دیر تک لیٹ ٹاپ پر اپنا حساب لگاتا الجھتا رہا۔ صبح ہلکی پھلکی باز پرس کی، مگر وہ جلد ہی وہاں سے کھسک کر باہر نکلوا اور چیزیں ڈیٹ کرنے لگ گئی۔ وہ بچن میں جت گیا، مگر گاہے بگاہے آ کر اسکرین پر پھر سے نگاہ ڈالتا اسے پورا یقین تھا میری ڈن نے کڑبڑ کر رکھی ہے، کیوں کہ اس کی شکل اور حرکتیں چوروں سے مل رہی تھیں۔ اس کی استغابیہ پٹھنی آنکھوں میں اس نے اپنی آنکھیں گاڑھ کر کہا ”وہی حساب جو تم چوری سے خود لگا رہی ہو“ کیا.....؟ وہ بہت زور سے بولی ”تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو، میں نے کوئی

کیوں اندر آئے.... باہر کلونگ کا سائن نہیں دیکھا۔“

”دیکھا تھا.... اسی لیے اسے پلٹ کر اندر آیا ہوں... اس کے مسکرانے پر وہ چڑ گئی۔“

”اچھا.... تو تم ہمارے بزنس میں دخل اندازی کر رہے ہو۔“ فوراً اسے اسمتھ کی جانب مڑی۔ ”دیکھو اسمتھ یہ شخص خواہ مخواہ فری ہو رہا ہے.... یہ صرف تمہارا اور میرا بزنس ہے.... یہ کون....“ وہ بات کاٹ کر بولا تھا۔

”یہ کچھ ہوتا ہے یا نہیں.... بات مت بدلو پہلے پیسے نکالو....“

”یار تم لوگ کب تک بچوں کی طرح لڑتے رہو گے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بے مروتی کی انتہا کر دیتے ہو۔“

”چھوٹی چھوٹی باتیں....“ اسمتھ رد دینے کی حد تک زچ ہوتا قدرے آگے ہوا۔ ”ہر ویک اینڈ پر یہ میڈیم تیں، پینتیس گاہکوں کی پے منٹ کھا جاتی ہے.... تم اسے چھوٹی بات سمجھ رہے ہو اور پھر اگلے دن فضول شاپنگ کر کے مجھے مزید چڑانی ہے.... میں نے اپنی فیس دینے کے لیے یہ شاپ بنائی ہے، اس کی فضول خواہشوں کے لیے نہیں۔“

”ایک منٹ، ایک منٹ....“ میرڈین نے اسے درمیان میں روکا تھا۔ ”اگر میں پیسے رکھ کر جھوٹ بول رہی ہوں، تو تم بھی جھوٹے ہو، تم نے کہا تھا، تمہاری ہر چیز میری ہے، تم میری ہر خواہش پوری کرو گے....“ وماغ خراب تھا میرا....“ اسمتھ کی سیاہ رنگت غصے سے مزید سیاہ پڑ گئی البتہ میرڈین کی مکلی رنگت پر عنایت کے ذرا آثار نہیں تھے۔ کیوں کہ اسے یقین تھا ہمیشہ کی طرح اسمتھ اب بھی کچھ نہیں کہے گا، دو بیلیں اٹھا کر زمین میں مارے گا، پھر کہے گا نکل جاؤ، آئندہ شکل مت دکھانا اور پھر کل کال کر کے خود ہی پوچھے گا چورنی کہاں مر گئی ہو.... ابھی تک شاپ پر نہیں آئیں۔ ایسا ہی ہوا اس نے گلاس سلیب سے اٹھا کر زور سے پٹخا ”سب

بکواس کرتا ہوں میں.... زبان ہے ناں پلٹتی رہتی ہے.... دل سے نہیں کہتا جو یقین کر کے تھماتا شروع کر دیتی ہو.... نکلو یہاں سے....“ جنڈب نے اس کے شانے پر پھینک لگاتے محبت سے کہا تھا۔ ”میرا خیال ہے تم دونوں کو بیٹھ کر یہ فیصلہ کر لینا چاہیے، کون سی بات دل سے کر رہے، کون سی وماغ سے.... تاکہ مستقبل کے فیصلے تکلیف دہ نہ ہوں....“ آخری جملہ اس کی آواز میں بہت صہکن بھر گیا تھا۔ جنڈب جب سے پاکستان سے آیا تھا کچھ بدلا بدلا لگا تھا۔ نا تو پہلے کی طرح بہت جلا کٹا رہتا تھا نا ہی خوش باش عجیب سا سنجیدہ، سویر ہو گیا تھا، روانیہ کو خوش دیکھ کر وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا اسے خوشی ہے یا کسک البتہ اتنا ضرور تھا وہ اللہ سے لمبی دعاؤں میں اپنے لیے سکون اور اس کی خوشی مانگتا تھا۔ جب دل بے حد بے چین ہوتا بھی اسے فون کر لیتا یا اسمتھ اور میرڈین کے پاس چلا آتا۔ اس کی یہ حالت میرڈین اور اسمتھ سے چھپی نہیں تھی۔ وہ اس کے جذبات سے بہت اچھی طرح واقف تھے اور اسی لیے اسمتھ نے آج پھر میرڈین کو یہ کہہ کر معاف کیا۔

”تمہیں آج صرف جنڈب سے اپنی دوستی کی وجہ سے معاف کر رہا ہوں.... اگر آئندہ یہ حرکت کی، تو میں وارن کر رہا ہوں، پیزا میں چکن کی جگہ تمہارا گوشت ڈالوں گا۔“ وہ ڈھیوں کے سابقہ ریکارڈ توڑتے زور زور سے ہنسی ”اچھا.... پھر سوسیز کی جگہ اپنا خون بھی چھڑک دینا۔“

☆☆☆

عدن زندگی میں آ جانے سے جیسے سب کچھ بدل سا گیا تھا۔ شہر و زمانہ اسے خود سے لمحہ بھر کو بھی الگ نہیں کرتا تھا۔ اس کے ہونے کو چھو کر محسوس کرتا۔ کتنے دن تو وہ آفس نہیں گیا۔ اسے چھینک چکی آنے پر بھی اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ سبرینہ نے جتنی منت مرا دوں سے بیٹا لیا تھا اس کا خیال تھا شاید وہ اس کو پوجنے لگے گی، اس کے ہونے سے پہلے جتنی دہ چنی طور پر خطی سی ہو گئی تھی، لیکن اب اس کی پیدائش کے

کوٹھی اور نئی خریدی گئی جس فیکٹری عدن کے نام کر دی تھی۔ وہ اسی طرح کا تھا خوشی میں فراخ دلی سے کام لینے والا اور کچھ عرصہ پاکستان رہنے کے بعد اپنی تمام پمیلی کو لے کر دینی شفٹ ہو گیا۔ اسے پاکستان میں آئے روز دہشت گردی کی فضا سے خوف آنے لگا تھا اسے ڈر تھا کہیں عدن کو کچھ ہونہ جائے۔ سبرینہ کسی صورت پاکستان چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ دبا دبا احتجاج کیا مگر وہ شہر ہوتا تھا۔ اپنی منوانے والا۔ اس نے دینی میں سبرینہ کے نام سے فلیٹ خریدی تھا۔ یہ ایک تحفہ تھا عدن دینے کے بدلے میں۔

☆☆☆

بدرنگی دو پناسر پر ٹکائے وہ ہینڈ پمپ سے پانی بھرے جارہی تھی بالکی کب کی بھر چکی تھی لیکن اس کا دھیان پانی کی بھرنے پر نہیں پانی کے بننے پر تھا۔ جا بجا پھینا دو پنا مسلسل پلنے کی وجہ سے سر سے پچسل کر کندھوں سے نیچے سرک رہا تھا۔ کنارے کیے فرش پر لگنے سے بھاری ہوئے دو بے کو مزید نیچے کی جانب کھینچ رہے تھے۔ اس کی سر و آنکھوں میں ملال کا پانی سوکھ چکا تھا۔ کچھ فاصلے پر بیٹھی گلزاری کا گے بگا ہے زینب پر نگاہ ڈال دیتی۔ پھر بالکل ایسے انجان بن جاتی جیسے دیکھا ہی نہیں۔ مگر اس ایک نگاہ سے اس کا دل کیسے کٹ کر رہ جاتا تھا وہ صرف اس کی ممتا ہی جانتی تھی۔ اچھی بھلی اس کی تاریخ رکھی جا چکی تھی۔ اپنی حیثیت کے مطابق گلزاری نے تیاری بھی شروع کر دی۔ میر ذکا نے اسلم کو اچھے خاصے پیسے دیتے کہا تھا۔

”زینب کی شادی سے بتا چلنا چاہیے، ہماری ملازمہ کی شادی ہوئی ہے۔“ اسلم بہت خوش تھا اور شہر سے اس کے لیے فرنیچر اور کپڑوں کا بندوبست کیا تھا۔ آئرمہ بیگم کو جب خالہ گلزاری نے آ کر بتایا کہ اس چاند کی چودہ تاریخ طے کر دی۔ آئرمہ کو اچھا خاصا غصہ آیا تھا۔

”خالہ یہ کیا کیا.... ہماری اتنی پرانی ملازمہ ہے اور تاریخ تو نے اکیلے ہی طے کر دی.... پوچھا تو ہوتا۔“ ”بس بی بی موقع ہی نہیں ملا.... رنجی آگئی تھی

بعد سے خوش تو تھی اور نظر آنے کی بھرپور کوشش بھی کرتی تھی مگر شہر وز کمال کا حد سے زیادہ عدن کے لیے احتیاط پسندی چڑھی پیدا کرنے لگا تھا اور جس دن وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ چھوٹی سی چار سالہ دعا بھائی کو گود میں لیے بیٹھ گئی۔ جانے اسے کیا سوچھی اس سے باتیں کرتے کرتے اسے احتیاط سے بیڈ پر لٹایا اور بھانگی اپنے کمرے میں گئی ایک چاکلیٹ کا کپیرا تار کر ویسے ہی بھانگی ہوئی آئی ایک چھوٹا سا ٹکڑا عدن کے منہ میں ڈال دیا۔ ہنستا ہوا عدن ایک لخت گہرے سانس لینے لگا تھا۔ ٹائی ناٹ لگاتے شہر وز کے ہاتھ ہم گئے۔ پلٹ کر اسے اٹھایا۔ اس کے منہ سے چاکلیٹ نکالی۔ جب تک سبرینہ بھی کمرے میں آگئی تھی۔ شہر وز نے بے طرح سے دعا کو ڈپٹے ہوئے پٹخنے کے انداز میں بیڈ سے اٹھا کر نیچے کھڑا کیا تھا اور دھاڑ کر سبرینہ سے بولا۔

”اگر اللہ نے دے ہی دیا، تمہاری لاپرواہی اسے مار دے گی.....“ دعا کے رونے کی وجہ سے اسے غصہ تو بہت آ رہا تھا مگر برداشت کرتے ہوئے بولی تھی۔

”آپ کا لچ بکس تیار کرنے گئی تھی.... دعا بچی ہے، اسے کیا پتا کہ وہ چھوٹا ہے، چاکلیٹ نہیں کھا سکتا۔“ لیکن اب پتا چل گیا ہے نا.... تو دھیان رکھنا اور تمہیں کوئی بھی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور ملازمہ کا بندوبست کروں گا، مگر میرے بیٹے کا خیال رکھنا.... ورنہ.... اس نے نخوت سے دونوں کو دیکھتے چپایاں اٹھائیں اور باہر نکل گیا۔ وہ بے جان ہاتھوں سے عدن کو اٹھائے دعا کو روتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر اپنے پاس بیٹھا کر پیار سے سمجھایا تھا کہ آئرمہ ایسے نہ کرے۔

شہر وز کمال نے ایک ماہ کے عدن کا عقیقہ بہت زبردست طریقے سے کیا تھا۔ اپنے تمام جاننے والوں اور رشتہ داروں کو اس پر مدعو کیا۔ سبرینہ کے میکے سے سب آئے تھے سوائے چیمہ جو بیلی والوں کے۔ اپنی خوشی میں شہر وز نے یہ محسوس نہیں کیا تھا بلکہ اپنی قیمتی

تاریخ لے کر ہی اٹھی.....“ ٹھیک ہے، لیکن تاریخ بدلی بھی جاسکتی ہے..... تمہیں بتاؤ ہے اصل کی بیوی کا حال..... اسپتال جانا ہوگا، گھر میں کام بڑھ جائے گا..... میں تمہارے اور زینب کے علاوہ کسی پر اعتبار کر ہی نہیں سکتی..... دس پندرہ دن تک منہر جاؤ اس کام سے فارغ ہو جائیں پھر تم رکھتی رہنا تاریخ.....“ جہاں خالہ گلزاری کا منہ بن گیا تھا وہاں زینب صفائی کرتے کرتے مسکرانے لگی۔

”دس پندرہ دن بعد تو چاند اترنے لگے گا۔“ رجبی نے تو پورا چاند مانگا تھا۔

”اپنا پورا چاند دیکھا ہے، اس نے“ گلزاری کے منمنانے پر آئندہ بڑبڑائی۔ ”اور اترتے چاند سے نصیب تھوڑا اتر جاتے ہیں..... خیر اگلے مہینے کا پورا چاند رکھ لیتا..... دو چار دنوں میں مجھے اسپتال جانا ہوگا..... تم زینب کی چھٹی مانگ رہی ہو.....“

آئندہ حکم یہ کہہ کر سامنے سے ہٹ نکلیں چارو ناچار اسے زینب کی تاریخ ایک مہینہ بعد کی رکھنی پڑی۔ ڈھول بینڈ باجا اپنی حیثیت کے مطابق رجبی نے ہر طرح سے ادا رات سجا لی۔ جب تک نکاح نامے پر اپنا نام نہیں لکھا تھا زینب کا چہرہ بے تاثر سرد سا تھا، کوئی امنگ، کوئی جذبہ آنکھوں میں نہیں جھلکا، لیکن قمر الدین کے نام کا سرخ گوٹے کناری سے سجا لباس بدن کو ڈھانچتے ہی اک تحفظ میں لپیٹ گیا۔

لب اسٹک زدہ سرخ مونٹ آہستہ آہستہ پھلنے لگے۔ دل کی تیز ہوتی دھڑکن آہستہ آہستہ خون کو گرمائی اس کے سانوے پن کو مزید دھکانے لگی۔ وہ ماں باپ کے آنسوؤں میں رخصت ہو کر قمر الدین کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ پتلا لمبا تڑکا قمر الدین موتیا رنگ کی قمیص، سفید شلوار پہنے زینب کے سامنے بیٹھا مسلسل اسے تند نگاہ سے گھور رہا تھا۔ سرخ پاؤں سے ڈھکے زینب کے پونے جھکے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں کی تیری اس کے وجود میں غمی بھر رہی تھی۔ وہ چبا چبا کر کڑکھلی سے بولنے لگا تھا۔

”بڑا غرور تھا تجھے اپنے کالے نین نقش پر

..... بڑا چلا چلا کر بولتی تھی، آج تیری زبان کہاں گئی۔“ اس نے کالی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا قمر الدین کی آنکھوں میں کدھر بھرا تھا۔ اس کا لب و لہجہ بدلنے پر وہ حیران ہی اوردہ مسلسل حنا اٹھا رہا تھا۔

”مجھے چہرے پر لگے داغ سے تجھے بڑی گھن آتی تھی.....“ میکھوں کا چھتا کہہ رہی تھی ناس دن تو.....“ زینب کی آنکھوں میں خوف تیرے لگا۔ ”ایمان سے میرا دل کر رہا ہے، تجھے ایک داغ لگا کر، داغوں داغ کر دوں..... لیکن مجھے حرام کاری کرتے اللہ سے بڑا ڈر لگتا ہے..... چل آج کی رات معاف کیا، طلاق پھر سہی.....“ طلاق کا سنتے ہی زینب کی پوری آنکھیں پھیلیں، سانس رک گئیں۔ سرخ سنہری چوڑیوں سے بھری کلاں ایک لخت انھیں مہندی سے بھرے ہاتھ اس کے سامنے جڑ گئے۔

”خدا کے واسطے قمر الدین..... یہ تو کیا کہہ رہا ہے.....“ وہ کہہ نہیں رہا..... طلاق کا سوچ رہا ہوں.....“ زینب کا سر نفی میں ہل رہا تھا۔ آنکھوں کا پانی کا جل کو بہا کر رخساروں کا میک اپ دھونے لگا۔

”تو ایسا نہیں کر سکتا..... تو مجھے طلاق نہیں دے سکتا.....“ اس کی بے بسی پردہ خیانت بھرا تہیہ لگا کر پنڈلی سے شلوار کا پانچہ اوپر کیے اپنی ٹانگ کھجانے لگا

”واہ، واہ، واہ.....“ ہو گئی ناسیدھی..... بڑا میرے داغ کا مذاق اڑاتی تھی، میرا داغ تو صرف نظر آتا ہے، جو تجھے لگاؤں گا نا وہ بولے گا بھی، تجھے سنائی بھی دے گا۔“ اور پھر اس نے یہی کہا تھا۔ علی الصباح جس وقت زینب نہاد ہو کر رجبی کے ساتھ دوبارہ سے کمرے میں آئی۔ اس کے سر ہانے ایک طلاق نامہ رکھا تھا۔ رجبی کی تو جھٹکھاڑنگی سونگلی تھی زینب کا کھڑے کھڑے سر چکر گیا تھا۔ کیلے بالوں سے چپکا دو ہڈیاں لخت پھسل کر نیچے گرا۔ زدہ تو رمدہ کی خوشبو سے مہکتے کچے درد دیوار مھسان سے بھر گئے۔ لڑائی جھگڑا، مار پٹائی سب ہو رہا تھا۔ گلزاری

جب گلزاری نے لگاؤ سے کہا تھا۔

”حویلی چکر لگاتی.... اذلان صاحب کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں.... خاص طور پر بڑی بی بی نے مجھے بلایا ہے۔“ اذلان کا نام لیتے ہی اسے بدن میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ غصے سے بولی تھی ”تو کہہ دے بی بی سے زینب اندھی ہو گئی ہے.... اس سے کام نہیں ہوتا.....“ گلزاری نے نخوت سے اسے ”دفع دور“ کہتے پنجر دکھایا.... وہ گردن جھڑک کر معمول کے کاموں میں لگ گئی۔

☆☆☆

وقت کے ساتھ شہر دزد کمال کے مزاج میں اچھی خاصی تبدیلی آ گئی تھی۔ عدن نے جب چلنا ہی شروع کیا تھا تب شہر دزد نے اپنی فیملی مستقل دینی میں شفٹ کر لی تھی۔ کاروبار آہستہ آہستہ منتقل کر رہا تھا۔ کاروباری سلسلے میں پندرہ بیس دن بعد پاکستان اک چکر لگاتا باقی چیزیں بیجنٹ دیکھ سکتی۔ مزاج بدلنے سے انداز میں بھی فرق آیا۔ اب سبرینہ اور بچپوں پر بے جا سختی نہیں برتا تھا۔ سبرینہ کے ساتھ جس چیز کے طعنے جڑے تھے وہ عدن نے سب دھو دیے تھے۔ ناصرف دیکھنے میں اس پر پیارا تا حریف بھی اس کی بہت معصوم سی خیمیں یا شاید شہر دزد نے پہلی بار کسی بچے کی حرکتیں اتنی قریب سے دیکھی تھیں۔ بچیوں نے کب چلنا شروع کیا، کب دانت نکلے، بولنے، کھانے پینے لگیں کسی چیز سے نہ دلچسپی تھی نہ یاد تھا۔ البتہ عدن کی ایک ایک حرکت نظر میں ہوتی تھی۔ اس کے والہانہ پن پر بھی اگر سبرینہ کہہ دیتی۔

”بچپوں اور عدن میں تمہارے سلوک کا واضح فرق، بچپوں کے دلوں میں عدن کے لیے فرق ڈال دے گا.....“

”مجھے تو محسوس ہوتا ہے، تمہارے دل میں بھی فرق آ جاتا ہے.....“ کارپٹ پر بیٹھے ڈرائنگ بناتے عدن کو گود میں بٹھاتے ہوئے شہر دزد نے سبرینہ پر طنز کیا۔ وہ ہیکہ سا مسکرائی ”متا کو پیچ مت کیا کرو.....“ شہر دزد نے بہت زور کا تہقہہ لگایا تھا۔ عدن کے رگڑی چھوٹے چھوٹے کٹے

اور اسلم نے مل کر رچی اور اس کے میاں کی بے عزتی کرتے ہاتھ پائی تک اتر آئے۔ قمر الدین جانے کون سے کھیتوں میں جا چھا تھا اگر سامنے ہوتا تو یقیناً ”سب اس کی بوٹی بوٹی کر دیتے.... سہاگ کی خوشبو کو چھو کر اڑی بیٹی کو جس دل سے گھولائے وہ ان کے روتے چہروں سے دکھائی دے رہا تھا۔ بہت سے مناظر آنکھوں میں آتے زینب کو اپنی بے بسی پر رونا آیا۔ اگر اس وقت حبل ذکا یہاں ہوتا وہ قمر الدین کا بھرکس نکال دیتا جیسے اس کی ملازمہ کی اس نے بے حرمتی کی تھی، مگر وہ ہوتا تب ناں.... مہینہ پہلے ہی وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ چکا تھا۔

پانی بائیں کے کناروں سے اٹھا جا رہا تھا اور وہ کسی روپوش کی طرح ہینڈ پمپ چلائے جا رہی تھی۔ حارساں سے زیادہ عرصہ بیت چکا تھا اسے کم مہم ہوئے آنریمیکم نے کئی بار اسے حویلی بلایا کہ کام پر آئے، صرف ایک بار گئی تھی اور جاتے ہی اس کا دل لٹنے لگا۔

”یہاں سے مجھے ارمائوں کی، خون کی بو آتی ہے.... میرے سے کام نہیں ہوتا۔“ پھر وہ مرکز نہیں گئی تھی۔ اس کی گوگو کیفیت پر کوئی کہتا اس پر آسب ہے یا کسی نے جادو کر دیا ہے۔ البتہ گلزاری کا داغ بھی کہتا تھا۔ اس کی شادی ہو جائے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ نذیر (میر ذکا کا مزارعہ) کے بیٹے اصغر کا زینب کے لیے رشتہ آیا ہوا تھا، مگر وہ خاموش تھی۔ اسے اب شادی نہیں کرنا تھی۔ گلزاری جلتی جلتی اکثر رقیہ سے کہتی ”دیکھ لے پورے چاند بھی داغ لگ گیا ناں۔“ پاس سے گزرتے گزرتے خاموش زینب نے آنکھیں سے کہا تھا۔

”داغ تو لگتا ہی پورے چاند کو ہے، کبھی پہلی کے چاند کو مگر بن سنا تو نے.....“ اس طرح کی بات کر کے پھر کتنے دن چپ رہتی تھی۔ بہت دیر پانی بہتا دیکھ کر گلزاری ڈپٹ کر بولی۔

”اے بس کر جا، بھگڑی بائی.... اٹھا کر غسل خانے میں رکھ آ.... تیرا ابا آتا ہوگا.... نہالے گا۔“ بائیں غسل خانے میں رکھ کر وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی

بالوں پر بوسا لیتے سبرینہ کو مطلع کرتے ہوئے کہا تھا۔
 ”میں نکل اپنے بیٹے کا ایڈمیشن کروانے جا رہا ہوں، دینی کے سب سے بڑے اسکول۔“ ابھی جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ چھلانگ مار کر باپ کی گود سے اترا بائیں پھیلاتا ہوا سبرینہ سے جا ملتا تھا۔
 ”میں ماما کے ساتھ جاؤں گا، جیسے آپیاں جاتی ہیں۔“ وہ استہزائیہ مسکراتے ہوئے شہروز کو دیکھ رہی تھی۔ عدین کی ننھے بازوؤں میں محبت اور تحفظ کی اتنی گرمائش تھی لیجے میں وہ خود کو دنیا کی سب سے محفوظ عورت سمجھنے لگتی تھی۔ شہروز جس قدر عدین پر محبت لٹاتا تھا اس سے کئی گنا زیادہ عدین سبرینہ اور بہنو سے کرتا تھا۔ شہروز کے ساتھ لیٹے لیٹے ایک نخت چھلانگ مار کر اتر جاتا۔

”مجھے آپوں کے ساتھ سونا ہے جبہ آپنی کی گود میں بیٹھنا ہے، عشا آپنی سے کھانا کھانا ہے، سوہا آپنی کے ساتھ کھیلنا ہے۔“ دعا میں تو اس کی جان تھی اپنا ہر آنے والا نیا کھلونا سب سے پہلے اسے دکھاتا تھا۔ یہ بھی ایک بہت بڑی وجہ تھی کہ شہروز کے دل میں بیٹیاں بھی کچھ قریب ہونے لگی تھیں۔ عدین کی ضد پر اس کا ایڈمیشن دعا کے ساتھ کروایا تھا۔ شہروز بہت خوش تھا۔ بدل تو وہ بہت گیا تھا، مگر اسے ایک خاص رنگین زندگی کی بری طرح لت پڑی ہوئی تھی اور رنگین عادتیں آسانی سے بدلی نہیں جاتیں، نفس کو باندھ کر دھکیلتے ہوئے واپس لانا پڑتا ہے، بہت بدل جانے کے باوجود شہروز کمال کو نفس پر اتنا کمال نہیں ہوا تھا کہ اسے جکڑ کر دھکیل سکتا۔ ہاں اگر عدین جوان ہوتا اور اسے روکتا تو یقیناً اس کی محبت میں وہ اپنے نفس کو چل بھی دیتا۔ جتنی وہ عدین سے محبت کرتا تھا اور عدین اس کی محبت کو محسوس بھی کرتا تھا، لیکن چار سالہ عدین اس کی باتوں کو کیا سمجھتا۔ شہروز کمال ڈریسنگ ٹیبل کے آگے تقریباً ”میں منٹ سے کھڑا تیار ہو رہا تھا۔ بیڈ پر بیٹھا عدین ہاتھوں کو جوڑ کر پیالہ بنائے چہرہ اس پیالے میں سجا کر پوری محویت سے شہروز کو دیکھ رہا تھا

”کیا دیکھ رہے ہو، میری جان.....“ اس نے آئینے میں ہی اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ مسکرا دیا۔ آپ اتنا تیار ہو کر کہاں جا رہے ہیں..... مجھے بھی جانا ہے۔“

”ہونہہ.....“ خود پر اسپرے چھڑک کر بند کر کے رکھا پیار سے عدین کے ریشمی بال بکھرتے ہوئے کہا تھا ”ابھی تم بہت چھوٹے ہو.....“ تب ہی سبرینہ کمرے میں آئی تھی۔ شہروز کی تیاری پر چونکی نہیں۔ اسے بہت اچھی طرح پتا تھا شام کے اس پہر اس کی خاص تیاری کہاں کی ہو سکتی ہے، سبرینہ کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ وہ بھی ہمتوں گھر سے باہر رہا کرتا تھا اور جو چند دن گھر میں گزارنا ذلیل کر کے رکھ دیتا تھا۔ وہ سب ختم ہو گیا تھا، اگر مہینے دو کے بعد اس کی فطرت ابلدی ہے تو ٹھیک ہے، ہر روز کی ذلت سے یہ بھی کبھی کی تکلیف بہتر تھی۔

”جب میں بڑا ہوں گا، میں بھی آپ کو نہیں لے کر جاؤں گا.....“ اس کے نرودھے پن پر سبرینہ جتا ہے ہوئے بولی تھی۔

”سن لیا یہ کیا کہہ رہا ہے.....“ شہروز کمال نے قہقہہ لگاتے چایاں اور موبائل جیب میں رکھے۔ ”بیٹا کس کا ہے آخر.....“ قافرخ سے اسے دیکھتا ”او کے پار..... نہ لے کر جانا.....“ وہ باہر نکل گیا تھا سبرینہ کی نگاہیں اس کی پشت کے ساتھ ساتھ گئی تھیں۔

”بیٹا ہونے سے تو شاید فرق پڑے یا نہ پڑے..... تم ماحول کیا دے رہے ہو اسے.....“ وہ اٹھ کر عدین کے پاس بیٹھ گئی اسے رساں سے سمجھا رہی تھی۔ ”اچھے مرد تیار ہو کر، اکیلے تھوڑا باہر جاتے ہیں..... فیملی کے ساتھ جاتے ہیں۔“

”ڈیڈی اچھے نہیں ہیں.....؟“ اس کے سوال پر وہ گڑ بڑا گئی تھی۔

”نہیں نہیں میری جان، وہ تو ایک آفس میٹنگ کے لیے گئے ہیں..... تفریحی کے لیے تھوڑا گئے..... چلو اٹھو..... ہوم ورک کمپلٹ کرو..... میں دعا وغیرہ کو دیکھتی ہوں۔“ وہ کہہ کر باہر چلی گئی۔ وہ بیڈ پر لیٹا

باپ کے تیار ہو کر جانے کو کس کرتا رہا۔

☆☆☆

مشہور ترین شاہراہ پر ایک بڑے سے گول ستون نما عمارت کھڑی تھی۔ جس کی بیرونی سطح پر لگے آسانی شیشوں سے رملین لیزر لائٹس پھوٹ رہی تھیں۔ وہ دہی کا مشہور میوزک کلب ”بیت ایش“ تھا۔ ڈانس فلور سے کچھ فاصلے پر شہر و کمال اپنی ریزرو سیٹ پر بیٹھا دسکی کے پیگ کے پیگ چڑھا رہا تھا۔ اس کی نظر ہزاروں بار انڈس پر گئی۔ وائٹن گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے ایک بیچ ٹیبل کی سطح پر مارا تھا۔ مینے میں ایک آدھ بار وہ اس میوزیکل ٹائٹ کلب میں اپنی ماڈل گرل فرینڈ سے ملنے آتا تھا کچھ وقت اس کے ساتھ گزار کر اپنے اندر کے شیطان کو تسکین پہنچاتا۔ آج مقررہ وقت سے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ وہ جھٹی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا اتنی ہی بار اس کے سیل پر کال ملتا رہا، مگر ہر بار لائن آف ل رہی تھی جس سے شہر و کا غصہ بتدریج اوپر جا رہا تھا۔ جیکتے کلب کی بھڑتی لڑکیاں ڈانس فلور پر اپنے جوڑے بنائے محو رقص تھیں۔ درمیان میں لگے مختلف بار اسٹینڈز پر لڑکے لڑکیاں کھڑے حسب خواہش لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہاں صرف شہر و کمال ہی ایسا جیسے اس وقت ہر چیز زہر کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے لیے ایک اور پیگ تیار کیا۔ دو گھنٹہ ہی لیے تھے جب وہ کسی اور لڑکے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے بہت بے باکی سے چپتے ہوئے گلاس ڈور سے اندر داخل ہوئی۔ شہر و کمال نشے میں دھت تھا اسے دیکھتے ہی گلاس ٹیبل پر بیٹھے جنونی انداز میں اٹھا تھا۔

”ہاؤ ڈیر یو“ (تمہاری جرات کیسے ہوئی) شہر و نے آگے بڑھ کر اس لڑکی کے منہ پر بہت زور سے طمانچہ مارا۔ ایک دم تو وہ ہٹپٹا گئی تھی۔ جب کہ اس کے ساتھی نے ناک بھنوں میں چڑھاتے ہوئے شہر و کو کالر سے پکڑ کر گالیاں دینی شروع کر دیں۔ اس کے شور سے تمام ہال میں یک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ صرف

ان دونوں کی آوازیں سنائی دی جارہی تھیں۔ اکثر لڑکیاں سہم کر لڑکوں کے پیچھے چھینے لگیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے گریبان پکڑے مغلظات بکتے لگے۔ شہر و جھٹ جھٹ اس ماڈل پر جا رہا تھا۔ اس کا اس سے مجاہدہ تھا وہ کسی کے ساتھ بنا پوچھے شراکت نہیں کر سکتی تھی۔ شہر و کمال تو ایسے معاملے میں انتہائی تک پہنچ جاتا تھا۔ اس نے گالیوں کے ساتھ اس لڑکے پر گھونسلوں کی بارش شروع کر دی اسے گریبان سے پکڑ کر اتنی زور سے بار اسٹینڈ پر پھینکا کہ بہت سے مشروب اور گلاس چھنکے سے گرے۔ اس لڑکے نے لڑکھڑا کر سنبھلتے ہوئے تندرنگانہ شہر و پر جمائیں۔ اس کی جیکٹ میں پھسل گئی۔ اس نے جڑے جماتے ہوئے آن واحد میں پھسل نکالا اور شہر و پر فار کھول دیا۔ ٹھاٹھا، ٹھاٹھا.... کلب میں شہر و کمال کا خون اور سناٹا تھا۔ سڑک پر ایک ایسبولینس تیز بھاگتی اسپتال کی جانب بڑھ رہی تھی۔ شہر و کمال کا خون آلود جسم اسپتال لے جا جا رہا تھا۔ پولیس نے اس کے گھر اطلاع دے دی تھی۔ سبرینہ اور شہر و کمال کی بڑی بیٹی حبیبہ جو تقریباً سولہ سالہ ایک نوجوان لڑکی تھی اپنے باپ کو زخمی حالت میں دیکھ کر چیختے چلائی گئی۔

”ڈاکٹر پلیز میرے ڈیڈی کو بچالیں.... پلیز.... آپ میرا سارا خون لگا دیں، مگر میرے ڈیڈی کو بچالیں.... پلیز.... میرے ڈیڈی....“ بھاتے اسٹریچر کے ساتھ ساتھ روتی بکلتی حبیبہ کو سنبھالنا بے حد مشکل ہو رہا تھا۔ شہر و کی سانس اکھڑ رہی تھیں۔ اسے پہلی بار زندگی میں اپنی بیٹی پر بے طرح ترس اور پیار آیا تھا۔ وہ روتی ہوئی حبیبہ کو اپنے سینے میں دیو بچ کر شفقت بھرا بوسہ دینا چاہتا تھا، مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی اسے تسلی کا ایک لفظ کہہ سکے بہت ہمت مجتمع کر کے اسے ہاتھ سے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس کا ہاتھ بمشکل اوپر ہوا۔ حبیبہ کی آوازیں اس کے کانوں میں مدھم سے مدھم تر ہونے لگیں۔ شہر و کی انگلیاں بلیں ہی تھیں کہ گردن لڑھک کر پتلیاں اوپر کو اٹھ گئیں۔ جب بے طرح تڑپتے ہوئے چلا رہی

بات بدلی..... ”اور مجھے تو فکر ہو رہی تھی ادھر اذلان کی تاریخ طے ہے ، اور تم پتا نہیں آؤ گی یا ویرلو کی تاریخ پڑھو لو گی۔“

”ایسے ہی نہ آتی اکلوتا بھانجا ہے میرا۔“ وہ بہت رسائیت سے بولی تھی جب کمرے سے نکل کر آتے اذلان پر نگاہ اسی کی کابایاں ہاتھ دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے اس کی نگاہ میں تاسف ابھرا۔

”میں نے اذلان کے لیے بہت دعا کی تھی آبی..... اللہ اس کے دائیں ہاتھ میں اتنی طاقت ڈال دے کہ کام کرتے اسے کوئی دقت پیش نہ آئے۔“ اذلان کے چہرے پر طرے لیے اپنا بایاں ہاتھ کھول کر پھر زور سے کبھی بند کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے کوئی دقت پیش نہیں آتی..... آپ سب

خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں.....“ آئمہ کے چہرے پر بھی تکلیف ابھر کر معدوم ہوئی۔ آج سے دو سال پہلے وہ چاولوں کی مل میں تھا۔ چھٹائی ہوئے چاولوں کو پالش کے لیے مشین سے گزرا جا رہا تھا۔ وہ مشین کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ جب اچانک بجلی چلی گئی۔

بجلی کا دیر رینک جانا اس قدر معمول تھا بعض اوقات تو فوراً ”مشین بند کرنا بھی بھول جاتے تھے۔ اس وقت بھی مشین آن ہی اذلان نے بڑے سے گرا بنڈر نما مشین کے پٹے (بیلٹ) کو غور سے دیکھا وہ تقریباً ”ٹوٹنے کو تھا۔ تب وہ اس کا جوڑ چیک کرتے ہوئے

ملازم کو سمجھا رہا تھا اگر یہ چلتے ہوئے ٹوٹ گیا تو مشین میں ڈالے گئے کتنے چاولوں کا نقصان ہو سکتا ہے ، ان کی پالش اور خوب صورت کٹائی لمحے میں ہی بے

ترتیب ہو کر خسارے کا سبب بنے گی۔ اس نے سیاہ بیلٹ کو دو تین جگہ سے جانچا تب اچانک ہی لائٹ آنے سے مشین چل پڑی۔ اذلان کے ہائیں ہاتھ کی پہلی دو انگلیاں اور اٹوٹھے کی اوپر کی پورے طرح

بیلٹ سے ٹکرا کر جسم سے ایسے الگ ہوئی جیسے اضافی ناخن کٹ کر گرا ہو ، حتیٰ نیکار اور خون اس میں سب کچھ ہوا۔ بہترین علاج بھی کروایا گیا مگر جو حصہ الگ ہو گیا سو ہو گیا۔ یہ بھی اللہ کا کرم تھا باز دور ہاتھ بچا

تھی۔

”ڈیڈی، ڈیڈی.....“ اس کا مردہ وجود بیٹی کے بٹن سے جچ گیا تھا۔ سر نہ کسی پتھر کی طرح گڑی اس کا داپس آتا اس پرچہ دیکھ رہی تھی۔

”کیسا شخص تھا یہ، جو مجھے سمجھ ہی نہ سکا، اس کی خاطر کیا، کیا نہیں کیا، کیا کیا نہیں چھوڑا اور وہ میری خاطر نشہ نہ چھوڑ سکا..... دنیا چھوڑ دی، اولاد چھوڑ دی..... وہ کاروبار جس کے لیے خاندان سے لڑتا پھرتا تھا وہ بیٹا جس کی خاطر دنیا ہلا رہی تھی اسے چھوڑ گیا، صرف ایک نشہ نہ چھوڑ سکا..... پتھر آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ جب کے بالوں میں گرتے رہے۔

☆☆☆

سر کو بہت اچھے سے ڈھانے وہ درمیان میں بیٹی تھی دوسری جانب آئمہ بیگم۔ سلوئی چند دن پہلے ہی عمرہ کر کے آئی تھی تو آئمہ نے اس کی دعوت کر دی شادی کے بعد سلوئی کا یہ چوتھا عمرہ تھا۔ عمرہ کرنے کے بعد بہت دنوں تک اس پر وجد کی کیفیت طاری رہتی پھر آہستہ آہستہ زندگی کے معمول میں مگن ہو کر سب کچھ ردئین پر آ جاتا۔ جب بھی وہ اپنے میاں کے ساتھ عمرہ کر کے آتی سب کی زبانیں اس کی قسمت پر رشک کرتیں ”اللہ ہر سال اپنے گھر بلاتا ہے ، اس سے بڑی بات کیا ہوگی..... جی بھی نیک

ہے ، اللہ اپنا مہمان پسندیدہ بندوں کو ہی بناتا ہے.....“ تو کر تو اکثر یہی باتیں کرتے پائے جاتے اب بھی وہ پوری رغبت سے یکہ مدینہ کے دس بار

سناٹے فیسے پھر یہ وہرا رہی تھی۔ تب آئمہ نے آہستگی سے تنبیہ کی ”جی“ ہر کسی کو مت سنانے لگ جایا کرو..... نظر لگ جاتی ہے..... آگے ہی جانے کس کی نظر لگی ہوئی ہے ، ابھی تک اولاد نہیں

ہوئی.....“ ”اوہو! آپ پریشان مت ہوں ہو جائے گی.....“ اس نے مسکرا کر ٹالا..... ”اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے..... اب اگر بچے ہوتے تو ایسے ہر سال اللہ کے ہاں حاضری ہوتی بھلا.....“ بچے پالنا بھی حج سے کم نہیں ہے.....“ آئمہ نے

میرے گھر تک لے آئے۔ وہ غوث سے اسے گھورتی جھٹکتے سے ابھی۔ جنڈب نے اسے روکنا چاہا۔
 ”بھئی کچھ آرام سے سن بھی لیا کرو.... پانچ سال ہونے والے ہیں اس نے دوسری شادی نہیں کی، چھپیں ڈیوارس نہیں دی.... آخر کوئی تو وجہ ہوگی.... سمجھو، سنو تو سہی....“ وہ دانت جما کر بولی تھی۔
 ”شادی تو تم نے بھی نہیں کی.... اس کی کیا وجہ ہے.... ہاں....“ وہ گیٹ سے اندر داخل ہو کر ان ہی کی جانب قدم اٹھا رہا تھا۔ روانیہ جان کر اونچا بولی تاکہ وہ سن لے۔

”روانیہ وہ انسان ہے، فرشتہ نہیں۔ غلطی نہ ہو۔“ جنڈب آج اس کا وکیل بنا روانیہ کو اپنا دشمن لگ رہا تھا۔

”اچھا.... وہ استہزائیہ میں ہنسی ”میرا خیال ہے عمل کے لیے عقل صرف انسانوں کو ہی دی گئی، فرشتوں کو صرف حکم ہوتا ہے۔ عقل نہیں.... تم اس سے کہو یہ چلا جائے.... نہیں تو جنڈب میں کچھ بہت غلط کر دوں گی۔“ وہ بہت آہستہ قدموں سے ان کی جانب آ رہا تھا۔ جنڈب کرسی سے ٹیک لگائے بہت ٹھنڈے انداز میں بیٹھا رہا۔

”صرف ایک بار اس کی پوری بات سن لو۔ اعتبار کرو یا ر.... پھر جو چاہے فیصلہ کرنا۔“

”اعتبار....“ اسے یہ لفظ بے حد مضحکہ خیز لگا تھا۔ کس کا اعتبار، ان لفظوں کا جو اس نے کہے.... جن پر ناخن، چھریاں، بلیڈ کچھ بھی نہ رکھے تھے اور میں پھر بھی زخمی ہوگئی.... ان زخموں کو دھوتے دھوتے میں خود بہہ گئی.... لیکن وہ بھرے ہی نہیں.... ان کا اعتبار کروں۔“ وہ کچھ فاصلے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ بے بس اک ہارے ہوئے جواری کی مانند ”جو لفظ مجھے لباس کہتے تھے، چوٹی کی آہٹ، باد نسیم.... ہونہ پھر میں برہنہ کیسے ہوتی.... آہٹ دھاڑ میں کیسے بدلی، اس باد نسیم نے مجھے جھلبلا دیا تھا۔ جنڈب!“ اس نے جنڈب کو مخاطب کرتے ہوئے اس سے ہٹ کر گاہ اٹھائی وہ بیٹھ کر

اچکائے اس کے غصے سے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ان گرے آنکھوں میں آج بلا کا اعتماد تھا۔ جو کبھی کا نپتی پٹکوں میں بھولین ٹکائی تھیں اس وقت قطبیت سے بھری تھیں۔ جھکیے جھری گری آنکھیں، تھکی بھوری آنکھوں نے جی تھیں روانیہ دانت جما کر بہت ٹھوس انداز میں بولی۔

”آسمان اور زمین کا اگر فاصلہ یاد ہے، تو سنو.... مجھے اس فاصلے سے کئی گنا زیادہ تم سے نفرت ہے۔“ نفرت لفظ کہتے اس کی آواز میں یک دم کمی ابھری تھی۔ تمہارے وجود سے، تمہارے سائے سے.... یہ تمہارے باپ کی حویلی نہیں ہے، اور نا ہی میرے باپ کی نام نہاد جائیداد.... جہاں تم جیسے لوگوں کی حکومت ہو.... یہ میرا ذالی گھر ہے.... اور یہاں سے ابھی، اسی وقت نکل جاؤ.... سمجھے....“ اس کا اٹل لہجہ اس کے لیے حیرانگی کا سبب نہیں بنا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ اس کا مستحق تھا یا شاید اس سے بھی زیادہ.... مگر اسے اپنی ایک بات اسے سنانا تھی اور ہر صورت سنانا تھی ”روانیہ، میں تم سے معافی مانگتے نہیں آیا۔“

”میرا نام اپنی زبان سے مت لو....“ وہ ذرا سا چونکا رد کی لہر ابھری اور فوراً بولا۔

”نہیں لیتا.... شاید اب مجھے یہ حق نہیں ہے، یا میں اس قابل نہیں رہا، میں یہاں سے چلا جاؤں گا.... میری فلائٹ نزدیک ہے۔ پھر بھی جی اپنی قابل نفرت صورت نہیں دیکھاؤں گا.... مگر پلیز میری ایک بات، صرف ایک بات سن لو۔“ سینے پر ہاتھ لپیٹے دوسری جانب دیکھتے ہوئے اس نے معمولی سی گردن پھیر کر اسے ایسے دیکھا۔

”ہونہ ایک بات.... اب برسوں بعد کیا سنانے آ گیا.... اور جب میں منٹیں کر رہی تھی جنبل جنبل میری بات سنو.... تب.... تب وہ صرف کروفر سے دھارتا رہا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا جب وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اور چکاڑ کی صورت لفظ نکلے تھے۔“ کیا ہے یہ؟“ وہ اس کے لہجے سے سہم گئی تھی

تھی بمشکل کہہ پائی۔
 ”بیٹی... بیٹی ہے۔“ بیٹی..... اس لفظ کا مطلب جانتی ہوں...“ وہ تعجب سے کہتا اسے کھانے کو دوڑا۔

☆☆☆

جیسے جیسے سفر سٹ رہا تھا ویسے ویسے روائیہ کی یاد اٹھ کر آ رہی تھی۔ ان نو دس ماہ میں اس کی یاد اس شدت سے نہیں آئی تھی جتنا یہ چند گھنٹوں کا فاصلہ طے کرنا مشکل بنا تھا اور اس سفر کے دوران جیل ڈکا پر واضح ہو چکا تھا وہ واقعی روائیہ سے حد درجہ محبت کرنے لگا ہے، وہ اس کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتا، اس کے مسکراتے چمکتے رخسار، گرے آنکھوں کا بھولین فضا میں اس کے ساتھ اڑ رہا تھا۔ اس کے پاکستان آنے سے لے کر اب تک کی جتنی باتیں تھیں سب باری باری سماعتوں میں گونجنے لگیں۔ اور خاص طور پر ان چند ماہ کی جب وہ خواہ مخواہ کا جس پھیلائے کے لیے فون پر اوٹ پنا ٹنگ باتیں کرتی تھی۔

”آسٹریلیا، آسٹریلیا والے اور وہ پاکستانی جو مجھے بھول کر جرمنی جا کر بیٹھ گیا.....“ سوچتے ہوئے جنبل کے لبوں پر مسکراہٹ آئی ”میرے پاس بھی ایک سرپرائز ہے، آؤ گے تو بتاؤں گی“ خوش کن خیال سے اس کی آنکھیں خود بخود موند گئیں اور سرسٹ بیک پر ٹکالیا۔ اس وقت وہ کسی مسافر کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا صرف اور صرف روائیہ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ ”میرا اس سے جھگڑا ہو گیا تھا۔“ اس کی آواز گونجی۔ جنبل نے ذرا کی ذرا پلٹیں اٹھا کر جہاز کی چھت کو دیکھا پھر آنکھیں موند لیں۔ ”جنبل میں بہت تنہا ٹیل کر رہی ہوں، کب آؤ گے.... جنبل اگر کوئی اپنی غلطی کی معافی مانگے، کیا اسے معاف کر دینا چاہیے۔“ گہرے گہرے تیرتے سانسوں کے درمیان وہ اپنی روائیہ کو سمجھ رہا تھا ”تم یہی کہو گے، پہلے کیوں نہیں بتایا، اب بتا رہی ہو.... غصے کے سوا تمہیں آتا ہی کیا ہے....“ اس کے

خوب صورت چہرے پر پراسرار پھیلی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ دوسرے آلات کی طرح یادیں ناچنے کا بھی اگر آلہ ہوتا، پھر میں بتائی کون، کب کتنا یاد آتا ہے۔“ محبت میں اس کی ڈوبی آواز جنبل کے اندر سکون بھر رہی تھی۔ ”مجھے بہت کچھ بتانا ہے، جو تم جانتے ہو، وہ بھی....“ جو نہیں جانتے وہ بھی.... شروع شروع میں تم مجھے بہت برے لگتے تھے، میں سوچتی تھی یہ اس گھر میں کیوں رہتا ہے۔“ خیالوں میں بے ساختہ اس کی روشنی پیشانی چوم لینے پر اس کی آنکھیں پٹ سے چل گئیں۔

”روائیہ بی بی، کیا چیز ہو تم....“ ہر طرف اس کے دھڑکنے احساس پر وہ اچھا خاصا کھینا بھی ہوا۔ اور ٹھیک ہو کر بیٹھا۔ وہ چند دن کے لیے پاکستان آ رہا تھا۔ جرمنی میں ابھی اس کا بہت سا کام اتوا میں پڑا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے تہیہ کیا اب وہ اسے اپنے ساتھ لے کر آئے گا.... جانے وہاں کون کون سی حرکتیں کر کے بیٹھی ہے۔ پھر اس کی تمام بوئگیاں درختوں پر چڑھنے کی فرمائش، ٹریکٹر، کرکٹ، کبھار کا چاک، ٹیوب ویل سب باری باری آنکھوں کے سامنے آ کر رکتی رہیں۔ ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہوئے اس نے پہلے روائیہ کا نمبر ملایا وہ بند جا رہا تھا۔ پھر میرڈکا کا ملایا۔ انہوں نے دوسری ٹون پر ہی ریسو کر لیا۔ اور یہ سنتے ہی کہ وہ پاکستان چل چکا ہے انہیں بے انتہا حیرت ہوئی تھی۔

”اچھا.... چلو ٹھیک ہے، تم گھر پہنچو، میں ایک دو روز میں آ رہا ہوں۔“

”کیا مطلب آپ گھر نہیں ہیں.... کہاں ہیں آپ.....“ اس کے استعجابیہ لہجے پر وہ کھل کر ہنسے۔ ”میں چار دن ہو گئے میں تو اسلام آباد میں ہوں، کچھ اجلاس چل رہے ہیں ان کے سلسلے میں“ میرڈکا کی شدید خواہش تھی وہ منسٹر کی سیٹ تک جائیں۔ اور قومی الیکشن قریب ہونے کے سبب ان کی پارٹی آئے روز مختلف جگہ جلسے اور ریلیاں کر رہی تھی۔ وہ چار پانچ دن سے گئے ہوئے تھے اور مزید دو

ضروری چیز سرچ کر رہی ہے، جنبل سامنے کھڑا ہو کر
کھنکارا چند بل تو اعشال کو یقین ہی نہیں آیا تھا آہستہ
آہستہ آنکھیں خوشگواریت سے پھیلیں لیپ ٹاپ
ایک جانب رکھ کر دونوں بائیں کھولے بھاگ کر
لپٹ گئی تھی۔ ”آپ..... آپ کب آئے
جاؤ.....!“ اس کے سر پر ہلکی سی چیت لگاتے مصنوعی
خفگی سے دیکھا۔

”لگتا ہے کسی کو میرے آنے کی خوشی نہیں ہے
تب ہی کوئی نظر نہیں آ رہا....“ آپ کے انتظار میں تو
خیر سے دیکھیں رکی ہوئی ہیں..... اس کے دو معنی لہجے
پر اسے قدرے اچنبھا ہوا اور سامنے صوفے پر پھیل کر
بیٹھ گیا تھا۔ ملازمہ نہ سلام کرتے ہوئے پانی لا کر دیا
اس نے چند گھونٹ بھر کر اعشال کو دیکھا تھا۔

”سب لوگ کہاں ہیں..... کوئی نظر نہیں
آ رہا..... بھر جاتی..... تمہاری چاچی..... اذلان
سے تو ابھی بات ہوئی تھی، وہ کہاں غائب ہو گیا۔“
”مسٹر اذلان تو کچھ دیر پہلے ڈیرے کی جانب
نکلا ہے، امی اور چاچی صاحبہ کے لیے آپ ایکٹنگ
نہ کریں، آپ کو سب پتا ہے.....“ وہ اچنبھے سے
اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا پتا ہے؟“ اور صوفے پر پھیل کر بیٹھ
گیا آنکھیں جمائی روکنے سے بھاری ہو رہی تھیں
دیکھنے سے لگتا تھا اسے شدید تھکاوٹ ہے وہ سونا
چاہتا ہے

”کچھ نہیں.....“ اس نے منہ بتاتے ہوئے کہا
تھا پھر توقف سے بولی۔ ”کھانا لگواؤں آپ کے
لیے یا پہلے آرام کریں گے۔“

”میں واقعی آرام کرنا چاہ رہا ہوں.....“ وہ
بھاری ہوئی آنکھوں کو ریلیکس کرتا ہوا اٹھا چند قدم
آگے بڑھا تھا جب اعشال نے پیچھے سے ہانک
لگائی تھی۔

”جب اسپتال جائیں، مجھے بھی لے کر
جائیے گا۔ میں ابھی تک نہیں گئی؟“ جنبل ذکا میکا کی
انداز میں بلاتا تھا۔

چارون لازمی لگ جانے تھے۔ ان کے بتانے پر جنبل
کو ذرا حیرت نہیں ہوئی تھی کیوں کہ انہیں اپنی
سیاست سے زیادہ کچھ عزیز بھی نہیں تھا۔
”چلیں پھر ٹھیک ہے۔“ وہ فون بند کرنے لگا
تب وہ خیام کا استفسار کر رہے تھے۔

”خیام ٹھیک تھا، کب آ رہا ہے....“
”ہاں جی ٹھیک تھے.... اگلے ماہ شاید آئیں
..... تب تک میں چلا جاؤں گا.....“
”کیوں.....؟ وہ خیر سے بولے۔“ کام ختم
نہیں ہوا.....

”مائی ڈیئر بابا ہم وہاں کام ختم نہیں شروع
کرنے گئے ہیں..... بڑس ہے مستقبل آنا جانا لگا
رہے گا..... آپ بے فکر رہیں..... آپ کی
دوونگ کے لیے ہم آجائیں گے.....“ اس نے
ظہر اکھا تھا اور وہ مذاق سمجھ کر قہقہہ لگاتے رہے۔ اس
نے دوسری کال گھر کی تھی جو اذلان نے ریسپونڈ
..... جنبل کے آنے کا سن کر وہ اچھا خاصا بوکھلا گیا
تھا۔ آئمہ یہ تو بتا چکی تھیں ایک دو روز تک وہ آ رہا ہے
لیکن آپ کا ہے، کاسٹے ہی گڑ بڑا گیا۔ اسے سب
سے پہلا خوف روانیہ کی طرف سے ہوا تھا اگر اس
نے بتا دیا کم از کم اس بات پر وہ بھیجے گا مارجن نہیں
دیں گے..... اسے اب خود کو محفوظ کرنے کے لیے
بہت سی پلاننگ کرنا تھی لیکن فی الوقت روانیہ اس
حالت میں نہیں تھی کہ فوراً بتا سکے۔ تب ہی اس نے
آواز میں خوشگواریت پیدا کرتے پوچھا۔

”آپ ویٹ کریں میں لینے آتا ہوں۔“
”نہیں یار تمہیں پہنچنے میں تھنئے دو لگ جائیں گے
..... میں کیب سے آ جاتا ہوں۔“ وہ چلتا ہوا ٹیکسی اسٹینڈ
پر پہنچ گیا تھا۔ جرمنی کی صاف ستھری ہوا سے زیادہ اسے
یہاں کی گرد آلود فضا بھی بہت اپنی لگی تھی۔ چہرے پر
اپنائیت کا احساس چھا گیا۔ جیسے ہی حویلی میں داخل ہوا
ملازم بھاگ بھاگ کر ملنے آئے تھے۔

گود میں لیپ ٹاپ رکھے وہ صوفے کے
درمیان میں بیٹھی تھی۔ اس کی محویت سے لگتا تھا وہ کوئی

والی۔ یہ تو کوئی اور ہی تھی۔ روکھی پھینکی تھاہت زدہ سی۔ پل بھر ٹھک کر جس تیزی سے وہ اس کی جانب بڑھا تھا۔ اگر لابی میں لوگوں کا خیال نہ ہوتا وہ اسے خود میں سمیٹ لیتا۔ روانیہ کی صبل سے نگاہ ملنے ہی سارا بدن یک لخت ڈھلا پڑ گیا۔ چہرے کی سرخی ابھرتے ہی نمی میں کھل گئی۔ رخسار مسکراہٹ میں پھیلانے کے باوجود گمان ہوتا تھا وہ شدت سے رونا چاہ رہی ہے۔ وہ جیسے ہی باس آ کر رکھا اس نے اس کی بازو زور سے دبوچ لیا صبل نے ترم بھری نگاہ سے اسے دیکھتے ہوئے دوسری بازو اس کے گرد پھیلانے سے سہارا دیا اور ٹرانس کی کیفیت میں بولا تھا۔

”تم..... تم ٹھیک تو ہو.....؟ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رکھا تھا۔ نمی سے بھری گرے آنکھیں اٹھا کر صرف اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اور بہت مشکل آواز نکلی۔

”مگر وہ ٹھیک نہیں ہے.....“ اس کی بیٹی کو آج دنیا میں آئے چوتھا دن ہو چکا تھا مگر انتہائی کمزور ہونے کے سبب وہ مستقل اکنیو بیٹر میں تھی۔ آج صبح ڈاکٹر نے کہا تھا اسے اکنیو بیٹر سے بیٹر بیڈ پر شفٹ کر دیا گیا ہے۔ شعاعیں لگا کر چند گھنٹے بعد اسے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ اب بچی خطرے سے باہر ہے مگر چند گھنٹے کیا زیادہ دیر ہو چکی تھی وہ یہی سن رہی تھی۔ ”ڈسچارج شیٹ تیار ہو رہی ہے۔“ ابھی بچی اسے دے دی جائے گی مگر کوئی اسے لایا نہیں تھا۔

چار دن گزر چکے تھے روانیہ نے اپنی بیٹی کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ صرف پیدائش کے وقت کسی بلی کے بچے نما آواز سن کے کان تک گئی ضرور تھی لیکن ثقاہت کے سبب اس سے ہلنا جلنا دشوار تھا۔ اس کی ڈاکٹر کا ایک جملہ ”اسے فوراً لے جاؤ“ خطرے میں ڈوبی آواز کانوں کے پردے سے ٹکرانی شاید وہ بچی کی حالت دیکھ کر نرس سے کہہ رہی تھیں۔ مگر روانیہ کو فوراً نیند کا انجکشن لگا دیا گیا۔ غنودگی اترنے کے بعد چار دن گزر گئے اسے اپنی بیٹی کی پل پل کی کنڈیشن آنکھ، اور نرسیں بتاتی رہیں۔ دوبارہ وہ ضد کر کے

”اسپتال..... کون سے اسپتال.....؟“
 ”جاو آپ کو واقعی نہیں پتا..... یا جرموں سے اداکاری سیکھ کر آئیں ہیں.....“ وہ قدم قدم اس کی جانب بڑھتے اچھی خاصی کرنگی سے بولا تھا
 ”اعشال مجھے آپ بتانا پسند کریں گی..... یا میں کسی اور سے پوچھوں۔ بات کیا ہے آخر؟“ اب حیران ہونے کی باری اعشال کی تھی۔ صبل مذاق میں اتنا کرخت نہیں ہوتا تھا اور اگر انہیں نہیں پتا، تو ابھی تک کیوں نہیں بتایا گیا۔ وہ الجھتے ہوئے بولی تھی۔
 ”امی اور چاچی اسپتال میں ہیں ناں..... گڑیا آئی ہے۔“
 ”گڑیا..... صبل کے استعجابیہ کہنے پر وہ

وضاحت دے رہی تھی۔
 ”آپ کو نہیں پتا۔ تمہی..... میری بہن۔ آپ کی بیٹی.....“ پل بھر کے لیے وہ بولق زدہ احمق لگا تھا۔ اس کی دونوں ہمنوؤں کے کونے سٹھے ہوئے تھے۔ لب بلبکے سے داتھے۔ تھکاوٹ اور بھائی تو نہیں غائب ہوئی تھی نا بچی سے اعشال کو دیکھتے ہوئے۔ آہستگی سے پوچھ رہا تھا۔

”تم کیا کہہ رہی ہو..... مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی۔“ پھر جب اس نے وضاحت سے بتایا وہ اگلے قدموں باہر کی جانب مڑا تھا۔ آنکھ کے نمبر برکال کر کے اسپتال کا پوچھا۔ وہ خود حیران رہ گئی تھیں صبل پہنچ چکا ہے اور یہاں اسپتال آ رہا ہے۔ انہوں نے اسے پیار سے کہا تھا۔

”تم آرام کرو..... ہم تھوڑی دیر تک آنے والے ہیں..... شام تک ڈاکٹر ڈسچارج کر دے گی۔“
 یہ سب سننے کے بعد اس کا آرام سکون تو بھاڑ میں گیا۔ وہ تیز ڈرائیو کرتا اسپتال پہنچا تھا۔ اس اوسط درجے کے اسپتال کی انٹرنل پارکر کے دہ تیزی سے لابی کی جانب بڑھا تھا۔ ایک کمرے سے وہ نرس کے ساتھ آہستہ آہستہ باہر آ رہی تھی۔ اس کے بچھے چہرے پر جو اضطحال گھلا تھا۔ صبل کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔ وہ، وہ روانیہ نہیں تھی شوخ چمکتی رنگت

نرسری تک گئی۔

گلاس ڈور سے ایلکوی بیڑ کی جانب اشارہ کر کے بتایا تھا ”گڑیا وہ ہے۔“ مگر وہاں سے اسے ناشکل نظر آئی تھی، نا آواز صرف مختلف پائیوں میں جکڑا تھا سا وجود دکھائی دیتا تھا۔ اس نے پل پل اپنی بیٹی کے ٹھیک ہونے کی دعا کی، آئندہ بیگم کے اسے کئی بار کہنے کے باوجود۔

”تم اب ٹھیک ہو، گھر پر آرام کرو۔ یہاں میں ہوں ناں۔“ مگر وہ بہت ہمت حوصلے سے ہسپتال میں رہی۔

”نہیں میں اسے لے کر جاؤں گی۔۔۔“ اب حنبل کو سامنے دیکھ کر یک لخت ہی ساری ہمت ٹوٹ گئی اس کی چھوٹی چھوٹی سسکیاں ہچکیوں میں بدلتی باہر نکل رہی تھیں۔ حنبل نے اسے پیار سے پھینکتے ہوئے کہا تھا۔

”تم آرام کرو، میں دیکھتا ہوں۔“
”انہیں ڈسپارچ کر دیا گیا ہے۔“ نرس حنبل کو بتا رہی تھی۔ ”بہتر ہے یہ گھر پر جائیں، شام تک بے نی کو بھی فارغ کر دیا جائے گا۔“ حنبل نے ”اوکے“ کے انداز میں گردن ہلاتی تھی جب ہی خالہ گلزاری ان کی جانب بڑھی تھی۔ حنبل نے نگاہ ملتے ہی پہلے ٹھوڑا سا ٹھکی پھر خوشگواریت پھیلاتے ہوئے اسے مبارک باد دی، اس نے نرسی سے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے خالہ گلزاری سے استفسار کیا تھا۔

”آپ لوگ کس کے ساتھ آئیں ہیں۔ مطلب باہر کون سے گاڑی میں.....؟“ گلزاری نے دد پٹا اچھی طرح جھاکر انگلی سے ایک کان کے پیچھے کرتے ہوئے کہا تھا۔

”نہب کا ابا۔۔۔ ہم چار دن سے ادھر ہی ہیں۔۔۔“

”ہوں۔۔۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔
”ایسا ہے، آپ روانہ ہو کر گھر لے جائیں، بانی سب میرے ساتھ آ جائیں گے۔“

گلزاری نے چند چیزیں اٹھاتے ہوئے روانہ ہو گیا۔ ہاتھ پکڑ لیا۔ پاس سے گزرتے گزرتے اس نے حنبل کی شرٹ پشٹ سے پکڑ کر رکھا اس نے گردن پھیری پھر سارا اس کی جانب مڑ گیا۔

”ہوں۔۔۔؟“
”تم ناراض تو نہیں ہو۔۔۔؟ اس کی معصومیت سے پوچھنے پر حنبل کی ہنسیوں استفسار میں جنبش کرنے لگیں۔ وہ فوراً سے بولی۔

”سوری۔۔۔ تم گھر آؤ گے، میں سب بتا دوں گی۔“ اس کا استفسار مسکراہٹ میں بدل گیا تھا۔
”میں بھی گھر آ کر بتاؤں گا۔“ پھر وہ گلزاری سے مخاطب ہوا تھا۔ ”اسلم سے کہنا گاڑی احتیاط سے چلائے۔“ انہیں آہستہ آہستہ لابی عبور کرتا دیکھ کر خود بھی پیچھے چلا اور ردائیہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر گاڑی تک بیٹھا کر آیا تھا۔ اسلم کو خود نصیحت کی تھی۔

”احتیاط سے چلا نا۔۔۔ جب وغیرہ دیکھ کر۔“
جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی وہ وہاں کھڑا رہا تھا پھر اندر نرسی کی جانب بڑھا تھا۔ انٹرس لابی کو عبور کر کے چھوٹا سا لانچ تھا جس کے دائیں جانب بے بی نرسی کا سائن لگا تھا۔ شیشے کے دروازے کے ساتھ لگے بچوں پر آئندہ اور سلوئی بیٹھی تھیں۔ کچھ فاصلے پر نہب بھی بیٹھی ایک تھرموس سے دوپٹوں میں چائے اینڈ ملی کر اٹھنے لگی۔ سامنے بچوں پر چند اور خواتین بھی بیٹھی تھیں۔

سلوئی کی باتوں کے انداز سے لگتا تھا وہ آئندہ سے کچھ پوچھ رہی ہے شاید وہ ابھی آئی تھی۔ بے بی اور ردائیہ کی خیرنیریت پوچھ رہی تھی۔ حنبل سے نگاہ ملتے ہی اس کا چہرہ سر ہو گیا تھا۔ البتہ آئندہ مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی تھیں اور والہانہ پن سے ملی تھیں۔ سلوئی نے اس کے سلام کے جواب میں سر کے خم سے جواب دیا اور پھر شیشے کے پار نرسی کے بچوں کو دیکھنے لگی اور چائے لاتے ہوئے نہب کے ہاتھ کاٹے۔ دھر کن غیر معمولی ہو گئی تھی۔
”آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔۔۔“ وہ حال

احوال کے بعد اب شکوے شکایتوں پر اتر آیا تھا۔
 ”ہیل وہاں کم پریشان تھا، مزید کر دیتی۔۔۔“
 آئمہ کا جواب اسے مطمئن نہیں کر سکا۔ اس کے
 چہرے پر ناراضی ہنوز تھی۔

”کون سا بے بی ہے۔۔۔؟“ اس نے گلاس
 دوسرے اندر دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ آئمہ نے ایک
 جانب اشارہ کیا۔

”مسئلہ کیا ہے۔۔۔؟“ لہجے میں تھک رہا تھا۔
 ”تجھے کئی مسئلے۔۔۔ لیکن اب ٹھیک ہے۔۔۔“
 ”لیکن آپ چہرے سے بہت ٹھیک ہوئی لگ
 رہی ہیں۔۔۔ خیریت ہے ناں۔۔۔؟“

”جنبل میں چار دن سے یہاں ہوں، مسلسل
 رات دن۔۔۔ تھکاؤ تو ہوئی ہے۔“ آئمہ کی بات
 پر جہاں جنبل تھکا آ میز مشر منہ سا ہوا تھا وہاں نرنب
 نے دل میں ”استغفار“ پڑھی تھی۔ کیوں کہ نرسری کے
 سامنے ایک بہترین کمرہ آئمہ کے لیے ریزرو تھا۔
 ہاں وہ آرام کرنے کے ساتھ چکر لگاتی تھیں مگر
 مسلسل تو صرف نرنب بیٹھی رہی تھی جس کا نام ہی
 نہیں۔ آئمہ اور سلویٰ تو کچھ دیر پہلے ہی یہاں آ کر
 بیٹھی تھیں۔ نرنب نے کڑوا سا منہ بناتے چائے کے
 ڈسپوزیبل کپ ان کی جانب بڑھا جے جنبل نے
 ”نہیں شکریہ“ کہہ کر انکار کر دیا۔ وہ ڈاکٹر سے ملنے کی
 بات کر رہا تھا۔ جب کچھ فاصلے پر بیٹھی خواتین سے
 پہلے ایک بوڑھی اماں اٹھ کر آئیں اور آئمہ سے پوچھا تھا۔

”اے بیو اے“ (یہ باپ ہے) آئمہ کے
 اثبات میں سر ہلانے پر وہ دعائیں دیتیں۔ ”شالا
 جیندی روے تیری دھی، نصیب بھلے ہوں۔۔۔
 وقتوں پیلاں ہوئی ناں۔۔۔ کوئی نہیں رب حیاتی
 دین آلا۔۔۔“ (زندہ رہے تیری بیٹی، نصیب اچھے
 ہوں، وقت سے پہلے ہوئی تو کیا ہوا، اللہ زندگی دینے
 والا ہے) بڑھیا اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا واپس بیٹھ گئی
 تھی۔ جنبل کے چہرے پر کچھ ناگواری سی ابھری کچھ
 الفاظ بے حد عجیب لگے تھے وہ شکوہ کنال انداز میں
 دیکھتا آئمہ سے پوچھ رہا تھا۔

”ڈاکٹر اسما کے پاس کیوں نہیں گئیں۔۔۔
 کہاں لے آئیں۔۔۔“ وہاں پر بیٹھیں خواتین اور
 ایک دوسرے جس طرح سے اسے دیکھ رہے تھے جنبل کو
 بے حد عجیب لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر اسما کا اچھا بھلا دی آئی
 لی اسپتال تھا، لیکن فی الوقت سب لوگوں کی نگاہیں چہ
 گوئیوں برداشت کرنا تھیں۔

”یہاں آنے کی بھی وجہ تھی اور ویسے بھی
 روانیہ خود بھی یہاں آنا چاہ۔۔۔“ آئمہ کے الفاظ
 ابھی منہ میں تھے سفید فیص شلواری پہنے دوزنیں تیزی
 سے نرسری کی جانب بڑھتی آ رہی تھیں۔ نرسوں کو دیکھ
 کر معمول کی طرح مائیں دادیاں بے چین ہوئیں ان
 کی طرف بڑھیں اور سب اپنی ہائیک رہی تھیں۔

”ساڈھے بچے دا خیال رکھیں۔۔۔ میرے
 بچے کو کپ فارغ کرو گے۔۔۔ میں نے تو اپنا پوتا
 دیکھا بھی نہیں، ذرا سا دکھا دو۔۔۔“

ایک عورت تو خوب ہی پیچھے بڑھ گئی تھی ”میرے
 نواسے کے تو ابھی اذان بھی نہیں دی گئی۔ وہی
 دلوادو۔۔۔“ انہوں نے پیچھے کو دھکیلتے نرس سختی سے
 بولی تھی۔

”سب کے بچوں کے کان میں اذان دے دی
 ہے، اگر چاہتی ہو ناں“ بچے فوج جاسیں تو اطمینان
 سے بیٹھو، نہیں تو خالی کرو یہ لائی اور اپنے اپنے کمروں
 میں جاؤ۔۔۔“ وہ دروازہ دھکیل کر اندر چلی گئی۔ کچھ
 اتاوی بڑھیاں کا فوج کے دروازے سے چپک کر اندر
 کے نظارے کرنے لگیں۔ جنبل کا بہت دل تھا وہ اس
 نرس سے اپنی بچی کی کنڈیشن پوچھے، مگر جس طرح
 سے وہ سب کو جھڑک کر اندر داخل ہوئی تھی اسے غیر مناسب
 ہی لگا۔ اس سے کہیں بہتر تھا وہ ڈاکٹر سے مل لے۔

”میں ابھی آیا۔“ کہہ کر ڈاکٹر کے کمرے کی
 جانب بڑھا تھا۔ مریضوں کی بھرمار چپک کرنے
 کے دوران ڈاکٹر لینی نے جنبل کے لیے کچھ وقت
 نکالا۔ چھوٹے سے کمرے میں شیشے کی میز کے پیچھے
 ریو لوگ چیئر پر بیٹھی ڈاکٹر لیتی تھیں جنبل کو پیشہ وارانہ
 انداز میں مسکرا کر دیکھا تھا۔ وہ کرسی صحیح کرنا سننے

بیٹھ گیا بچی اور روانہ کے بارے میں معلومات لینے لگا۔ ڈاکٹر لئی کا لب و لہجہ خاصا عجالت آمیز تھا۔ اس نے چند جملوں میں اس کی مناسب تسلی کرنا چاہی تھی۔ ”بچی میں اس سنجین کا کچھ مسئلہ تھا، اب ٹھیک ہے، ڈسچارج شیٹ تیار ہو چکی ہے آپ نرس سے ریسیو کر کے سائن کر دیں اور آپ کی سرز آمد اللہ ٹھیک ہیں۔۔۔ ہفتے بعد یاں بیٹی کا چیک اپ کروالیں تو مناسب رہے گا۔ باقی سب ٹھیک ہے۔“ اس نے مزید کچھ پوچھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا۔ وہ فوراً بول پڑی۔

”دیکھیں سر میں اس وقت بڑی ہوں، باہر پشعٹ انتظار کر رہے ہیں۔۔۔ ایک کیس بھی ہینڈل کر رہی ہوں۔۔۔ آپ شام میں تفصیل پتا کرنے آ سکتے ہیں۔ ویسے زچہ بچہ دونوں خطرے سے باہر اور اب فٹ ہیں۔“ وہ شکریہ ادا کرتا اٹھا تھا۔ اسے وہاں زیادہ سے زیادہ دس پندرہ منٹ لگے تھے، لیکن جب لائی میں پہنچا وہاں کا منظر نامہ یکسر بدل چکا تھا۔ دو تین خواتین ایک نرس پر بے طرح سے جھپٹ رہی تھیں۔

”میں آپ دیکھیا انے بچاں دے ناں بدلے۔۔۔ ہائے ساڈے بچے نوں بدل دیتا۔“ (میں نے خود دیکھا اس نے بچوں کے نام بدلے، ہائے ہمارا بچہ بدل دیا) خود کو بچاتے ہوئے نرس اسے سمجھا سمجھا کر ٹنگ آئی تھی، مگر اس بڑھیا کی ایک ہی رٹ تھی اس نے شور ڈال کر اپنے مردانہ ربل لے لیے تھے۔

”ہائے ساڈی چاؤ اکیٹرا زمین دا وارث انے بدل دیتا۔۔۔ میں آپ دیکھیا۔“ (ہائے ہماری چار اکیٹرا زمین کا وارث اس نے بدل دیا۔۔۔ میں نے خود دیکھا) مائی دہائیاں ڈال رہی تھی۔

معاہلہ یوں تھا جب نرسیں اندر داخل ہوئیں دو بچوں کو انکیو بیئر سے نکال کر ہیٹر بیڈ پر شفٹ کیا تھا۔ نرسیں میں بچوں کی شناخت کے لیے ان کی کلائیوں یا پاؤں پر برتھ بیڈ باندھ دیے جاتے ہیں جن پر ان کے والد کا نام اور علاقہ لکھا ہوتا ہے۔ ایک بہت کمزور بچے کا برتھ بیڈ انکیو بیئر سے ہیٹر بیڈ تک لے جانے میں پھسل کر ٹکل گیا۔ ہیٹر بیڈ کی کمی کے سبب کاٹ نما

علمہ، بچوں کی شناخت نہیں رکھ سکتا۔“ وہ کمر جانے کے لیے بعد اصرار تھے چونکہ نرس کی اچھی خاصی انسٹل ہو چکی تھی۔ اب وہ بھی قدرے سختی سے بولی تھی۔
 ”آپ کے سامنے میڈم کہہ کر گئی ہیں، بچوں کے ڈی این اے کرواؤ۔۔۔ تو سب بچوں کا ہوگا۔۔۔ ہمیں کیا پتا کچھ دیر میں آپ لوگ شور ڈال دیں ہمارا بچہ بدل دیا۔“ سلوئی ڈاکٹر لٹی کی دوست تھی۔ اس کی بہن کی بات رد ہونے پر اچھی خاصی سکی محسوس ہوئی پھر جس طرح سے حبل بار بار چہرے کے زاویوں سے اسپتال کی ناقص کارکردگی بتا رہا تھا۔ وہ ذرا عرب سے بولی تھی۔

”ڈاکٹر لٹی کو میرا بتاؤ۔۔۔ انہیں جلدی ہے، وہ جانا چاہ رہے ہیں۔“ نرس نے لیبارٹیرین کو حبل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔
 ”ہیلے ڈران کا لے لیں، انہیں جلدی ہے۔“ پھر سلوئی کی جانب ہلکا سا رخ پھیر کر کہا تھا۔
 ”میڈم اس وقت لیبر روم میں ہیں، فی الحال بات نہیں کر سکتیں، فارغ ہوں گی کر لیجیے گا۔“

☆☆☆

وہ بہت دیر سے ایک روم میں بیٹھے روپوش کا انتظار کر رہے تھے۔ بچی کو ڈسچارج کر کے ان کے پاس بے لی کاٹ میں سلا رکھا تھا۔ سلوئی اور آئمہ خاصی بے چین دکھائی دے رہی تھیں۔ اتنے دن بعد یہاں سے جان چھٹنے لگی، مگر ایک بڑھیا نے سب کو مصیبت میں ڈال دیا۔ سلوئی نے دوبار ڈاکٹر لٹی سے ملنے کی کوشش کی، لیکن اپنے کیس سے فارغ ہوتے ہی وہ قریبی اسپتال میں ایک ایمرجنسی کیس میں چلی گئی تھی۔ جس طرح ہر شعبہ زندگی میں تمام کو لیگنڈ ایک دوسرے کو مشکل میں پکار لیتے ہیں اسی طرح ڈاکٹر ز بھی اپنی عدم موجودگی میں اپنے سامھی ڈاکٹر کی مدد لے لیتے ہیں کہ وہ ان کے مریض چیک کر لے۔ قریبی اسپتال کی ڈاکٹر کسی کام سے دوسرے شہر تھیں۔ ڈاکٹر لٹی اور ان میں یہی طے تھا کہ ان کی ایمرجنسی ڈاکٹر لٹی دیکھ لیں گی اور اس وقت وہ ان کی

ایمرجنسی کیس کو دیکھنے لیں اور خاصا وقت لگ گیا۔ سلوئی نے لیبارٹری تک جانے کی کوشش کی کہ جلد فارغ ہوں۔ وہاں پہلے ہی حبل موجود تھا۔ کچھ دیر میں ایک فائل بے لی آف حبل ڈکا کے نام سے اسے تھما لی گئی۔ اسے پڑھتے ہوئے اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔

”یہ کیا بکواس ہے۔۔۔“ اس نے فائل لیبارٹری کے آگے چھینکی تھی اور تیزی سے اس نرس کی جانب بڑھا۔

”کس بچے کا سپیل دیا تھا میرے ساتھ۔“ نرس سننے ہی ہڑبڑائی اور کاٹ میں لٹی بچی کو دیکھا تھا۔

”سراسر کا۔۔۔“

”کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔۔۔ ان بچڑ ہے۔۔۔“ حبل کا لہجہ کرخٹ تھا۔ آئمہ اور سلوئی کی ہونٹوں سے آنکھیں پھیل گئیں چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔؟“ آئمہ اٹھ کر بچی کی جانب بڑھی تھیں۔ پھیلی آنکھوں کی چلتیاں بچی کا طواف کر رہی تھیں۔

”یہی بچی ہے سر آپ کی۔۔۔ اس بچی کا سپیل آپ کے ساتھ گیا تھا۔“ نرس کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیسے یقین دلائے۔ آئمہ بھی گھبراہٹ سے کبھی حبل اور کبھی بچی کو دیکھ رہی تھیں۔

”ہاں ہاں حبل۔۔۔ یہی اپنی بچی ہے۔ میں یہی کپڑے اس کے لائی تھی۔“ وہ آکٹا ہٹ سے برداشت کر رہا تھا۔ آئمہ نے مزید وضاحت دی۔

”مشینری خراب ہوگی لیبارٹری کی۔۔۔ کیمیکل ایکسپائر ہوں گے۔“

”آپ لوگوں کو ہی پسند آیا تھا یہ اسپتال۔۔۔ دیکھ لی کارکردگی۔۔۔“ حبل کے طنز پر نرس کے چہرے پر نخوت بچھ گیا تھا۔

دیکھیں سر۔۔۔ نرسری میں پری میچور بچی صرف ایک اور آپ کی تھی اور چار دن سے بھی، باقی تو آکسیجن اور بیرقان کے بچے تھے آج اور کل کے

--- جو سچ کر گئے۔

”جبل کو کچھ سنائی نہیں دیا سوائے ”پری میچور کے۔“ اس کی چونکی نگاہ ابھی بھی اور لابی میں حوصلہ دیتی بڑھیا کے لفظ کانوں میں گونجے۔

”وقتوں پیلاں ہوئی ناں۔۔۔ کوئی نہیں رب جیاتی وین آلا۔۔۔“ (وقت سے پہلے ہوئی ہے، کوئی نہیں اللہ زندگی دینے والا ہے) وہ استغفار کر رہا تھا۔

”پری میچور سے کیا مطلب ہے آپ کا۔۔۔“ آئمہ جلدی سے اٹھ کر سامنے آئیں۔

”جبل چل چھوڑ، جانے کیا کہہ رہی ہے، مگر چلتے ہیں۔“

”ایسے ہی مگر چلتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں آہستہ آہستہ غصہ بڑھنے لگا۔ ”پری میچور اور دقت سے پہلے کا کیا قصہ ہے، اس بچی کی فائل دلائیں مجھے دیکھنا ہے۔۔۔ میں دس ماہ بعد پاکستان آیا ہوں، میری بچی پری میچور کیسے ہو سکتی ہے۔۔۔ کیا، کیا ہے آپ لوگوں نے۔۔۔“ اس کے آنکھوں کے غصے سے نرس ساری کانپ گئی۔ وہ گبر اہٹ میں بول رہی تھی۔

”سر ہم نے کیا کرنا ہے۔ یہی بچی۔“

”آپ فائل لائیں اس کی۔۔۔“ نرس کے نکلنے ہی وہ خود بھی بولتا ہوا پیچھے پیچھے نکلا تھا۔

”مجھ سے ڈی این اے ان میچڈ ہے، پری میچور کیا بکواس ہے یہ، میں بات کرتا ہوں ڈاکٹر سے۔۔۔“ آئمہ بھی پیچھے ہونے لگیں۔ سلوئی نے روک لیا تھا۔ زنب پر بہت دیر سے معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کچھ سمجھتے ہوئے بولی تھی۔

”بے بی کا کی کا خون جبل صاحب سے نہیں مل رہا۔۔۔؟“

”تم چیپ کرو۔“ سلوئی نے اسے ڈیٹا تب خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے آئمہ کے قریب ہوئی۔

”مجھے ایک بات پتا ہے۔۔۔“ اس کے یوں کہنے پر آئمہ کی ساری جان نکل گئی تھی بولی کچھ نہیں صرف نگاہیں اس پر جم رہی تھیں۔ جو کچھ زنب نے

آئمہ کو بتایا آئمہ یکم کا جی چاہا زمین ابھی کھود کر زنب کو اس میں ڈال دیں۔ انتہائی غصے کو کنٹرول کرتے دانت جما کر بولی تھیں۔

”میرے بچے پر بہتان لگا رہی ہے، کمینی۔۔۔“

”میں سچ کہہ رہی ہوں بی بی۔۔۔“ جبل صاحب کو گئے دو مہینے سے اوپر ہو گئے تھے۔ سردیوں کی راٹیں تھیں، میں نے خود دیکھا تھا، کھڑکی سے پردہ ہٹا ہوا تھا۔۔۔ بلکہ مجھ سے گملا کر گیا تھا۔ اس آواز پر ہی کوئی کمرے سے باہر نکلا۔۔۔ میں تو صرف کوریڈور کی بتیاں بند کرنے لگی، مگر۔۔۔“

”چیپ کر جا۔۔۔“ آئمہ کی دبی دبی چیخ نکلی۔ زنب منمناتی تھی۔

”میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ بلکہ کچھ دیر میں آپ بھی آئیں گے تو میں پیچھے سے بھاگ گئی تھی۔ اس سرد رات میں اذلان کی ہوتی، کھڑکی سے سر کے پردے سے آتی روشنی اور گرا ہوا گلاسب کا سب آئمہ کی آنکھوں کے آگے پوری طرح آن موجود تھا۔ وہ تو آج تک مجھتی رہیں صرف انہیں ایسا پتا تھا، مگر زنب گھر کی خادمہ؟ ایک دم سے آئمہ کا ہاتھ اٹھا اور چٹاخ سے زنب کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔

”آواز بند۔۔۔“ جبل کمرے سے نکل کر جیسے ہی

نرس کے پیچھے چلا تھا سامنے سے ڈاکٹر لیتی تیز لابی میں داخل ہو رہی تھی جبل نے اسے دہاں ہی جا پکڑا۔

”کیا بکواس ہے یہ۔۔۔ میری بچی پری میچور کیسے ہو سکتی ہے۔۔۔ اس اسپتال میں ہو کیا رہا ہے۔“ ڈاکٹر لیتی اپنا چشمہ جاتے کچھ دیر اسے بغور دیکھتی رہی پھر قطعیت سے کہا تھا۔

”اس کا جواب بچی کی اینڈنٹ سے لیں۔“

پھر وہ لٹے پاؤں گھومی اور اسی کمرے میں داخل ہو گئی جہاں آئمہ اور سلوئی بیٹھی تھیں۔ وہ ٹھوس انداز میں کہتے ہوئے سلوئی پر نگاہیں جمائے تھی۔

”اس بچی کی پیدائش آپ کے سامنے یہاں ہوئی ہے۔۔۔ یہ پری میچور کیوں ہے، آپ کو اچھی طرح پتا ہے میرے اسپتال کی رپو کا مسئلہ ہے،

اپنا مکرن

کثروں کریں انہیں۔۔۔ بھنوسے حبل کی جانب اشارہ کرتی جیسے آئی تھی ویسے باہر نکل گئی۔ آئمہ کے ہوش زنب نے اڑا رکھے تھے۔ انہیں خوف تھا وہ کچھ بول نہ دے۔ گال پر ہاتھ رکھے زحی نظروں سے دیکھتی زنب کو سلوئی نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔
 ”زنب تم میرے ساتھ گھر چلو۔۔۔“ اٹھتے اٹھتے سلوئی نے جانے ایسا کیا لفظ بولا تھا آئمہ نے گہری سانس لیتے ہوئے سنبل کو روکا جو پھر غصے میں ڈاکٹر کنبی کے پیچھے جانے لگا تھا۔ آئمہ نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

”میری بات سن۔۔۔“ اس نے گردن پھیر کر دیکھا آئمہ چپ کر گئی تھیں۔ سلوئی اور زنب جانے کی تیاری میں سامان سمیٹ رہی تھیں اتنی دیر آئمہ چپ رہیں ان کے باہر نکلتے ہی انہوں نے اسے سامنے بیٹھنے کا کہا تھا، مگر وہ پلٹ کر بولا۔
 ”آپ بات بتائیں۔۔۔“

”حبل یہ کوئی معمولی بات نہیں، جو تجھے کھڑے چڑھے سنا دوں۔۔۔ اسے سننے کے لیے بہت حوصلہ چاہیے، اسی لیے کہہ رہی ہوں بیٹھ جا۔۔۔“
 ”حوصلہ ہے مجھ میں۔۔۔ بتائیں آپ۔۔۔ وہ منہ بند کیے گہرے سانس لیتی رہیں وہ ٹکلت آمیز بیچ نما صوفے پر آگے کو ہو کر ٹک گیا۔

”بتائیں۔۔۔“
 ”حبل تجھے مجھ پر کتنا اعتبار ہے۔۔۔“ اس نے چند پل ان کی آنکھوں میں جھانکتے ٹھوس انداز میں کہا تھا۔

”جتنا اپنی ماں پر ہوتا ہے۔۔۔“ اک پھمکی مسکراہٹ آئمہ بیگم کے ایک گال پر ریتکیں۔
 ”پھر تیری ماں کہہ رہی ہے، اس معاملے کو یہاں ہی دن کر دے۔۔۔ بچہ کو جتنا کریدے گا ناں۔۔۔ وہ تجھ پر چھینے مارے گا۔۔۔ خدا کے واسطے۔۔۔“ انہوں نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے تھے۔ حبل کے ماتھے پر یک دم پسینے کے قطرے پھوٹ پڑے اک نادیدہ خوف گرد میں

بدلتے لگا۔
 ”اللہ کے واسطے حبل۔۔۔ اس حویلی کی عزت تیرے ہاتھ ہے۔۔۔ اگر میری زبان حلی باپ، دادا کی پٹریاں اچھل جائے گی۔“
 ”اکیس کی بات ہے۔۔۔ وہ ٹرانس کی کیفیت میں تھا۔

”اکیس ہی بات ہے۔۔۔ میرا حوصلہ دیکھ میں نے یہ خبر بابا جان سے، تمہارے بھائی سے بھی چھپائی اب آنے سے چند دن پہلے بتایا ہے۔ تجھے کیا بتانی۔ یوں ہی تو چپ بیٹھی تھی۔“

”بھرجائی کیا بات ہے۔۔۔“ حبل کی سانسوں میں طوفان برپا تھا اس طوفان سے سوال ابھرنے بھی مشکل ہونے لگے۔ آئمہ کو اس کی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا گلاس میں پانی اٹھل کر اس کی جانب بڑھایا اس نے نفی میں سر ہلاتے بمشکل کہا تھا۔
 ”بات بتائیں۔۔۔؟“ آواز کسی پاتال میں اترتی محسوس ہوئی۔

”کیا بتاؤں۔۔۔“ انہوں نے گلاس سائڈ پر رکھ دیا۔ ”غیروں کی شادی میں تنہا جانے کی کیا ضرورت تھی، مانا میری طبیعت خراب تھی، اذلان تو جا رہا تھا ناں۔۔۔ ضد کر کے اسے چھوڑ کر گئی۔۔۔ تیرا نام لے کر۔۔۔ بتا کیا کرتی میں۔۔۔“ حبل کے کانوں میں سانسیں سانسیں ہونے لگی۔
 ”اس بات کا اس سب سے کیا تعلق؟“

”میں بھی یہی سمجھتی رہی۔۔۔ وہ تو جب رضا حیات کا بیٹا آیا تھا معافی مانگنے، بتا ایسا کیا ہوا تھا وہاں، جس کی اسے معافی مانگنی پڑی اور کس ویدہ دلیری سے یہ آدمی رات کو اس کے پاس چلی گئی، بابا جان نے اس رات سے روانیمہ سے بات نہیں کی اتنے ناراض ہیں۔“ حبل نفی میں سر ہلاتا یک لخت کھڑا ہو گیا تھا۔

”شادی پر ہفتے کا پروگرام بنا کر گئی تھی اگلے ہی دن آدمی رات کو بھاگتی واپس آئی، ایسا کیا ہوا جو دن چڑھنے کا انتظار نہ کیا، پھر وہ اس دن معافی مانگنے آیا تجھے پتا ہے تجھے میں کیا لایا تھا، سرخ رنگ کی نی

سُترت جس پر انہی سس پو لٹھا ہوا تھا۔۔۔ انہی ہی رسی ہے اس کی لٹاری میں۔۔۔
 ”نہیں بھر جانی ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔ روانیہ ایسی نہیں ہے۔“ حبل کی آواز صدے اور خوف سے ٹوٹ رہی تھی۔

”کاش ایسا نہ ہوتا حبل، ہم لٹ گئے، برباد ہو گئے۔۔۔ مجھے تو پتا ہی تب چلا جب دن بہت اوپر ہو گئے تھے، ورنہ اس بدنامی کو تب ہی دھو دیتی۔“
 آئمہ کی آواز رنہ رنہ لگی۔ ”شروع میں تو خود جانی رہی ڈاکٹر کے، پھر کہتی رہی حبل تھوڑا غصہ کریں گے پھر معاف کر دیں گے۔۔۔ میں کیا کرتی پتا۔۔۔ میں تو اسے بھی سمجھاتی رہی جو ہوا سو ہوا کسی کو مت بتا۔۔۔ حبل کو بھی نہیں۔۔۔“ اس نے تند نگاہ سے انہیں دیکھا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس کھڑی ہوئیں اور پشت سہلاتے نرمی سے بولی تھیں۔

”ذرا حبل سے حبل۔۔۔ چیخ پکار سے اپنی منہ پر کلک آئے گی، میں ٹھکاری خالہ سے بات کروں گی وہ پال لے گی بچی کو۔۔۔ خدا کے واسطے حبل تو مار پیٹ کرے گا، اگر گھر سے نکل گئی، کہاں کہاں بدنامی ہوگی حویلی کی۔“
 ”پلیز بھر جانی۔۔۔“ اس کے سننے کی طاقت جواب دے گئی۔ سارے بدن کے اعصاب بری طرح سے شل ہو رہے تھے۔ وہ منہ کھول کر سانس لیتے نفی میں سر ہلارہا تھا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔ میں جانتا ہوں روانیہ کو، کوئی غلط نہیں ہے۔۔۔“ کہتے ہوئے وہ بھاری قدموں سے بے بی کاٹ کی جانب بڑھا۔ سانولی تختی سی بچی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تختی سے بند کیے بے سدھ پڑی تھی۔ اسے اٹھاتے ہوئے حبل کو اپنے ہاتھ لرزتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ وہ اب اس کے ہاتھوں میں تھی۔ اس کے جسم کی حرارت سے حبل کو خود میں کوئی پدرانہ شفقت، محبت، ترس، ہمدردی کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔ وہ کڑوا ٹھونٹ نکلتے ہوئے بہت آہستگی سے بولا تھا۔

ان کی گاڑی بڑک پر دوڑ رہی تھی۔ بچی آئمہ نیگم کی گود میں تھی۔ حبل بالکل کم صم تھا نگاہیں پتھر کی طرح اسکرین پر جمی تھیں۔ آئمہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ماہم کی شادی اور اس کی بعد روانیہ کے رویے کے واضح بدلاؤ پر کوئی بات کر دیتیں۔ حبل نے کئی بار کہا تھا۔

”پلیز جب کر جائیں۔“ پھر جانے اس نے کیا سوچ کر اپنی گاڑی آغا خان لیبارٹری کی پارکنگ میں روک دی۔ بچی کو لے کر گیا۔ ٹیسٹ کے لیے بلڈ دے کر واپس آ بیٹھا۔ پھر تو اس نے کئی لمبھ کے آگے گاڑی روکی۔ آئمہ نے ٹوکا بھی تھا۔

”تو پاگل تو نہیں ہو گیا حبل۔۔۔ جگہ جگہ اپنا اور بچی کا خون دے رہا ہے۔۔۔ وہ پہلے ہی کمزور ہے، اس معصوم کا کیا قصور، کیوں اسے ایسے سزا دے رہا ہے۔ یہ بی بچی پیدا ہوئی، میں اس کی گواہ ہوں اور مسلسل میں وہاں رہی کسی سے نہیں بدلی یہ بچی پھر کیا تصدیق کر رہا ہے، پتا تو دیا تجھے سب۔۔۔“ وہ چپ رہا۔ شام اتر چکی تھی وہ خود کھرجانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اسلم کو فون کر کے گاڑی شہر منگوائی بچی اور آئمہ کو اس کے ساتھ حویلی بھجوا دیا۔ آئمہ کے پوچھنے پر بچی سے بولا تھا۔

”آ جاؤں گا۔۔۔ آپ جائیں۔“
 ”دیکھ حبل میں نے تجھے بچوں کی طرح پالا ہے، خدا کے لیے کچھ الٹا سیدھا مت کرنا۔ جو ہوتا تھا وہ ہو گیا۔ اگر تجھے کچھ ہو گیا کسی کو فرق نہیں پڑنے والا، میرا کلیجہ بچ جائے گا۔ چل تو بھی گھر۔۔۔ دفع کر۔۔۔ نابات کرنا اس سے مگر اپنا تو خیال کر۔“

”بھر جانی پلیز آپ جائیں میں آ جاؤں گا۔“
 وہ انہیں اسلم کی گاڑی میں بٹھا کر گاڑی اڑا لے گیا۔ آئمہ کا دل مٹی میں مسلا گیا۔

اوتھتے جاتے گزر رہی گئی۔ صبح وہاں کے چوکیدار نے چائے کا کپ لا کر اس کے سامنے رکھا۔ وہ خاموشی سے کپ پر تیری کتھی رنگ کی سلوٹوں کو دیکھتا رہا۔ پیٹرول ڈلوآنے کی وجہ سے کچھ جان پہچان تھی چوکیدار نے خیر خیریت پوچھی تھی، مگر وہ چپ ہی رہا۔ ہر آنے والا لمحہ خوف کی صورت اس کے چہرے پر چمک جاتا سورج اوپر اٹھتے ہوئے باقاعدہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنی حدت اتارنے لگا۔ وہ چائے پی کر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ واضح نہیں تھا اسے پہلے کہاں جانا ہے۔ ساری رات اس کے موبائل پر روایتیہ اور بھر جانی کی کالز، میسجز آتے رہے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی فون بند کر دیا۔ سڑک پر رینکیتی کا ہی لینڈ کر دوزر خود بخود لیمیز کے آگے رکتی گئی۔

رپورٹس ہاتھ میں آنے پر اس کا شدت سے دل چاہا زمین آسمان پھٹ جائیں یا پھر سب رہیں صرف وہ اور روایتیہ کہیں نہ ہوں۔ وہ بہت تیز ڈرائیو کرتا گاؤں کی جانب بڑھ رہا تھا گاؤں پہنچ کر گاڑی کا رخ خود بخود چوہیلی کے بجائے ڈیرے کی جانب موڑ دیا۔ گاؤں میں دن خاصا روشن ہو چکا تھا۔ ڈیرے پر لوگوں کی پہل قدمی ضرور تھی، مگر اس طرح نہیں جس طرح اس کے یہاں سے جانے سے پہلے ڈیرہ آباد تھا۔ ایک وجہ میر ذکا بھی موجود نہیں تھے پھر خیام اور خلیل کے جانے سے بھی فرق پڑا تھا۔

اس کی گاڑی رکتے دیکھ کر دو تین لوگ محبت سے آگے بڑھے۔ وہ چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائے حال احوال پوچھ اندر کی جانب بڑا۔ برگد کے درخت کے نیچے چار پائیاں پھٹی تھیں، حقہ بھی رکھا تھا، مگر لوگ نہیں تھے۔ وہ برآمدہ عبور کر کرے کی جانب بڑھا۔ بید سے بنی لکڑی کی کرسی پر رجسٹر پھیلانے اذلان بیٹھا کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے کو دیکھ کر چونکا چند بل لگے اپنی ہبراہٹ پر قابو پانے میں۔ خوش حوالہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے دونوں ہانپیں پھیلاتے ہوئے اٹھا۔

سورج ڈوب کر سارا فیصل آباد اپنی سیاحی دھونے کے لے برتی ققوں سے غسل لے رہا تھا۔ شہر کی رونقیں اسے نوجہ کنناں لگ رہی تھیں۔ لیبارٹری سے اسے کال آ چکی تھی اپنی رپورٹس لے جائیں، مگر اس میں اتنی سکت نہیں تھی وہ ان جگہوں پر جاتا جہاں شک کی دلیل موجود تھی۔ اس نے ساری رات ادھر ادھر گاڑی بھگاتے، پیٹرول ڈلوآتے گزار دی اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کل کا سورج اس کے لیے کون سی اذیت لے کر چڑھنے والا ہے۔ دل کی صورت ماننے پر آواہ نہیں تھا اس کی معصوم بی بیوی اسے بھی دھوکا دے سکتی ہے۔ دھوکا بھی ایسا جو بھی مٹانے سے بھی نامٹ پائے۔ دس ماہ کے گزرے پل۔ باری باری دماغ میں کلبلانے لگے۔

روایتیہ کا ادا کیا ایک ایک جلداب ہتھوڑوں کی طرح سماعتوں پر برس رہا تھا۔ ”اگر کوئی غلطی کر کے معافی مانگے، معاف کر دینا چاہیے؟ خواہ غلطی کتنی ہی بڑی ہو۔“ تم اکیلے کہیں بھی جاسکتے ہو، جتنے مرضی عرصہ کے لیے وہ اچھا لگتا ہے، میں کہیں چلی جاؤں وہ اچھا نہیں۔۔۔ کیوں؟ میں بھی انسان ہوں، کچھ خواہائیں ہیں، تنہائی بہت کچھ سکھا دیتی ہے، ”تم سے شادی کر کے پچھتاتی ہوں۔۔۔ وہ مجھ سے ناراض تھا۔۔۔ ہمارا جھگڑا ہو گیا تھا۔ تم آؤ گے پھر سب بتا دوں گی۔۔۔ مجھے اس سے ضروری بات کرنا تھی، وہ شادی سے منع کر رہا تھا، ناراض ہے مجھ سے، میرے پاس بھی ایک خبر ہے، لیکن تم غصہ کرو گے، اب بتا رہی ہو۔ نہیں، بہت کچھ بتانا ہے، جو تم جانتے ہو وہ بھی، جو نہیں جانتے وہ بھی۔“ خلیل کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔

☆☆☆

صبح کا سورج معمول کے مطابق اپنی تپتی کرنیں شہر کے درود یوار پر گرا رہا تھا۔ رات کے جانے کس پہر اس نے اپنی گاڑی کی پیٹرول پمپ پر گھڑی کی اور سوچتے سوچتے وہاں ہی آنکھ لگ گئی۔ پمپ کے درکرز نے آکر اسے جگا کر وجہ پوچھی وہ اٹھ کر ان کے بنے وینٹنگ باغ پر بیٹھ گیا۔ سیاہ رات

”اوہ۔۔“ اس کے ہونٹ ”اوہ“ میں سڑے پھر
 ٹارنل انداز میں بتاتا تھا۔ ”چاچی اکیلے جانا چاہ رہی
 تھیں، پہلے مجھے آ کر سختی سے منع کیا میں ناجاؤں، پھر
 امی سے کہہ دیا، لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“
 اس نے جواباً نفی میں سر ہلایا۔ ”ویسے ہی“ پھر
 توقف سے پوچھا۔

”جب وہ آیا تھا۔ جناب، تم اس روز کہاں
 تھے۔۔۔؟“
 ”بابا کے ساتھ ایسی ہی تھا۔ مگر آپ۔۔۔؟“
 اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے بات
 کاٹ دی۔

”اس کا اور رویہ کیا کس بات پر ٹھٹھا تھا۔۔۔
 کیوں معافی مانگنے آیا تھا۔۔۔ تو پتا ہوگا۔۔۔؟“
 ”اس بات کا مجھے بالکل علم نہیں۔۔۔“ اب وہ
 جان کر نہیں بلکہ سچ سچ حیران تھا۔ اسے حیرت تھی کہ
 اگر انہیں اس رات کا پتا چل گیا تو اب تک تو میری
 بوٹیاں کر دیتے، لیکن وہ تو کچھ اور ہی پوچھ رہے ہیں،
 جو وہ بھی نہیں جانتا۔

”تمہیں کسی بات کا علم نہیں۔“ وہ غصے میں کرسی
 سے اٹھا تھا۔ ”جہاں تک مجھے علم ہے، تمہاری اور اس
 کی بہت دوستی ہے، ہر وقت، ہر لمحہ، پھر تمہیں کیوں
 نہیں پتا، اتنا سب کچھ ہو گیا میرے پیچھے اور تم لا علم
 ہو۔“ حنببل کے اٹھنے پر وہ جھٹکے سے پیچھے ہوا، سانس
 رک گئی۔ اسے لگا چند منٹ بعد وہ زندوں میں نہیں
 ہوگا، مگر وہ ابھی کچھ اور بھی کہہ رہا تھا جس نے اذلان
 کی رکی سانس بحال کی۔

”پہلے تو ہر وقت تم چاچی چاچی کیے آگے پیچھے
 گھومتے تھے، پھر تم نے کیوں نہیں پوچھا، کیا ٹھٹھا
 ان کے پیچھے۔“ چند پل لگے تھے اسے یہ سمجھنے میں مسئلہ
 کچھ اور ہے اور یہی وہ وقت تھا جب وہ حنببل کے سامنے
 اپنا مکمل اعتماد بٹھا سکتا۔ وہ سنبھل سنبھل کر بولا تھا۔

”چاچو۔۔۔ دراصل آپ کے جانے کے بعد
 ۔۔ چاچی بہت عجیب ہو گئی تھیں۔ خواہ خواہ غصہ کرنے

سے آپ کو میری یاد آ رہی ہو۔۔۔“
 حنببل سے لپٹ کر کمر پر زور کی پھینکی دیتے شکوہ کیا
 تھا۔ ”کل سے کہاں تھے آپ۔۔۔ سب پریشان
 ہو رہے تھے۔“
 ”سب میں کون۔۔۔؟“ وہ اس سے الگ
 ہوتے ہی سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”سب میں سب۔۔۔ امی، میں، اعشال اور
 آپ کی منز۔۔۔“ حنببل کے لبوں کو زخمی مسکراہٹ
 نے چھوا تھا۔ آنکھیں موندتے ہوئے کرسی کی پشت
 سے سر نکالیا قدرے پھیل کر آرام وہ انداز میں بیٹھ
 گیا۔ اذلان حیرت سے دیکھتے ہوئے انہیں سمجھنے کی
 کوشش کر رہا تھا۔ دل کا چور زور زور سے دھڑکنے لگا۔
 اسے یقین سا ہو گیا تھا۔ چاچی نے انہیں سب بتا دیا
 ہے تب ہی یہاں اکیلے میں ملنے آئے اور اب جانے
 اس کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔ اس نے اپنے
 دفاع میں جملے سوچنے شروع کیے نیا جملہ ذہن میں
 آتے ہی پرانا نکل جاتا۔ لٹنے اور لوٹنے والے میں
 بہت فرق ہے، لٹے بٹے شخص کا نقصان اس کا گزرا
 کل ہے جو کبھی نہیں کی طرح سینے میں ابھرتا ہے، مگر
 وقت بھول کا مہم رکھ دیتا ہے، جب کہ لوٹنے والے
 شخص کا جرم اس کا ہر آنے والا کل بن کر کسی کام کا
 نہیں چھوڑتا۔ اس کا جرم ظاہر ہو جانے کا خوف پوری
 زندگی کی بے سکونی بن جاتا ہے اور یہی بے سکونی
 اذلان کی زندگی کا ہر آنے والا پل بن گئی تھی۔

حنببل نے بیک سے سر اٹھا کر جب اسے دیکھا
 خوف بھری لہر اذلان کے سارے بدن میں تیری۔
 ”تم شادی پر کیوں نہیں گئے تھے؟“

اذلان کو یہ سوال بہت مختلف اور عجیب لگا تھا، مگر
 اسے اندازہ تھا حنببل سچ اگلوانے کے لیے ایسے گما پھرا
 کر باتیں کرتا ہے، بندہ اپنے دام میں خود آ جائے، مگر
 اذلان کو پھنسا نہیں تھا۔ وہ انجان بن کر بولا۔

”کون سی شادی۔۔۔؟“
 ”میرے پیچھے کئی شادیاں ہوئی ہیں۔“ حنببل
 کے لہجے میں کوفت بھری تھی۔ ”میں رضاحیات کی بیٹی

دائیں اور اس شادی پر سے آ کر تو میری بات کا جواب تو دور کی بات جہاں میں ہوتا وہاں بیٹھنا پسند نہیں تھا، کتنی بار پوچھا بس ایک ہی جواب، مجھے یہاں سے جانا ہے۔ پھر میں کیا پوچھتا۔۔۔ وہ اتنی معصومیت بھرے انداز سے کہہ رہا تھا۔ حبل کیا کوئی اور بھی دیکھتا تو اسے دنیا کا آخری معصوم کہہ کر مہر لگا دیتا۔ حبل کے خون کا درجہ حرارت آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔۔۔ اپنے جڑے تخت سے بھیج کر آواز کی کرختی کو کچھ قابو کیا۔

”میں ڈیرے پر بیٹھتا تھا، گھر کی ایک ایک بات بتا ہوتی تھی مجھے۔۔۔ تم یہاں بیٹھ کر بھی حبل نہیں بن سکے۔“ وہ کہہ کر کان نہیں تیزی سے باہر کی جانب قدم بڑھاتے عقب سے اس نے ہانک لگائی۔

”اب کدھر جا رہے ہیں، آپ؟“

”حبل کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اذلان کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر بات کیا ہے۔ جذب والا کیا قصہ ہے۔۔۔ البتہ اتنا اندازہ ہو چکا تھا چاچی نے ابھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا وہ خود کو مزید محفوظ کرنے کے لیے جلدی سے ان کے پیچھے ہوا تب تک حبل اپنی کاہی لینڈ کروزر اڑاتا نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا پیچھے صرف وہ گردوغبار تھا جو نارتروں اور سالنکس نے چھوڑا تھا۔ اذلان نے اپنی جیب نکالی اور اس رستے پر ڈال دی۔

☆☆☆

کاہی لینڈ کروزر اور جیب آگے پیچھے چوبلی میں داخل ہوئی تھیں۔ اور وہ آسانی برق کی طرح گاڑی کا دروازہ بند کر عمارت کی جانب بڑھا تھا۔ ہاتھ میں چند فائزر پکڑ رکھی تھیں اس کے سفید چہرے سے نارنجی آگ جیسے شرارے نکل رہے تھے۔ بہت دیر ڈیرے پر بیٹھ کر وہ سمجھ رہا تھا اپنے غصے کو قابو کر لے گا۔ کسی طرح روانیہ کا سامنا نہ کرے، جانے غصے میں کیا سے کیا کر ڈالے۔ مگر جوں جوں وقت گزرا تھا اس کا خون ایسے ہی ابل رہا تھا۔ جیسے کوئی ہانڈی چولہے پر

آ نکھوں پر کتنی دیکھے وہ بیڈ پر لیٹی تھی۔ اور مسلسل حبل کو سوچ رہی تھی کہ آخر کہاں ہے فون بھی نہیں اٹھا رہا۔ ناکی میچ کا جواب بھر جانی سے کئی بار پوچھا انہوں نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔ پریشان وہ بچی بے حد تھیں۔ لیکن اب جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا انہیں آنے والے طوفان کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ اب اس طوفان کی لپیٹ میں کون کون آتا ہے یہ اندازہ لگانا فی الوقت ناممکن تھا۔ وہ اسی لیے پیچھے پیچھے آئی تھیں۔ حبل کی آواز پر روانیہ کے بری طرح چوہنے پر وہ خود بھی ڈگمگائیں۔

اس نے آنکھوں سے کتنی ہٹاتے تعجب سے حبل کو دیکھا اس کالب والہ سمجھ سے باہر تھا۔ کل تک تو اسے سہارا دے کر کہہ رہا تھا ”گھر آ کر بتاؤں گا۔“ مگر یہ کیا۔ وہ کتنی کے سہارے سے قناعت زدہ سی لگی۔

”کیا مطلب کیا ہے۔۔۔۔۔ بیٹی ہے۔“ حبل کو اپنے اندر شعلہ بھڑکتا محسوس ہوا تھا۔

”مطلب جانتی ہو اس لفظ کا؟“ اس کا انداز ، لفظ آواز کوئی ایک بات بھی تو اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ بیڈ سے ٹپک چھوڑ کر آگے کو ہوئی۔ حبل جڑے تخت سے جمائے اسے کھا جانے کی حد تک گھور رہا تھا۔

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“ وہ بیڈ سے پاؤں لٹکاتی اٹھنے لگی۔ ”مجھے سمجھ نہیں آیا۔“

”سمجھ تو میں نہیں سکا نہیں۔“ وہ تندگاہوں سے

میں آ رہا تھا۔ آئمہ بار بار ماتھے سے کمرے کی جانب بڑھتے
اڈلان کے قدم چوکھٹ پر رک گئے۔

☆☆
(باقی آئندہ)

”کرن کا دسترخوان“

اب ہر ماہ کرن کے ساتھ مفت حاصل کریں

کرن کا دسترخوان عن ذریعہ کرن کی شرکت کے لیے سلسلہ

”کچن اور آپ“ خزانہ کیا ہمارا ہے۔

آپ اس میں حصہ لیں اور نفع ماہ کے لیے کرن (مفت) حاصل کریں

سوالات یہ ہیں

- 1- آپ کیا کھانے کے لیے جاتا ہے یا چنے کے لیے لکھا جاتا ہے؟
- 2- گھر کے کام کا حصہ کیا ہے؟ میں آپ کی دلچسپی کس حد تک ہے یا پڑھنے کا شوق آپ کو ان کچنوں سے دور رکھتا ہے؟
- 3- ہوشیار نہیں ہوتا کہ کامزور دہائی ہے، کبھی کسی نتائج پر غور نہیں کرتے ہیں۔ ایسے میں کھانے والوں کے کیا تجربے ہوتے ہیں؟
- 4- کون سی بات کو پڑھتے وقت کھانا کھاتے ہیں اس سے حلق کوئی یادگار واقعہ؟
- 5- عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ”ان“ کے دل میں اتارنے کا راستہ صحت سے ہو کر گزرتا ہے۔ آپ اس خیال سے کہاں تک اتفاق کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں کوئی تجربہ ہو ”تجربہ“؟
- 6- لوگ آپ سے زیادہ تر کس ڈش کی فرمائش کرتے ہیں؟ آپ میں اس ڈش کی ترکیب بتائیں۔
- 7- پہلی ڈش کون سی جاتی اور گھر والوں کے کیا تجربے تھے اس ڈش پر؟
- 8- کون سی ڈش کو دیکھ کر آپ کے والد، بھائی یا شوہر کو کھانا جاتا ہے اور پھر ان کا کیا رد عمل ہوتا ہے؟
- 9- گھر والوں کی پسند کی کوئی ایسی ڈش ہے آپ کو کھانا گوار کر دیتی ہے؟
- 10- ایسے کون سے آپ کے دوستے یا پارٹیز ہیں جن کے دوست احباب ہیں جن کی خاطر قوت وضع کے لیے بہن میں جانا آپ کے لیے سخت ناپسندیدگی کا باعث ہوتا ہے؟
- 11- سرال میں کیا پہلی چیز بنائی؟
- 12- آپ کے خاندان کی کوئی خاص ڈش؟

اسے گھورتا دو قدم آگے بڑھا۔ ”میں سمجھتا تھا دنیا کی معصوم، نیک، بے وقوف لڑکی میری بیوی ہے۔ یہ نہیں پتا تھا اتنا سب کچھ کس خاموشی سے کرے گی۔ وہ۔“
”جنبل۔! ابھی ہرنی کی طرح دیکھتے اس کی آواز لرز گئی۔ تھوک نکل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایم سوری جنبل۔۔۔ رینلی، ویری سوری۔“
اس کا خیال سے بھرا ”سوری، رینلی ویری سوری“ جنبل کے جلتے بدن پر پیٹرول کی طرح آگرا تھا۔ رپورٹس لے کر ڈیرے اور ڈیرے سے گھر تک آنے کے دوران اسے مبہم سا گمان تھا شاید کہیں کوئی غلطی ہوئی ہو، شاید یہ خواب ہو کوئی چکا دے، کوئی کہہ دے یہ جھوٹ ہے، اڈلان کوئی سرا ہاتھ دے دے یا رو انیہ ہی کہہ دے ایسے نہیں ہے، اگر وہ کہہ بھی دے تو پھر کیا ہے۔ کیوں ہے، آخری اس کی بی بی کا ڈی۔ این اے سچ کیوں نہیں کر رہا، وہ پری پیچور کیوں ہے۔ شاید رو انیہ ہی کہہ دے یہ اس نے جزم نہیں دی۔ مگر وہ تو بہت آرام سے اپنی غلطی کا اعتراف کر رہی تھی۔

اتنا سب کچھ کر لینے کے بعد ”سوری۔“ اس کے اتنے بے باک سوری پر جنبل کے ہاتھوں کی ہڈیاں اکڑتے ہوئے مٹھی میں پیچھے کھینچ جلد پر سبز رنگوں کا تن کر چال ابھرا آیا۔ کھینچے جڑوں میں گہری ہونی سانسوں نے خون میں شرارے دوڑا دے اس کا جی چاہا ہاتھ بڑھا کر اس کی راج ہنس جیسی گردن دبوچ لے اور اتنا دبوچے کہ وہ اگلی سانس بھی نہ لے سکے۔ ہنسی بھنکیں اچکا کر آنکھیں پھاڑا وہ اس کے مقابل تنا تھا۔ شدید غصے سے جنبل کے گلے کی کٹلی تیزی سے گردن میں تیرنے لگی۔

”یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی، مجھے بتایا ہوتا عزت سے چھوڑ دیتا۔ میرے منہ کو داغ دار کرنے کی جرات کیسے کی تم نے۔“

چپا چپا کر لفظ ادا کرتے آخر میں وہ اتنی زور سے دھاڑا کمرے اور کمرے سے باہر کھڑے نفوس بری طرح سے لرز گئے، اب کیا ہو گا کسی کی سمجھ میں

دلچسپی

بالکل پسند نہ آئی۔ انہوں نے بھائی کی پسند کو بھونٹنے سے انکار کر دیا۔ اور بھائی کی شادی اپنی بھانجی سے کروا دی۔ بھائی اپنی محبت کی ناکامی پر اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نہ ہی ہوم ٹیوشن لیں گے اور لڑکیوں کو تو ہرگز نہیں پڑھائیں گے! ”اب کے غبر نے کھل کر وضاحت کی۔“ ”اوہ۔۔۔ اب میں کہاں سے ٹیچر تلاش کروں گی!“

فروا فکر مند لہجے میں بولی۔

تم پریشان نہ ہو، ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ تم بھی تلاش جاری رکھو کوئی نہ کوئی اچھا ٹیچر مل ہی جائے گا!“ غبر اس کو حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔

دین نے ہارن بجایا تو غبر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اچھا میں چلتی ہوں کل ملاقات ہو گی!“ وہ کہتے ہوئے کالج سے باہر نکل گئی۔



”واہ بھابھی! کھانا تو آپ نے لا جواب بتایا ہے۔“ حسن بھائی کھائیں گے تو انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے!“ غبر تو صوفی انداز میں بولی۔

”کھانا واقعی اچھا بتا ہے؟“ سارہ بے یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

”جی بھابھی! کھانا واقعی لذیذ ہے!“ غبر پر زور انداز میں کہتے ہوئے مسکرائی۔

”ارے بھابھی کیا ہوا؟“ سارہ کو بے تحاشا روتے ہوئے دیکھ کر غبر گھبرا کر بولی۔

”ابھی حسن آئے تھے وہ تو کھانا کھائے بغیر ناراض

”کیا ہے یہ بی بی! اے کی انگلش“ نری مصیبت ہے ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑ رہا۔ پیچہ ز سر پر ہیں اور کوئی ٹیچر ہوم ٹیوشن کے لیے بھی نہیں مل رہا!“ غبر مسکراتے ہوئے فروا کی پریشانی سن رہی تھی۔

”تم مسکرا رہی ہو اور میری جان پر بخ ہے۔۔۔ تمہارے تو بھائی ٹیچر ہیں جو مشکل ہوئی ہو گی پلک جھپکتے میں دور کر دیتے ہوں گے!“ فروا رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں یہ تو ہے!“ غبر کے لہجے میں اطمینان تھا۔

”آئیڈیا۔۔۔ غبر کیا تمہارے بھائی مجھے ہوم ٹیوشن دے سکتے ہیں!“ فروا چٹکی بجاتے ہوئے بولی۔

”ارے نہیں یہ ممکن نہیں ہے!“ غبر نے نفی میں گرولن ہلائی۔

”دیکھو میں تمہارے گھر آجایا کروں گی۔۔۔ زیادہ ٹائم بھی نہیں لوں۔“ صرف ایک گھنٹے کا سوال ہے بابا!“

فروا ہاتھ جوڑتے ہوئے منت بھرے انداز میں بولی۔

اس کے انداز پر غبر مشکل اپنی ہنسی روک سائی۔

”فروا بات آنے جانے کی نہیں ہے وراصل بھائی لڑکیوں کو ٹیوشن نہیں پڑھاتے۔“ غبر نے مجبوری بتائی۔

”کیوں بھی یہ کون سا نیا اصول فیما غورث ایجاو ہو گیا ہے کہ لڑکیوں کو ٹیوشن پڑھانے پر پابندی لگا رکھی ہے!“ فروا شور مچاتے ہوئے بولی۔

”اصل بات یہ ہے کہ بھائی کسی لڑکی کو پڑھانے اس کے گھر جاتے تھے۔ بھائی کو اس لڑکی سے محبت ہو گئی۔ وہ خاصی ماڈرن اور آزاد خیال تھی۔ اسی کو وہ لڑکی

ہو کر رہے تھے؟ سارہ روئے ہوئے ہوئی۔

”لیکن کیوں؟“ غبر سوالیہ انداز میں حیرت سے پوچھنے لگی۔

”وہ کہہ رہے تھے کہ کھانا بہت بد ذائقہ ہے اور انہوں نے کھانے کے برتن بھی پھینک دیے۔ حسن کو تو میری کوئی بات بھی اچھی نہیں لگتی۔ میری ذات میں کیرے نکالنا ان کی عادت بن گئی ہے۔ میری ذات سے اعتماد تک ختم کر دیا ہے۔ اب تم خود ہی بتاؤ کہ میں تمہاری تعریف کو حقیقت سمجھوں یا ان کی برائی کو

!“ وہ آبدیدہ ہو کر بولی اور اٹھ کر چلی گئی۔

”حسن بھائی بھی حد کر دیتے ہیں سارہ بھابھی کا دل دکھانے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ تاجا نے اپنی ناکام محبت کا بدلہ کب تک بھابھی سے لیتے رہیں گے!“ غبر دھکی دل سے سوچ رہی تھی۔



”کیا بات ہے بہت خوش لگ رہی ہو؟“ فردا کو چمکتا



نہیں ہیں۔ بلکہ مجھے تو اکثر لگتا ہے کہ آپ کے رویے نے ان کی شخصیت کو بڑا سا دبا ہے کہ وہ خود کو جاہل سمجھنے لگی ہیں! ”عزیز نے سارہ کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

اسی دوران سارہ آگئی نیلے رنگ کی ساڑھی میں ہلکا سا میک اپ کیے ہوئے بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ ”بھابھی بہت اچھی لگ رہی ہیں!“ عزیز نے دل سے تعریف کی۔ حسن نے سارہ کی سادہ سی تیاری پر تنقیدی نگاہوں سے گھورا تھا۔ سارہ اس کی نظروں کی بڑھی سمجھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

”بھائی اگر آپ کا پیار اور تھوڑی سی توجہ انہیں مل جائے تو ان کی شخصیت کی یہ بے اعتدالی جو آپ کو تکلیف دیتی ہے ختم ہو سکتی ہے۔“ عزیز نے ایک مرتبہ پھر اسے سمجھایا۔

”تم خواہ مخواہ اس جاہل کی وکالت کر رہی ہو۔ لکھ لو ایسی شکلیں بدلنے والی نہیں ہوتی۔“ حسن شعلہ بار نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ تو سارہ بھی آنکھوں میں آنسو لیے خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔

”کیا ہوا عزیز کچھ اب سیٹ لگ رہی ہو!“ فردا سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہر روز ایک حوا کی بیٹی کی آدم کے بیٹے کے ہاتھوں توہین و تذلیل دیکھتی ہوں تو پھر اب سیٹ تو ہونا ہی ہے۔“ عزیز دکھ بھرے انداز میں بولی۔

”اوہ! وہی تمہارے بھائی اور بھابھی کا مسئلہ؟“ فردا نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں وہی مسئلہ۔“ فردا یہ مرد بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ زبردستی اپنی پسند کے خلاف شادی تو کر لیتے ہیں مگر پھر اس زبردستی کی سزا ساری زندگی اس لڑکی کو دیتے ہیں۔ جو بالکل بے قصور ہوتی ہے۔ دیے بھی یہ مرد کون سالوں کیوں کی طرح مجبور ہوتے ہیں جو نافرمانی

ہوا دیکھ کر عزیز نے پوچھا۔

ایک بڑی اچھی خبر ہے۔ ابو کے جانے والے نے ایک ٹیکسچر کار کا بتایا ہے۔ انگلش میں ایم فل کر رہے ہیں۔ بے حد گریس فل پرسنیلٹی ہے۔ فرزا انگلش بولتے ہیں!“ فردا خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔

چلو بھئی تمہارا یہ مسئلہ تو حل ہوا!“ عزیز مسکراتے ہوئے بولی۔

”عزیز وہ اتنے سمارٹ ہیں کہ ٹین ایجر کو پیچھے چھوڑ رہے ہیں!“ فردا رجوش لہجے میں بولی۔

”ویسے مجھے لگ رہا ہے کہ محترمہ کی ٹیچرس زیادہ دلچسپی سے اور پڑھائی میں کم۔ اگر کسی عالم ہا تو بی اے میں آپ کی سہیلی سوفیہ پڑی ہے!“ عزیز ہنسی۔

”ہائے اللہ نہ کرے!“ فردا نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا اب یہ ٹیچر نامہ بند کرو۔۔۔ چلو اب اگلی کلاس اشارت ہونے والی ہے۔“ عزیز نے اسے بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔

”بھائی آپ لوگ کیسے جا رہے ہیں؟“ عزیز نے حسن کو تیار ہونا دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں ایک جگہ ڈنر ہے وہیں جا رہے ہیں۔ لوگوں کو بھی ناجائز کیا سو سمجھتی ہے ٹیکمٹ کو کبھی ساتھ مدعو کر لیتے ہیں!“ اس نے کہتے ہوئے غصے سے سر جھٹکا۔

”حسن بھائی یہ تو اچھی بات ہے کہ سارہ بھابھی بھی آپ کے ساتھ چلی جاتی ہیں ان کے اعتدال میں اضافہ ہوتا ہے!“ عزیز نے قائل کرنے والے انداز میں بولی۔

”اعتدال۔۔۔ اس کے ساتھ تو میرا اعتدال ختم ہو جاتا ہے۔ ناجائز کس دل سے لوگوں سے اس کا تعارف کروانا ہوں۔ امی نے پتا نہیں دنیا سے جاتے جاتے مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا جو اس ایف اے پاس کو میرے پلے باندھ گئیں۔“ حسن کا زہرا گلتا لہجہ عزیز کو دکھی کر گیا۔

”حسن بھائی اب سارہ بھابھی اتنی بھی مگنی گزری

نے پوچھا۔
”نہیں وہ کہہ رہے تھے کہ ضروری کام ہے تم لوگ کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا! سارہ نے کہا۔
”یہ بھائی کچھ زیادہ ہی باہر رہنے لگے ہیں!“ غبر تشویش بھرے انداز میں بولی۔

”اچھا ہے باہر رہتے ہیں کم از کم خوش تو رہتے ہیں!“ سارہ ہم لہجے میں بولی۔

ہائے ری خوا کی بیٹی تو کس مٹی کی بیٹی ہے کہ ہر حال میں اپنے مجازی خدا کی خوشی کی فکر ہوتی ہے۔ جب کہ تیرا مجازی خدا اس کو شش میں رہتا ہے کہ خوشی کو جتنا ہو سکے تیری زندگی سے دور کر دے!“ غبر نے سوچا۔



”بہت خوش لگ رہی ہو؟ ہو گئی تمہارے ٹیچر کی برتھ ڈے!“ غبر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہوں بہت مزا آیا۔۔۔ وہ مجھے بعد میں آکس کریم کھلانے بھی لے کر گئے ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر لگ رہا تھا جیسے میں ہواؤں میں اڑ رہی ہوں۔ اس قدر خوش گوار لمحہ تھا جی چاہ رہا تھا کہ وہ یونسی سدا میرے ساتھ رہیں۔“ وہ کھوٹے کھوٹے انداز میں بولی۔

”اوہ! ہیلو خیر تو ہے محترمہ آج تو بہت افسانوی باتیں ہو رہی ہیں!“ غبر نے شرارت سے اسے چھیڑا۔

”نہیں غبر میں کوئی افسانوی باتیں نہیں کر رہی۔ مجھے لگنے لگا ہے کہ شاید مجھے اپنے ٹیچر سے محبت ہو گئی ہے۔ پہلے تو میں ان کی سحرانگیز شخصیت سے متاثر تھی مگر اب ان کی محبت میرے دل و دماغ پر قابض ہو گئی ہے۔“ فروا دیوانوں کی طرح دور خلاؤں میں گھورتی ہوئی بولی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں! سنبھالو اپنے آپ کو اگر کسی لڑکی کی کان میں یہ خبر پڑ گئی تو خواہ مخواہ پورے کالج میں بات پھیل جائے گی۔“ غبر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”پھیلتی ہے تو پھیلنے دو یہ خبر مجھے کوئی پروا نہیں ویسے بھی عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔“ فروا

”کیا ہو گیا ہے تمہیں! سنبھالو اپنے آپ کو اگر کسی لڑکی کی کان میں یہ خبر پڑ گئی تو خواہ مخواہ پورے کالج میں بات پھیل جائے گی۔“ غبر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”پھیلتی ہے تو پھیلنے دو یہ خبر مجھے کوئی پروا نہیں ویسے بھی عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔“ فروا

کر س کے تو تمام عمر بد دعا میں اور سزائیں ان کا پیچھا کرتی ہیں۔۔۔ یہ تو بالکل بیخ کنی طرح ہوتے ہیں۔ پر جھاڑے اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کسی کی بد دعا اور ناراضی ان کا کیا باگ ڈالتی ہے!“ دکھ سے کہتے ہوئے غبر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”غبر ڈونٹ وری۔۔۔ بایوس نہ ہو واللہ ایک دن سب کچھ اچھا کر دے گا۔“ فروا نے اسے محبت سے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

اور تم سناؤ! تمہارے وہ پیئڈ سم سے ٹیچر کیسے ہیں!“ غبر نے بیخ کن موضوع سے اپنا دھیان ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

وہ بالکل فٹ فاٹ۔۔۔ بے حد فرینڈلی ہیں۔۔۔ بہت خوش مزاج ہیں۔“ فروا جوش سے بولی۔

”یعنی خوب صورتی اور خوب سیرتی دونوں یکجا ہیں!“ غبر ہنسی۔

”بالکل۔۔۔ تمہارے بھائی کا سنتی ہوں تو مردوں سے خوف آنے لگتا ہے اور جب اپنے ٹیچر کا سوچتی ہوں تو لگتا ہے سب مرد بڑے نہیں ہوتے۔ ہائے کاش! وہ میرے اتج فیلو ہوتے“ فروا نے آہ بھرتے ہوئے غبر کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ارے ارے خود کو سنبھالو۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے انہوں نے تمہارے اوپر جادو کر دیا ہے۔“ غبر کی دہائی پر فروا مسکرانے لگی تھی۔

”آج میں نے لاسٹ پیئرڈ تک کرنا ہے!“

”کیوں؟ آج تو بہت اہم لیکچر ہے!“ غبر حیران ہوئی۔

”وہ اصل میں آج میرے ٹیچر کی برتھ ڈے ہے۔ میں نے ان کے لیے گفٹ لینے مارکیٹ جانا ہے تم چلو گی میرے ساتھ؟“ فروا نے بتایا۔

”نہیں فروا تم چلی جاؤ۔۔۔ میں پیئرڈ نہیں مس کر سکتی!“ غبر نے مجبوری ظاہر کی۔ اور فروا نے اکیلے جانے کا ارادہ پختہ کر لیا۔



”سارہ بھابھی! بھائی ابھی تک نہیں آئے!“ غبر

افسوس کی ہے بولتے ہوئے کلاس کی طرف چل پڑی۔
عزیز سارا دن غور کرتی رہی کہ فروا موجود تو کالج میں
ہے مگر اس کا دل و دماغ کہیں اور ہی ہے۔ پورا دن اس
نے بہت بے زاریت سے گزارا لیکن پھر کے دوران پتھر
بھی بہت دفعہ اس کو متوجہ کرنے کے لیے ٹوکتی رہیں
۔۔۔ سارا دن اس کے دل پر اداسی کا اثر تھا۔
اگلے دو دن تک فروا کالج نہیں آئی تو عزیز کو فکر لاحق
ہوئی۔ وہ غیر ذمہ دار تو بالکل نہیں تھی۔ کبھی اطلاع
دیے بغیر چھٹی تو نہیں کرتی۔۔۔ عزیز نے بیک سے
موبائل نکالا اور فروا کا نمبر ملایا مگر اس کا فون آف جا رہا
تھا۔ عزیز کی پریشانی و گئی ہو گئی۔ فروا کی فکر اتنی حاوی
ہوئی کہ عزیز اس کے گھر پہنچ گئی۔۔۔ دروازہ اس کی امی
نے کھولا۔

”السلام علیکم آئی۔۔۔ فروا کیسی ہے؟ خیریت تو ہے
نا!“ وہ اندر آتے ہوئے بولی۔
”کیا بتاؤں بیٹا اس لڑکی نے تو ہمیں مصیبت میں
ڈال دیا ہے!“ فروا کی امی بہت پریشانی سے بولیں۔
”کیا ہوا آئی!“ عزیز گھبرا گئی۔
”نیند کی گولیاں کھا کر خوشی کی کوشش کی ہے اس
لڑکی نے بہت مشکل سے اس کی جان بچی ہے!“ وہ کہہ
کر زار و قطار رونے لگیں۔
”لیکن کیوں آئی؟ ایسا کیا ہو گیا ہے!“ عزیز پر حیرتوں
کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔
”خود ہی پوچھ لو اس سے اپنے کمرے میں ہے!“
فروا کی امی سنجیدگی سے بولیں۔
”فروا یہ آئی کیا کہہ رہی ہیں!“ عزیز اس کے کمرے
میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔
”ٹھیک کہہ رہی ہیں!“ فروا نے آنسو صاف کرتے
ہوئے کہا۔

”لیکن فروا! میری جان یہ کہل کی عقل مندی
ہے تمہارے پیچہ تم سے عمر میں بڑے ہیں۔ مجھے تم
سے اس بے وقوفی کی امید ہرگز نہیں تھی!“ عزیز
افسوس بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
”محبت کا عمر سے کیا تعلق ہے؟ یہ ان تمام باتوں
سے بے نیاز ہوتی ہے!“ فروا نے اپنے موقف کی
حمایت میں بولی۔
”محبت۔۔۔ یہ صرف پاگل پن ہے جسے تم محبت کہہ
رہی ہو۔۔۔ باز آجاؤ ورنہ ساری عمر پچھتا پڑے گا!“ عزیز
نے محبت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔
”جی محبت انسان کو کبھی پچھتانے نہیں دیتی میرا
ایمان ہے اس بات پر!“ فروا مضبوطی سے بولی۔
”فروا! کیا تمہاری محبت یکطرفہ تو نہیں؟“ نبھان
خندے میں گھر کر عزیز بولی۔

”زبان سے تو انہوں نے مجھے اظہار نہیں کیا مگر
عزیز۔ ہر بات زبان سے تو نہیں کہی جاتی میں نے ان کی
نگاہوں میں اپنے لیے پسندیدگی اور پیغام محبت دیکھا
ہے۔ وہ صرف اپنے پیچہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک
اظہار نہیں کر پارہے ورنہ ڈھکے چھپے الفاظ میں تو اکثر
اپنی محبت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔“
”سوچ لو فروا کل کو تمہیں اپنے اسی وقتی جذبے پر
ہنسی آئے گی!“ عزیز غم زدہ ہو کر بولی۔
ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ سوچ چکی ہوں کہ میں
صرف ان سے ہی شادی کر دوں گی!“ فروا نے فیصلہ کن
انداز میں کہتے ہوئے منہ پھیر لیا۔

☆ ☆ ☆
بھابھی! حسن بھائی ابھی تک نہیں آئے!“ عزیز نے
پوچھا۔
”کافی دیر ہو گئی ہے۔“ سارہ پریشانی سے بولی۔
”بھائی اب بہت لیٹ آنے لگے ہیں۔۔۔ مجھے
ٹیسٹ کے متعلق بہت ضروری بات کرنی تھی۔“ عزیز
بولی۔
”ہاں اب تو ان کا زیادہ وقت باہر ہی گزرتا ہے۔“

”لیکن فروا یہ بے وقوفی کس لیے کی ہے!“ اب کی
بار عزیز کی آنکھوں میں برہمی نمایاں تھی۔
”عزیز تمہیں پتا ہے کہ میں اپنے پیچہ سے محبت کرنے
لگی ہوں۔۔۔ مگر امی ابو ان کے ساتھ میری شادی پر تیار
نہیں ہیں!“ فروا ہیکے لہجے میں بولی۔

دے دیتا۔ ”حسن غصے سے دھاڑتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کون سچا تھا اور کون جھوٹا۔ کیا سارہ بھابھی ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ بھائی کسی لڑکی میں انوالو ہیں! ”غیر کا سوچ سوچ کر دماغ بند ہونے لگا تھا۔



رات دیر تک روتے رہنے کی وجہ غمخیز پر مشرودہ سی تھی۔ مگر کالج جانا بھی ضروری تھا۔ کالج میں فروا کو مسکراتے ہوئے پایا۔

”شکر ہے فروا تمہارے چہرے پر مسکراہٹ تو لوٹ آئی! ”غیر اواسی سے مسکراتی ہوئی بولی۔

”مگر تم خاصی اپ سیٹ لگ رہی ہو!“ فروا فکر مندی سے بولی۔

”فروا! بھائی کسی لڑکی سے محبت کرنے لگے ہیں!“ غیر دھک سے بولی۔

”کیا...؟“ فروا حیرت سے اچھل پڑی۔ غیر کی نگاہوں میں غم کے بادل چھائے تھے۔

”ایسے مردوں کو تو کوڑے لگنے چاہئیں جو ایک وقت میں دو دو عورتوں کے جذبات سے کھیل رہے ہوں۔“ فروا غصے سے بولی۔

”کوڑے... ان کا کیا باگاڑ سکتے ہیں۔ یہ اتنے ڈھٹ ہوتے ہیں کہ کھال دوبارہ آتے ہی اسی ڈگر پر چلنے لگتے ہیں۔“ غیر بولی۔

”تمہارے بھائی جب اپنی بیوی کے جذبات نہیں سمجھ سکے تو اس لڑکی کو کیا خوش رکھ پائیں گے مانا کہ اسلام میں مردوں کو ایک سے زائد شادیوں کی اجازت ہے مگر یوں جذبات کا قتل تو نہ کریں۔ سارہ بھابھی کے ساتھ اتنی بے رحمی کا سلوک کر کے خود پھولوں کی بیج سچانا چاہتے ہیں۔“ فروا نفرت سے بولی۔

”اور تم سناؤ... کچھ عقل ٹھکانے آئی۔“ غیر نے آنسو صاف کرتے ہوئے فروا سے پوچھا۔

”لو بھلا میں کون سا کوئی بے وقوفی کا کام کر رہی ہوں بس محبت تو کی ہے۔“ فروا مسکراتے ہوئے بولی۔

کھانا بھی نہیں کھاتے۔۔۔ اکثر رات کو دیر تک فون پر بات کرتے رہتے ہیں نا جانے کیا پریشانی چل رہی ہے۔ کسی سے شیئر کرنے کی بھی تو علوت نہیں ہے۔“ سارہ مزید بولی۔

”چلیں ٹھیک ہے وہ جس وقت بھی آئیں آپ مجھے ضرور اٹھا دیجیے گا۔ صبح میرا بہت ضروری میٹ ہے اور اگر بھائی سے ڈسکس نہ کیا تو بہت مسئلہ ہو جائے گا۔“ غیر نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

باہر سے شور شرابے کی آوازیں سن کر غیر دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے سے باہر بھاگی۔

بھائی اور بھابھی دونوں خوب غصے میں تھے۔

”کیا ہوا بھابھی بھائی کیا بات ہے؟“ غیر بولی۔

”یہ کیا بتائیں گے جن کے دل میں چور ہو گا وہ بھلا سچ کب بول سکتے ہیں!“ سارہ بھڑک کر بولی۔

”تمہارے بھائی صاحب کسی لڑکی سے عشق فرا رہے ہیں۔ ساری ساری رات اس سے فون پر بات کرتے رہتے۔“ سارہ کا لہجہ زہر اگل رہا تھا۔

”بند کرو اپنی بکواس شکی عورت۔۔۔“ حسن سچ برداشت نہ کر سکا تو سارہ کے منہ پر زور دار طمانچہ مار دیا۔

سارہ آنکھوں میں آنسو لیے حسن کے بے رحم چہرے کو تک رہی تھی۔

”جھوٹ ہے سراسر۔“ حسن کا کنور لہجہ اس کی چغلی کھا رہا تھا۔

”یہ جھوٹ نہیں ہے غیر۔ ثبوت ہے میرے پاس یہ دیکھو ان کے محبت بھرے پیغامات۔۔۔ مجھ سے تو ہمیشہ انہوں نے سیدھے منہ بات تک نہیں کی۔“ سارہ نے کہتے ہوئے حسن کا فون غیر کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ حسن نے اسے دھکا دے کر فون اس سے چھین لیا۔

”کن تو تمہارے اندر پہلے بھی کوئی نہیں تھا۔ بس شک کرنے کی کسر رہ گئی تھی وہ خوبی بھی آج تمہارے اندر آگئی۔ جلال، شکی عورت، مرحومہ ماں سے وعدے کا لحاظ نہ ہوتا تو کھڑے کھڑے تمہیں طلاق

☆ ☆ ☆
 جذبات و احساسات کا خیال رکھا جاتا ہے۔۔۔“ فروا
 مسکراتے ہوئے بولی۔

”لیکن فروا تم لوگوں نے اچھی طرح سے معلومات
 تو حاصل کر لی ہے نا!“ غمبر کے لہجے میں انجانا سا خوف
 تھا۔

”ہاں ہاں وادی اماں سب دیکھ لیا ہے۔ وہ دنیا میں
 بالکل اکیسے ہیں ماں باپ تو کافی سال پہلے وفات پا گئے
 تھے۔ غیر شادی شدہ ہیں۔“ فروا مطمئن انداز میں بولی
 ”اچھا اب فضول باتیں چھوڑو۔۔۔ میری مفتی پر آ رہی ہو
 نا؟“ فروا نے چپکے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں ضرور آؤں گی۔“ غمبر نے مسکراتے
 ہوئے سر ہلایا۔

☆ ☆ ☆

”بھائی ایک بات کرنی تھی!“ غمبر نے حسن کو پکارا۔
 ”ہاں بولو!“ حسن نے مڑ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”بھائی اس اتوار کو میری دوست کی مفتی ہے آپ
 مجھے لے جائیں گے!“ غمبر نے پوچھا۔

”اس اتوار۔۔۔ مشکل ہے مجھے اس اتوار کو آؤٹ
 آف شٹی جانا ہے۔ ضروری میٹنگ ہے تم سارہ کے
 ساتھ چلی جانا!“ حسن نے مجبوری بتائی۔

”سارہ بھابھی۔۔۔ آپ کو پتا ہے کہ وہ کتنی اپ سیٹ
 ہیں ایسے میں انہیں ایسی کوئی بات کرنا مناسب نہیں
 لگتا۔“ غمبر بھپکائی۔

”ہاں میں بھی کتنا بے وقوف ہوں جو اس کنویں کی
 مینڈک کے ساتھ تمہیں جانے کا کہہ رہا ہوں وہ تو خو
 اتنی بور شخصیت کی مالک ہے کہ اپنی یاسیت کا اثر
 دوسرے پر ڈال کر دوسرے کا موڈ بھی بریاد کر دیتی
 ہے۔“

حسن نے پھر سارہ کی ذات پر زہر میں ڈوبا طنز کا تیر
 چلایا۔

”تو ٹھیک ہے آپ مجھے کرائے اور گفٹ کے پیسے
 دے دیں۔“ غمبر بولی۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن غمبر کالج آئی تو اس کی نظر فروا پر پڑی جو
 مٹھائی کا ڈبا ہاتھ میں لیے لڑکیوں کو مٹھائی کھلا رہی
 تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔

”سارا کالج مٹھائی کھا چکا ہے اور جسے کھلانے کی
 سب سے زیادہ بے چینی تھی وہ محترمہ اتنی دیر سے آئی
 ہیں!“ فروا نے کہتے ہوئے اس کے منہ میں گلاب
 جاسن ڈال دیا۔

”بھئی پتا تو چلے کس خوشی میں کھلائی جا رہی ہے!“
 غمبر مٹھائی کھاتے ہوئے بولی۔

”غمبر! ایی ابویاں گئے میری محبت جیت گئی۔“ فروا
 خوشی سے نہال تھی۔

”کیا واقعی؟“ غمبر حیرت سے چلائی۔
 ”ہاں اور اس اتوار کو میری مفتی ہے۔“ فروا
 مسکراتی۔

”اور تمہارے بیچرہ مان گئے۔“ غمبر بے یقینی سے
 بولی۔

”خود پر یوز کیا ہے جناب نے مجھے۔!“ وہ ایک ادا
 سے ہال جھٹکتے ہوئے بولی۔ غمبر کی آنکھوں میں حیرت
 بالکورے لے رہی تھی۔

”دیکھو غمبر۔۔۔ سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔
 جیسے سب کی شکلیں اور نام الگ ہوتے ہیں۔ ویسے ہی
 سب کی عادات بھی الگ ہوتی ہیں۔ تمہارے سامنے

تمہارے بھائی کی بے حد سخی مثال ہے جس نے
 تمہاری سوچ اور رائے کو کچ بٹایا ہے۔ مگر میرے بیچر
 تو بالکل مختلف مرد ہیں بے حد کیرنگ، خوش مزاج
 انہیں جب پتا چلا کہ میں نے خوشکشی کی خوشکشی کی تو وہ
 بے حد بے چینی رہنے لگے تھے۔ میرے ساتھ محبت
 بھری باتیں کرتے مجھے اپنے ہاتھ سے دوا کھلاتے پہلے تو

میں ان کی صورت کی دیوانی تھی مگر اب ان کی سیرت
 نے بھی میرا دل موہ لیا ہے۔۔۔ میرا دل چاہتا کہ

تمہارے بھائی سے اپنے بیچر کی ملاقات کروا دوں تاکہ
 ان میں بھی وہ خصوصیات آجائیں کہ کیسے عورتوں کے

رہا تھا۔
 ”واہ حسن بھائی واہ! آپ نے دوسری شادی کرنے کے لیے بیوی کا تو کیا تانا تھا جیتی جاگتی بہن کو بھی مروہ قرار دے دیا۔“ غمخیز کا دل غم سے بھر گیا تھا۔
 فروا حیرت کا مجسمہ بنی غمخیز اور حسن کو تک رہی تھی۔ آنسو ٹھکنے کو بے تاب تھے۔ فروا کا وجود ریت کی دیوار کی مانند بکھرے لگا تھا۔ ”دل بے رحم“ پھر چال چل گیا تھا۔ آدم کا بیٹا پھر حوا کی بیٹی کے ساتھ ہاتھ کر گیا تھا۔ متکئی کی انگوٹھی تو فروا کی انگلی سے اتر کر نا جانے کب کی گر چکی تھی۔ اپنے کرتے وجود کو سنبھالنے کے لیے حوا کی بیٹی نے دیوار کا سار الیا تھا۔
 کیا خوب ہی ہوتا اگر دکھ ریت کے ہوتے مقفی سے گرا دیتے پاؤں سے اڑا دیتے

☆ ☆

”غمخیز کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں اب آئی ہو اب تو متکئی کی رسم بھی ادا ہو چکی ہے۔“ فروا شکوہ کرتے ہوئے بولی۔
 ”بس وہ رکشا بہت مشکل سے ملا تھا اور بھائی بھی شہر سے باہر ہیں۔ لیکن تم شکر کرو میں آگئی۔“ غمخیز نے کہتے ہوئے اسے گلے لگایا۔
 ”بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ غمخیز نے اسے گفت دیتے تو صوفی انداز میں کہا۔
 فروا کے حسین چہرے پر خوشیوں کی کھکشاں جگمگا رہی تھیں۔ محبت کو پالینے کا احساس اس کی نگاہوں سے عیاں تھا۔ غمخیز نے دل ہی دل میں اس کی دائمی خوشیوں کے لیے دعا مانگی۔

”بھئی کہاں ہیں آپ کے وہ ہیرو نما، پنڈت سم سے مگھیتیر۔ آج میں بھی تو دیہکوں محترم میں کیا ہے ایسا کہ تم نے ان کی خاطر جان بھی داؤ پر لگا دی تھی۔“ غمخیز شرارت سے بولی۔

وہ اصل میں حسن ذرا مہمانوں کے پاس سے فارغ ہو جائیں تو تم سے ملواتی ہوں!“ فروا کے لبوں پر شرمیلیں مسکراہٹ تھیں۔

”حسن، بڑا حسن اتفاق ہے کہ میرے بھائی اور تمہارے مگھیتیر کا نام ایک ہے۔“ غمخیز مسکرائی۔
 ”نام ایک ہے مگر میرے حسن لاکھوں میں ایک ہیں بہت محبت کرنے والے انسان ہیں۔ تم ملو گی تو تم بھی بے حد متاثر ہو گی۔“ فروا قفاخر سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”اچھا تم بیٹھو۔ میں حسن کو لے کر آتی ہوں۔“ فروا اپنا بھاری بھر کم لنگا سنبھالتی اندر چلی گئی۔
 ”حسن یہ میری فرینڈ ہے غمخیز اور غمخیز!“ فروا آگے بولتے بولتے رک ٹکائی ”ایک منٹ فروا۔ آگے میں جتا رہی ہوں ان سے ملو یہ ہیں میرے بھائی حسن۔ اور حسن بھائی دوسری بار متکئی پر بہت بہت مبارکباد ہو۔“ غمخیز دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

غمخیز کی آنکھوں میں اشکوں کا سیلاب اٹھ آیا تھا۔ گھبراہٹ اور شرمندگی کے مارے حسن نگاہیں چرا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

لیکھی مشال

مختصر ناول

مکمل ناول کتابیں شامل ہیں شائع ہو گیا ہے

قیمت - 500 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37 روپے پر لکھی

میری نالٹوئی کھٹکے

رکتے ہی انہوں نے اپنے مطلوبہ ڈبے کی طرف دوڑ لگا دی۔ عجیب آہ و بکا کا عالم تھا، لمبی ٹرین کے گرد لوگ یہاں سے وہاں ایسی دوڑیں لگا رہے تھے کہ قیامت کا منظر کا گماں تھا، کسی کا پچھ پہلے چڑھ گیا، تو ٹرین کے اندر بچہ چڑھ رہا ہے۔ ہاں باہر چلا چلا کر تسلی دے رہی ہے۔ ”آ رہی ہوں گند و ٹکر نہ کر، بس یہ مولیٰ تو ند والا چڑھ جائے تو پھر میری باری ہے۔“ کوئی خود چڑھ گیا تو سالان باہر رہ گیا۔ عجیب ہڑونگ مچی تھی۔ وہ تینوں باوجود کوشش کے گاڑی میں سوار ہونے میں ناکام

ہو رہی تھیں۔ سوار ہوتے ہی تو کیسے خالہ درباری کو اپنے قوی الجشہ کے ساتھ چڑھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ آخر جب ٹرین نے وسل دی تو انہوں نے خالہ کو برے دھکیلا اور خود پھرتی سے اندر چڑھ گئیں۔ کھینچ کھانچ کر خالہ کو جیسے ہی اندر چڑھایا گاڑی نے اپنے قدم سر کائے۔



دبا اور شیا جزواں بہنیں تھیں۔ شفیق عالم کو اپنی بیوی عدیلہ سے ایسی محبت تھی جو کسی شاعر کو اپنے دیوان سے ہوتی ہے۔ عدیلہ، شفیق کے محلے میں اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ شفیق کو عدیلہ کے حسن نے ایسا جکڑا کہ ہزار مخالفتیں مول لے کر اپنے گھر کی رانی بنالائے۔ ماں جیسے بیٹی کو اپنے گھر کا ہونے دیکھنے کی منتظر تھی، جو ہی بیٹی اپنے گھر کو سدھاری ماں ملک عدم جا پہنچی۔ عدیلہ اپنے حسن سیرت و حسن

جو انوں پر نظر رکھنے کے بجائے سالان پر نظر رکھو۔ گاڑی کی روشنی سامنے سے نظر آ رہی ہے، دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر میری قیص کا پلو پکڑ لو، جیسے ہی میں ریل گاڑی میں چڑھوں تم بھی پائیدان پر پاؤں رکھ کر میرے پیچھے چلی آنا۔ سنبھل کر چڑھنا، ذرا جو تمہاری نظر پھسلے، پاؤں پھسل کر نیچے مردوں میں بڑی ہوں گی۔ یہ مت سوچنا کہ کوئی بانکا جیلا تمہیں اٹھانے کے لیے آگے بڑھے گا، سب کو اپنی اپنی پڑی ہوتی ہے۔ اللہ معاف کرے، مجھے تو گاڑی پر سوار ہوتے ہوئے شتر کا ساماں محسوس ہوتا ہے۔ ہر کسی کو سوائے اپنی گاڑی میں چڑھنے اور سیٹ حاصل کرنے کے علاوہ کسی دوسرے کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ پاؤں کچلا جا رہا ہے یا اپنی کمنیوں سے دھکے دیتے کسی کی پسلیاں توڑی جا رہی ہیں۔ عجیب بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ خالہ درباری ان دونوں کے کانوں میں اپنی نصیحتیں پگھلے سیسے کی مانند اندر ٹیل رہی تھیں۔ انہوں نے شد و مد سے گردن ہلاتی اور ایک ہاتھ میں سالان اور دوسرے کو دونوں مضبوطی سے تھامے خالہ کے پیچھے ہو لیں۔ چٹکی سے خالہ کی قیص کا پلو بھی پکڑ لیا۔ ٹرین سے پہلے ایک ٹرین تیار ہو چکی تھی۔ عجب مضحکہ خیز نقشہ پیش کر رہی تھیں وہ تینوں، مگر یہاں پر کسی کو انہیں دیکھنے کی فرصت ہی کب تھی۔ خالہ صبح کہہ رہی تھیں۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے۔ جوں ہی گاڑی کی دھک پلٹ فارم پہ گونجی ان کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ٹرین میں سفر کرنے کا یہ ان کا پہلا تجربہ تھا۔ ٹرین



طرح المے تلے کرتے دیکھتیں تو ہو کے (آپیں) بھر کر رہ جائیں۔ انہوں نے اپنے پاؤں پہ خود کھڑائی ماری تھی۔ شفیق نے تو پہلے ان ہی سے اپنی بیٹیوں کو رکھنے کا کہا تھا، مگر انہوں نے کوراچنا جواب دے دیا۔

”بھائی برامت ماننا“ میرے اپنے پانچ بچے مجھے ہلکان کے رکھتے ہیں۔ میں کہاں اس جوڑی کی پرورش کر سکوں گی، جوڑوں کا درد مجھے چین ہی کب لینے دیتا ہے۔“ انہوں نے زمانے بھر کی تھکن لمحے میں سمو کر زندگی گود اس جوڑی سے بھردی۔ شاکرہ بچیوں کو گود میں لیے چپ بیٹھی رہیں، نہ ہاں کی، نہ نا، بھائی نے ان کی خاموشی کو رضامندی سمجھ کر حب دیا، شیبہ کے ننھے منے ہاتھوں میں ہزاروں کے نوٹ دہائے تو انہوں نے جھٹ اس جوڑی کو سینے سے لگایا۔ آنکھوں میں آنسو اٹھ ائے۔ (بارے خوشی کے)

بھائی کو یقین دلایا کہ ان کی چنداں فکر نہ کرنا اپنی چنداں سے بھی زیادہ لاڈلیاں بنا کر رکھوں گی۔ مائی بشری نے جو ہرے ہرے نوٹوں کی ہمار دیکھی تو دل مسوس کر رہ گئیں۔ کاش ان نوٹوں کی جھلک شفیق عالم پہلے دکھا دیتے۔ تو وہ دیا، شیبہ کو اپنے کلیجے سے چٹا لیتیں۔ مگر

اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں جگ گئیں کھیت۔ زند کے حالات تو دونوں میں بدل گئے، گھر کی آرائش و گھریلو اشیا کی بے دریغ خریداری، دیکھ کر بشری کی رالیں ٹپتی رہتیں جنہیں ان کا افریقی بالوں والا بیٹا ان کے دوپٹے میں جلدی سے جذب کرنا مبادا پچھو ان کا مذاق اڑانے لگیں۔

دیا اور شیبہ جوں کی حدود کو چھونے لگیں تو پچھو کا رویہ ان سے کشیدہ ہو گیا، بات بے بات روکنے ٹوٹنے لگیں، پہلے پہل تہمتوں پر اعتراض ہوا، پھر دوپٹے گلے میں ڈالنے پر اور اس کے بعد اپنے فرزند ارحمند شعیب سے مخصوص بازی پر تیوریاں چڑھنے لگیں۔ بیٹے کو علیحدگی میں خوب لٹاڑا کہ خبردار ان سے یارے کا سوچا بھی تو آنکھیں نکال کر پھیل کر رکھ دوں گی۔ وہ بھس بھسے دماغ ڈرپوک دل کا بگ کر بیٹھ گیا۔ ماں

صورت سے شفیق کے دل پہ حکمرانی کرنے لگیں۔ شفیق کا تو یہ عالم تھا کہ آنکھیں دن کا آٹنا عدیلہ کے سرخ روشن کو دیکھ کر کرتیں تورات کو مایتالی چرو سمو کر سوتیں۔ ایسی دالمانہ محبت دیکھ کر دنیا (رشتہ دار) تو کلی لکڑی کی طرح سلگ ہی رہی تھی۔ آسمان کو بھی شفیق کی بیوی سے الفت آنکھ میں کھٹکنے لگی۔ خیر سے عدیلہ امید سے ہوئیں تو دار فتنگی میں منگانی کی طرح روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ ادھر دیا اور شیبہ نے دنیا کو دیکھنے کے لیے آنکھیں داکیں، ادھر عدیلہ نے ہمیشہ کے لیے دنیا سے آنکھیں موند لیں۔ شفیق کی تو دنیا اندھیر ہو گئی۔ گرمی میں سورج کی تمازت بھی کیا تزیائے جو عدیلہ کی جدائی ان کے جسم و جاں کو دن رات جھلسا رہی تھی۔ دن بھر اشکوں کا سیلاب ہستا تو رات کو محبوب بیوی کی یاد میں پورا بدن سلگتا، کسی بل عدیلہ کی یاد دل کا دامن نہ چھوڑتی۔

دیا اور شیبہ اپنی جنت کھوجانے سے بے خبر مائی اور پچھو کی گودوں کے آسے پر رہیں، ایسی صابر بچیاں کہ نہ ماں کے کچھرنے کا غم کیا نہ باپ کی بے توجہی پر

منہ بسور۔ شفیق نے اپنے غم کا یہ حل نکالا کہ دیں نکالا ہو گئے، یہ سوچ کر کہ شاید عدیلہ کی جدائی کا درد ان فاصلوں سے ان تک پہنچنے میں ناکام رہے اور واقعی وہ اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی رہے، تھوڑی بہت جو بیوی کی شبیہ آنکھوں میں اتر کر بی تھی، اس کی جگہ ان کی دوسری جرمن بیوی کی نیلی آنکھوں نے لے لی تھی۔

دیا اور شیبہ سے ان کا اتنا ہی واسطہ رہا کہ ایک کثیر رقم ہسن کے اکاؤنٹ میں جمع کر دیا دیتے جو پچھو بہ تم اپنی اولاد کو عیش کرانے میں زیادہ صرف ہوئی، آخر کو ان کا بھی اس روپے پر پورا حق تھا۔ گورنس کے فرائض پوری طرح سر انجام دے رہی تھیں۔ حالانکہ بھائی سال میں دو چار بار کسی آتے جاتے کے ہاتھ ڈھیروں تحائف ان کے اور بچوں کے لیے بھیجا کرتے۔ بڑی بھابھی دیا، شیبہ کی مائی امی عمند کو اس

طلب کر کے لینے والا آجائے۔

پھپھو کی پونے قد اور سانپوں رنگت والی چندا کے رشتے کی تلاش شروع ہو چکی تھی، مگر اس کا سانولا پن اور چھوٹا قد ہر بار رشتے کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جاتا۔ مزید ستم یہ ہوتا کہ دیبا اور شیدا مہمانوں کا پر تپاک استقبال کرتیں۔ بعد اصرار ٹیبل پر رکھے لوازمات موتیوں سے دانتوں کی پوری نمائش کر کے کھلائے جاتے کہ آنے والے مہمان اور مستقبل کے نوٹے میاں ان پر فریفتہ ہو جاتے، پھپھو لاکھ گھوڑیں، انہیں وہاں سے آشادوں ہی اشاروں میں اٹھ جانے کا کہتیں، مگر وہ لاہروا بنی ان کا دل جلاتی، لڑکے کے سامنے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ براجمان رہتیں۔ بعد میں شاکرہ ان کے ایسے لتے لیتیں کہ کوئی حساس بندہ ہوتا تو ان کے زہریلے لہجے سے چار دن بستر سے نہ اٹھتا، مگر وہ دیبا اور شیدا تھیں، ان کے تن فن کرتے لہجے کے سامنے ان کی کھل کھل ہنسی شاکرہ کے وجود میں انگارے بھر دیتی۔ اگر بھی ان دونوں کو ان کی تائی بشری کے ہاں بھیجنے کا ارادہ کرتیں تو وہ فون پر کورا جواب دے دیتیں۔

”بھئی دیکھو، ان دونوں بہنوں کا میری طرف رخ نہ

سے کچھ بعید نہ تھا کہ جو کہا تھا کر دکھائیں۔ وہ تو پھر بیٹا تھا، باپ کی مجال نہ تھی کہ ادھر ادھر جھانک لیتے، ہمیشہ ناک کی سیدھ میں چلا کرتے، چاہے تو دیوار سے ٹکرائیں یا کسی لاچار سے۔ وہ اپنی سیدھ سیدھی رکھتے۔

شاکرہ کی ہتھیوں سے کھچاؤ کی بھی ایک وجہ تھی۔ شفیق عالم نے کافی عرصے سے انہیں پیسے بھیجنے سے ہاتھ کھینچ رکھا تھا اور جو کبھی تھوڑے بہت بھیجتے بھی تو وہ اتنی ناکالی رقم ہوتی کہ بمشکل دیبا، شیدا کی ضرورتوں کو ہی پورا کر پاتے اور اب ان بے چاری کی ضرورتیں رہی ہی تھیں، پھپھو نے میٹرک کروا کر گھر بٹھا لیا کہ گھرواری سیکھ، انہیں بھی بڑھائی میں ایسی خاص دلچسپی نہ تھی، سوا ایک ہن نے کچن سنبھالا تو دوسری کو گھر کی صفائی کی مہم پر لگادیا۔ کچن سنبھالنے کا فائدہ یہ ہوا کہ دیبا اپنے لیے بھنا بھنا گوشت نکال کر ساندز پر رکھ دیتی، شاکرہ لاکھ ان پر نظر رکھتیں، مگر وہ بھی نظر بچا کر اپنا کام دکھا دیتی، جبکہ شیدا صفائی کی مہم کے دوران ہر فرد کے بہت سے رازوں سے آشنا ہو چلی تھی۔ پھپھو اگر ان سے خار کھانے لگی تھیں تو انہوں نے بھی انہیں زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

اب تو گھر کا تقریباً ہر فرد ان سے ٹالال رہنے لگا تھا۔ ان کی دو دو تکی روٹی بوجھ لگنے لگی بات بے بات طعن ملنے لگے، دن بھر پھپھو اور ان کی اولاد کا مقابلہ کرنے والی دیبا اور شیدا رات کی تنہائی میں ایک دوجے کے آنسو بوجھ کر آنے والے دنوں کے لیے ہمت باندھتیں، کبھی بھار باپ کی شکل ٹیٹ پر بات کرنے سے جو نظر آجایا کرتی تھی، اس سے بھی گھٹیں۔ آنکھ کے ساتھ دل بھی روتا۔ اداسیوں کی آماجگاہ بنا دل دوسروں کے سامنے کھوکھلے قہقہے لگانا کہ ان کو یہ گوارا نہ تھا کہ ان پر ترس کھایا جائے اور وہ خامشی سے اپنوں کے ظلم سہی رہیں۔ تائی، پھپھو کے سپوت ماں کی نظروں سے بچ بچا کر ان کے گرد منڈلاتے تو وہ خاطر میں نہ لاتیں۔ انہیں اپنی کردار کشی ہرگز گوارا نہ تھی۔ بس وہ تو اس انتظار میں تھیں کہ جلد کوئی ان کو ان کی سچی

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول



دستِ میا
مچھ میا

قیمت - 400 روپے

مکمل ڈائجسٹ

کتابخانہ ڈائجسٹ 37 - اردو ادب کی تاریخ - ڈاکٹر 32735021

کلاس کو کوئی مسئلہ ہو گیا تو دنیا سارا الزام میرے بچوں کے سر تھوپ دے گی اور یہ دودھ کی دھلی دھیزا میں صاف بچ نکلیں گی۔“ بشری کا جواب سن کر وہ دل مسوس کر رہ جاتیں کہ کریں تو کیا کریں، عجیب ہڈی بنی ہوئی تھیں وہ دونوں ان کے لیے نہ کھائے بنے نہ اگلے۔



ہر یار مسترد ہونے کا دکھ سانونی چندا کے سانولے پن میں مزید اضافہ کیے جا رہا تھا۔ بیٹی کا دکھ شاکرہ کا دل بڑھا دیتا۔ اس دن بھی وہ چھت پر کونے میں بیٹھی وظیفہ کر رہی تھیں۔ شیا پھپھو کو سارے گھر میں نہ پا کر فوراً اوپر چلی آئی۔ اس کا خیال صد فیصد درست ثابت ہوا۔ وہ گرگڑا کر اپنی بچی کے لیے اچھی جگہ پر رشتہ ہونے کی دعا میں کر رہی تھیں۔ اچھی جگہ سے ان کی مراد لڑکا ماں کے سایہ شفقت سے محروم ہو۔ باپ ہٹا کٹا کھانا کھاتا ہوا، تاکہ بیٹے پر بوجھ نہ بنے اور بہن، ایک دو ہوں تو اپنے سسرال کو پیاری ہو چکی ہوں، آگے میری بیٹی کی زبان اور اوامیں سب سنبھال لیں گی۔ شیبائے خویوں انہیں رو کر دعائیں مانگتے دیکھا تو دل میں ہوک سی اٹھی۔ کاش آج ہماری ماں زندہ ہوتی تو ہمارے لیے بھی متفکر ہوتی۔ ماں کے خیال نے آنکھ سے چند آنسو چپکے سے نیچے لڑھکادیے۔

”پھپھو۔“ وہ ان کے قریب آکر پکاری تو شاکرہ اچھل پڑیں۔ انہوں نے کاٹ کھانے والی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور جلدی سے دعا کے لیے پھیلائے ہاتھ منہ پہ پھیرے۔

”کم بخت جو تک کی طرح چٹ گئیں، کہیں بھی چین نہیں لینے دیں گی۔“ وہ ہڑبلا کر رہ گئیں۔ شیبان کے قریب ہی پھسلا مار کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے جلدی سے جا نماز سیٹی۔

”پھپھو۔ میں آپ کا درد جانتی ہوں۔“ رقت آمیز لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ان کے دونوں ہاتھ

”ہائیں۔ کیسا درد؟“ وہ چونکیں۔
”بیٹی کے رشتہ نہ ہونے کا غم ماں کو کیسے رلاتا ہے۔ یہ میرا دل جانتا ہے۔ راتوں کو آپ کروٹیں بدل کر اپنا وقت گزارتی ہیں۔ چاند کی مدھم روشنی میں آپ کے دکھ لوں چمکتے ہیں کہ ماروں کی چمک ان کے آگے چھپکی پڑ جاتی ہے۔“

”مے زیادہ لفظوں کی مار نہ مار۔ دس جماعتیں کیا پڑھ گئی چاند تاروں کی باتیں کرنی آگئیں۔ نہ مجھے یہ بتا کہ میری کروٹیں تو کیسے بدلتے دیکھتی ہے۔“ انہوں نے جھپکے سے اپنے ہاتھ چھڑائے اور چشمکیں نگاہوں سے گھورا تو شیا یک ٹک ان کو دیکھنے لگی۔

”پھپھو! یہ فکر چھوڑ دیں کہ میں آپ کو کیسے کروٹیں بدلتے دیکھتی ہوں، بس میں تو آپ سے انتہائی کہوں گی کہ چند بابائی کے رشتے کی فکر چھوڑ دیں۔“
”دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا بیٹی کے رشتے کی فکر کیسے چھوڑ دوں؟ کیا بیٹی نہیں بیاہنی مجھے اور تو یہ بتا تو چند بابائی کہنا نہیں چھوڑے گی۔ سال دو سال بڑی چھوٹی میں کیا فرق ہے اور میری چندا تو ویسے بھی تم دونوں بہنوں سے چھوٹی لگتی ہے۔“

”سچ کہہ رہی ہیں پھپھو۔ چند بابائی ہم سے کافی چھوٹی لگتی ہیں۔ ہم دونوں ہمیں سرو قامت اور وہ بے چاری فریزر میں سے برف کے کنورے بھی اچک اچک کر نکالتی ہیں۔“ شیا اپنی کئی بات پہ خود ہی مسکائی۔

”اچھا۔ اب اپنی اول فول بند کر، اٹھ یہاں سے نیچے جا کر دیکھ دیہانے کھانا تیار کیا کہ نہیں۔“
”دیہانے کھانا تیار کیا یا نہیں؟ اس کا تو مجھے نہیں پتا“
ہاں البتہ چند بابائی نے شادی کے لیے لڑکا تیار کر لیا ہے۔“ اس نے آنکھیں منکا کر انکشاف کیا تو ان کے تئیر بدل گئے۔

”جبکہ اس بند کر الزام لگا رہی ہے میری بچی پر۔ کہاں سے کون سا لڑکا شادی کے لیے تیار کر لیا۔ ہر وقت تو کمرے میں بند پڑی رہتی ہے۔ یہ تو تم ہی دونوں ہمیں

چھلا وہ جو کبھی چھت پر تو کبھی ساتھ والوں کے۔
 ”ہاں تو کمرے میں بند پڑی نہیں بک پر جانے کتنے
 لڑکوں کو انہوں نے پناہ رکھا ہے، وہ تو میں اس دن ان
 کے کمرے کی ڈسٹنگ کر رہی تھی کہ موبائل پر لکھا
 دیکھا۔ چندا باجی واش روم میں تھیں، وہ لڑکا تو ان کے
 عشق میں ٹخنوں ٹخنوں گرفتار ہو چکا ہے، بس آپ نیک
 کام میں دیر نہ کریں، جلدی سے ان سے معلومات لے
 کر لڑکے کو بلا کر رشتہ پکا کریں۔“ وہ ان کے بدن میں
 شرارہ چھوڑ کر سیڑھیاں پھلا نکلتی رہ جاؤ جا۔

”کم بخت ہر کسی کی ٹوہ میں لگی رہتی ہے۔ اللہ
 کرے یہ بات درست ہو میری چندا نے تو میری مشکل
 آسان کر دی۔ یا اللہ تو نے کتنی جلدی میری سن لی یہ
 وظیفہ تو مدرسے والی ساجدہ باجی نے بالکل صحیح بتایا کہ
 مکمل ہوتے ہی خوش خبری ملے گی، ابھی دوا مکمل بھی
 نہ ہوئی کہ میرے رب نے رشتہ بھیج دیا۔ اے میرے
 پروردگار! تیرا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔“ دل میں
 خوش ہوتے ہوئے وہ بھاری وجود کے ساتھ جو جلدی
 جلدی سیڑھیاں اترنے لگیں تو آخری سیڑھی پر ایسا
 پاؤں مڑا کہ وہیں فرش پر سجدہ ریز ہو گئیں۔ دیا عشیا کی
 دلی دبی ہسی انہیں اس وقت ایسی بری نہ لگی جو عام
 حالات میں لگا کرتی تھی۔ انہوں نے دیا کا خود کو
 اٹھانے کے لیے بڑھایا ہوا ہاتھ جھٹکا اور گرل کا سارا
 لے کر اٹھ گئیں، ان کا دھیان تو بس چندا کے پھنسائے
 لڑکے کی طرف تھا، شکر ہے کوئی کام تو اس نے ڈھنگ
 کا کیا۔ آئے دن موبائل پر ایرانی لوڈ کرائے گئے پیسے
 جیسے آج وصول ہو گئے تھے۔

انہوں نے جو چندا سے استفسار کیا تو پہلے پہل تو وہ
 گھبرائی، مگر جب ماں نے حوصلہ دیا تو اس نے اعتراف
 کرنے میں ذرا تامل نہ کیا کہ ایک دو مرغوں کو اس نے
 چھانٹ رکھا ہے، جو زیادہ سپر لیس تھا۔ اس نے اس کا
 قصہ بیان کر دیا۔ ماں نے فوراً لڑکے سے ملاقات کا
 ٹائم لینے کو کہا تو اس نے بھی بلیوں دل اچھلنے محبوب
 سے ملنے کا کہہ دیا۔ معلومات لینے پر پتا چلا کہ وہ بزنس
 میں ہے۔ بازار میں اپنی ذاتی دکان ہے۔ شاکر نے کہا۔

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گیمیلو اسٹائیکلو پیڈیا

کیانا خزانہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
 سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول



کیمیلو اسٹائیکلو پیڈیا

رنگین لکچر

قیمت - 300 روپے

نحلی حلیہ میں



فلاخو جین

قیمت - 400 روپے

”جی تیرا بھی ملنا مناسب نہیں، پہلے مجھے چپ چاپ تحقیق کرنے دے۔“

”جلاوطنی گفت سینئر۔“ یہی نام بتایا تھا۔ شاکر نے دکان کا نام بڑھ کر اندر قدم رکھا۔
”جی آئی جی بتائیے کیا چاہیے۔ کسی پرانی سیپلی کو گفت دینا ہے، بڑھے شوہر کو یا بوائے فرزند کو۔“ کاؤنٹر پر بیٹھا لڑکا پیشہ وارانہ انداز میں تیز تیز بولا۔
”اے لڑکے! ملنا تو خراب نہیں ہے تیرا اس عمر میں، میں کیا بوائے فرزند بناؤں گی۔“ تیوری پر بل ڈالے وہ چادر سنبھالتے ہوئے بولیں۔

”اچھا۔“ اچھا میں سمجھ گیا، آپ نے اپنے بڑھے شوہر کو شادی کی پچیسویں سالگرہ کا تحفہ دینا ہے، یہ دیکھیے یہ ان کے لیے کافی مناسب رہے گا۔ اللہ کے گھر کا دیدار بھی ہوتا رہے گا اور چاروں قل بھی یاد ہو جائیں گے کہ آج کل فرشتہ اجل کا کام زوروں پر ہے، دوست احباب، محلہ، رشتہ دار تیزی سے اس دار فانی سے کوچ کر رہے ہیں۔ سو قل شریف پڑھنے میں آسانی رہے گی۔“ اس نے ایک ڈیکوریشن پس ان کے سامنے کیا۔

”جب کہ بہت بولتا ہے تو۔ یہ تو تو نے ٹھیک کہا کہ شادی کو پچیس برس گزر گئے، پر اتنے برسوں میں کیا میرا شوہر بڑھا ہو گیا۔! تیرے ساتھ لاکھڑا کروں تو لوگ تیری طرف کم میرے شوہر کو زیادہ دیکھیں گے۔“

”جی۔۔۔ جی مجھے اندازہ ہو گیا بیشہ مضحکہ خیز چیز کو ہی زیادہ دیکھا جاتا ہے۔“ روائی میں منہ سے جملہ نکلا اور شاکر کے گھورنے برداشتوں میں زبان دہلی۔ وہ اس کی شرمندگی دیکھ کر ڈانٹنے کا ارادہ ملتوی کر گئیں۔

”بیٹا! اصل میں مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ دکان کس کے نام ہے۔“ ان کا انداز سرکشانہ تھا۔

”نام تو جی یہ بڑے حاجی صاحب مرحوم کے ہے، مگر آج کل چھوٹے حاجی صاحب اس کو اپنے نام رجسٹری کروانے کے چکر میں ہیں، کیونکہ ان کے مرنے کے

بعد تو وہی اس کے اصل مالک ہیں۔“
”ناشاء اللہ۔۔۔ نو جوانی میں رنج بھی کر رکھا ہے، کوئی بہت ہی نیک گھرانے کا نیک صفت بچہ ہے۔ یہ حاجی صاحب اس وقت کہاں پر ہیں۔“

”آج تو جی ان کا بیٹا دینی سے آ رہا ہے، اسی کو لینے اور پورٹ کئے ہیں، کوئی کام تھا ان سے تو مجھے بتائیں۔“ شاکر سوچ میں پڑ گئیں کہ یہ حاجی صاحب تو اس عمر میں بھی لڑکیاں پھنسا رہے ہیں۔

”بیٹا مجھے کلیم نام کے بندے سے ملنا ہے، اسی دکان کا بتایا تھا اس نے کہ یہ میری ذاتی دکان ہے، کبھی کچھ خریدنا ہو تو آجاؤ۔“ کچھ ہچکچاتے ہوئے انہوں نے بات کی تو وہ لڑکا حیرت سے انہیں تنکے لگا۔

”آئی بہت افسوس ہوا جو ان لڑکوں کو تو ایف بی پر عشق بگھارتے دیکھا تھا، آپ بھی ان چکروں میں پڑ گئیں۔“

”بیٹا جیسی تیری شکل ہے، ویسی ہی تیری عقل ہے۔ اس سفید ہوتے چوندے کے ساتھ میں ایف بی پر لوٹدے پھنساؤں گی کیا۔“ انہوں نے اس کے سر پر ایک چپٹ لگائی تو وہ لڑکا خاموش ہو گیا۔

”تو پھر کلیم سے کیوں ملنے آئی ہیں۔“

”بس تو مجھے کلیم کی شکل دکھاوے، کام تو میں اسی کو بتاؤں گی۔“

”آپ مانیں یا نہ مانیں کلیم نے پھر سے ایف بی پر کوئی چکر چلایا ہے۔ آئی جی اس کا تو سارا دن یہ ہی کام ہے۔ ادھر گوشت بنا رہا ہوتا ہے اور ادھر فیس بک پر لڑکیوں کو پٹا رہا ہوتا ہے۔ حاجی صاحب نے کلیم کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا رکھا ہے۔ اسے ذاتی کام بھی کروا کے دیا جب بھی کسی لڑکی کو ملنے کا تاثر دیتا ہے حاجی صاحب کی دکان کا انڈریس بتا دیتا ہے، کتنی مرتبہ حاجی صاحب سے جوئے کھا چکا، مگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ وہ بے چارہ بھی کیا کرے، دو بیویاں چھوڑ کر جا چکی ہیں، ایک مرگئی، دوسری طلاق لے کر کسی دوسرے کی ہوئی، اب تیسری نہ کرے تو کیا تھا مرے۔“ اس باتوں لڑکے نے ساری معلومات فراہم کیں۔ تو شاکر کا سر چکر اکر

رہ گیا۔
 ”علیم اس وقت کہاں پر ہے۔“ مرے مرے لفظ
 نکلے وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر دکان سے باہر لے آیا۔ دو تین
 دکانیں چھوڑ کر ایک پھٹے کی طرف اس نے اشارہ کیا۔
 وہ رہا علیم فیس بک عرف کلو قصائی۔ لڑکا انہیں حیران
 چھوڑ دیا بارہ دکان میں جا گھسا اور وہ مرے قدموں سے
 کلو قصائی کی طرف چل دیں، رشتہ نہ سہی دو کلو
 گوشت ہی خرید لیں۔ مطلوبہ جگہ پر وہ پہنچیں تو ایک
 مستنڈا افریقی رنگت کے بدن میں چٹا سفید بنیان پہنے
 قہمے بنائے میں مصروف تھا۔ دو چار باتوں سے تصدیق
 ہوئی کہ یہ وہی وہ لوٹا ہے جسے ان کی دختر بے وقوف
 نے اپنے چنگل میں پھنسا یا ہے، گھر آکر وہ اس پر برس
 پڑیں۔

”کلم بخت یہ ہی ملا تھا تجھے پھانے کو۔“

”کیا ہوا امی، کیا پہلے سے شادی شدہ ہے۔“ وہ ماں
 کے اتنے شدید رد عمل پر یہی نتیجہ اخذ کر پائی۔
 ”پہلے سے شادی شدہ ہوتا تو بھی گوارا تھا، مگر وہ تو کم
 بخت کا قصائی نکلا۔“

”ہائے میں مر گئی۔“ چندا نے دل تھام لیا۔ ”جب
 ہی بد ذات مجھے میرا دل، جگر کہا کرتا تھا۔“ روائی میں
 اس کے منہ سے پھسلا تو ماں کے گھورنے پر شرمندگی
 سے سر جھکا لیا۔

”دے اوھر، تو کسی کام کی نہیں، سارے پیسے
 پھونک ڈالے۔“ شا کر نے اس کا موبائل اپنے قابو
 میں کیا، ایسے تو سو رشتے ہوا نصیبین روز لے کر آتی
 ہے موبائل چھین جانے پر چندا کے چہرے پر مردنی
 سی چھا گئی۔

درباری خالہ داوی کی سہیلی کی بیٹی تھیں۔ سرگودھا
 کے تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت پر کسی قصبے
 میں شادی ہوئی تھی۔ سال دو سال بعد وہ طے کے لیے
 چلی آئیں۔ پچھو انہیں دیکھ کر منہ اوھر اوھر کر کے
 ناک بھوں تو بہت چڑھا نہیں، کیونکہ وہ دس بارہ دن کی

مسمان تو ضرور بنتی تھیں، مگر ان کے اسے ساتھ لائے
 سازو سامان کو دیکھ کر چہرے پر پھلکی ہنسنے لگا
 لیتیں۔ کسی گھی کے ڈبے، کسی اینڈے اور کسی
 مرغیاں جب ان کے پیٹ میں پختہ تھیں تو ہر بندے
 کے منہ سے یہی فقرہ نکلتا۔

کتنی سندر کتنی پیاری
 خالہ درباری، خالہ درباری

شعیب تو باقاعدہ خالہ درباری کے گلے میں بازو ڈال
 کر لہک لہک کر گاتا اور پھوپھو اور چندا سر دھنے
 جاتیں۔

”ایک نمبر کا چالپوس ہے یہ خالہ درباری اس کی
 باتوں میں مت آئے گا، کسی گھی اور کسی مرغی کے
 لالچ میں آپ کی تفریقیں کرتا ہے، آپ کے بیٹے پیچھے پتا
 ہے آپ کو کیا کہتا ہے؟“ خالہ درباری نے چونک کر دوبا
 کی طرف دیکھا۔

”کیا کہتا ہے؟“ ان کے ماتھے پر بل پڑنا شروع
 ہو گئے چندا کی کھنکار پھپھو کی گھوری اور شعیب کے
 ہاتھ بجا کر جوڑے ہوئے ہاتھ اس کی زبان کو روکنے
 میں ناکام ہو رہے تھے۔

”بوڑھی گھوڑی لال لگا۔“

”کیا۔؟“ خالہ کی بلی کی طرح چمکتی آنکھیں
 شعیب کو خوف زدہ کر گئیں۔

”ہائیں۔۔۔ ہائیں یہ کہا اس نے مجھے۔“ وہ یہ سن کر
 لال چلی ہو گئیں۔ شعیب نے جھٹ کانوں کو ہاتھ
 لگائے۔

”ایک نمبر کی جھوٹی ہیں یہ دونوں بہنیں۔ میں نے
 یہ کب کہا۔ میں نے تو بس اتنا ہی کہا تھا کہ خالہ کو اب
 سفید رنگ سے انسیت ہوئی چاہیے کہ کیا پتا کب پھنسا
 پڑ جائے۔“ اس کی بات سن کر جہاں دوبا اور شیبانے
 قہقہہ لگایا وہیں خالہ درباری نے اپنے مکھن ملائی
 کھائے مضبوط ہاتھوں کا دھموکا جڑا تو وہ ہائے کر کے
 اپنی کمر پکڑ کر دوبا ہو گیا۔

”مے خالہ کس کی باتوں میں آرہی ہیں یہ دونوں تو
 میرے جگر کے ٹکڑے کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گئی ہیں

”ہائے۔۔۔ سڑکوں پر یوں ریں! دی حالت درباری زندہ ہے۔“ انہوں نے اپنے سینے پہ ہاتھ مارا۔

”پچلو لڑکیوں تیار کر فیصلہ ہو گیا تم دونوں اب میرے ساتھ چلو گی ایسے گھر میں رہنے کا کیا فائدہ جہاں خون ہی سفید ہوں۔“ خالد درباری نے اپنا فیصلہ سنایا دبا اور شیا جیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

”ہاں۔۔۔ ہاں لے جاؤ ان کو شوق سے۔ مجھے بھی انہیں اپنے پاس رکھنے میں چنداں دلچسپی نہیں ہے جب سے پیدا ہوئی ہیں میرے سینے پر مونگ دل رہی ہیں اچھا ہے ان بلاؤں سے میرا گھر پاک ہو جائے۔ جانے کیا کیا بدھ کر چھوکتی ہیں کہ میری بچی کا رشتہ ہی ہونے میں نہیں آ رہا یہ“ لگیں تو میری چندا کا نصیب جاگے۔ ”شاکرہ اپنی جون میں آگئیں شرافت و بشاشت کا جو لبیاہ چہرے پر سجا رکھا تھا ایک دم اندر کھینکا وہ دونوں بھی بھٹ پٹ تیار کر کے خالد درباری کے ساتھ ان کے گاؤں جانے کی تیاری کرنے لگیں۔

”اچھا ہے اس گھر سے تو جان چھوٹے جہاں ہر وقت عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔“ دونوں بہنیں ڈڈائی آنکھوں سے اپنی ضرورت کی چند اشیاء بیگ میں رکھتی بیڑے لگیں۔



گاڑی سبک رفتاری سے بڑھتی چلی جا رہی تھی یہ ان دونوں بہنوں کا ریل کا پہلا سفر تھا ہر اسٹیشن پر سوار یوں کی آمدورفت سیٹ کے لیے لڑائی جھگڑا تو تیار ان کے لیے انوکھی تھی۔ چیزیں بیچنے والے بار بار چکر لگا رہے تھے خالد نے آواز دے کر ممنوعہ بیچنے والے کو اپنے پاس بلایا وہ دوڑا چلا آیا۔

”جی اماں۔۔۔“

”میرا بیٹا مجھے یہ بتا دے کہ تو یہ آواز حلق سے نکالتا ہے یا ناک سے“ ”ڈال اے اے اے کراری دال اے اے اے“ خالد نے ہو ہو ہنسی کی تو ڈبے میں موجود سب ہی ہنسنے لگے وہ بے چارہ شرمندہ سا ہو گیا۔

”ماں یہ آواز پیٹ نکالتا ہے میرا۔ خالی پیٹ جب

ان کی اداؤں کے حال میں جو نہیں پھنستا اب کسی نہ کسی طرح انتقام تو لیتا ہے ہاں ان کو۔“ شاکرہ بیٹے کی اس طرح دھمکانی و بے عزتی پر مارے غصے کے الزام تراشی پر اتر آئیں۔

”خالد درباری! سن رہی ہیں ہاں آپ یہ پھپھو ہم پر کیسے گھٹیا الزام لگا رہی ہیں حالانکہ آپ جب بھی آتی ہیں بچی گھونچو نہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں پٹانے کی کوشش کرتا ہے اگر ہم نے اس کو اپنے جال میں پھنسانا ہوتا تو کب کی کوئی سی بہن کورٹ میرج کر کے اس چند کو ماں باپ سے جدا کر کے کسی جھوٹری میں چین کے گیت گارہی ہوتی۔ کتنی ہی مرتبہ اس نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی۔ گواہوں اور مولوی تک کا انتظام کر لیا مگر میں نے یہی سوچا کہ نہیں ماں کے بکچہ کو چین کر بھلا میں کیسے سکون سے رہ سکتی ہوں۔“ ”میاں آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بے جنہیں شیا نے بچے کرنے سے پہلے ہی اپنے ہاتھوں میں جذب کر لیے دونوں بہنیں گلے لگ کر خوب بین کر کے روئیں۔ وہ زار و زار روئیں تو خالد درباری کا کلیجہ کٹ گیا حسرتوں کو اپنی ہانوں میں بھر لیا۔

ادھر شعیب کی حالت دیدنی تھی جسے ماں کچا چبا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ بھری محفل میں ان دونوں بہنوں نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا وہ دم دیا کر وہاں سے بھاگتا ابھی غصے کا اظہار کرتی وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چل دی۔

”ہائے میرے بچپوں! مجھے کیا بتا تھا کہ تم دونوں کے ساتھ اتنا برا سلوک ہو رہا ہے کچھ کچھ اندازہ تو ہو رہا تھا مجھے پر یہ علم نہ تھا کہ ایسی بد سلوکی سے پیش آ رہی ہوگی یہ مولیٰ شاکرہ!“

”خالد ان چڑیلوں کی باتوں پہ کان نہ دھرو میں بھلا اپنے خون کے ساتھ ایسی بد سلوکی کے بارے میں سوچ سکتی ہوں۔ انہوں نے ہی میرا ناک میں دم کر رکھا ہے جینا حرام کر دیا ہے مجھ سمیت میری اولاد کا۔ باپ تک شکل دیکھنا گوارا نہیں کرتا میرا دم نہ ہو تو سڑکوں پر ریں دونوں بہنیں۔“

بچے بھوکے گھر بیٹھے ہوں تو پیٹ سے خود بخود کراہی آواز نکلتی ہے۔

”میرے بچے کیسی سولہ آنے کھری بات کی ہے۔“
خالہ درباری نے اس کی بات سے متاثر ہو کر اسے
گڈے بالوں پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر مزید رگڑا۔
”اچھا یہ بتا یہ تیری دکان کا سامان کتنے کا ہے۔“
انہوں نے اس کے سامان کا طائرانہ جائزہ لیا۔

”یہی کوئی چار ہزار کے لگ بھگ۔“
”تو بس پھر یہ سامان تو ہوا میرا۔ یہاں رکھ دے۔“
”ہاں آپ مذاق تو نہیں کر رہیں۔“ وہ حیران
پریشان تھا۔

”اے بیٹا مجھے یہ بتا میری عمر ہے تیرے سے مذاق
کی۔“ انہوں نے اپنا ہوا کھولتے ہاتھ روک کر اسے
دیکھا۔

”نہیں اماں وہ بس۔ میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔“
”لے بیٹا یہ تیرے چار ہزار روپے گھر پر پوری فوج
تیار بیٹھی ہوگی کہ اماں ہمارے لیے چیزیں لے کر آئے
گی ان ہی کے لیے لے جا رہی ہوں۔“ خالہ نے اس
کے ہاتھ میں پیسے پکڑائے اور اپنا سامان سائڈ پر رکھا
کچھ دال، بسکٹ اور ٹافوں کے پیگٹ انہوں نے ڈبے
میں موجود بچوں میں بانٹ دیے۔ بچے خوش اور دال
والا بھائی شکر ادا کرتا چلا گیا۔

دبا اور شیا خالہ کی دریا دلی اور رحم دلی کی قائل
ہو گئیں دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو نیکی کمانے کا کوئی
موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔



تھوڑی دیر پہلے ان کے بالکل سامنے والی سیٹ پر دو
گندمی رنگت کے لڑکے آکے بیٹھے تھے سنجیدہ برہنہ
سے مجال ہے جو انہوں نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر
انہیں دیکھا ہو حالانکہ وہ دونوں ہمیں نظر انداز کرنے
کی چیز تھیں کوئی ایک بار دیکھ لے تو نظریں چل چل
جائیں مگر وہ بتا نہیں شرافت کی کسی مٹی سے بنے تھے
جنہیں صف مخالف سے آنکھیں سینکنے میں کوئی دلچسپی

نہ تھی۔ ایک کوئی اپنی طرح سنجیدہ سی کتاب پڑھنے
میں مشغول تھا تو دوسرا باہر کی جانب بھاگتے دوڑتے
مناظر پر نظریں جمائے تھا۔

”ہائے کیا بور سفر گزار رہا ہے سارے بڑھے
کھوسٹ، چرسی، بھنگی، نضنی آنکھیں بھاڑ بھاڑ کر
ہمیں گھور رہے جا رہے ہیں اور جن کو کھورنا چاہیے وہ
آنکھوں پر شرافت کی پٹی باندھ کر بیٹھے ہیں۔“
شیانے اتنی زور سے دبا کے کان میں سرگوشی کی
کہ سامنے بیٹھے وہ دونوں جوان سن لیں اور انہوں نے
سن بھی لی تھی مگر شرافت کے دائرے میں سے انہوں
نے نہ نکلنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”آہ۔ میں نے تو سنا تھا کہ ریل کے سفر میں اکثر
سیٹنگ ہو جاتی ہے رہائشی تے اور فون نمبرز کا بھی
تبادلہ ہو جاتا ہے کئی کے رشتے آپس میں ملے جاتے
ہیں مگر یہاں تو رشتے چھوڑ فرشتے آنکھ تک ملانے نہیں
دے رہے۔“ شیانے سرد آہ بھر کر اپنے دل کو سمجھا
بجھا کر تھپک تھپک کر سلا دیا۔ ”خالہ آپ کا گاؤں کب
آئے گا۔“ شیانے جھنجھلا کر خالہ کو جھجھوڑا تو وہ ہڑبڑا
کر اٹھ بیٹھیں۔

”آگیا اسٹیشن، چلو جلدی کرو، سامان پکڑو، گاڑی
زیادہ دیر نہیں رکتی یہاں۔“ انہوں نے پاؤں میں
چھکیل پھینیں۔ جنہیں ٹرین میں سوار ہوتے ہی اتار کر
شارپ میں ڈال کر تکیے کا کام لے لیا تھا۔ دونوں ہمیں سر
پیٹ رہ گئیں۔

”م بھی نہیں آیا ہم آپ سے پوچھ رہے ہیں کب
آئے گا۔ تین گھنٹے ہو گئے ہمیں اس ٹرین میں چھکولے
کھاتے۔“ خالہ نے کڑی کھول کر باہر جھانکا سورج
دم دبا کر بھاگ چکا تھا۔ شام کے سرمئی اندھیرے نے
باہر کا منظر دھار دھار اسرار سا بنا دیا تھا۔

”بس جوں ہی شام رات کے گلے لگے گی، اپنے
گاؤں کا قریبی اسٹیشن آجائے گا۔“ خالہ کا جاپنچے کا پنا
ہی انداز تھا۔

”واہ آٹاؤں کا تو ایک دوسرے سے گلے لگنے کا
سن۔“ دبانے بھورے بالوں اور گری ناک دالے لڑکے

کو دیکھ کر رحمہ کسا تو وہ اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔

”وہ مارا۔“ دہانے شیبہ کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔
”آگیا بھی، آگیا لڑکا لائن پر آگیا۔“

”کہاں۔؟ کہاں۔؟“ زنجیر پھینچو جلدی سے، آئے کسی کے کچے کا ٹکڑا کٹ کر نہ کر پڑے۔ مومے آج کل کے لڑکے بھی ناٹاں، باپ کی محبت کو بھاڑ میں جھونک کر نیلی پٹی آٹکھوں والی کے عشق میں ناکام ہو کر اپنی جان ریلوے لائن پر دینے آجاتے ہیں۔“
خالہ کا دوا پلا شروع ہو گیا۔ تو کئی مسافر اٹھ کھڑے ہوئے اس سے پہلے کہ زنجیر پھینچتے دہانے کھڑے ہو کر چلانا شروع کر دیا۔

”نہ پھینچو، نہ پھینچو جرمانہ ہو جائے گا، میں تو ویسے ہی مذاق کر رہی تھی۔“ اس کی بات سن کر کچھ نے ناک بھوں چڑھائی تو کچھ زیر لب مسکرا دیے۔

ذرا دیر بعد ہی رات شام سے بغل گیر ہوئی۔ خالہ نے اپنا سامان ہاتھ میں پکڑ کر ٹرین کے گیٹ کے قریب ہونا شروع کر دیا۔ وہ دونوں بہنیں بھی خالہ کے ساتھ کھٹکے لگیں۔ جاتے سے ایک بار بھی انہوں نے ان لڑکوں پر ایک اچھتی نگاہ تک نہ ڈالی تھی۔ کیا فائدہ جس گلی کا راستہ ہی نظر نہ آئے، وہاں پر پاؤں رکھنا ہی حماقت ہے۔ وہ دونوں دھیمی دل کے ساتھ ٹرین کے رکتے ہی پیچھے چھلانگ لگا گئیں۔ خالہ کو بھی بانوؤں میں بھر کر پیچھے آنا۔

اسٹیشن سنسان پڑا تھا۔ اکا دکا مسافر بیچوں پر بیٹھے تھے۔ رات کا وقت پورے اسٹیشن پر سناٹے کا راج تھا۔ ان کے دل کو خوف نے جکڑ لیا۔ وہ خالہ و درباری کے ساتھ لگ گئیں۔

”گھبراؤ مت، تمہارا شہر نہیں کہ چوراچکے، لچے، لفٹنگے تمہا عورتوں کو دیکھ کر گھیرے میں لے لیں گے۔ یہ تمہاری خالہ کا گاؤں ہے، سب ماں بیٹیوں کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مجال ہے جو کوئی میلی آنکھ سے کسی خاتون کی طرف نظر بھی ڈالے۔“

”اچھا۔“ وہ حیران ہوئیں۔
”ہاں نہیں تو کیا۔ اس اسٹیشن کے آس پاس چار“

پانچ گاؤں ہیں، ویسے تو سب ہی گاؤں والے عورتوں کی عزت کرتے ہیں، پر تمہاری خالہ کے گاؤں کی بات ہی الگ ہے۔ گاؤں میں جو بھی کانا نظر آئے گا سمجھ لینا اسے آنکھیں سینٹنے کی سزا آٹکھ پھوڑ کر دی گئی ہے۔“
”کیا۔؟“ اس انکشاف پر ان کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ”صحیح کہہ رہی ہوں، بڑا صاف ستھرا ماحول ہے میرے گاؤں کا۔ کسی نے ہاتھ سے چھیرا تو ہاتھ توڑ دیا، آنکھ مٹکا لیا تو آنکھ کا ٹیلا پھوڑ دیا، کسی لڑکی کے پیچھے پڑا تو لنگڑا ہوا۔ یہاں تو اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے والا معاملہ ہے۔ سب لڑکیاں بالیاں بے خوف ہو کر گھر سے نکلتی ہیں۔“ خالہ و درباری گاؤں کے اوصاف بیان کرتی جا رہی تھیں اور وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اسٹیشن سے باہر ان کے ہمراہ چل رہی تھیں۔

”لے بھی شیبہ یہاں تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ میں یہاں سے کالی اور تو لنگڑی ہو کر نکلے گی۔ اس لیے اپنی حرکتوں پر کنٹرول کرنا پڑے گا۔ جب لڑکوں کے گئے یہ سزا ہے تو لڑکیاں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوں گی۔“ دہانے خوف سے جھرجھری لی تو شیبہ بھی سسم گئی۔

”سوچ لیں گے، فی الحال تو تیز قدم اٹھاؤ، دیکھو تو خالہ و درباری کے اپنے گاؤں میں اگر قدموں میں کیسی جان آگئی ہے۔“ وہ تیزی سے چلتی ہوئیں، خالہ کے برابر ہو گئیں۔

”سلام خالہ۔“ ایک کو چوان ان کی طرف بڑھا۔
”وعلیکم السلام۔“ خالہ نے اس کے آدھے منہ سے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس نے مسکراتے ہوئے جلدی سے سامان ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

”کیا بات ہے خالہ، اس دفعہ واپسی جلدی ہو گئی۔“
”بس بیٹا! جب بزرگوں کا ادب احترام دل سے رخصت ہو جائے تو اپنے گھر کی راہ لینی ہی پڑتی ہے۔“
خالہ نے سر دھرتے ہوئے ان دونوں کے دپٹوں کو آگے کی طرف کھسکا کر گھونکھٹ کاٹھ دیے۔ ”یہ کیا تم مردوں کو پٹر پٹر دیکھ رہی ہو، آنکھیں پٹی کر کے دوڑنے کو چہرے سے نہ ہٹانا۔“ خالہ نے سر کو شی میں

سیسہ کی ٹوہہ دل مسوس کر رہے ہیں۔ وہ ہاتھ میں
چمکولے اور پیچ و تاب کھاتی خالہ کے گھر کی طرف
گامزن تھیں۔



ایک کنال کے رقبے پر پھیلی حویلی ان کی نظروں کو
حیران کر گئی۔ یہ بڑے بڑے کمرے برآمدے، بڑا سا
مجن سب جگہ جگہ رہا تھا۔ ساتھ ہی دیوار کے بکریوں،
بھینسوں کا بارہ تھا۔ اپنے گھر کا دودھ، مکھن ملائی سب
دستیاب تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک طرف مرغیوں
کے ڈربے تھے مختلف رنگوں اور سائز کی مرغیاں
یہاں وہاں کٹاک کٹاک کرتی مرگشت کر رہی
تھیں۔ مچن کے آخری حصے میں گیٹ کے پاس کچھ
زمین بھی تھی۔ جس کو لان کی شکل دے رکھی تھی۔
مختلف پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ ایک سائڈ پر پی
لمبی سی کھدائی میں ہر ارضیا، پودہ نہ آنکھوں اور دل
کو خوشی فراہم کر رہے تھے۔ ”لیموں، انار اور امروہ کے
درخت ہوا سے اٹکھیلیاں کرتے، مسکرا مسکرا کر اپنا
پھل انہیں پیش کر رہے تھے۔ دیبا اور شیاہ سب دیکھ
دیکھ کر کھلی جارہی تھیں۔ صاف ستھرا سکون ماحول
نے ان کے ذہن کی ساری بے چینیوں کو دھو کر جیسے
اجلا کر دیا تھا۔ وہ سرشار سی یہاں وہاں چہرے شوق سے
دیکھتی پھر رہی تھیں۔ خالہ درباری انہیں یوں خوش
دیکھ کر جیسے مطمئن سی ہو گئیں۔ ورنہ انہیں یہ ہی
دھڑکا لگا تھا کہ شہری ماحول کی پروردہ یہ لڑکیاں شاید
گاؤں کے ماحول کو پسند نہ کریں مگر وہ تو جب سے آئی
تھیں خوش باش چلتی پھلتی ہی پھر رہی تھیں۔

دیبا اور شیاہ کو یہاں آکر پتا چلا کہ خالہ درباری کا نام
درباری کیوں رکھا گیا۔ صبح کاموں سے فارغ ہو کر گاؤں
کی خواتین اور لڑکیاں خالہ کے بڑے سے دالان میں
جمع ہو جاتیں۔ اپنی اپنی بریثانیوں کو خالہ کے سرد
کرتیں، تو وہ منٹوں میں انہیں سلجھا کر ان کے بوجھ کو
ہٹا کر دیتیں، سب کے منہ سے ان کے لیے دعاؤں کے
مٹلے نکلتے، وہ چوڑے رنگین پالوں والے اونچے سے

موتھے پر بیٹھی لگا کر میں کہ جن کے دربار
میں لوگ حاضریاں دینے آتے اور اپنی الجھنوں کو
سلجھا کر جاتے۔ بچن میں کھانے پک رہے ہوتے،
جس کا دل چاہے کھا کر جائے اور جس کا دل چاہے وہیں
شام تک قیام کرے۔ مائیں اپنی بچیوں کو بے فکر ہو کر
خالہ کے گھر بلیجیتیں صبح سے شام تک ان کے گھر میں
روتی لگی رہتی۔ کوئی کڑھائی کر رہی ہے، تو کوئی
سلانی۔ سارے گھر کا کام سنبھال رکھا تھا ان لڑکیوں
نے، صفائی، ستھرائی، کھانا پکانا سب ان ہی کے ذمہ تھا۔
خالہ تو بس صبح سویرے لٹی پلوٹیں، مکھن نکالتیں اور
نہا دھوا پنے دربار میں بیٹھ جاتیں۔

خالہ بڑے درویش صفت بندے تھے۔ وہ صبح کا
باشتا کر کے گھر سے نکلتے تو شام کو گھر کی راہ لیتے۔ ان
کے لیے کھانا، لسی، چائے ہر چیز وہیں پہنچ جاتی۔

خالہ درباری کی کوئی اولاد نہ تھی، مگر گاؤں کی بچیاں
ان کی اولاد کی مانند تھیں۔ اپنی اولاد کا سکھ تو نصیب
سے ملتا ہے۔ یہاں خالہ بے اولاد ہو کر بھی اولاد والوں
سے زیادہ اولاد کا سکھ پاری تھیں۔ بچے بڑے بوڑھے
سب ہی ان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے، وہ دونوں
تو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتیں۔ خالہ نے کبھی اپنی زمینوں
اور امارات کے قصے انہیں نہ سناے وہ تو سمجھ رہی
تھیں کہ وہ عام سی گاؤں کی عورت ہوں گی جو بس اپنے
شوہر کی ہر بات میں خوش حال زندگی گزار رہی ہیں۔
پھپھو اگر ان کے یہ ٹھٹھاٹھ دیکھ لیں تو غش کھا کر گر
پڑیں۔



”چلو بھی کنواریوں، تیاری کرلو، آج سب نہر پر
چلیں گے۔ اچھا، اچھو اور شیدے کو چوان کو میں نے
کہہ دیا ہے کہ تانگا تیار رکھیں۔ تم بس جلدی سے
کھانے پینے کا سامان تیار کرو۔“ خالہ نے حکم دیا تو
سب لڑکیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ جلدی جلدی
ہاتھ چلانے لگیں۔ کچھ ماؤں کو ہاتھ چل دیں اور کچھ
تیار ہونے۔ وہ دونوں بھی پر جوش ہوتی تیار ہونے

ہنسنے لگیں۔ تانگے وقفے سے ایک بڑے چھل وار درختوں سے لہے پھندے بلوغ کے قریب رک گئے۔ وہ سب نیچے اتر گئیں اور بلوغ کے احاطے میں آگئیں۔

دیا اور شیا بڑا نرس کی سی کیفیت میں تھیں۔ ایسے گاؤں کا نقشہ انہوں نے صرف کتابوں میں پڑھا تھا۔ مگر آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ بڑی لمبی اور چوڑی نہرواں دواں تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے صنف نازک کے پیراہن سے انکھیلیاں کرنے لگے تاحہ نگاہ پھیلا سبزہ ہندی کا مدہم شور ماحول کو بڑا خوف ناک بنا رہا تھا۔ وہ بے اختیار ہو کر خوشی سے بازو پھیلا کر گول گول گھومنے لگیں۔ خالہ درباری ان کو دیکھ کر مسکرا دیں۔

”تو بھی میں تو یہاں آرام کروں گی، تم لوگ گھوم پھرو، کوئی ڈر خوف نہیں سارا علاقہ اپنا ہے۔“ ایک ادھیڑ عمر آدمی خالہ کے آرام کرنے کے لیے چارپائی لے آیا تھا۔ ان دونوں نے اپنے جسموں کو چادر کی قید سے آزاد کیا اور تہ کر کے خالہ کے سر کے نیچے رکھ دیں۔

”دلیں خالہ آپ کا تکیہ۔ اب ہمیں آزادی سے گھومنے دیں۔“ وہ کہہ کر تیزی سے نہری طرف چل دیں۔

”دھیان سے نہر کے زیادہ قریب نہ ہونا بڑا تیز بہاؤ ہے۔“ خالہ درباری زور سے بولیں تو انہوں نے دور سے ہی ہاتھ کے اشارے سے انہیں تسلی دی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے خالہ کو پل میں نیند کی واہیوں میں لے گئے۔ وہ دونوں آپ آزاد تھیں۔ وہ نہر میں پاؤں ڈالے پانی اچھال رہی تھیں۔ لڑکیاں ان کا اس طرح سے دیوانہ پن دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔

”باجی جی! کیا آپ کے شہر میں نہریں نہیں ہوتیں؟“ رانی پران نہروں کا یہ خواب ناک و سحر انگیز ماحول نہیں ہوتا۔ یہ پلانت یہ سبز یہ پر رونق سماں شہر میں کہاں دستیاب ہے۔“ وہ منسلک پانی سے کھیل

لگیں۔ نہری سیران کے لیے ایڈو سچر سے کہن تھی۔ ان دونوں نے کھلتے رنگوں کے سوٹ زیب تن کیے۔ لائٹ سائیک اپ کر کے بالوں کو شانوں پہ کھلا چھوڑ دیا۔ پھیلا کر دوٹالیا اور باہر چلی آئیں۔ جہاں خالہ اور لڑکیاں ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ جیسے ہی باہر آئیں سب لڑکیوں کی ستائشی نظریں انہیں شرمندہ کر گئیں۔ وہ سب ان کو ایسے نکارتیں جیسے کوئی باورائی مخلوق زمین پر اتر آئی ہو۔ سب لمبے لمبے رنگ برنگے پرائڈے ڈالے ہرے لال، پیلے رنگوں کے سوٹ پہنے تیار کھڑی تھیں۔ زیادہ تر کے لبوں پر مسخ لپ اسٹک تھی۔ لگتا تھا کہ ایک ہی لپ اسٹک سے سب نے استفادہ کیا تھا۔ بڑی بڑی چادروں سے انہوں نے اپنے آپ کو ڈھانپ لیا۔

”چلو کنواریوں! یہ دوپٹے تہ کر کے اس شاہر میں رکھو اور یہ چادریں اوڑھو۔“ خالہ نے دو بڑی بڑی کڑھائی والی چادریں ان کے سپرد کیں۔ ”مگر خالہ ہمارے دوپٹے کالی بڑے ہیں۔“ وہ منمنائیں۔

”شرم و حیا عورت کا زیور ہے، مرداسی عورت کی عزت کرتا ہے جو اپنے جسم کی حفاظت کرتی ہے یہ جالی کا دوٹا تمہاری نسوانیت چھپانے سے قاصر ہے۔ لہذا یہ چادریں لے کے نقاب کرو، تاکہ غیر محرم کی نظروں سے محفوظ رہو، گلے میں دوٹا ڈالے منہ چمکائے خود مردوں کو دعوت نظامہ دیتی ہیں، پھر کتنی ہیں۔ فلاں ہمیں گھور رہا تھا۔ فلاں نے ہمیں دیکھ کر سینی بجائی کسی نے جملہ کسا۔ جب خود نمائش کروا دی تو مرد تو نظروں و زبان سے وار کریں گے ہی۔“ خالہ کی بات سن کر وہ دل موس کر رہ گئیں۔ باری باری سب تانگوں میں سوار ہو گئیں۔ وہ جان بوجھ کر اس تانگے میں بیٹھیں جس میں خالہ درباری نہیں تھیں۔ ورنہ سارے راستے ان کی چادر ہی دورست کرائی رہتیں، انہیں تو ابھی سے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ خالہ کا تانگا پیچھے تھا اور وہ اگلے تانگے میں آگے بیٹھی تھیں۔ سوچے کو فوراً ہی نقاب سے آزاد کیا۔ لڑکیاں ان کی اس حرکت پر دبلی دبلی ہنسی دیاں تو وہ بھی خفت سے

رہی تھی۔ ”اچھا۔“ وہ درخت حیرت میں۔ کیا تم لوگ کبھی شرمیں لگیں۔“

”میرے چاچے کے پتر شرمیں رہتے ہیں، یہ بڑی کوٹھی ہے ایک واری میں کئی تھی۔ اس کے بعد نہ جانے کی قسم کھالی۔ چاچی کا تو مزاج ہی نہیں ملتا۔ باجی یہ شہر کے پڑھے لکھے لوگ اتنے روکھے مجاز (مزاج) کے کیوں ہوتے ہیں، گاؤں والوں کو کج سمجھتے ہی نہیں۔“ بڑی بڑی آنکھوں والی نرگس نے دیبا کی آنکھوں میں جھانک کر سوال کیا تو وہ نہ بڑی۔

”ہم بھی تو شہر سے آئی ہیں، کیا تم لوگوں کو ہمارا مزاج روکھا لگتا ہے۔“

”وہ تو پھر ہماری پھپھو ہیں، بابا کو دیکھو جن سے ہمارا قدرتی رشتہ ہے۔ انسان ہر رشتے کے بغیر رہ سکتا ہے، مگر اولاد کے بغیر نہیں۔ جب وہ ہمیں بھول سکتے ہیں۔ ہماری پروا نہیں ہے تو پھر باقی رشتوں سے شکوہ تو بے معنی ہے۔“ وہ چلتے چلتے کافی دور نکل آئیں۔ دونوں کے چروں پر اواسی نے بال بکھیر دیے تھے۔ وہ تھک کر نہر کے کنارے بیٹھ گئیں۔ یہ دیکھے بغیر کہ یہاں ان کے علاوہ بھی کوئی ذی روح موجود ہے۔

”ہیلو۔“ کوئی ان کے بے حد قریب سے پکارا۔ وہ اچھل پڑیں۔

”محترمہ سنبھل کے اگر میں ہاتھ نہ پکڑتا تو آپ نہر میں غوطے لگا رہی ہوتیں، ہمیں تو تیرنا بھی نہیں آتا۔ دل پر پتھر رکھ کر حسین دوشیزاؤں کو سفاک نہروں کے سپرد کرنا پڑتا۔“

”آ۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ وہی ہیں نا جو ٹرین میں۔۔۔“

”جی۔۔۔ جی بالکل، ہم وہی ہیں جو ٹرین میں شریف دوشیزہ کا روپ دھارے زبان پر اہل فنی اور آنکھوں پر حیا کی چادر ڈالنے بیٹھے تھے۔“ بھورے بالوں والے نے سر جھکا کر شوشی سے بولا۔ دیبا کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

”آپ یہاں کیسے۔“ دیبا نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”آپ یہاں جیسے۔۔۔ اس نے بھی جواباً ”آنکھوں کی ساری مستی دیبا پہ لٹائی۔

”بھاگ جا میں یہاں سے، کیا آپ کو اس گاؤں کے اصول معلوم نہیں ہیں۔“ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

”نہ جی آپ دونوں تو اتنا مٹھا (میٹھا) بولتی ہو گڑو گڑا (گڑ جیسا) اوپر سے رنج کے سوحنی، بندہ آپ کو دیکھ کر تو کھلا (بالکل) ہی ہو جائے۔“ وہ دونوں اپنی تعریف سن کر کھلکھلا دیں۔

”آپ سب کو خالہ درباری کھانے کے لیے بلا رہی ہیں۔“ اسی آدمی نے جس نے خالہ کے لیے چارپائی بچھائی تھی۔ اس نے دور سے ہی نظریں نیچی کیے ہانک لگائی۔ سب لڑکیاں فوراً کھڑی ہو گئیں۔

”تم لوگ چلو ہم ابھی آتے ہیں۔“

”نہیں باجی، خالہ ناراض ہوں گی، آپ ہمارے ساتھ ہی چلیں۔“

”وہ ہو کچھ نہیں کہتیں، بس، ہم ابھی پانچ منٹ میں آتی ہیں، تم کھانا لگاؤ۔“ وہ انہیں وہیں چھوڑ آگے کی طرف چل دیں۔

”واؤ کتنا زبردست ماحول ہے دیبا۔“

”واقعی بالکل جنت کا سا لگتا ہوتا ہے۔“ تنک ہوا کا جھونکا شیشا کے بدن سے گھرایا تو اس نے جھرجھری لی۔

”ویسے شیشا میں سوچ رہی تھی کہ شاید پھپھو ہمیں آتے وقت روک لیں یا اگر غصے میں اس وقت ہمیں جانے دے رہی ہیں تو چند دن بعد ہی ہمیں فون کر کے بلا لیں گی۔“

”تم نے ہی فضول میں یہ خوش فہمیاں پال رکھی

”مخس سے رحم ہو رہی تھی۔ موسم دیکھتے ہی لڑکیوں نے بیسن گھولنا شروع کر دیا۔“

”میں نے مال پورے بھی بنا لیتا۔ ایسے موسم میں بڑے سوداوی (مزدار) لگتے ہیں۔“ خالہ درباری نے کڑاہی ساند پر رکھی اور اٹھ کھڑی ہوئیں دودھ کی بالائی اکٹھی کر کے انہوں نے کافی سارا ایسی کھی نکال لیا تھا ہاتھ دھو کر وہ برآمدے میں بچے رنگین پتنگ پر بیٹھ گئیں جہاں دبا اور شیبیا سر جوڑے کسی بات میں مصروف تھیں۔

”کیا بات ہے کنواروں! کوئی پریشانی ہے تو اپنی خالہ کو بتاؤ۔“

”پریشانی تو ہے خالہ۔“

”کیا۔۔۔؟“

”ہم دونوں سوچ رہی تھیں کہ سارا دن پتنگ توڑتی ہیں یہ لڑکیاں اور آپ کسی کلام کو ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتیں تو پھر ہم کب تک ایسے فارغ بیٹھیں گی۔“

”تو پھر وہاں کر دوں تمہارا ناکہ مصروفیت نکل آئے۔“ خالہ مسکرا کر بولیں تو دونوں نے دوپٹے مروڑ کر دانٹوں میں انگلی دبا کر شرمانے کی بھرپور ایکٹنگ کی۔

”ہمارے ایسے نصیب کمال۔“ سرود آہوں نے خالہ کو ہنسا دیا۔

”کیا بات؟ کیا کی ہے میری شہزادوں میں۔“

”کئی تو ہے ناں خالہ! آج کل لوگ بڑھی لکھی لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں آپ کو پتا ہے شہر میں دس جماعتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔“ شیبیا اٹھ کر ان کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گئی خالہ نے انجھٹے سے ان کی طرف دیکھا۔

”شہر میں تو پچھپھونے بسنے گھر کے کلاہوں کی وجہ سے ہماری بڑھائی چھڑادی تھی کچھ ہمیں بھی اس وقت عقل نہ تھی مگر اب ہم سوچ رہی ہیں فارغ رہنے سے بہتر ہے آگے بڑھ لیا جائے ہم بڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونا چاہتے ہیں آخر کب تک ہم یوں دوسروں پر بوجھ بنے مفت کی روٹیاں توڑتے رہیں گے۔“ شیبیا کالج بھیک گیا۔

”موصول معلوم ہے جب ہی نو سرٹیف برادران بن کر بیٹھے تھے۔ اگر خالہ درباری نہ ہوتیں تو آپ کی ہمرانی میں سفر کیا خوش گوار گزرتا۔“ دوسرے نے آنکھیں بند کر کے حسین سفر کا تصور کیا۔

”آپ خالہ درباری کو جانتے تھے۔“ وہ حیران ہوئیں۔

”ہم تو خالہ درباری کو جانتے تھے۔ صد شکر وہ ہمیں نہیں پہچانتی تھیں۔ یہاں ہمارے تایا جی رہتے ہیں ہمارا ان ہی کی طرف قیام ہے پایا یہاں پر فیکٹری لگا رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں ہمارا آنا جانا لگا رہتا ہے۔“

لبی ناک والے نے جلدی جلدی معلومات فراہم کیں۔ ویسے آپ کا اسم مبارک کیا ہے؟

”میں شیبیا۔“

”دور میں دبا۔“ وہ اٹھائیں۔

”میں احیان اور یہ شیطان۔“ احیان نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا تو جبران نے اس کے دھمو کا جڑا خاکسار کو جبران کہتے ہیں۔ ہم برادران تو ام ہیں۔“

”ہم خواہراں تو ام ہیں خالہ درباری کے گھر قیام ہے۔ اب آپ کو سلام ہے بندہ ہماری جانب آ رہا ہے ہمارا دل گھبرا رہا ہے۔“ دبا شیبیا نے گھبرا کر قدم بڑھائے۔

”پلیز دوبارہ ملنے کی قسم کھالے۔ جائے ملاقات بتائیے۔“ وہ دونوں شمع ہوئے، مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

”نرگس سے راہ درست بڑھالے گا۔ وہ ہمارے تائے کی بیٹی ہے اس کے گھر آئیے گا۔“ وہ دیکارے ہم وہاں آجائیں گے۔“

فی الحال آپ یہاں سے جا لے۔ ورنہ آنکھ پھڑپھڑائیں گے۔ لو لے لنگڑے ہو جائیں گے۔“

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کھلکھلائی اس طرف جانے لگیں۔ جہاں سے وہ رکھوالی آ رہا تھا۔ یقیناً خالہ درباری کا پیغام لے کر آ رہا ہو گا۔ ان کے قدموں میں تیزی آئی۔



”آج تو یہ بات لکری دے۔ چھوٹا سا بازار تھا پتھروں کی جوتوں کی چند دکانیں تھیں بانی کریا نہ کی دکانیں۔ فروٹ کی ریڑھیاں بھی لگی تھیں۔ یہ گاؤں سے کوئی پندرہ منٹ کی مسافت پر تھا لوگ یہیں سے آکر خریداری کرتے سادہ طبیعت لوگ تھے سادہ سی ہی چیزیں دکانوں پر راج رہی تھیں جن لوگوں کو یہ چیزیں پسند نہ آتیں یا جن کے پاس کچھ پیسے کی فروانی تھی وہ قریب کے شہر جا کر خریداری کر لیتے رہا اور شیبانے چادروں سے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا وہ جس دکان کے سامنے سے گزرتے لوگ خالو کو دور سے ہی سلام کرتے وہ ہاتھ اٹھا کر لب پھیلا کر ان کے سلام کا جواب دیتے ایک کتابوں کی دکان پر وہ انہیں لے کر اندر داخل ہو گئے وہاں سے انہوں نے انٹر میڈیٹ کی کتابیں خریدیں جو نہیں ملیں دکان دار نے شہر سے منگوانے کا وعدہ کر لیا۔ واپسی پہ خالو نے انہیں گئے کارس پلایا۔ فروٹ چاٹ کھائی اور انہیں لیے گھر آگئے وہ خوشی خوشی کتابیں کھول کر دیکھنے لگیں۔

شام کو پنک اور فیوڑی رنگوں کے سوٹ پہنے چادریں اوڑھے کتابیں سنبھالے خالہ درباری سے زرگس کے گھر جانے کی اجازت طلب کرنے آئیں آنکھوں میں لگا کا جھل کسی کو گھائل کرنے کو کافی تھا۔

”لے جاؤں خالہ ان کو اپنے گھر“ زرگس نے ان کی اجازت چاہی۔

”نہیں رہنے دے۔“ خالہ کے انکار پر وہ اچنبھے سے انہیں دیکھنے لگیں کہ کل کو تو انہوں نے خود انہیں جانے کی اجازت دی تھی پھر آج کیا ہو گیا تھا یہ خالہ بھی ناں ہمارے ارمانوں پر پوری اوس ڈالنے کے چکر میں ہیں۔

”نر کیوں خالہ؟“

”تو ایسا کر اپنے تائے کے بیٹوں کو یہیں لے آ۔ جو کچھ انہوں نے نوچنا ہو گا۔ یہیں پوچھ لیں گی۔ ان کنواریوں کو میں لڑکوں سے اکیلے میں ملنے کی اجازت تو نہیں دے سکتی ناں۔ میرے گھر امانت ہیں اور مجھے امانت کی اچھی طرح حفاظت کرنی ہے۔“ خالہ نے ان

”آج تو یہ بات لکری دے۔ چھوٹا سا بازار تھا پتھروں کی جوتوں کی چند دکانیں تھیں بانی کریا نہ کی دکانیں۔ فروٹ کی ریڑھیاں بھی لگی تھیں۔ یہ گاؤں سے کوئی پندرہ منٹ کی مسافت پر تھا لوگ یہیں سے آکر خریداری کرتے سادہ طبیعت لوگ تھے سادہ سی ہی چیزیں دکانوں پر راج رہی تھیں جن لوگوں کو یہ چیزیں پسند نہ آتیں یا جن کے پاس کچھ پیسے کی فروانی تھی وہ قریب کے شہر جا کر خریداری کر لیتے رہا اور شیبانے چادروں سے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا وہ جس دکان کے سامنے سے گزرتے لوگ خالو کو دور سے ہی سلام کرتے وہ ہاتھ اٹھا کر لب پھیلا کر ان کے سلام کا جواب دیتے ایک کتابوں کی دکان پر وہ انہیں لے کر اندر داخل ہو گئے وہاں سے انہوں نے انٹر میڈیٹ کی کتابیں خریدیں جو نہیں ملیں دکان دار نے شہر سے منگوانے کا وعدہ کر لیا۔ واپسی پہ خالو نے انہیں گئے کارس پلایا۔ فروٹ چاٹ کھائی اور انہیں لیے گھر آگئے وہ خوشی خوشی کتابیں کھول کر دیکھنے لگیں۔

”جب کوئی کسی کے گھر آتا ہے تو اللہ اس گھر میں اس بندے کا رزق پہلے پہنچا دیتا ہے تو پھر بوجھ کیوں ہو میں۔ تم دونوں جتنا دھنا ہے رہو اسٹیشن کے پاس لڑکیوں کا کالج ہے آٹھ گھنٹہ کی مسافت ہے اچھو کو چوان کی ڈیوٹی لگا دوں گی چھوڑ بھی آیا کرے گا، لے بھی آئے گا اب تم دونوں یہاں سے نہیں نہیں جاؤ گی تمہارا ویاہ ہو گا تو اس گھر سے نکلو گی۔ ابھی تو تم یہ گرم گرم پکوڑے کھاؤ۔“ انہوں نے دونوں کے منہ میں ایک ایک پکوڑا رکھا جو زرگس لے کر آئی تھی۔ تو ان کا ذہن جیسے ہلکا پھلکا ہو گیا وہ ان کی طرف سے محبت و احساس تشکر سے دیکھنے لگیں دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کے کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے لگیں۔

”بابی میرے چاچے کے لڑکے آج کل شہر سے آئے ہوئے ہیں اگر آپ کو کسی مدد کی ضرورت ہو تو میرے ساتھ میرے گھر چلنا آپ کو ساری بات سمجھا دیں گے بڑے بڑے لکھے ہیں۔“ زرگس نے آنکھیں مٹکا میں تو دیا شیبانے دلوں میں گھنٹیاں بجنے لگیں جو ملاقات کی سمیٹیل تو خود بخود نکل آئی۔

”اگر خالہ اجازت دیں گی تو ہم تمہارے گھر آجائیں گی۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں پر ایک بات کا خیال رکھنا ان شہر کے لڑکوں سے زیادہ فری نہ ہونا آنکھ مٹکا کرنے میں ماہر ہوتے ہیں ویسے تو تم بھی شہر کی ہو ان کی عشق معشوقی کی علوت سے واقف ہو گی۔ پھر بھی خیال رکھنا۔“ خالہ نے سمجھایا تو وہ مسکرا کر اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں اس وقت ان کا پورا دھیان احیان اور جبران کی طرف تھا۔



اگلے دن وہ وقت ضائع کیے بغیر خالو کے ساتھ بازار

کی بات کا جواب دے کر میرا سر کی طرف دیکھ کر مالو
ان دونوں کا انکاساں بھل ہوا۔

”خالہ اب میں پھر ان کو گھر سے بلانے۔ جاؤں۔“ مارا۔

زرگس کی شکل پھیل کر گئی۔

”اتنی دور جانے کو کون کہہ رہا ہے موبائل لاندر
سے میرا فون کر کے بلانے۔“ دیا وڈ کر اندر سے
موجود موبائل اٹھا لائی زرگس کا بتایا نمبر اور موبائل اس
کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

زرگس نے مل سے چھوٹے بھائی کے ساتھ احیان
جبران کو بھیجنے کا کہا خالہ نے اس سے موبائل لے کر
سامڈ پر رکھا اور پھر سے گنے کے رس کی کھیر پنانے میں
مشغول ہو گئیں جو نئی دروازے پر دستک ہوئی زرگس
وڈ کر گئی انہوں نے اپنی نگاہیں دروازے پر مرکوز کر
دیں۔

”بیٹھک میں بٹھا زرگس میں آ رہی ہوں تو چچے چلا
شع دیکھ کھیر لگنے نہ پائے۔“ وہ ہاتھ صاف کرتی اٹھ
کھڑی ہوئیں وہ دونوں بھی خالہ کے اطراف چلتی
بیٹھک میں داخل ہو گئیں۔

وہ دونوں سر پر ٹوپیاں جمائے شرافت کی اعلا مثال
بنے نظرس جھکائے بیٹھے تھے۔

خالہ کی آمد پر کھڑے ہو کر جھک کر ادب سے سلام
کیا تو خالہ نہال ہی ہو گئیں۔ ”انہوں نے شفقت سے
ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کی شکلوں کو جو غور سے
دیکھا تو کچھ مانوس ی لگیں۔

”مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے تمہیں پہلے
کہیں دیکھا ہے۔“ وہ بھنویں سکیر کر ذہن پر زور
ڈالنے لگیں۔

”ہمیں بھی آپ کی شکل جانی پہچانی محسوس ہو رہی
ہے وہ انجان بننے کا ذرا مہرچا جانے لگے۔

”پر کہاں؟ یہ بھی تو سوچو میرا تو دماغ پر بھا پے نے
کھو کھلا کر دیا پر تمہاری تو جوانی کی عمر ہے تمہارا حافظہ
اتنا کمزور کیوں ہے۔“ خالہ کی بات سن کر وہ شرمندہ
سے ہو گئے۔

”آگیا خالہ۔ یاد آگیا یہ۔ یہ وہی ہیں ناں جو اس

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہ تو وہی پائے ہیں جنہوں نے
سارے سفر میں تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا
تھا۔ زرگس! یہ پتر کون سے شریف تائے کے پتر شہر
سے آئے ہیں۔ تیرے تو اک دی چاچا تائے سے
شرافت چھو کر نہیں گزری تھی یہ کہاں سے حاجی
نپک پڑے۔“

”وہ خالہ تیا اکبر کے بیٹے ہیں یہ دونوں یاد نہیں
اللہ بخشے آپ کو میری بے بہتانی تھیں کہ شہر پڑھنے
گئے تو شہر کے ہی ہو کر رہ گئے پڑھی لکھی کڑی پسند کر
کے اس سے دیا کہ لیا تھا یہ ان ہی کے پتر ہیں۔“

”اچھا۔۔۔ یہ اکبر بھیجئے عاشق کے پتر ہیں۔“

”جی۔۔۔؟“ خالہ کی بات پر دونوں نے چونک کر ان
کی طرف دیکھا۔ دیا شیا اور زرگس نے نگاہیں چرا کر
زبان دانتوں میں دبالی۔

”برانہ ماننا پتر! تمہارا باب ایک نمبر عاشق تھا
گاؤں کی کوئی الیزبیتا اس کی آنکھ کے سیکھے (گری)
سے نہیں جچی تھی۔ اچھی بھلی آنکھوں کو سیرھی کر
کے لو کیوں تو اتنا تھا تو ایک آنکھ میں اچھا خاصا فرق آ

گیا تھا سب نے اس کا نام اکبر بھیجئے کا عاشق رکھ دیا تھا۔“

خالہ کی دہی گئی معلومات پر وہ جھل سے ہو گئے۔

”اس کی آنکھ کا فرق اب ٹھیک ہوا کہ نہیں۔“

چچے لفظوں میں خالہ نے ان عاشقانہ مزاج کا پوچھا۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔ اب تو بالکل ٹھیک ہے۔ جب سے مما
سے شادی ہوئی ہے غور سے دیکھنے پر بھی آنکھ میں
معمولی سا فرق بھی نظر نہیں آتا۔“ انہوں نے مسکرا کر
خالہ کو مطلع کیا تو وہ سب بھی مسکرا دیں۔

”اچھا شہری منڈے اوتسی اس طرح کرو کہ میری
ان شہر سے آئی سوہنیو کو تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہو۔ ان
کو پڑھنے کی بڑی چاہ ہے۔ ویسے تم لوگ یہاں پر کرنے
کیا آئے ہو، کتنے دن کا داؤد پانی ہے۔“ خالہ اردو اور
پنجابی کس کر کے بولیں تو ان کی ہنسی نکل گئی۔

حاضری دیتے اپنے دل کے نہال خالوں میں چھپی محبتوں کے راز ایک دوسرے پر منکشف کرتے اور پھر اپنے شہری راہ لیتے اور وہ دونوں آنکھوں میں سینوں کی جوت جگائے کھوئی کھوئی اپنی پردھالی میں مصروف ہو جاتیں اب تو وہ خالہ کے گھر کی فردن چلی تھیں۔ گاؤں کی عورتیں انہیں خالہ کی بیٹیوں کا سامان دیتیں خالو بھی شفقت سے پیش آتے ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے دیبا شیا کے دم سے ان کے گھر میں رونق آچکی تھی۔ جب سب چلی جاتیں تو ان دونوں کی ہنسی کی جھنکار حویلی میں گونجتی تو خالہ درباری رب سوہنے کا شکر ادا کرتیں کہ ان کی گود سونی ہے تو کیا ہوا گھر تو سونا نہیں ہے۔

مال کی محبت اور باپ کی شفقت کیا ہوتی ہے ان دونوں بہنوں کو اس گھر سے محبت و شفقت کی چاشنی نصیب ہوئی اپنے سارے دکھ خالہ کی گود میں سر رکھ کر ان کے سینے میں منتقل کر دیے انہوں نے ان کے آنسو پونچھ کر جیسے ان کے زخموں پر پھارے رکھے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کے جینز کی تیاری تک شروع کر دی تھی۔

”بس جیسے ہی کوئی اچھے لڑکے ملے تم دونوں کے ہاتھ پیلے کرنے میں ذرا پر نہیں کروں گی۔“
 ”خالہ میرے ہاتھ تو پیلے ہی پیلے ہیں دیکھیں تو ذرا۔“ دیبا نے شرارت سے اپنی گوری تھیلیاں ان کے سامنے کیں۔

”یہ پیلے ہاتھ کچھ نہ کھانے کی وجہ سے ہیں۔ کھن ملائی کھاؤ دودھ پیو تاکہ ہاتھوں کی یہ پیلاہٹ ختم ہو۔“
 خالہ نے محبت سے انہیں سینے سے لگایا تو وہ مسکرا دیں۔



صبح سے موسم ابر آلود تھا سردی اچھی خاصی بڑھ گئی تھی۔ وہ دریاں بننے سر پر گرم ٹوپیاں لیے حویلی کے لائن میں چلی آئیں دونوں بہنوں کا دل اواس ہو رہا تھا۔
 ”شیبا! میرا پھوپھو سے بات کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔“

شہر میں وہ خالص اردو زبان کا استعمال کرتیں اور یہاں صحیح دیہات بنی گاؤں کی بولی بولتیں۔
 ”بابا نے اپنی زمینوں پر فیکٹری لگانے کا سوچا ہے تو اسی سلسلے میں ہمارا یہاں آنا جانا لگا رہتا ہے کام شروع ہو چکا ہے تھوڑے تھوڑے دن بعد آکر ہمیں چیک کرنا ہوتا ہے۔“ جبران نے بتایا تو وہ حیران ہوئیں۔
 ”تو تھوڑے تھوڑے دن بعد تم گڈی میں اس طرح ذلیل ہو کے آتے ہو میں تو سال بعد گڈی میں بیٹھنے کا سوچوں تو میرا سال (سائس) رکنے لگتا ہے۔“
 ”نہیں خالہ ہم تو اپنی گاڑی میں آتے ہیں ہمارا شہر یہاں سے ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ ٹرین کا سفر تو ہم نے ایڈو نگر کے طور پر کیا۔“ احیان مسکرا کر بولا وہ اچھا کہہ کر کھڑی ہو گئیں۔

”چلو اب تم کڑیوں کو پردھالو میں تمہارے کھانے کے لیے کچ (کچھ) بھیجتی ہوں آخر تم ہمارے مہمان ہو اور ہاں ایک بات یاد رکھنا اپنے اباے اکبر کا اثر نہیں آتا چاہے جیسی شرافت کا مظاہرہ ٹرین میں کیا تھا ویسے ہی پیسے (مضموم) بن کر پردھانا اور کڑیوں تم نے بھی ان شریف برادران کو تنگ نہیں کرنا۔“ خالہ انہیں تنبیہ کرتیں دروازے سے باہر نکلنے لگیں۔

”نرگس تو بھی آجا میرے ساتھ یہاں بیٹھ کر کیا کرے گی تیری مولی عقل میں یہ پردھالی کی باتیں کہاں سائیں گی۔“ وہ نرگس کا ہاتھ پکڑ کر باہر چل دیں اور ان چاروں کے چروں پر ایک پرسکون و دلکش مسکراہٹ نے ڈیرا جمالیا۔ احیان اور جبران کے سینوں میں گھٹے سانس نے باہر کا راستہ دکھا۔



وہ پوری دلچسپی سے پڑھ رہی تھیں خالو نے ان کا ایڈیشن کروا دیا تھا اچھو کو چوان کو سختی سے آرڈر تھا کہ وقت پر کالج لے جایا کرے۔ احیان نے دیبا کے دل کے تاروں کو اپنی آنکھوں کی شوخی سے چھیڑا تھا جبکہ شیبا کے دل کو جبران کے بھورے بالوں نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ جب بھی گاؤں آتے خالہ درباری گھر پر

کیا ہوا جو انہوں نے ہمارا حال نہیں پوچھا، ہم پوچھ بیٹے ہیں، ڈبا ڈرتے ڈرتے بولی تو شیبہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”اگر پھپھو کی یاد ایسی بے چین کر رہی ہے تو خالہ سے موبائل لے کر بات کر لو۔“ شیبہ نے اسے اجازت دی۔

”سچ...؟“

”ہاں۔“ اس نے گردن ہلائی۔

”چند ابا کی کا بھی پوچھ لیتا کہ ہماری نحوست چھٹنے کے بعد ان کے نصیب کھلے کہ نہیں۔“ شیبہ تلخی سے بولی تو بیابانے سر ہلایا۔ وہ پھپھو کا نمبر ملا رہی تھی نیل جا رہی تھی مگر فون کوئی اینڈ نہیں کر رہا تھا۔ آخر کار بار بار کی کوشش سے اس کا فون شعیب گھونچنے رہیو کر لیا وہ دیبا کی آواز سن کر چمک اٹھا۔

”برے بے وفا ہو تم! ایک بار بھی خبر نہ لی کہ ہم جیتی ہیں یا مر گئیں۔“

”میں تمہارے دشمن مت پوچھو کہ تمہارے بغیر گھر کیسا سونا اور ویران جنگل کا منظر پیش کر رہا ہے دل کی ویرانی اس سے سوا ہے۔“ گھونچو روماننگ ہونے لگا۔

”پھپھو کہاں ہیں؟“

”وے اوہر کس سے اتنا مسکرا مسکرا کر باتیں ہو رہی ہیں۔ ماں، بہن سے بولتے ہوئے تو انگارے نکلتے ہیں۔“ اسے شاکرہ کی آواز سنائی دی تو اس نے جھٹ سلام کیا۔ دیبا کی آواز سن کر ان کے حلق تک کڑواہٹ کھل گئی۔

”اچھا۔ تو یہ تم مہسنی ہو وہاں جا کر بھی میرے بچے کا پیچھا نہیں چھوڑا اب تو اس کی جان چھوڑ دو۔ وہیں خالہ درباری کے گاؤں کے لوہنڈوں کو پھنسا کر نکال چڑھوا لیتا۔ خوار! جو اوہر کا رخ بھی کیا تو۔“ ان کی زبان زہر اگلنے لگی۔ دیبا کی پلکوں کے گوشے جھینکے لگے۔

”پھپھو میں نے تو آپ کی خیریت اور چند ابا کی کے رشتے کا پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔“ اس کی آواز

رندھ کی۔ ”شکر ہے اس مالک کا تمہارا سایہ اس گھر سے جدا ہوا تو میری چندا کا رشتہ طے ہوا بہت اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں لڑکے کا اپنا پرنس ہے کروٹوں کھاتا ہے میری چندا عیش کرے گی اگلے مہینے شادی کر رہی ہوں۔ کان کھول کر سن لو اب اس گھر میں تمہاری کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تمہارا لٹکانا اسی پردھیا کا گھر ہے جو تمہیں یہاں سے نکال کر لے گئی اگر وہ تنگ آجائے تم سے تو باؤ کو فون کر دیتا اگر لے جائے گا اپنی چھتیاں کو۔“ ان کا زہر خند لہجہ اسے تڑپا گیا پھپھو نے فون، بند کر دیا تھا اور وہ بتے اشکوں سے موبائل کو دیکھ جا رہی تھی۔ کتنی بے دردی سے انہوں نے زہر میں بیجے لفظوں سے اسے اذیت پہنچائی تھی۔ وہ ہلکا اٹھی تھی۔

”ہو گیا شوق پورا اپنی پھپھو سے بات کرنے کا۔“ شیبہ صورت حال سمجھ گئی تھی دیبا زار زار رونے لگی۔ ”میری معصوم بہن اپنے دل سے ساری جھوٹی امیدوں کو نکال پھینکو کوئی ہمیں یاد کرنے والا نہیں۔ اللہ نے جس کے در کو ہمارا آسرا بنایا ہے بس اسی کو اب اپنا سب کچھ سمجھ لو۔“ شیبہ نے اسے ساتھ لگا کر تسلی دی تو اس نے اپنے سارے آنسو پونچھ ڈالے۔

”آج کے بعد ہمارے لیوں پر اپنوں کے کسی رشتے کا نام نہیں آئے گا۔“ انہوں نے دل مضبوط کیا۔ ”چلو اب اندر چلتے ہیں خنکی خاصی بڑھ گئی ہے دیکھو تو ہاتھ کیسے ٹھہر رہے ہیں۔“ شیبہ نے اسے اپنے ٹھنڈے ہاتھ اس کے گلے سے لگائے تو وہ دونوں اندر چل دیں۔



وہ اپنے فرسٹ سمسٹر کے رزلٹ کے انتظار میں تھیں عجیب بوریت ہو رہی تھی کلج جانے اور پڑھائی کی مصروفیت میں دن گزرنے کا تاہی نہیں چلتا تھا اور اب وقت کاٹے نہیں کھٹتا تھا۔ خالہ نے کڑھائی سلائی سیکھنے کا کہا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ اس کام میں انہیں بالکل بھی دلچسپی نہیں ہے سو وہ خاموش

ہمارے عزت پر حرف اُٹے اور دونوں نے سی پیسے احتیاط کا واسن تھامے رکھا اگر تم نے میرے دل کو روشن کیا ہے تو میرے گھر میں بھی تمہارے وجود سے ہی روشنی ہوگی اسنے گھر کو اجالوں سے منور کرنے کے لیے ہم دونوں بھائی گھر کو اس قافلہ بنانے کے چکروں میں ہیں کہ تم روشن ستارہ بن کر چمکتی رہو۔ تمہارا یہ دلکش چہرہ ہمارے گھر آکر ماند نہ پڑے۔“

”کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟“ اس کی باتوں سے وہ الجھی۔

”دیکھو دیبا یا کاتو یہ اپنا گاؤں ہے وہ اس سے چاہے جتنی بھی دور رہ لیں مگر ان کی جڑیں ہمیں سے ہیں اور وہ اپنوں سے ملنے ان میں رہنے بسنے میں خوشی محسوس کریں گے مگر مہما اس کے برعکس ہیں گاؤں اور گاؤں میں رہنے والوں سے سخت الگ ہیں“ احیان کی شرمندہ سی آواز یہ نہیں میں ابھری۔

”اوہ تو اس کا مطلب ہے کہ ہماری راہیں جدا ہیں۔ تو ٹھیک ہے آج کے بعد ہمارا تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہو گا جب تم ہمیں اپنا نام دے نہیں سکتے تو مزید تعلق رکھنا سراسر بے وقوفی ہے۔“ وہ مرودہ لہجے میں بولی۔

”پوری بات تو سن لویا یا کو ہم نے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے بس اب مہما کو طریقے سے راہ پر لا رہے ہیں۔ تمہارا ساویٹ کرو۔ ان شاء اللہ بہت جلد ہمارے خوابوں کی تعبیر بن کر ہمارے گھر کو رونق بخشوگی۔“ اس نے دیا کو تسلی دی تو وہ سانس بھر کر رہ گئی پتا نہیں یہ جھوٹی تسلی تھی یا وہ واقعی سچ کہہ رہا تھا۔ بہر حال اس کی جوت جگائے انتظار کی راہوں پر قدم رکھ دیے۔



نرس کی شادی ہو رہی تھی سب لڑکیاں بڑی پر جوش تھیں وہ بیابہ کر ساتھ والے گاؤں میں اپنی خالہ کے گھر جا رہی تھی بچپن کی مٹکنی نے دونوں کے دلوں میں ایک دوجے کی محبت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے وہ

ہو رہیں۔ احیان اور جبران کو گاؤں آئے بہت دن ہو گئے تھے ان کی فیکٹری کا کام تکمیل کے مراحل میں تھا فون پر اکثر بات چیت ہو جاتی تھی خالہ نے انہیں ضرورت کے تحت ایک موبائل لے کر دے دیا تھا کہ اپنی کسی دوست وغیرہ سے بڑھائی کے متعلق بات کرنی ہو تو کر لیا کرو۔ وہ صحن میں بیٹھی کیونکہ کھارہی تھیں جب اچانک دیبا اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بور ہو رہی ہوں احیان کو فون کرتی ہوں۔“ اس نے شیبہ کے کان میں سرگوشی کی تو وہ مسکرا دی۔

کمرے میں آکر اس نے احیان کا نمبر ملایا اس نے جھٹ ریسو کیا۔

”زبے نصیب آج کیسے میری یاو نے تمہیں بے تاب کیا ورنہ جب تک میں فون نہ کروں تمہیں توفیق نہیں ہوتی۔“ وہ ٹھوہ کناں ہوا۔

”احیان مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ بلا تمہید گویا ہوئی۔

”ضرور۔“ کہو کیا کوئی خاص بات ہے؟“

”تم دونوں اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم دونوں بہنوں نے اپنوں کی بے رخی و بے اعتنائی کے بڑے زخم سے ہیں ہم میں اب اور کسی دکھ کو جھیلنے کی ہمت نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ یہ سلسلہ آخر کب تک چلے گا اگر تم دونوں بھائی ہمارے لیے سیریس ہو تو بات آگے بڑھاؤ۔“

”بات تو بہت آگے بڑھ چکی ہے۔“ وہ فو معنی بولا۔

”میرا مطلب ہے اپنے والدین سے بات کرو۔“

”کیا بات کروں؟“ وہ اسے زنج کرنے لگا۔

”احیان۔۔۔ اتنی ایم سیریس۔“ وہ زور سے چیخی۔

”اوکے۔۔۔ اوکے دیکھو وقتی دل لگی کے بارے میں تو ہم نے کبھی سوچا نہیں ٹھیک ہے ہم بھائی شوخ و شریر ضرور ہیں مگر عورت کی عزت و پاسداری کرنا جانتے ہیں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ خالہ کے گھر کے علاوہ ہم نے تم بہنوں کو کبھی اوھر اوھر ملنے پر مجبور نہیں کیا کبھی ایسی کوئی بات یا حرکت نہیں کی جس سے

زنگس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتیں اور وہ شرم سے دہری ہو جاتی لڑکیاں اس کے چہرے پر حیا کی لال لکھ کر کھلکھلا اٹھتیں۔

”بس یہی تو فرق ہے شرار اور گاؤں کی لڑکیوں میں۔ شرکی لڑکیاں دیہا والے دن بھی آنکھیں پھاڑے پڑھڑ بولے جاتی ہیں۔ نہ باپ بھائی کی شرم نہ لحاظ۔ لڑکے کے ساتھ جڑ جڑ کے فوٹو کھنچواتی جاتی ہیں کہ غیرت مند مندہ شرم سے پانی پانی ہو جائے اور ہمارے گاؤں کی کنواریاں شادی کے نام پر ہی گلزار ہو جاتی ہیں پلکیں شرم سے پو جھل اور دل منگیتر کے نام سن کر تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔“ خالہ دہباری بھی لڑکیوں کے پاس آ بیٹھیں تو دیبا شیا شرم مندہ سی ہو گئیں۔

”ہاں ہاں اٹھ جاؤ دھمی رانی زنگس بھی تمہارے پسند سے چیزیں خرید لے گی۔“ زنگس کی ماں نے بھی اصرار کیا۔

”آپ کہہ تو ٹھیک رہی ہیں خالہ! پر کیا کریں شر میں ہر طرف یہی ماحول ہے تو کسی کو معیوب نہیں لگتا۔“ انہوں نے شرکی لڑکیوں کی طرف داری کی آخر وہ بھی تو شرم سے آئی تھیں۔

”تم چلی جاؤ دیبا میرے سر میں درد ہے۔“ شیبانے انکار کیا تو دیبا مسکراتے ہوئے تیار ہونے چل دی۔ احیان کی گاڑی کا بارن سنا تو وہ بارہنکل آئی۔ زنگس اور اس کی چھوٹی بہن پیچھے بیٹھی تھیں احیان نے اس کے لیے فرسٹ ڈور کھول دیا تو وہ ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گئی۔

”میری دھمی ماحول بنانے سے بنتا ہے اور یہ فرض ماں باپ کا ہے کہ وہ اپنی بچیوں کو کھلی آزادی نہ دیں انہیں ڈھانپ کر رکھیں کہ کھلی بڑی شے پہ کھیاں جھنجھٹانے لگتی ہیں۔ حیا عورت کا زبور ہے سنگھار ہے۔“ زنگس کی ماں جو اسے بلانے آئی تھی انہوں نے بھی گفتگو میں حصہ لینا ضروری سمجھا۔ دیبا شیبانے بیوں سے مزید بحث مناسب نہ سمجھی کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہی تھیں کہ شرار اور گاؤں کے ماحول سے کیا فرق پڑتا ہے اصل بات تو تربیت کی ہے اور سب سے بڑھ کر جب ہمارے مذہب نے عورت کو پردے میں چھپا کر رکھنے کا حکم دیا ہے تو پھر کیا گاؤں کیا شہر سب پر شرعی احکام لازم ہیں۔ جو لوگ عمل کر لیتے ہیں وہ پینڈو جاہل اور جو بے حجاب عریاں لباس میں مغرب کی تقلید کرتے ہیں وہ ماؤرن ٹبل۔ وہ سوچ کر رہ گئیں۔

”چل زنگس اٹھ احیان آیا ہوا ہے اس کے پاس گڈی ہے چل کر شہر سے جو چیزیں لینی ہے لے لے۔“ چھوٹی بھی تیار بیٹھی ہے۔“ زنگس کی ماں نے بتایا تو احیان کا نام سن کر دیبا کے دل میں مدھمکھٹان بجیں۔

”جائے گئے نہ زنگس کی شادی میں پہننے کے لیے جو کچھ لینا ہے جا کر لے آؤ۔“ خالہ نے محبت سے کہا تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

”نہیں خالہ ہمارے پاس کافی کپڑے ہیں ہم ان میں سے ہی پہن لیں گی۔“ دونوں نے صاف انکار کر دیا وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ ان پر مزید بوجھ بنیں۔

”وہ پھیکے رنگوں کے کپڑے شادی میں پہننے کے قابل ہیں شادی میں تو چمکیلے بھڑکیلے کپڑے ہی اچھے لگتے ہیں۔ میں جو کہہ رہی ہوں کہ جا کے لے آؤ چلو اٹھو شاباش۔“ انہوں نے پکڑا۔

”ہاں ہاں اٹھ جاؤ دھمی رانی زنگس بھی تمہارے پسند سے چیزیں خرید لے گی۔“ زنگس کی ماں نے بھی اصرار کیا۔

”یہی چلو ناں برا مزہ آئے گا شہر کے وہی بھلے اور گول گھپے بھی کھائیں گے۔“ چٹوری زنگس ان کے سر ہو گئی۔

”تم چلی جاؤ دیبا میرے سر میں درد ہے۔“ شیبانے انکار کیا تو دیبا مسکراتے ہوئے تیار ہونے چل دی۔ احیان کی گاڑی کا بارن سنا تو وہ بارہنکل آئی۔ زنگس اور اس کی چھوٹی بہن پیچھے بیٹھی تھیں احیان نے اس کے لیے فرسٹ ڈور کھول دیا تو وہ ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گئی۔

”جائے گئے نہ زنگس کی شادی میں پہننے کے لیے جو کچھ لینا ہے جا کر لے آؤ۔“ خالہ نے محبت سے کہا تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

”نہیں خالہ ہمارے پاس کافی کپڑے ہیں ہم ان میں سے ہی پہن لیں گی۔“ دونوں نے صاف انکار کر دیا وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ ان پر مزید بوجھ بنیں۔

”وہ پھیکے رنگوں کے کپڑے شادی میں پہننے کے قابل ہیں شادی میں تو چمکیلے بھڑکیلے کپڑے ہی اچھے لگتے ہیں۔ میں جو کہہ رہی ہوں کہ جا کے لے آؤ چلو اٹھو شاباش۔“ انہوں نے پکڑا۔

”ہاں ہاں اٹھ جاؤ دھمی رانی زنگس بھی تمہارے پسند سے چیزیں خرید لے گی۔“ زنگس کی ماں نے بھی اصرار کیا۔

”یہی چلو ناں برا مزہ آئے گا شہر کے وہی بھلے اور گول گھپے بھی کھائیں گے۔“ چٹوری زنگس ان کے سر ہو گئی۔

”تم چلی جاؤ دیبا میرے سر میں درد ہے۔“ شیبانے انکار کیا تو دیبا مسکراتے ہوئے تیار ہونے چل دی۔ احیان کی گاڑی کا بارن سنا تو وہ بارہنکل آئی۔ زنگس اور اس کی چھوٹی بہن پیچھے بیٹھی تھیں احیان نے اس کے لیے فرسٹ ڈور کھول دیا تو وہ ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گئی۔

”جائے گئے نہ زنگس کی شادی میں پہننے کے لیے جو کچھ لینا ہے جا کر لے آؤ۔“ خالہ نے محبت سے کہا تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

”نہیں خالہ ہمارے پاس کافی کپڑے ہیں ہم ان میں سے ہی پہن لیں گی۔“ دونوں نے صاف انکار کر دیا وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ ان پر مزید بوجھ بنیں۔

”وہ پھیکے رنگوں کے کپڑے شادی میں پہننے کے قابل ہیں شادی میں تو چمکیلے بھڑکیلے کپڑے ہی اچھے لگتے ہیں۔ میں جو کہہ رہی ہوں کہ جا کے لے آؤ چلو اٹھو شاباش۔“ انہوں نے پکڑا۔

دو لاکھ چار سو تیسے گورجی کی زبان میں ان کے دلوں کے پیچھے ہم رسانی کر رہی تھی۔ سارا سفر خوشبوؤں میں بار بار حل عشق کی لے پر رقص کرتے رہے۔
اس نے اپنے اور شیبہ کے لیے دو دو جوڑے خریدے کہ زیادہ قیمتی بھی نہ ہوں اور خالہ کا دل بھی رہ جائے نرگس اس کے ہمراہ بڑے شوق سے شاپنگ کر رہی تھی۔ احیان نے انہیں ایک اچھے سے ریٹورنٹ میں کھانا کھلایا، "اُس کریم سے لطف اندوز ہوئے اور واپسی کی راہ لی۔ ملگا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ عالم کیف میں سفر تک گزرا انہیں کچھ پتہ نہ چلا دل بھی تمنا کر رہا تھا کہ یہ ساتھ طویل ہو جائے احیان نے پہلے نرگس اور اس کی بہن کو گھر چھوڑا اور مسکراتے ہوئے فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھا۔

"ہوں۔ تو کیا رہا مہدولت کی ہمراہی میں آج کا یہ سحر انگیز سفر۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
دبا گاڑی میں اکیلی اس کی سنگت سے کنفیوژ ہو گئی۔

"کچھ باتیں بن بتائے جان لی جاتی ہیں اگر آپ کے لیے یہ سفر سحر انگیز تھا تو میرے لیے ہر قسم کی گھنٹوں کا ساتھ نہیں چاہیے عمر بھر کی رفاقت کا مان بخشیں گے تو یہ بل زندگی بھر ذہن میں خوش گوار یاد بن کر مہکا کریں گے۔" اس نے پراعتماد ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"مما نرگس کی شادی میں شرکت کریں گی گو کہ وہ گاؤں کے فنکشن اینڈ نہیں کرتیں مگر بابا کی ضد پر آنے کی حاجی بھری ہے بس تم بہت اچھا سا تیار ہونا کہ مما تمہارے حسن سے مرعوب ہو کر اپنے بیٹوں کے بارے میں سوچنے لگیں۔" وہ دھیرے دھیرے گاڑی چلا رہا تھا۔

"ایک بات یاد رکھنا احیان اگر آپ کی ممانے ہم بہنوں کو رعب کھٹ کر دیا تو ہمارے لیے کبھی بھی کوشش مت کرنا ہم ہمیں کبھی بھی اس گھر میں جانا پسند نہیں کریں گی جہاں ہمیں عزت اور چاہ سے نہ

کے بچے جلد ہی آپ جیڑے میں رہیں گی۔
ہم اپنی زندگی میں مزید مشکلات کی گرہیں نہیں کھولنا چاہیں اور نہ ہی کبھی یہ چاہیں گی کہ بیٹے ماں کے لیے آزار کا سبب بنیں۔ ماؤں کو بیٹوں پر بڑا مان ہوتا ہے ان کی زندگی کے جیسے کا سبب ہوتے ہیں انہیں کسی امتحان میں مت ڈالنا۔"
"لیکچر اچھا دے لیتی ہو تم۔" وہ بے خیالات جان کر خوش ہوئی۔ "ترجہیں نظموں سے دیکھتے ہوئے اس نے گاڑی کا رخ نہروالی سائڈ پر کیا۔
"یہ آپ کہاں لے کے جا رہے ہیں رات کا اندھیرا پھیل رہا ہے۔"

"میں چاہتا ہوں تمہارے رخ نمایاں کو دیر تک ٹکتا رہوں تم نہیں جانتیں یہ لمحے میری زندگی کا حاصل ہیں۔ چاہا اور چاہے جانے کا احساس کس قدر خوش کن ہے اس کا اندازہ مجھے آج ہو رہا ہے۔ لوگ محبوب کی یادوں میں زندگی گزار دیتے ہیں اور یہاں تو محبوب روبرو ہے پھر کیسے وقت گزرنے کا پتا چلے میرا دل چاہ رہا ہے شہر کا کنارہ ہو، ہم دونوں کا ساتھ اور آوارہ ہوا کے جھونکوں پر ہماری دھڑکنوں کا شور۔" وہ بے خود ہونے لگا۔

"زیادہ رومانٹک ہیرو بننے کی ضرورت نہیں ہے آپ پہلے ہی چیٹنگ کر چکے ہیں خالہ دریاری کا کھر پہلے آتا تھا۔ آپ کو مجھے پہلے اتارنا چاہیے تھا اور اب نہروالی بات تو بالکل ہی ناممکن ہے سیدھے گھر چلیں کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی اس حرکت پر آپ کو گاؤں بدر کر دیا جائے۔"

"دبا تمہیں میری محبت کا یقین ہے ناں۔ تمہاری محبت کی چنگاریاں میرے پورے وجود میں پھوٹ رہی ہیں۔ جب سے تمہاری چاہت دل میں سلتی ہے زندگی دھنک رنگوں کی طرح بڑی پیاری لگنے لگی ہے کوئی لمحہ کوئی ساعت ایسی نہیں گزرتی کہ جس دم تمہارا پیکر نگاہوں سے ہٹا ہو تم میری زندگی کی امید ہو میرے دل کا روشن چراغ ہو میرے دل کا یہ دیا بھی بجھنے نہ دینا

سادی میں سرشار کرتے رہے۔ اس لیے اس میں گھاس کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ خوشی غمی میں یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جیسا ہوتے ہیں۔ شہر میں تو ساتھ والے گھر میں میت پڑی ہو تو لوگ بے خبری کی نیند سو رہے ہوتے ہیں۔

بارت بینڈ بایے اور ڈھولک کی تھاپ پر آئی تھی۔ لڑکے کے دوست کزن اور سنبھلے نوجوان رقص کرتے دوہلا کو اپنے گھرے میں لیے آ رہے تھے۔ وہ دونوں بھی باقی سب خواتین کی طرح چوہ چھپائے بارات کو دیکھنے میں مگن تھیں رخصتی تک وہ احیان جبران کی مہمانی منتظر رہیں کہ وہ ان کو دیکھے، بات چیت کرنے کے لیے شاید ان کی طرف آئیں مگر وہ اکثری ہوئی گردن والی خاتون اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ نرس کی جھولی بہن سے تصدیق ہو گئی تھی کہ یہی اس کی حاجی ہیں۔ عورتیں ان کے گرد گھبراڈالے انہیں ستا سکی نظروں سے دیکھ رہی تھیں جو کسی شوپیس کی طرح سچی بیٹھی تھیں۔

”تو یہ ہے گردن میں سرا ڈالوا کر آئی ہے یہ خاتون۔ ایسا بھی کیا غرور کہ انسان کے دل سے رشتوں کی مٹھاس ہی ختم ہو جائے۔“ انہوں نے ان کی طرف ایک نظر ڈال کر دوبارہ دیکھنا بھی گوارا نہ کیا وہ دونوں بہتیں سلگتی رہیں دبا اور شیبانے بھی ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔



شادی کے ہنگامے ختم ہوئے تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ اب وہ ان دونوں بھائیوں کے فون کی منتظر تھیں کہ دیکھیں ان کی مہمانی کیا فیصلہ کرتی ہیں مگر وہ ان کو کسی مثبت جواب کی توقع نہیں تھی مگر پھر بھی ایک موموم سی امید تھی اور یہ امید بھی اس وقت ٹوٹ گئی جب ایک دن احیان کا فون آیا اس کی آواز اداسی کا عنصر لیے ہوئے تھی۔

”بلا تمہید مجھے یہ بتاؤ احیان کہ آپ کی ممانے ہمارے بارے میں کیا رائے دی۔“ وہ دھڑکتے دل کے

دوبانے کی سانس لے کر احیان نے جدبابت کی شدت میں ڈوب کر اظہار کیا احیان نے دبا کے ہاتھ میں ایک پیکٹ نکھایا۔ ”پنہو کی تو مجھے خوش ہوگی۔“ دبا نے کچھ ہچکچاتے ہوئے پیکٹ تھام لیا الوداعی نظر اس پر ڈالی اور معمور جڑیوں سے معمور دل لیے خالہ وریاری کی حویلی میں داخل ہو گئی احیان وارفہ نظروں سے اسے جانا دیکھ رہا تھا۔



نرس کی شادی ان کے لیے بڑی انوکھی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ وہ گاؤں کی شادی اینڈ کر رہی تھیں اینٹ مہندی پر ناچ گانا مختلف ریمیں سب ان کے لیے دلچسپی کا سامان بنی رہیں۔ شادی والے دن بڑے سے کھلے میدان میں شامیانے لگا کر ایک طرف عورتوں کا انتظام کیا گیا تھا اور تھوڑے فاصلے پر مردوں کا انتظام تھا بڑے بڑے رنگین پاپوں والے پلنگ شامیانوں سے باہر ترتیب سے بچھائے گئے تھے جن پر سفید چادریں بڑی اچلی اور گھری لگ رہی تھیں۔ گاؤں کے ٹیک لگائے بزرگ حضرات حقہ پینے اور باتیں کرنے میں محو تھے میدان کے دوسرے احاطے میں وٹیکس پک رہی تھیں روایتی و سادہ کھانے زرہ پلاؤ، خوشکشت اور تندوری روٹی کامیہو تھا۔

لڑکیاں شامیانے میں زرق برق موتی ستاروں سے لیس گہرے میک اپ میں یہاں وہاں اتراتی پھر رہی تھیں۔ جوان بیٹیوں کی ماؤں کے گل بھی گلگل بنے تھے اور لب رنگین ہوئے ہوئے تھے۔

آج تو خالہ وریاری نے گہرے آتش رنگ کی ساڑھی سے اپنا نیم خیم وجود ڈھانپ رکھا تھا۔ گورے رنگ پر آتش رنگ الگ ہی چھب دکھا رہا تھا شیبانے زبردستی ساڑھی کے ہر رنگ لپ اسٹک بھی لگا دی تھی۔ کتنی دیر تک خالو کے سامنے جانے سے انہیں لاج آتی رہی اور وہ اس عمر میں بھی خالو سے ایسے شرمانا دیکھ کر دلی دلی ہنسی ہنسی رہیں گاؤں کا کوئی گھریسا نہ ہو گا جہاں سے کسی کو مدعو نہ کیا گیا ہو لوگ اپنے کام چھوڑ

ساتھ بولی۔

”کیا بتاؤں ڈیر مجھے قطعاً“ امید نہ تھی کہ ماما ہمارے ساتھ ایسا کریں گی۔“ اس کا لہجہ افسردگی لیے ہوئے تھا۔

”ہمیں پہلے ہی اندازہ تھا مگر میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی تھی۔ بعض لوگوں کی قسمت محبتوں سے تھی ہوتی ہے ان میں سے ایک ہم ہمیں ہیں نہ ماں کی محبت اور لمس نصیب ہوا نہ باپ کی محبت کا ذائقہ چکھا رشتہ داروں سے تو محبت کی امید رکھنا ہی عبث ہے ایک تمہاری صورت میں زندگی اجالوں کی طرف جاتی دکھائی دی تھی مگر وہ بھی اندھیروں کی نذر ہو گئی۔“ اس کے لہجے میں دکھ بلکورے لینے لگا تو احیان تڑپ اٹھا۔

”نہیں دیا ایسا نہیں سوچتے اللہ بہتر کرے گا جبران اور بابا ماما کو قائل کرنے میں لگے ہوئے ہیں میں بھی مجنوں کا روپ دھارے کمرے میں پڑا رہتا ہوں تم مایوس مت ہو اللہ نے ہماری قسمت میں ایک دوسرے کا ساتھ ضرور لکھا ہے بس تم ناامیدی کو اپنے دل سے اکھاڑ پھینکو۔“ وہ اسے تسلیاں دے رہا تھا اور اس کے آنسو تواتر سے اس کے گالوں کو چومتے دامن میں جذب ہو رہے تھے شیبانے اس کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا۔

”اب تم دونوں بھائی ہم سے کبھی رابطہ کرنے کی کوشش مت کرنا کیونکہ جو رشتہ پروان چڑھتا دکھائی نہ دے اس سے تعلق رکھنا عبث ہے ہماری زندگی میں تم دونوں بھائی خواب کی صورت داخل ہوئے تھے اور خواب کی طرح ہی نکل گئے۔“ وہ تلخ لہجے میں بولتی جا رہی تھی۔

”میری بات سنو شیبانے“ اب کی بار جبران بولا۔

”جو بات سنائی تھی وہ احیان نے سناوی ہے براہ کرم آپ زحمت نہ کریں ہم بہنوں نے زندگی میں تلخیوں کے بہت گھونٹ پیے ہیں علوی ہو گئی ہیں۔ اس غم کو بھی تقدیر کا لکھا سمجھ کر خاموشی سے سہہ جائیں گی اور اف بھی نہ کریں گی۔ میں نے تو ویسے بھی اپنے دل میں

کسی امید کو جگہ ہی نہ دی تھی یہ دبا بے وقوف احیان کی محبت کو سینے میں چھپائے بڑی چاہت سے پیچتی رہی ہے۔ سمجھا لوں گی میں اسے چند دن کر لائے گی پھر سے اپنی قسمت سے مجھوٹا کرے گی بس آپ احیان سے نہیں کہ اس سے کبھی بھی رابطہ نہ کرے۔“

جبران بولنے کی کوشش ہی کرتا رہا مگر وہ ناان اسٹاپ بولے چلی جا رہی تھی اور یکدم فون آف کر دیا سم نکالی اور ڈسٹ بن میں اچھال دی۔

دبا زار و زار رو رہی تھی شیبانے اس کے دکھ پر کٹ کر رہ گیا اپنے دل کو تو اس نے شروع سے دلاسا دے رکھا تھا مگر دبا بے وقوف ہر رشتے سے آس لگا کر بیٹھ جاتی تھی اور پھر نامراد ہو کر اشکوں سے رشتہ جوڑ کر بیٹھ جاتی۔

”دبا میری پیاری بہن زندگی احیان پر ختم نہیں ہو جاتی اور ہو سکتا ہے اللہ نے ہمارے لیے اس سے بہتر کوئی فیصلہ کیا ہو اور ویسے بھی ہم دونوں نے عہد کیا تھا کہ اگر ہمیں احیان جبران کے گھر سے عزت نہ ملی تو ہم اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیں گی۔ ہماری پہلی ترجیح عزت ہے ان کی امی بیٹوں کے دباؤ میں اگر ہمیں بیاہ کر بھی لے جاتیں تو کیا ہمیں وہ عزت اور مان دے سکتی تھیں، کبھی بھی نہیں اور جس گھر میں عزت ہی نہ ہو وہاں یہ رہنے کے خواب دیکھنا حماقت ہے۔ سو اپنے ان خوابوں کو اپنی آنکھوں سے آج ہی فوج ڈالو۔ محبتوں کے بغیر تو ہمیں جینے کا ہنر آگیا ہے مگر عزت کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہ کرنا۔ ہم اس گھر میں جائیں گے جہاں ہمیں پورے مان، عزت اور چاہ سے لے جایا جائے۔ تمہاری بھی تو یہی سوچ تھی ناں پھر یہ آنسو کس لیے؟“

شیبانے بڑے ضبط سے اپنے آنسوؤں کو پیتے ہوئے دبا کے اشک صاف کیے جو قطار بنائے چلے ہی آرہے تھے وہ اس کے پاس سے اٹھ کر باہر چلی آئی کہ کچھ دیر اسے اکیلا چھوڑ دیا جائے اس کا دل اپنی ماں جانی کے دکھ پر دھکی ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے اللہ سے

شکوہ تھا نہ احیان، جبران سے اور نہ ان کی ماسے یہ تو
تقدیر کے کھیل تھے اور تقدیر پر اس نے سر تسلیم خم کر
دیا تھا۔



”لیکن خالہ ہم ابھی شادی نہیں کرنا چاہتیں۔“
شیدا بلی بلی آواز میں بولی دیا نے بھی اس کی تائید میں
گردن ہلاتی۔

”مگر کیوں۔۔۔؟“ شادی کا یہی مناسب وقت ہے
لڑکیوں کی عمر نکل جائے تو اچھے رشتے بڑی مشکل سے
ملتے ہیں۔“

”ایسے رشتے ہونے سے تو اچھا ہے کہ عمر ہی نکل
جائے۔“ وہ سوچ کر رہ گئیں۔
”رنگ روپ، قد کاٹھ میں بالکل مل بیو (مل باپ)
ورگے۔“

”کیا۔۔۔؟ تنے کالے۔“ دیا کا دم خشک ہو گیا۔
”کالا رنگ ہے تو کیا ہوا، مرو کا کالا رنگ کس نے
دیکھا ہے۔ مرو کی شرافت اور کلمائی اس کے کالے
رنگ پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ مرو وہی اچھا جو عزت کے
ساتھ عورت کو دو وقت کی روٹی کھلا سکے اور یہ سب
خوبیاں اس خاندان کے تمام مردوں میں پائی جاتی ہیں
عورت کی عزت اور قدر کرنا جانتے ہیں۔“

تم دل چھوٹا نہ کرو۔ لڑکے اپنے باپ کی جسامت
کے نہیں ہیں وہ تو تیلے ورگے (تھکے جیسے) ان کا باپ تو
سارا دن گھر میں پڑا حقہ پیتا اور روٹیاں توڑتا ہے یا پھر
دیے (ندیم) ماشی سے ماش کروا تا رہتا ہے، وہ شوے
(بے چارے) تو صبح کے زمینوں پہ گئے رات کو گھر کا
منہ دیکھتے ہیں۔“

خالہ بتاتی جا رہی تھیں اور وہ سلگ رہی تھیں خالہ
نے ان پر اچھا حق جتایا تھا کہ ان سے ان کی مرضی تک
معلوم نہیں کی اور لڑکے والوں کو ہاں کہہ دی۔

”میں تو مگر کبھی یہ شادی نہ کروں، ہم اتنی گری
پڑی نہیں ہیں کہ جس کا دل چاہیے کسی بھی کھونٹے
سے باندھ دے۔“ دیا سلگ رہی تھی۔

”انکار کر کے کیا خالہ کا یہ ٹھکانا ہمیں نصیب ہو گا“

کہتے ہیں کہ وقت ہر دکھ کا دوا کر دیتا ہے مگر کچھ دکھ
ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو اندر ہی اندر گھن کی طرح
چاٹتے چلے جاتے ہیں۔ یہی حال دیا کا تھا بظاہر مضبوط
نظر آنے والی دیا اندر سے جیسے ختم ہوتی جا رہی تھی۔
شیدا اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی۔ راتوں کو نیند کی جگہ
رتھ جگموں نے لے لی تھی۔ آنکھوں کے گرد بڑے
حلقے، ادا سی کیفیت کا غماز چہرہ لبوں پر پھٹکی مسکان
خالہ درباری کو بہت کچھ سمجھا رہی تھی مگر وہ انجان بنی
ان کے دکھ کو نظر انداز کیے ہوئے تھیں۔

دکھوں کی فصل کاٹنے کاٹنے ایک اور دکھ ان سے
آن ملا تھا۔ جب ایک شام خالہ درباری نے انہیں اچھا
ساتا رہوئے کو کہا۔ ان کا ماتھا ٹھکا اور پھر شام کو آنے
والے مہمانوں سے یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ نووارد اپنے
فرزند ان کے رشتے کے لیے تشریف لائی تھیں وہ
دونوں بھونچکا رہ گئیں خالص پنڈتوں ب و لہجہ لیے وہ
دونوں ادھیڑ عمر کے میاں بیوی خالو کے دور پرے کے
رشتہ دار تھے ساتھ ہی کسی پنڈت میں رہتے تھے بقول خالہ
درباری کے مریعوں کے مالک تھے۔

”تو پھر یہ ان سے استفادہ کیوں نہیں کرتے۔“
”کیا مطلب۔۔۔؟ خالہ نے چونک کر اس کی طرف
دیکھا۔

”یہ مرے بے کھا کر اپنی رنگت کیوں نہیں نکھار لیتے“
گاجر اور سیب کا مہہ نکھاسیں اور چہرہ چمکائیں۔“ خالہ
اس کی بات سن کر مسکرا دیں۔

”میری، بھولی دھی، میں ان مریوں کی بات نہیں کر
رہی۔ مریوں سے مراد زمینیں ہیں۔ یہ بڑی حویلی، ٹوکر
چاکر۔۔۔ اللہ کا دیا سب بچ ہے، عیش کریں کی میری
سوہنی کزیاں۔“

یہ سب سن کر ان کے منہ لٹک گئے کیا ان کا نصیب

کمال جاں نگی ہم دونوں۔ بس نصیب کا لکھا سمجھ کر
چپ چاپ قبول کر لو۔ خالہ صبح کہہ رہی تھیں کہ مرد
کی شکل و صورت سے کیا لیتا اصل تو اس کی عورت کو
دی گئی عزت ہے ہمیں عزت سے رہنے کا ٹھکانا مل
جائے اس سے زیادہ کی تمنا بھی نہیں ہے۔“ شیبہ جیسے
ہار مانے بیٹھی تھی۔

”تم کمپو دماز (سمجھو تا) نہیں کرو گی خالہ ہمیں
یہاں نہیں رکھتیں تو نہ رکھیں۔ اللہ کی زمین بہت
بڑی ہے کہیں بھی چلی جائیں گے کسی دارالامان میں
پناہ لے لیں گے مگر یوں اپنی ذات کو تماشا نہیں بننے
دیں گے۔ ہماری بھی مرضی ہے، ہمارے بھی ارمان
ہیں۔“

”ہمارے ارمان ہماری ماں کے مرنے اور باپ کے
ہمیں دو سروں کے آسرے پر چھوڑ جانے پر ہی مگر گئے
تھے۔“ شیبہ حد درجہ مایوس تھی۔

”جو ہو رہا ہے جیسے ہو رہا ہے بس ٹھیک ہے تم ایسا
کچھ نہیں کرو گی کہ ہمیں دنیا کے مزید پھیرے سنے
پڑیں۔“ شیبہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی اور دیکھنے لگا
بہن ہو کر آنسوؤں سے نانا جو ڈالیا۔

☆ ☆ ☆
”دکھ اس بات کا نہیں کہ ہم نے دو سروں کی دی گئی
افیتوں سے اپنا دامن بھرا دکھ تو اس بات کا ہے کہ ہم
باپ کی چھتر چھایا ہوتے اس سے محروم ہو کر سورج کی
نمازت برداشت کرتے رہے اگر آپ کی محبت کا
احساس ہی ہمارے پاس ہوتا تو کسی کی کیا مجال تھی کہ
ہم ٹھوکروں کی زد میں رہتے۔“ دونوں نے باپ کو
شرمسار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

”بس بہت تقریریں لی تم دونوں بہنوں کی، آج تم
نے ثابت کر دیا کہ پردھانی کچھ سکھائے نہ سکھائے،
بہنوں کے سامنے زبان درازی ضرور سکھا دیتی ہے۔“

”خالہ درباری یہ زبان درازی نہیں یہ تلخ حقائق
ہیں جو آپ جانتے ہو جیسے چشم پوشی سے کام لے رہی
ہیں۔“ شیبہ کو ان کی بات ناگوار نہ تھی۔

کمال جاں نگی ہم دونوں۔ بس نصیب کا لکھا سمجھ کر
چپ چاپ قبول کر لو۔ خالہ صبح کہہ رہی تھیں کہ مرد
کی شکل و صورت سے کیا لیتا اصل تو اس کی عورت کو
دی گئی عزت ہے ہمیں عزت سے رہنے کا ٹھکانا مل
جائے اس سے زیادہ کی تمنا بھی نہیں ہے۔“ شیبہ جیسے
ہار مانے بیٹھی تھی۔

”تم کمپو دماز (سمجھو تا) نہیں کرو گی خالہ ہمیں
یہاں نہیں رکھتیں تو نہ رکھیں۔ اللہ کی زمین بہت
بڑی ہے کہیں بھی چلی جائیں گے کسی دارالامان میں
پناہ لے لیں گے مگر یوں اپنی ذات کو تماشا نہیں بننے
دیں گے۔ ہماری بھی مرضی ہے، ہمارے بھی ارمان
ہیں۔“

”ہمارے ارمان ہماری ماں کے مرنے اور باپ کے
ہمیں دو سروں کے آسرے پر چھوڑ جانے پر ہی مگر گئے
تھے۔“ شیبہ حد درجہ مایوس تھی۔

”جو ہو رہا ہے جیسے ہو رہا ہے بس ٹھیک ہے تم ایسا
کچھ نہیں کرو گی کہ ہمیں دنیا کے مزید پھیرے سنے
پڑیں۔“ شیبہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی اور دیکھنے لگا
بہن ہو کر آنسوؤں سے نانا جو ڈالیا۔

☆ ☆ ☆
”دکھ اس بات کا نہیں کہ ہم نے دو سروں کی دی گئی
افیتوں سے اپنا دامن بھرا دکھ تو اس بات کا ہے کہ ہم
باپ کی چھتر چھایا ہوتے اس سے محروم ہو کر سورج کی
نمازت برداشت کرتے رہے اگر آپ کی محبت کا
احساس ہی ہمارے پاس ہوتا تو کسی کی کیا مجال تھی کہ
ہم ٹھوکروں کی زد میں رہتے۔“ دونوں نے باپ کو
شرمسار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

”بس بہت تقریریں لی تم دونوں بہنوں کی، آج تم
نے ثابت کر دیا کہ پردھانی کچھ سکھائے نہ سکھائے،
بہنوں کے سامنے زبان درازی ضرور سکھا دیتی ہے۔“

”خالہ درباری یہ زبان درازی نہیں یہ تلخ حقائق
ہیں جو آپ جانتے ہو جیسے چشم پوشی سے کام لے رہی
ہیں۔“ شیبہ کو ان کی بات ناگوار نہ تھی۔

کمال جاں نگی ہم دونوں۔ بس نصیب کا لکھا سمجھ کر
چپ چاپ قبول کر لو۔ خالہ صبح کہہ رہی تھیں کہ مرد
کی شکل و صورت سے کیا لیتا اصل تو اس کی عورت کو
دی گئی عزت ہے ہمیں عزت سے رہنے کا ٹھکانا مل
جائے اس سے زیادہ کی تمنا بھی نہیں ہے۔“ شیبہ جیسے
ہار مانے بیٹھی تھی۔

”تم کمپو دماز (سمجھو تا) نہیں کرو گی خالہ ہمیں
یہاں نہیں رکھتیں تو نہ رکھیں۔ اللہ کی زمین بہت
بڑی ہے کہیں بھی چلی جائیں گے کسی دارالامان میں
پناہ لے لیں گے مگر یوں اپنی ذات کو تماشا نہیں بننے
دیں گے۔ ہماری بھی مرضی ہے، ہمارے بھی ارمان
ہیں۔“

”ہمارے ارمان ہماری ماں کے مرنے اور باپ کے
ہمیں دو سروں کے آسرے پر چھوڑ جانے پر ہی مگر گئے
تھے۔“ شیبہ حد درجہ مایوس تھی۔

سے مجھے تمام حالات کا پتا چل گیا تھا۔ جو کسی کی بیٹیوں پر ظلم کرتے ہیں ان کے ساتھ بھی کچھ اچھا نہیں ہوتا۔ چننا کی شادی کچھ عرصہ ہی چلی اس کے سرال والے لالچی لوگ تھے آئے دن کے روپے پیسوں کے تقاضوں اور بار بیٹ سے تنگ آکر وہ باپ کے گھر ایک بچی کو لیے بیٹھی ہے۔

شفیق عالم بتا رہے تھے اور چننا کے بارے میں جان کر انہیں حقیقتاً ”دکھ ہوا کہ انہوں نے ان کے ساتھ لاکھ برا کیا مگر ان دونوں بہنوں نے بھی ان کے بارے میں برا نہ سوچا کوئی بد دعا نہ دی۔ باپ کی محبت نے انہیں چند دنوں میں ہی مرجھائے پھول سے ایک حسین و شگفتہ کلی میں بدل ڈالا تھا۔

”میں صرف چند دن کے لیے تمہارے ساتھ بھیج رہی ہوں مگر یہ بتا دوں کہ ان کی رخصتی اسی گھر سے ہو گی۔ یہ بات یاد رکھنا کبھی شہر جا کر تو تے کی طرح آنکھیں پھیر لو۔“ خالہ درباری نے شفیق کو گھوڑا توڑا مسکرا دیے۔

”بے فکر رہیں جہاں سے میری بیٹیوں کو عزت اور پاں ملا یہ وہیں سے رخصت ہوں گی۔“ انہوں نے تشکر نگاہوں سے خالو کی طرف دیکھا تو وہ بھی دھیمے سے مسکرا دیے۔

شادی کے ذکر پر دبا کا چہرہ پیکا پڑ گیا۔ شفیق عالم نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

”میں لڑکوں سے مل چکا ہوں ماشاء اللہ دونوں بچے بہت اچھی شخصیت کے مالک ہیں والدین بھی نائس ہیں مجھے امید ہے کہ میری بیٹیاں وہاں خوش رہیں گی۔“

”ہو نہ۔۔۔ ان کالے کوئیں اور ان بڑھڑ زمینداروں کے ساتھ ہی تو ہم خوش رہیں گی خود تو تم (گوری) کر کے لے آئے اور ہمیں حبشیوں کے حوالے کر رہے ہیں۔“ دنیا بیڑائی۔

شیبانے اسے کہنی ماری تو وہ کلس کر رہ گئی۔



حفصہ اور عادل سے مل کر جیسے ان کے ہر دکھ کا

”بس گزرے وقت کی تلخیاں اب اپنے ذہن سے تھوک دو، صبح کا بھولا شام کو گھرا آجائے تو اسے بھولا نہیں کتے، کچھ حقائق اس ندامت میں ڈوبے شخص سے بھی سن لو۔ بعض اوقات حقیقت وہ نہیں ہوتی جو ہمیں دکھائی دے رہی ہوتی ہے، پتا بھی ہے کہ یہ کتنا عرصہ اسپتال میں زندگی و موت کی کشمکش میں بڑا رہا ہے یہ تم لوگوں کا نصیب ہی تھا کہ جو اس شخص کو تمہارے سامنے لا کھڑا کیا۔“

شفیق عالم کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت پر رہے تھے۔ مضبوط جالی سے باندھا ہوا تھوپ کر ان کی طرف بے اختیار بڑھے تھے انہیں سمجھنا کہ اپنے سے ایسے لگایا کہ برسوں کی نفسی لحوں میں مٹا لینا چاہتے ہوں۔ باپ کا مشفق و مضبوط سینہ دونوں بہنوں کے دل کی دنیا کو زیر کر گیا یوں لگا وہ کسی مضبوط سائیاں تلے آگئی ہوں جہاں کوئی خوف و ڈر، اندیشہ نہ ہو، اشکوں کا سیل رواں سب شکوکوں کو بہا لے گیا۔

”بس اب چلنے کی تیاری کرو تمہارا بھائی اور تمہاری ماں تم سے ملنے کے لیے بے قرار ہیں۔“ دونوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

”سگی ماں کا پاپا تو شاید ہی دنیا کی کوئی ہستی دے سکے مگر جب جنہو جو کہ اب حفصہ ہے تمہارے دلوں کو ماں کی محبت سے بھر دے گی۔ میں اتنے دنوں اس سے خواہ مخواہ ہی بدگمان رہا کہ اسے جب تم لوگوں کا پتا چلے گا تو وہ بہت جھگڑا کرے گی مگر جب میرا ایک سیکنڈ ہوا اور میں اسپتال میں پڑا رہا تو اسے میری ڈائری مل گئی کسی پاکستانی ٹیلی سے ڈائری پڑھوائی تو اسے میرے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔ ایک باپ اپنی اولاد کی جدائی میں کیسے دن رات تربیتا ہے اولاد بھی وہ جو ماں سے محروم ہو تو اس پر کیا گزرتی ہے وہ تمہارے بارے میں سب جان کر بہت روئی مجھ سے بہت لڑی مگر اس بات پر کہ میں نے اسے اتنا عرصہ اس بات سے بے خبر کیوں رکھا۔ تمہارا بھائی عادل بھی تم لوگوں کے بارے میں جان کر خوش ہوا جیسے ہی میں چلنے کے قابل ہوا حفصہ مجھے لے کر یہاں آگئی۔ فون پر خالہ درباری

ازالہ ہو گیا تھا، ایسی والمانہ محبت بھائی کا پیار وہ اپنے آپ کو خوش قسمت ترین تصور کرنے لگیں۔
 چھبھو کے چہرے پر شرمندگی کے آثار دیکھ کر وہ بنا کسی غلے شکوے کے ان کے گلے لگ گئی تھیں انہیں ان کے رب نے بہت کچھ نوازا تھا پھر کسی رشتے سے شکوے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔

وعدے کے مطابق شفیق عالم ان سب کو لے کر خالہ و رباری کی حویلی میں حاضر ہو گئے تھے۔
 حویلی میں رونقیں جاگ اٹھی تھیں مگر دیبا کے چہرے پر مرنی پھائی ہوئی تھی۔ کتنی ہی مرتبہ اس نے اس رشتے سے انکار کا ارادہ باندھا مگر زبان پر انکار کا لفظ آتے آتے رک جاتا۔ آئندہ کی زندگی کے بارے میں سوچ کر وہ پریشان ہو جاتی۔ راتوں کی نیندیں ختم ہو چکی تھیں عجیب بے چینی تھی کوئی کسک تھی جو دل کو مضطرب کیے ہوئے تھی۔

اسی اضطراب اور ذہنی کشمکش میں ماپوں اور مندی کی رسمیں بھی ہو گئیں۔ دیبا کی آنکھوں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر نکھرتے رہے۔

”تو احیان تمہارے جذبے اس قدر بوجھ نکلے۔ سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے آج میرے ہاتھوں پر کسی دوسرے کے نام کی جتا بھی جگ گئی اور تم میری زندگی سے کسی ہوا کے جھونکے کی مانند گزر گئے وہ جھونکا جو مجھے ہمیشہ ہماری آمد کا یقین دلاتا تھا میرے قلب کو خزاں کی زبردی کا پیرا ہن اوڑھا گیا۔ تمہاری آنکھوں میں چمکتی یقین کی ڈوری کیا کچی تھی یا میں نے ہی تمہارے جذبوں کے پانکھن میں سچائی کا عنصر تلاش کرنے میں غلطی کی۔“

”چلو بھی کڑو اب دونوں دوہنی کی جان چھڑ دو (چھوڑ دو) انہیں آرام کرنے دو، سو رہے جنج نے بھی آتا ہے تم سب بھی اپنے گھروں کی راہ لو“ خالہ و رباری کی آواز نے اس کی سوچوں کی پوٹی کو گرہ لگائی۔ کچھ خواتین اور لڑکیاں بالیاں انہیں ان کے کمرے میں چھوڑ گئیں۔ شاگرہ پھپھو، تانی، بشری، چندا سب گاؤں والوں کی طرف سے ان کو اتنی اپنائیت ملنے پر

جیراں تھیں کہ چھ ہی عرصہ میں انہیں محبتیں کا وسیع سمندر ان کے رب نے انہیں عطا کر دیا تھا۔
 شعیب کبھی شیدا اور کبھی دیبا کو دیکھ کر سر دھڑک رہا جاتا راون آنکھیں نمکین پانی سے بار بار بھر جاتیں۔
 ”آئے ہائے منڈے دی اکھال داتے ناس ہی مارا گیا۔“ (لوکے کی آنکھوں کا تو برا حال ہو گیا)
 میرا پتر آ میں تیری اکھال دی بینکالی کراں۔“ (میرا بیٹا تیری آنکھوں کی سینکالی کروں)
 خالہ برکتے اس کی آنکھوں سے ٹپکتے پانی اور سرخی کو دیکھ کر اپنا تجربہ آزمائے پر آمادہ ہوئیں۔
 دیبا اور شیدا اس کی طرف متوجہ ہو میں اور ان کی ہنسی نکل گئی وہ دونوں ان کے اطراف آ بیٹھیں۔
 ”خالہ برکتے آنکھوں کی یہ دھن اور ٹپکتا پانی کسی سینکالی سے نہیں جائے گا ہمیں پتا ہے کہ اس بے چارے کو کیا دکھ ہے اور آنکھوں سے یہ برسات مسلسل کیوں ہو رہی ہے۔“

کمرے میں موجود سب کا ہاتھ ٹھک گیا شاگرہ کے دل کی دھڑکن ست پڑ گئی کہ کوئی پتا نہیں دیبا ان کے لخت جگر کے دل کا راز طشت از پام کر دے۔

”شعیب میرے سوچنے غم نہ کر یہ وقت تو ہر ایک پر آتا ہوتا ہے اس موقع پر صبر سے کام لیتا ہی پڑتا ہے یہ دنیا کا ستور ہے ایک دن، بہنوں کو بھائیوں سے جدا ہونا ہی پڑتا ہے، میرے بھائی جدائی کا یہ زہر بھائیوں کو پینا ہی پڑتا ہے۔“

دیبا کی بات پر شعیب کے آنسو بھل بھل بننے لگے اور شاگرہ کا انکا سانس بحال ہوا۔

”یہی بات تو میں اسے کتنے دنوں سے سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں پر اس کی موتی عقل میں کہاں بات سمائی ہے۔“ شاگرہ پھپھو اپنا پیٹ پکڑے لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئیں کہ کئی دن سے ٹھن ملانی سے بنی اشیاء اور لسیاں بی بی کران کا پیٹ دہائی دینے لگا تھا۔

”چل اب چپ کر جا۔ شیدا تو ہی اسے چپ کرائے گی میری تو یہ سنے گا نہیں۔“ شیدا بھی بھائی کی گردان کرنی اسے حوصلہ دینے لگی تو شعیب کا حوصلہ بالکل

ہی پست ہو گیا وہ وہاں سے اٹھ کر شکستہ قدموں سے مروانے میں چل دیا۔

☆☆☆

آج صبح کا دن بڑا روز تھا شفیق بیگم پلکوں سے انتظامات میں لگے تھے گو کہ خالہ و براری کے شوہر نے سب انتظام سنبھال رکھا تھا فکشن بھی مختصر ہی تھا مگر باب ہونے کے نالے وہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کی کوشش کر رہے تھے ساری عمر بیٹیوں سے دور رہے اور جب ملے تو بیٹیوں کو خوش سے جدا کرنے کا وقت آگیا مگر اس سب کے ساتھ ساتھ ان کے دل کو ایک سکون بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بچپن کو ان کے گھر بھیجنے کا فریضہ ادا کرنے خود موجود تھے۔

دیا اور شیبہ کی حالت بھی ان سے یکسر مختلف نہ تھی۔ ان چند دنوں میں باب نے ان کے دل کو اپنی بے پناہ محبت سے بھر دیا تھا۔ ان کے دل سے ہر شکوہ چپ چاپ رخصت ہو گیا۔ ایک محبت ملی تو دوسری چھین گئی، دل آنے والے وقت سے لرز رہا تھا بظاہر وہ مطمئن تھیں مگر اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ دیا تو آئندہ کی زندگی سے بالکل بھی مطمئن نظر نہ آتی تھی بہت نہیں آنے والا وقت ان دنوں کے نصیب کا کیا فیصلہ کرے، یہی خیال پریشان کیے وے رہا تھا اور پھر لمحے گزرتے چلے گئے ان کے نام کو ہمیشہ کے لیے کسی کا ساتھ نصیب ہو گیا اور وہ سو گوار فضا میں غم آنکھوں سے نصیب کے کیے گئے فیصلے پر سرخم کیے اپنے اصل گھر کو روانہ ہو گئیں ساری امیدوں و خواہشوں کا وقت تمام ہو چکا تھا۔

دو گھنٹے کے لیے سفر اور مختصر رسموں کے بعد انہیں اپنے اپنے حجرے میں پہنچا دیا گیا کتنی ہی مرتبہ اسے دیا نے کن آنکھوں سے دو لہا کو دیکھنے کی ناکام کوشش کی مگر وہ دونوں چہروں پر پھولوں کا سہرا ڈالے ہوئے تھے۔

”جالب! پینڈو۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”سارے ہمارے نصیب پر ایسے رشک کر رہے ہیں جیسے شہزادوں سے بیاہی جا رہی ہوں۔“ دیا نے

جھنجھلاتے ہوئے اپنے کھڑا رو پٹے کو پیچھے کیا اور پاؤں پھیلانے کمرے پر طائرانہ نظر ڈالی تو مہسوت ہو گئی۔

اسے کمرے پر چنستان لگا گئی ہوئے لگائیوں لگا ہر شے نے گلوں کا غلاف پہنا ہوا ہے۔ کونا کونا ہمارے صدا لگا رہا تھا۔ کمرے کی فضا گلوں کی خوشبو سے معطر ہو گئی۔

صوفے، بروے، فرنیچر سب میں کرا سیکم کا بے طرح خیال رکھا گیا تھا۔

”ہونہ۔۔۔ سارے پیسے کے کھیل ہیں پیسہ سے سب کچھ کروالو۔ انسان کی تعلیم اور شکل اچھی نہ ہو تو پیسہ کیا خوشی دے سکتا ہے۔“ اسے ان کے کمرے سانولے رنگ کا سوچ کر ہی پاؤں آگیا۔

حالانکہ خوب سمجھتی تھی کہ شکل رنگ روپ چند دن کی خوشی دے سکتے ہیں مگر کردار، شرافت اور عزت ہمیشہ انہیں معتبر کر دیتی ہے مگر پھر بھی وہ فضول باتوں کو ذہن میں جگہ دیے جا رہی تھی۔

دروازے کا ہینڈل کھونٹنے کی آواز سنائے میں ایسی گونجی کہ دیا کا دل اچھل کر حلق میں آگیا، ہتھیلیاں پسینے سے نم ہوئیں وہ آنے والی شخصیت کا سامنا کرنے سے بے طرح گھبراہٹ تھی، وہ اس وقت سے خوف زدہ تھی جب اسے اپنے شریک سفر کو نہ چاہ کر بھی چاہے جانے کا ڈھونگ رچانا پڑے گا وہ اپنے دل کو کسی بھی خوش کن خیال و احساس سے عاری پارہی تھی۔

چند گھنٹوں پہلے جس شخص کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا اپنی رضا مندی کا عہدہ دیا تھا وہ پورے استحقاق سے اس کے سامنے بر اجمن تھا۔

”بشا اللہ بہت دنوں سے آپ کے حسن بلا نیز کے قصے سن کر دل ویدار شوق کا تمنی ہوا تھا۔ آپ کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھوں کی سچائی پر یقین لے آیا ہوں کہ اس روئے زمین پر میرے گھر میں اک حسین پری نے رونق بخش کر میسے دل و نظر کے قرار کو چھین لیا ہے۔“ سامنے بیٹھا شخص چہرے پر پھولوں کے سرے میں سے جھری بنا کر اس کے حسن کے قصیدے پڑھنے میں مگن تھا۔

ماہنامہ حنا

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

لاہور

نمبر 2017 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

نومبر 2017 کے شمارہ کی ایک فہرست

☆ ”صراطِ مستقیم“ حنا مقرر کا مکمل ناول،

☆ ”کسی ہمسفر کی تلاش میں“ عمار اٹلا

کا مکمل ناول،

☆ ”دل کیا ہجر“ عدلی عباس کا مکمل ناول،

☆ ”سب سے منتظر ہو گئی“ سونچا ہدیری کا ناول،

☆ ”میں نے قسم“ بشری سیال کا ناول،

☆ ”دل گزیدہ“ امیر کا

سلسلے دار ناول،

☆ ”ہریت کے اس پار کہیں“ ثانیہ بیٹا

کا سلسلے دار ناول،

☆ وجیہ بخاری، نصیر بخاری، آسیہ مظہر، انورین شاہد،

راجہ بخاری، اور کونول ریاض کے افسانے،



پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشاء نامہ،

اور مستقل سلسلوں کے علاوہ وہ سب کچھ جو

آپ پڑھنا چاہتے ہیں

دیبا تھک گئی اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا
مگر وہ چہرہ پھر گلوں کے پیچھے چھپ گیا۔
”آپ کا چہرہ اداسی کا غماز ہے کہیں اس شادی پر
زبردستی تو نہیں راضی کیا آپ کو۔“ اس شخص کا سوال
اور آواز دونوں نے الجھا دیا۔

”دیکھیے زندگی کے اس سفر میں دونوں فریق کی
باہمی رضامندی ضروری ہے اگر آپ کو میرا ساتھ دل
سے قبول نہیں تو۔۔۔“ اس کی بات مکمل ہونے سے
قبل ہی دیبا نے اس مانوس آواز پر دو لمبے میاں کا
پھولوں بھرا سہرا تیزی سے فوج ڈالا۔

”ہائے میں مر گئی۔۔۔ احیان کو سامنے دیکھ کر بے
ساختہ اس کے لبوں سے نکلا۔

”مجھ پر۔۔۔؟“ وہ شرارت سے مسکرایا۔

”ویسے پہلی بار ایسا ہوا ہو گا کہ دلہن نے دولہا کا
گھونگھٹ کھولا۔ شوق دیدار کی بھی حد ہو گئی۔“

”دل تو چاہ رہا ہے کہ اتنے بڑے دھوکے پر گنجا کر
کے اپنے بالوں میں گلی ساری پنوں کو آپ کے سر میں
جھپھالوں۔“ وہ جو بیویشن کے بنائے گئے پھنسا شائل
سے عاجز آئی ہوئی تھی دانت چبا کر بولی احیان نے
تقریباً لگایا۔

”یہ دھوکا نہیں ہے میڈم سر براؤز ہے عمت پوچھو
کہ اس سر براؤز کے لیے ہم بھائیوں نے کتنے پارڈ
بیلے۔ وہ اسے ایک ایک بات بتاتا چلا گیا کہ اس کی ماما کو
وہ دونوں بہنیں نرسنگ کی شادی میں بے حد پسند آئی
تھیں۔ سدا کی حسن پرست ممانے انہیں فوراً ”او“ کے
کر دیا تھا بس ذرا گاؤں کی وجہ سے ہچکچاہٹ کا شکار
تھیں جب ہم نے بتایا کہ تم لوگوں کا تعلق بھی شہر سے
ہے اور تمہارے بابا ملک سے باہر ہوتے ہیں تو پھر یہ
ہچکچاہٹ بھی ختم ہو گئی۔ ہم بھائیوں کو یقین نہ آتا تھا
کہ ممانا اتنی آسانی سے مان جائیں گی اس دن تمہیں
تھوڑا تک کرنے کے لیے میں نے بات گھما پھرا کر کی
اور تم نے تو مزید میری کوئی بات سنی ہی نہیں خود سے
ہی سارے قیافے لگا لیے پھر ہم نے بھی خاموشی اختیار
کر لی اور معاملات بہوں کے سپرد کر دیے۔

میں نیک نیتی۔“ وہ سچ میں خالہ درباری کے خلوص سے متاثر ہوا تھا۔

”خالہ درباری جیسے فرشتہ صفت لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ اللہ انہیں ان نیکیوں کا اجر عظیم عطا کرے۔ ان دو سالوں میں ماں باپ، دوست، رشتہ دار سب رشتوں کا مان دیا۔ وہ ہمارا میکا ہے احیان، ہمیں کبھی اپنے میکے سے دور نہ کرنا۔“ اس کی آنکھیں جھلما لیں تو احیان ان کنول میں ڈوب سا گیا۔

دیوانے اس کی مخمور نظروں کی ناپ نہ لا کر فوراً پکوں کی چلین گرائی دل کی دھڑکنوں نے تیز گام کی رفتار پکڑ لی تھی وہ واپس اپنی جون میں پلٹی۔

”وہ سارے پیار تم نے کہاں رکھے ہیں۔“

”کنول سے۔۔۔؟“ احیان نے اچنبھے سے پوچھا۔

”ویں جو تم دونوں بھائیوں نے بیلے تھے انہیں فرائی کر کے پاپڑوں کی ریڑھی لگواؤں گی تمہیں محنت سے بیلے گئے پیار ایسے ضائع تھوڑی کریں گے۔“

”بابا بابا۔۔۔“ ہنستے ہوئے اس نے دیا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ دیوانے اس بار کوئی مزاحمت نہ کی خود سپروگی کے عالم میں اس نے اسے اپنا آپ سوپ دیا تھا۔

”صحیح کہہ رہی ہو یا ان پیسوں سے پھر ہم ہنی مون منانے چلیں گے کیا خیال ہے۔“ وہ شوخ ہوا اور دیا نے شرمیلیں مسکراہٹ سجاتے ہوئے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا تھا کہ اس کے رب نے ان کے تمام دکھوں کا ازالہ کر دیا تھا شیا کے کمرے کا منظر بھی اس سے کچھ

مختلف نہ تھا وہ وضو کیے اپنے رب کے حضور سجدہ ریز تھی کہ جن کو چاہئے والا شریک سفر باپ کی شفقت، ماں کی چاہت، بھائی کا مان ہر ایک چیز سے ان کے رب نے انہیں نوازا دیا تھا جوڑیوں کی کٹنگ کے ساتھ ان کی ہنسی کے جلتے رنگ دلوں کو سرور بخش رہے تھے۔

قدرت ہم پر مہربان ہو رہی تھی سچی محبت کی طلب کرنے والوں کو منزل مل ہی جایا کرتی ہے۔ خالہ درباری تمہارے بابا اور میرے ماما بابا کے درمیان سب کچھ طے ہو رہا تھا بس تم لوگوں کو بے خبر رکھا۔

اصل میں اسی دوران ماما بابا کا کسی فنکشن سے واپسی پر ایک سیٹنٹ ہو گیا۔ بابا کو شدید جوڑیں لگیں مگر کسی بڑے حادثے سے بچ گئے لیکن ماما کی ٹانگ دو تین جگہ سے فریکچر ہو گئی۔ گھر میں کافی پریشانی تھی۔

ممانے خالہ درباری سے فون پر رشتے کی بات کی تو وہ بھی کچھ پس و پیش کے بعد مان گئیں۔ ابھی ماما مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہیں اس لیے مختصر سا فنکشن کر گئے تمہیں اس گھر میں لے آئے جیسے ہی ماما مکمل طور پر تندرست ہوں گی۔ کریڈٹ ولیمہ کریں گے گاؤں سے بھی بہت سے لوگوں کو مدعو کریں گے اس واقعہ کے بعد ماما میں بہت حد تک چیخچاچا آیا ہے وہ اپنوں کی اپنائیت محسوس کرنے لگی ہیں۔“

احیان نے ساری بات چتا کر ہو لے سے اس کی ناک کو دیا جو اسے بڑے انہماک سے سن رہی تھی۔

”اور وہ تاریک رات کا حسن لیے ہمارے سانس سرکس نے بھیجے تھے۔“ اس نے احیان کے ہاتھوں کو جھکا دیا جو اسے اپنے ساتھ لگانے کے لیے آگے بڑھے تھے۔

”اس کا انتظام خالہ درباری نے کیا تھا۔ ویسے یار خالہ درباری کیا ولچپ خاتون ہیں ایسے منٹوں میں مسئلے سلجھانی ہیں کہ بندہ حیران رہ جائے۔ انہیں تو ملک کی وزیراعظم ہونا چاہیے ہر کام میں سدھار، ہر کام

سرورق کی شخصیت

ماڈل عظمیٰ طاہر

میک اپ روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی موسیٰ رضا

کارولٹ

منعم ملک

آوازِ دو



گلاب کی پتیوں کی خوشبو سارے ماحول سے لٹکی پڑی تھی۔ اور فلادور شاپ میں چلتی روشنیوں کے نیچے کھڑی مہر النساء کا وجود وہاں بڑے سفید گلابوں کے ہر پھول سے بڑھ کر مہک رہا تھا۔ اب اتنی ہی بار سنجیدگی سے اسے دیکھ چکے تھے وہ بے نیازی سے شاپ کے آخری کونے میں کھڑی آئینے کو دیکھے جا رہی تھی۔ فلادور اسٹال سے گلابوں کو ذیل کرتے دلی کا سارا وہبان بھی اواھر ہی اٹکا ہوا تھا!

”مہر النساء وقار احمد“ اس کے لبوں نے آہستگی سے ادائی کی۔ اور آئینے میں لہراتا عکس مسکرانے لگا۔ مس ورلڈ جیسے تیج سچ کر قدم اٹھاتی باہر آئی۔ ابائی چہرے پر ناخوش صاف پڑھی جاسکتی ہے۔ ”ڈیر ابا آئی ایم ریڈی“ مس ورلڈ نے سیاہ ریشمی ایرلائن فرائڈ کا ٹونا پڈر کر خود کو ہلکا سا گھمایا۔

اب اس کی اس حرکت پر مسکرائے بنائیں رہ سکے۔ وہ شرارت میں ابائی طرف انگریزی کا جملہ چھیکی تھی۔ دلی یوں انجان کھڑا تھا جیسے اس کی طرف نہیں دیکھ رہا۔

”میں کیسی لگ رہی ہوں۔؟“ اس نے خود کی تعریف مانگی۔ وہ ہمیشہ کی نسبت آج لائٹ سا گر اچھا سا تیار ہوئی تھی۔ آج سے قبل اسے کبھی تیار ہونے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اور ابائی خوشی کی وجہ یہی آج کی ”ضرورت“ ہے۔ وہ روک چکے تھے وہ نہیں رکی تھی۔

”نساء۔ نہیں کوئی تجھ سارے۔“ پھولوں کا بکے تیار کرتے ہاتھ روک کر انہوں نے جواباً اتنی شرارت سے کہا اور ابائی نساء زور سے ہنسی چلی گئی۔ وہ اندر سے کچھ اٹھانے لگے۔ غالباً ”کافنہ۔ مہر النساء قل قل ہنسی ان کے پیچھے اندر چلی آئی۔

”پیارے ابا آپ بھی نیل کبھی بڑے رومانیک موڈ میں آجاتے ہیں۔ دلی صحیح کتا ہے ہمیں سانس دینے کے لیے آپ کو ایسے موڈ میں آتے رہنا چاہیے۔“ وہ میرے میرے مسکراتے ہوئے کاؤنٹر پہ پڑے سفید گلابوں کے بکے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

”نساء۔ نہیں کوئی تجھ سارے۔“ پھولوں کا بکے تیار کرتے ہاتھ روک کر انہوں نے جواباً اتنی شرارت سے کہا اور ابائی نساء زور سے ہنسی چلی گئی۔ وہ اندر سے کچھ اٹھانے لگے۔ غالباً ”کافنہ۔ مہر النساء قل قل ہنسی ان کے پیچھے اندر چلی آئی۔

”پیارے ابا آپ بھی نیل کبھی بڑے رومانیک موڈ میں آجاتے ہیں۔ دلی صحیح کتا ہے ہمیں سانس دینے کے لیے آپ کو ایسے موڈ میں آتے رہنا چاہیے۔“ وہ میرے میرے مسکراتے ہوئے کاؤنٹر پہ پڑے سفید گلابوں کے بکے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

”سب دیکھ رہا ہوں۔“ ابا اچانک سے سنجیدہ

”معلوم نہیں لوگ ہنسی کو ہی خوشی کی علامت کیوں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ خوش ہونے اور ہنسنے کے درمیان کا فاصلہ ہمیشہ واضح رہتا ہے۔“ ابانے ہلکے ہلکے انداز میں کہا۔ مہر النساء چونکی، پھر بات سمجھتے ہوئے مسکراہٹ مزید گہری کر کے بولی۔

”معلوم تو یہ بھی نہیں کہ لوگ جانے کیوں ہمیشہ ہنسی اور خوشی کے درمیانی فاصلے میں الجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ انہیں صرف مسکراہٹ کے جواب میں مسکراہٹیں ہی بانٹنی چاہیے۔ کیوں ڈیر ابا؟“ اس کے جتانے پر ابابا نے۔

”کمال ہے۔ سنجیدہ باتوں پر ہنس پڑتے ہیں۔“ اس نے منہ بتایا۔

”ٹھیک ویسے جیسے تم مزاحیہ باتوں پر بھی نہیں ہنسی۔“ انہوں نے سر پر ہار سے چیت لگائی۔ ابابا بنایا بکے تیار تھا۔ مہر النساء بھی تیار۔ دلی باہر کسی سے کہہ رہا تھا کچھ۔ آواز آرہی تھی۔

”مس۔ سرخ گلاب نہیں ملے گا۔“

”لیکن مجھے صرف سرخ گلاب ہی چاہیے۔“

”اصل میں وہ ختم ہیں۔ آپ یہ دیکھیں۔“

”وائٹ۔“

”تو نو نو۔“ اوٹلی ریڈ روئس۔ (نہیں صرف سرخ گلاب)۔

”یہی ہی میں مل گئے کٹھن لکھیں گے۔“ وہ ایک بار پھر مسکرا دی۔ ”او کے ڈیرہ ابا۔ ہم جلدی آئیں گے۔“

وہ پھول اور ابا کا وائٹ اٹھاتی شاپ سے باہر نکل گئی۔ دلی پلاسٹک کی شفاف سطح میں پٹنا سرخ گلاب اپنے گلاب کووے کر رخصت کر رہا تھا۔ وہ قدم قدم اٹھاتی دلی کے قریب آئی۔

”سو مشرودید آریو ریڈی۔“ اس کے سوال پر چودہ سالہ لڑکے نے دانت نکالتے ہوئے سر ہلایا۔ مہر النساء کے ساتھ جانا اس کے لیے ہمیشہ سے باعث خوشی تھا۔ بلکہ باعث فخر۔ مہر النساء جو اچھی تھی۔ پوری دنیا میں سب سے اچھی لگتی تھی۔ تاریکی جا رول سمت پھیلی تھی اور سفید روشنیاں سیاہی میں جھلی لگ رہی تھی۔ ہاتھ میں سرخ گلاب پکڑے وہ لڑکا بالکل غیر ارادی طور پر مڑا۔ پھر جیسے اپنی اس حرکت پر خوش ہوتے ہوئے واپس آیا۔

”ہائے۔“ آواز پر وہ دونوں چونکے۔ دلی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ اکثر یہاں پھول لینے آتا تھا مگر آج تو کچھ زیادہ ہی سرکھارہا تھا۔

”ناؤ۔ واٹ ہیٹھ۔“ (اب کیا ہوا ہے) دلی نے بہت سوچ کر سوال کیا۔ (اف اب جواب کیا ہو گا۔ خیر مہر آپی ہیں ناں) اس نے اطمینان سے سوچا۔ مگر وہ لڑکا اسے نظر انداز کیے اسے دیکھ رہا تھا۔ مہر النساء کو۔ مہر النساء کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔ ”او تم یہاں۔ آئی مین۔“ وہ خوشی سے بولتے ہوئے ایک بیل کو چپ ہوا۔ پھر چمکتی آنکھوں سے پھول والا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا۔ ”تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ میں۔ تم یہ پھول لے سکتی ہو۔ پلین۔ میری طرف سے ایک پیاری سے لڑکی کے لیے پیارا سا تحفہ۔“ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ آنکھوں میں ڈھیروں سناسن لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ مہر النساء کی آنکھیں پچھٹی اور پھولوں کا بے ہاتھ سے چھوٹ کر قدموں میں جا کر۔

”او۔“ وہ سٹپٹا گیا۔ ”سوری مجھے غلط مت

ہو گئے۔ مہر النساء نے اوا سی بھری آنکھوں سے ان کے سرعت سے بدلتے رنگ دیکھے تھے۔ گلابوں کی خوشبو اوا سی میں گھلنے ملے لگی۔ اس منہ سے مہر النساء کا دل بو بھل پن کا شکار ہوا۔

”بابا کیوں پور کرتے ہیں آپ۔“ ”مہمو۔ کیوں خود کو تکلیف دیتی ہو؟“ وہ شکوہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

”بابا ابی تو تکلیف نہیں ہوتی۔“ وہ اوا سی سمیت مسکرائی۔ تاریکی دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں بیٹھنے لگی۔

”کیا مجھے سزاوے رہی ہو؟“ ابا نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ مہر النساء کے دل کو دکھانا تھا۔

”بابا خدا کے واسطے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔“ وہ گھٹی گھٹی آواز میں ناراضی سے بولی۔ ابا شرمندہ سے نظر آنے لگے۔

”مہمو تمہیں وہاں جا کر اذیت ہی ملے گی۔“ وہ جانتے تھے۔ اس نے نہیں مانا۔ اور وہ مانی بھی نہیں۔

”کیوں۔ کیا میں کوئی پری ہوں جو وہاں جا کے اپنے پر چلا آؤں گی؟۔“

”مہر النساء تم جانتی ہو۔“ ”ہاں ابا میں جانتی ہوں۔ کسی کو میری مودھوگی سے فرق نہیں پڑے گا۔ تائی جان کی پرنسز کے سامنے میری کیا اوقات۔ مگر ابا میں انہیں بتانا چاہتی ہوں، ہمیں نہیں پڑتا فرق۔ کوئی ہم سے ناتا تو ذکران سے جوڑ رہا ہے تو سودا۔؟ میری طاقت آپ ہیں یہی طاقت انہیں دکھانا چاہتی ہوں کہ ہم آج بھی خوش ہیں۔ انہوں نے بلایا ہے مجھے جانا جا رہے۔ ہے ناں پیارے ابا۔“ وہ ان کے ہاتھ تھام کر مضبوط لپٹے میں کبہ رہی تھی۔ ابا نے ایک گرمی سانس اندر کو ٹھینچی تھی۔

”یہ انت پسندی ہی ہے۔“ وہ اسے سمجھانے کا ارادہ ترک کر کے بولے اور کاؤنٹر پر بکرا اسلمن سیٹنے لگے۔

کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ شبیر محفوظ کن دھیمی دھیمی مسکان مسکانا ہوا ان کے قریب آ بیٹھا۔ اس کی شفاف آنکھیں باہر دھلتے دن سے زیادہ روشن تھیں۔

”بالکل صوفیہ بی۔ لیں چائے۔ آپ سے پڑھ کر محبت کو بھلا کون سمجھ سکتا ہے۔“ وہ صوفیہ پر آرام وہ انداز میں بیٹھتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔ صوفیہ بی جی بھر کر بد مزہ ہو گئیں۔

”اے پرے کرو اس جان کے گھائے کو۔ لڑکے جان چھڑواؤ اس کلی دواسے اتنی گرمی میں جان جلا کر رکھ دیتی ہے۔ اللہ جانے کیوں یہ جلے دودھ کا گھونٹ دنیا کی نعمت لگتی ہے تم لوگوں کو۔ توبہ!“ ناگواری سے کپ ایک طرف کرتے ہوئے وہ ڈپٹ کر بول رہی تھیں۔ شبیر نے کان پکڑ کے دکھائے۔

”جب آپ کا دل ہو تب تو اچھی طرح“ اس جان کے گھائے کو بھول جاتی ہیں آپ۔ خود کی دفعہ تو نما دھو کر بچن میں جا گھستی ہیں۔ یوں کہیں کہ میرے جاگنے سے پہلے ہی یہ شغل فرمایا جا چکا ہوتا ہے۔ آپ بھی نا صوفیہ بی۔“

”کمال ہوں نا۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنستی چلی گئیں۔ ”بڑے چالاک ہو گئے ہو لڑکے۔ تمہارے حق میں یہ بہتر ہے۔“

”کیا چالاک کی۔“ اس نے حیران ہو کر دیکھا۔ ”بالکل۔۔۔ جہاں چالاک لومڑیاں بہت ہوں نا۔ وہاں کوؤں کا ہوشیار ہونا نہایت ضروری ہو جاتا ہے۔“ وہ سچی آواز کر کے رازداری سے بولیں۔ شبیر نے بڑی مشکل سے قہقہہ کا گلا دیا۔

”چھاتو آپ کیا کہہ رہی تھیں۔“ وہ کپ سے اٹھتی بھاپ کو دیکھ کر بولا۔ چائے ایک طرف دھری تھی۔ وہ گرم چائے پسند نہیں کرتا تھا۔

”ہوں۔۔۔ میں تمہیں بتا رہی تھی۔ لوائٹ فرسٹ سائٹ۔ وہ یار جو تمہارے دادا کو مجھ سے ہوا تھا۔ یو نو پہلی نظر کی محبت۔“ وہ فخریہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے شرماتے لگیں۔ شبیر کے لبوں پر ایک محبت

سمجھو۔ مجھے اس کی ضرورت ہے مگر میں سفید گلاب پر سرخ اسپرے کر دالیتا ہوں۔ یہ تمہارا ہوا پلینز لفس۔“ گلابوں کی خوشبو اس کے آس پاس بکھری تھی اور وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ مہر النساء نے آنکھیں کھول کر اس خواب سے نکلنا چاہتا۔ وہ ہمیشہ سے دیکھتی آتی تھی وہ عام سی لڑکی ہے۔ بہت عام سی شکل و صورت کی عام سی لڑکی۔ جس میں کچھ بھی خاص نہیں تھا تو پھر کیسے؟ وہ مسکراتا ہوا چمکتی آنکھوں میں التجا لیے اسے بھول پیش کر رہا تھا۔ اور وہ کسی گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی!

”دل میں گڑے کاٹنے اس طرح نکلیں گے۔“ اس نے ابا سے کہا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ ایسے نکلیں گے۔ اسے کہل جاتا ہے اسے بھول گیا۔ اس رات پہلی بار شبیر نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

گلاب کے پھولوں پر روشنی پھینک دی گئی ہے۔ سفید گلابوں پر پھلکی چاندنی ہو رہی ہے۔ بہتی جا رہی ہے!



گلابی دھوپ اونچے مکانوں کی منڈیروں پر پڑی ستارہ بی تھی۔ اسی باعث سارا دن بہت ساری گرمی سننے کے بعد اس وقت پر سکون سانس لینے میں دشواری کا سامنا نہیں تھا۔ صوفیہ بی عصر پڑھ کر فارغ ہوئیں تو شبیر چائے لے آیا۔ گرمی کچھ گری تھی مگر فضا میں ٹھنن کا احساس بدرجہ اتم موجود تھا۔ صوفیہ بی کہہ رہی تھیں!

”ٹھکرائے جانے کا دکھ دل پر اثر کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ درد ختم بھی ہوتا جائے تو دماغ پر اس خوف کے بوجھ ہمیشہ رہتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک نایک دن اس خوف کی جگہ ضرور محبت لیتی ہے۔ یونولہ۔ مجھے وہ محبت کہ۔ جو ایک زوال کے خدشے سے پرے کا جذبہ ہے۔“ چھوٹے مگر انتہائی نفاست سے سچائے گئے اس خوبصورت سے گھر میں ان کی میٹھی سی آواز گونجتی ہوئی شبیر کے

کر آئی تھیں پورے وقار سے بات کرتی تھیں۔ دل کرتا تھا ساری دنیا اسے سنے جائے کاش ایسی ایک اور معجبہ نہ اس گھر کے مقدر میں لکھی ہو۔ ایک گہری سانس لے کر انہوں نے جھکن کا اظہار کیا۔ وہ مزید بولنے کے موڈ میں نہیں لگتی تھیں۔ اب شبیر کو بولنا تھا۔ وہ ارادہ بھی کر رہا تھا۔!

”بتا ہے دادو۔ آج کل میری توجہ کا مرکز ایک لڑکی بنی ہوئی ہے۔“ وہ عادت کے مطابق ہنستا ہوا آگے ہو کر بیٹھا۔ دادو بری طرح چونک گئیں۔

”کون سی لڑکی۔“

”یہ تو میں نہیں جانتا۔ مگر کل رات میں نے اسے پھول پیش کیا۔ پونو ریڈ روڈ۔“ وہ صوفیہ بی کے انداز میں دانت نکالتے ہوئے بولا تھا۔ دادو بری طرح اچھل پڑیں۔

”ہیں یہ کیسا چھچھورا بن ہے۔ نالائق۔“
”ارے نہیں یاد۔ کیا آپ بھی ایسا کہیں گی۔“ وہ خفا خفا سا ہو کر بولا۔

”تو تمہاری اس حرکت پر۔ شاماشی دوں۔“ وہ ڈپٹ کر بولیں۔ ابھی تک ان کا گھورنا بند نہیں ہوا تھا۔ آخر دو منٹ پہلے تک انہیں اپنے پوتے کی شرافت پر پورا بھروسہ تھا۔

”یار دادو سن تو لیں۔ میں نے صرف اسے بار بار دیکھا ہے۔ کبھی واک کرتے ہوئے، کبھی سائیکل پر جاتے، کبھی پرندوں کے ساتھ۔ آپ جانتی ہیں دادو اس کے بہت سے پرندے دوست ہیں۔“ شبیر کی آنکھوں کی چمک لوٹ رہی تھی۔ وہ پورے جوش سے بولتا ہوا دادو کو حیران کر رہا تھا۔ دادو حیرت سے اسی دیکھنے لگیں۔

”کیا وہ سائیکل چلاتی ہے۔ یعنی کہ اتنی بڑی لڑکی۔“ وہ آخری بات فی الحال نظر انداز کیے آنکھیں پھاڑے پوچھ رہی تھیں۔ ”کیا اتنی بڑی لڑکی کو سائیکل چلانا سوتھ کرتا ہو گا۔؟“ بے اختیار انہیں جھرجھری آئی۔

”اوہ وہ دادو۔ شاید اپنے لبا جی کے ساتھ۔“ اس

بھری مسکراہٹ بھری ہوئی تھی۔ اور وہ پوری توجہ سے انہیں سن رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔ ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھیں چمک سے بھری ہوئی تھیں۔

”پھر تمہارے باپ کو ایسی محبت ہوئی مگر میرا بیٹا بہت شرم والا تھا۔“ ان کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔ شبیر نے کپ لہوں سے لگا کر ہٹایا۔

”یعنی صرف محبت دل میں رکھنے پر اکتفا کرنے والا۔“ اس نے آنکھ دیا کر ٹکرا لگایا۔ دھلتے دن میں دھوپ مدھم پڑتی جا رہی تھی۔

”ہاں نہیں بتا ہے۔ جب بھی تمہارے باپ کو مجھ سے کوئی بات کرنی ہوئی تھی وہ اچانک سے بہت فواں بردار اور سعادت مند بنا نظر آنے لگتا تھا۔ بالکل تمہاری طرح۔ پھر تو میں بھی دیر دیر سے اس کی عادت پچھاننے لگی۔ اور دل ہی دل میں بیٹھ کر سوچتی رہتی تھی کہ کب اگر اصل وجہ بتانا ہے۔“ ان کے نور برساتے چہرے پر ممتا کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں کے درمیان ایک دم نامحسوس انداز میں اداسی پھیل رہی تھی۔ مگر وہ دونوں ہی اداس ہونا چاہتے تھے۔ شبیر کی نگاہیں صوفیہ بی پر لگی تھیں۔ اور صوفیہ بی کی دور بکھری سنہری دھوپ پر۔ دونوں ہی کی آنکھیں چمک کھو چکی تھیں۔

”اور آپ کو ان کے بتانے سے پہلے ہی وجہ معلوم ہو گئی۔“ وہ سوچ کر افسردگی سے مسکرایا۔ صوفیہ بی کی مسکراہٹ بھی ایسی ہی تھی۔

”بالکل۔ یہ تمہاری ماں کو چپکے چپکے دیکھا کرتا تھا۔ اور اس سے پہلے کے کچھ بتانا سبب نہ خود ہی ایک دن اس کے دوست کی مدد سے یہاں آچکی۔ تم دیکھتے کسے ہو انیاں اڑی ہوئی تھیں۔ تمہارے باپ کے چہرے کی۔“ صوفیہ بی نے شرارت سے بتاتے ہوئے ہاتھ اونچا کیا۔ اور ایک تالی کی آواز کے ساتھ قہقہوں کی آواز پورے گھر میں بکھر گئی۔ صوفیہ بی نے چپکے سے آنکھیں صاف کر لیں۔ ”تمہاری ماں تو تمہاری ماں تھی۔ خود اعتماد ہنس مکھ، مخلص، اور خاص رکھ رکھاؤ والی۔ تمہارے باپ کی شکایت لے

نے جھنجھلائے بغیر وضاحت کی۔ دادو ”وہ“ والے انداز میں سر ہلاتے ہوئے حیرت دیا گئیں۔
 ”اور پرندوں سے دوستی کیوں۔ انسان کیا کم پڑ گئے ہیں۔“ انہوں نے دو سرا اعتراض اٹھایا۔ کوئی عجیب سی لڑکی لگتی تھی۔
 ”معلوم نہیں۔ مگر وہ ہر روز پرندوں کو خوراک دینے جاتی ہے دادو۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتیں میں کتنا متاثر ہوا ہوں اس سے۔“ شبیر کا اشتیاق عروج پر تھا اور ستائش چہرے سے چھلک رہی تھی۔ دادو تنبیہ کی سی اس کے اثرات جانچ رہی تھیں۔
 ”اور وہ پھول والا واقعہ۔“



ناخوش گوار صبحیں۔ جلتی دھپیریں۔ سلگتی شامیں۔ اور گرم راتیں۔ فضاؤں میں مٹھن اور باسی پن۔ جس کا ایک ناختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ یہ گرمیوں کے روٹھے اور خاصے بے کیف دن تھے۔ ہوائیں جنگلوں میں کہیں پتے اوڑھے سوتی تھیں۔ اور گرم لہروں کا ہمہ وقت راج تھا۔ شدید جس کا غبار فضا میں اٹھ آتا تو دل وحشت کے مارے باہر آنے کو بے قرار ہو جاتا تھا۔ لپا اور مہر النساء ہمیشہ ایسے موسم میں محکمہ موسمیات کے فرائض سرانجام دینے لگتے۔ اب تو آندھی آئے گی۔ نہیں آئے گی۔ یارش کے آثار لگتے ہیں۔ صرف آثار ہی لگتے تھے کبھی آسمان صاف ہو جاتا۔ کبھی فضاؤں کا بوجھ ہٹ جاتا۔ محکمہ موسمیات کھیانے نظر آنے لگتے۔ گرمیوں کا موسم یوں بھی بے اعتبار ہوتا ہے۔ میری مائیں تو کسی بھی موسم کا دین ایمان نہیں۔ آخر تیور ہوتے ہی بگڑنے کے لیے ہیں۔ آج بنے۔ کل بگڑے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔! ان ہی گرمیوں کی یہ ٹھنڈی صبح تھی۔ بھگپے پروں والے راج ہنس کے جیسی سفید اور چمک دار۔

بھور سے بادل کھل کر پرے تھے۔ اسی کارن ہوائیں ہلکی نمی لیے پھر رہی تھیں۔ سفید لباس میں مہر النساء لمبے سے سفید دوپٹے میں لپیٹی اس خوش گوار موسم میں منور ہوتی ہوئی ”پہنی بلع“ کا آہنی دروازہ پار کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا باس تھا جسے وہ گن انداز میں ہلکا سا ہلاتے ہوئے پتھر لی روش پر اتر رہی تھی۔ اور ساتھ میں دانت نکال کر کچھ کہتے

”میں نے اسے اس کی پرندوں سے محبت کے لیے پھول دیا دادو۔ مگر اس نے وہ پھول واپس کر دیا۔“
 شبیر کے چہرے پر پاپوسی کی لہر دوڑی۔ اب کی بار دادو نے جس کو اپنے اندر سر اٹھاتے دیکھا۔
 ”اس نے ایسا کیوں کیا۔؟“
 ”اس نے کہا۔ ٹوٹے ہوئے پھول بہت جلد مر جھانے لگتے ہیں۔ اور میں مر جھانے ہوئے پھول نہیں دیکھ سکتی۔ اس پھول کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہے۔“
 ”شبیر نے اس کی بات دہرا کر دادو کو دیکھا۔ جو اس جواب پر پہلی بار مسکرائی تھیں۔
 ”بہت حساس لگتی ہے۔“
 ”اس بھی۔“
 ”شبیر نے جملہ مکمل کیا تو صوفیہ بی سوچوں میں کھو گئیں۔ چند پل کے لیے سارے ماحول میں سکوت چھایا رہا۔

”تم بھی فاروق بن رہے ہو۔“ دادو نے اپنے بیٹے اور شبیر کے باپ کا نام لیا۔ شبیر کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ دادو کے ساتھ ہوتے ہوئے وہ ایک کلام کرتا تھا۔ اور بہت کرتا تھا۔ ”مسکراتے رہتا۔“
 ”یہی بات نہیں ہے۔ مگر کوئی بات ہے

”وہ الجھ گیا۔“
 ”چلو کبھی ملیں گے اس حساس لڑکی سے۔ تم بتاؤ کب بازار چل رہے ہو۔ کل وقت نکالو۔“

ہوئے وہ اپنا دودھ پلا کر کھاتا۔ میرا دور سے دیکھ کر بے ساختہ مسکرائے بتائیں رہ سکتا تھا۔
پتھر ملی روش کے اطراف میں گھٹے سایہ دار قطار کی صورت میں سر اٹھائے کھڑے تھے۔ بارش کی وجہ سے سبزہ گھر کے سامنے آگیا تھا۔ روش کے درمیان میں لگی کیاریاں رنگ برنگی پھولوں سے بھری تھیں۔ سرخ، سفید، زرد، نارنجی، بنفشی، پھولوں کا ایک حسین منظر تھا۔ جس کی خوشبو مٹی کی سوندھی سوندھی مسک میں گھل کر سارے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ دلی نے کیاریوں کے سامنے لگے بورڈ کو بد مزہ ہو کر دیکھا۔

”پھول تو نانا منع ہے۔“ دلی نے بلند آواز میں دہرایا۔ مہر النساء جانتی تھی یہی ہو گا۔ مسکراہٹ دیتے ہوئے وہ مخصوص جگہ رک کر باکس کھول رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے اس سے اپنا دودھنا سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ شیر اسے پلکیں جھکے بغیر دیکھے گیا۔
”تم بڑے پھول توڑنے کے پیچھے ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ باکس سے چاول اور بارہ نکال کر وہ درختوں کے تنے میں رکھتی جا رہی تھی۔ ٹہنیوں پر انتظار میں بیٹھے پرندے۔ دوسرے لمحے پھڑ پھڑاہٹ کی آواز فضاؤں میں بکھیرتے ہوئے زمین پر اتر رہے تھے۔ مہر النساء دو قدم پیچھے کھڑی ہو کر بے شحاشا خوشی کے ساتھ پرندوں کی ہمار کو دیکھ رہی تھی۔ یہ ایسا لمحہ تھا جب وہ ہر چیز کو بھول جاتی تھی۔ یاد رہتا تھا تو بس یہی کہ یہ سب اس کے دوست ہیں اور اسے پہچاننے لگے ہیں۔ ہاں یہ بہت مشکل رہا تھا۔ مگر اس نے یہ مشکل کام کر لیا تھا۔ اور اس سے کچھ فاصلے پر پڑنیا کے پھولوں کے قریب کھڑا شیر اس کے سانولے چہرے پر چنگی خوشی کو دیکھ رہا تھا۔ اور مبہوت ہو کر دیکھ رہا تھا۔ وہ بچوں کی سی معصوم مسکراہٹ لبوں پر سجائے دلی کو فخریہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ دلی کو متاثر ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے لیے یہ نئی بات نہیں تھی۔ مہر النساء ہر کام کر سکتی ہے۔ وہ بھی جس کا تصور نہیں۔

”ہاں تو؟“ اس نے حیران سے ولید کو دیکھا۔
”تو تیرا وراثت گن لیتا ہے۔ پھر دانت ایک ایک کر کے گرنا شروع ہو جاتے ہیں۔“

”ہاں۔ ارے واہ! تمہارے نیلے کو گنتی بھی آتی ہے۔ کون سے اسکول جاتا ہے؟“ مہر النساء کی گہری ہوئی ہنسی نے اسے خفا کر دیا۔
”مذاق اڑا رہی ہیں۔؟“

”نہیں جواب مانگ رہی ہوں۔“
”تو مذاق اڑانا ہی ہوا۔“ وہ برلمان چکا تھا۔
”اچھا سوری۔ شاید تمہارے اسکول آتا ہو گا۔“ وہ کھی کھی کرتی آگے بڑھنے لگی۔ شیر کے لیے یہ منظر پوری دلچسپی لیے ہوئے تھا۔ اس نے پہلے بھی اسے یوں بٹتے نہیں دیکھا تھا۔

پرندے ایک ایک کر کے پرواز کرنے لگے تھے۔ شیر چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتا ان تک پہنچ چکا تھا۔ مہر النساء نے چاب پر گردن گھمائی۔ شیر نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ فوراً ہاتھ ہلایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی اس لمحے فضا میں ہلکی سی گونج پیدا ہوئی تھی۔ تینوں نے غیر ارادی طور پر گردنیں گھمائیں۔ کہنی باغ کی دوسری دیوار کے پار سے شکاری نے کسی پرندے کو نشانہ بنایا تھا۔ شیر درخت سے زمین پر گرا اور گر کر پھڑ پھڑاتے ہوئے تڑپ رہا تھا۔ مہر النساء کے دل کو دھکا لگا۔

بچپن میں وہ فحش ہوئی مرغی کو دیکھ کر کئی دن سہمی رہتی تھی اور اب۔۔۔

طیش کی شدید ترین لہر کے ساتھ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی۔ شیر نے پہلے اسے دیوانہ وار بھاگتے دیکھا۔ پھر حواس باختہ دلی کو۔ شل چہرے کے ساتھ

”پھول تو نانا منع ہے۔“ دلی نے بلند آواز میں دہرایا۔ مہر النساء جانتی تھی یہی ہو گا۔ مسکراہٹ دیتے ہوئے وہ مخصوص جگہ رک کر باکس کھول رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے اس سے اپنا دودھنا سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ شیر اسے پلکیں جھکے بغیر دیکھے گیا۔
”تم بڑے پھول توڑنے کے پیچھے ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ باکس سے چاول اور بارہ نکال کر وہ درختوں کے تنے میں رکھتی جا رہی تھی۔ ٹہنیوں پر انتظار میں بیٹھے پرندے۔ دوسرے لمحے پھڑ پھڑاہٹ کی آواز فضاؤں میں بکھیرتے ہوئے زمین پر اتر رہے تھے۔ مہر النساء دو قدم پیچھے کھڑی ہو کر بے شحاشا خوشی کے ساتھ پرندوں کی ہمار کو دیکھ رہی تھی۔ یہ ایسا لمحہ تھا جب وہ ہر چیز کو بھول جاتی تھی۔ یاد رہتا تھا تو بس یہی کہ یہ سب اس کے دوست ہیں اور اسے پہچاننے لگے ہیں۔ ہاں یہ بہت مشکل رہا تھا۔ مگر اس نے یہ مشکل کام کر لیا تھا۔ اور اس سے کچھ فاصلے پر پڑنیا کے پھولوں کے قریب کھڑا شیر اس کے سانولے چہرے پر چنگی خوشی کو دیکھ رہا تھا۔ اور مبہوت ہو کر دیکھ رہا تھا۔ وہ بچوں کی سی معصوم مسکراہٹ لبوں پر سجائے دلی کو فخریہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ دلی کو متاثر ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے لیے یہ نئی بات نہیں تھی۔ مہر النساء ہر کام کر سکتی ہے۔ وہ بھی جس کا تصور نہیں۔

”ہاں تو؟“ اس نے حیران سے ولید کو دیکھا۔
”تو تیرا وراثت گن لیتا ہے۔ پھر دانت ایک ایک کر کے گرنا شروع ہو جاتے ہیں۔“

”ہاں۔ ارے واہ! تمہارے نیلے کو گنتی بھی آتی ہے۔ کون سے اسکول جاتا ہے؟“ مہر النساء کی گہری ہوئی ہنسی نے اسے خفا کر دیا۔
”مذاق اڑا رہی ہیں۔؟“

”نہیں جواب مانگ رہی ہوں۔“
”تو مذاق اڑانا ہی ہوا۔“ وہ برلمان چکا تھا۔
”اچھا سوری۔ شاید تمہارے اسکول آتا ہو گا۔“ وہ کھی کھی کرتی آگے بڑھنے لگی۔ شیر کے لیے یہ منظر پوری دلچسپی لیے ہوئے تھا۔ اس نے پہلے بھی اسے یوں بٹتے نہیں دیکھا تھا۔

پرندے ایک ایک کر کے پرواز کرنے لگے تھے۔ شیر چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتا ان تک پہنچ چکا تھا۔ مہر النساء نے چاب پر گردن گھمائی۔ شیر نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ فوراً ہاتھ ہلایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی اس لمحے فضا میں ہلکی سی گونج پیدا ہوئی تھی۔ تینوں نے غیر ارادی طور پر گردنیں گھمائیں۔ کہنی باغ کی دوسری دیوار کے پار سے شکاری نے کسی پرندے کو نشانہ بنایا تھا۔ شیر درخت سے زمین پر گرا اور گر کر پھڑ پھڑاتے ہوئے تڑپ رہا تھا۔ مہر النساء کے دل کو دھکا لگا۔

بچپن میں وہ فحش ہوئی مرغی کو دیکھ کر کئی دن سہمی رہتی تھی اور اب۔۔۔

طیش کی شدید ترین لہر کے ساتھ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی۔ شیر نے پہلے اسے دیوانہ وار بھاگتے دیکھا۔ پھر حواس باختہ دلی کو۔ شل چہرے کے ساتھ

”ہاں تو؟“ اس نے حیران سے ولید کو دیکھا۔
”تو تیرا وراثت گن لیتا ہے۔ پھر دانت ایک ایک کر کے گرنا شروع ہو جاتے ہیں۔“

”ہاں۔ ارے واہ! تمہارے نیلے کو گنتی بھی آتی ہے۔ کون سے اسکول جاتا ہے؟“ مہر النساء کی گہری ہوئی ہنسی نے اسے خفا کر دیا۔
”مذاق اڑا رہی ہیں۔؟“

”نہیں جواب مانگ رہی ہوں۔“
”تو مذاق اڑانا ہی ہوا۔“ وہ برلمان چکا تھا۔
”اچھا سوری۔ شاید تمہارے اسکول آتا ہو گا۔“ وہ کھی کھی کرتی آگے بڑھنے لگی۔ شیر کے لیے یہ منظر پوری دلچسپی لیے ہوئے تھا۔ اس نے پہلے بھی اسے یوں بٹتے نہیں دیکھا تھا۔

پرندے ایک ایک کر کے پرواز کرنے لگے تھے۔ شیر چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتا ان تک پہنچ چکا تھا۔ مہر النساء نے چاب پر گردن گھمائی۔ شیر نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ فوراً ہاتھ ہلایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی اس لمحے فضا میں ہلکی سی گونج پیدا ہوئی تھی۔ تینوں نے غیر ارادی طور پر گردنیں گھمائیں۔ کہنی باغ کی دوسری دیوار کے پار سے شکاری نے کسی پرندے کو نشانہ بنایا تھا۔ شیر درخت سے زمین پر گرا اور گر کر پھڑ پھڑاتے ہوئے تڑپ رہا تھا۔ مہر النساء کے دل کو دھکا لگا۔

بچپن میں وہ فحش ہوئی مرغی کو دیکھ کر کئی دن سہمی رہتی تھی اور اب۔۔۔

مہر النساء چاہ کر بھی اس سکرابٹ کو نظر انداز نہ کر سکی۔ کیسی عجیب سی تھی۔۔۔ نہیں عجیب ترین سی۔

”معلوم نہیں یہ ٹھیک بھی ہوگا۔۔۔“ وہ کوئی مایوس سا جملہ بولنے والی تھی۔ شیر نے فوراً ”روک دیا۔“

”تم نے کہاں۔۔۔ تو بس کچھ نہیں ہوگا اسے۔“ مہر النساء کو اسی تسلی کی ضرورت تھی۔ مگر وہ مطمئن پھر بھی نہیں ہوئی تھی۔

”نگراس کا گھاس۔۔۔“ اس نے ہتھیلی آگے کر دی۔

”پلیز پیچھے کر داسے۔“ وہ نظریں پھیرتے ہوئے دو قدم پیچھے کو ہوا۔ مہر النساء شرمندہ ہو گئی۔ لب بچھتے ہوئے اس نے ہاتھ واپس مڑ لیا۔ شیر نے اس کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی کو دیکھا تو معذرت خواہانہ انداز میں آگے کو ہوا۔ وہ بالکل چپ سی ہو گئی تھی۔

”ایم سوری۔ کیا تم اسے وہاں رکھ سکتی ہو؟“ اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔ مہر النساء نے فوراً محسوس کیا کہ وہ اس بل بہت مریحیاء لگ رہا تھا۔ بنا کچھ کہے وہ زمین پر زور ڈال کر اٹھی اور جہاں تک ہاتھ جاسکتا تھا۔ بیروں کو درخت کی ٹہنی پر بٹھا کر واپس آ گئی۔ شیر واقعی الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

”کیا تم ٹھیک ہو۔۔۔؟“ اس نے تشویش سے سوال کیا۔ شیر ڈھیلے سے انداز میں ٹانگیں نیچے پھیلا کر سولنگ کے کنارے بیٹھ رہا تھا۔ مہر النساء ہنسنے لگی تھی۔

”ہاں۔۔۔ کیا تم یہاں بیٹھ سکتی ہو۔۔۔“ سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے وہ امید سے پوچھ رہا تھا۔ مہر النساء اس کی سفید ریتی رنگت کو دیکھ رہی تھی۔ پھر نرمی سے ذرا سا مسکرا کر کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ وہ زمین پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔

”تم برا مت ماننا۔۔۔ اصل میں میں خون نہیں دیکھ سکتا۔ دیکھ لوں تو وحشت سوار ہو جاتی ہے۔“ مہر النساء حیرت سے اسے دیکھ گئی۔ پھول والی شرارت کے بعد اس کا یہ روپ مہر النساء کے لیے

وہ خون میں لت پت بیز رو دیکھ رہا تھا۔ شاید یہیں وہ کسی اور کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں چلتی کوئی فلم یا حقیقت۔ اس کے سامنے دور تک صرف خون اور بس خون بہہ رہا تھا۔ شور۔۔۔ تڑپ۔۔۔ کراہیں اور بس خون۔۔۔

مہر النساء پھولوں کی لمبی سی پاؤ پھیلاؤ لگ کر لالہ بھبھو کا چہرے لیے سخت تاثرات کے ساتھ کسی سے لڑ رہی تھی۔ شیر کی آنکھوں میں ابھری کرب کی لہروں نے ہر منظور ہند لاکر دیا تھا۔ دلی زمین پر بیٹھا ہوا تھا شاید۔ اور وہ۔۔۔ شیر کو۔ اس سے اس رویے کی توقع تھی یا اس سے بھی زیادہ۔ ہاں وہ چاہتی تو صادقاً سبھی بچھاؤ دے۔ شیر نے آنکھیں بند کر کے تکلیف دہ باتوں سے بچھا چھڑانا چاہا۔ وہ واپس آ رہی تھی۔ وہی یعنی مہر النساء۔ پرندے کا زخم صاف کرتی ہوئی۔ شیر اس کی ہتھیلی پر بنا پھڑپھڑائے سکون بیٹھا تھا۔ زمین پر خوراک لیتے پرندے سب سے سب سے فضاؤں کو وسعتوں میں چکر کھ رہے تھے۔ مہر النساء قریب آ رہی تھی۔ اور اس کی بڑبڑاہٹ شیر کو سناٹی دے رہی تھی۔

”بہت بے رحم ہیں یہ۔۔۔ انسانیت نامی چیز تو ان کے اندر ہے ہی نہیں۔ مجھے زہر لگتے ہیں ایسے لوگ۔“ اس کا چہرہ ابھی تک اپنی اصلی حالت میں نہیں لوٹا تھا۔ وہ دلی سے شاید مرہم لانے کو کہہ رہی تھی۔ دلی چلا گیا۔ وہ اسے نظر انداز کیے کیے شیر کو زمین پر کھڑا کر رہی تھی۔ شاید دانہ دکھا کے تسلی دینے کی کوشش۔ شیر کا دل چاہا ایک بار تو مسکرا ہی دے۔

”یہ زندہ ہے۔“ مہر النساء کو بے چین پا کر وہ بے اختیار کہہ گیا۔ وہ شیر کی بوجھل آواز پر چونک گئی۔ صبح ہوئے کافی وقت بیت چکا تھا۔ اور صبح ہنوز خوشگوار تھی۔

”یہ زندہ ہے۔“ مہر النساء کے ہوتے ہوئے انہیں کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔ اس نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔ شیر اس انداز پر ہلکا سا مسکرا دیا۔ اور

جیران کن تھا۔ ”کیوں؟“ وہ پوچھے بغیر رہ نہیں سکی۔
 ”ایسے ہی۔۔۔“ وہ افسردگی سے بولا۔۔۔ ”میرے والدین ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گئے تھے۔ اسی حادثے کا مجھ پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ میں خون دیکھ لوں تو سن ہو جانا ہوں۔ اس پرندے کی طرح۔۔۔ وہ دونوں خون میں لت پت میری بانہوں میں دم توڑ گئے۔ تب سے ہی۔۔۔ پتا نہیں کیوں۔۔۔ مگر۔۔۔ اور اسی وجہ سے میں نے میڈیکل فیلڈ کو بھی چھوڑ دیا ہے۔“

”اوس۔۔۔“ وہ بالکل لاجواب ہو گئی تھی۔ شہیر ابھی تک کمزور لمحے کی زد میں تھا۔ پلکیں ہلکی سی بھیگی ہوئی تھیں۔ مہر النساء کو اپنے دل میں بے پناہ ہمدردی کے جذبات اٹھتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ چاہ کر بھی اس کی تکلیف کو اس کے جتنی نہیں محسوس کر سکتی تھی۔۔۔

”تم؟“ وہ اسے پکارتے ہوئے رک گیا۔ مہر النساء اس کی الجھن سمجھ گئی۔ اس لیے بغیر سوچے بولی تھی۔

”مہر النساء۔۔۔“ وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ اس کے بتانے پر دھیرے سے مسکرایا۔ دوستانہ مسکراہٹ۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”گڈ نیٹم۔ بہت پیارا۔۔۔ جاؤ تمہیں دیر ہو رہی ہوگی۔“ اور مہر النساء نے خود کو کہتے سنا۔

”تم کہو۔ میں تمہیں سن سکتی ہوں۔۔۔“

”تم نے ابھی کہا نا کہ تمہارے ہوتے ہوئے ان پرندوں کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھ یہ خیال گزرا کہ میرے ہوتے ہوئے میری مٹی پیا میری نظروں کے سامنے سے چلے گئے اور میں کچھ نہیں کر سکا۔“ وہ

زخمی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مہر النساء کو فی الفور کہنا پڑا۔

”میں نے ایک بات کی ہے۔ قسمت کے آگے تو سب ہی بے بس ہوتے ہیں۔“ وہ سر ہلا کر قائل ہوا۔

”تم ٹھیک کرتی ہو۔۔۔ مگر پھر بھی میں کئی راتیں سکون سے سو نہیں پاؤں گا۔“ وہ کسی معصوم بچے کی

مانند منہ پر ہاتھ پھیر کر خود کو پرسکون کر رہا تھا۔ مہر النساء کو باہر سے ہنستے مسکراتے فکروں سے بظاہر آزاد لگتے اس لڑکے پر بہت ترس آ رہا تھا۔

”یہ واقعی بہت بڑا صدمہ ہے۔“ وہ کچھ بھی کہہ لیتی کم ہوتا۔ اسی لیے یہی کہہ پائی۔

”ہاں۔۔۔ میں ابھی تک بے یقین ہوں کہ ایسا کیسے ہو گیا۔۔۔ مٹی کتنی تھیں شہیر میں تمہارا گھر دیکھنا چاہتی ہوں۔ جس میں تم خوش باش رہتے ہو گے اور میں تمہاری خوشیاں دیکھ کر کئی سال مزید جی لوں گی۔ خوشی انسان کو کبھی بوڑھا نہیں ہونے دیتی۔

میں نے تو ہمیشہ انہیں خوش رکھا پھر بھی۔“ وہ سنبھل کر بول رہا تھا۔ مگر آواز بوجھل ہو رہی تھی اور چہرہ سرخ۔ مہر النساء صرف اسے سننے چاہتی تھی اور وہ بولنا چاہتا تھا۔

”میں انہیں بہت مس کرتا ہوں۔۔۔ اگر دادو کی والہانہ محبت اور سارا میرے ساتھ نہ ہوتا تو میرا معلوم نہیں کیا ہوتا۔“ اس کی بھرائی آواز خشک ہو چکی تھی۔ مہر النساء نے اپنی آنکھوں کے کونے انگلی کی پوروں سے صاف کر لیے۔

”تکلیف وہ باتوں کو بھولنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تم ان کے سکون کے لیے دعا کرتے رہا کرو۔“ مہر النساء نے اسے حوصلہ دیا تھا۔ اس کا اپنا دل بہت بوجھل ہو گیا تھا۔ طبیعت بھی۔

”تھینک یو مہر النساء۔ مجھے سننے کے لیے۔“

مہر النساء مسکرائی۔ ”نہیں تمہارا شکریہ۔ مجھے سنانے کے لیے۔۔۔ ورنہ کچھ لوگ دوسروں کو سنانا پسند نہیں کرتے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے مبہم سا جملہ بولی تھی۔ شہیر کو دادو کی بات یاد آئی تو ماحول پر چھائی

یاسیت دور کرنے کے لیے بول اٹھا۔

”تم نے پرندوں کو دوست بنا رکھا ہے۔ کیا انسان کم ہیں؟“

”میں نے انسانوں کو دوست بنانا چھوڑ دیا ہے۔۔۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ پرندے بہت محبت کرتے ہیں مجھ سے۔“ اس کا انداز بتاتا تھا کہ اسے

فرق نہیں پڑتا۔ شیر بہت لمبے سوچتا رہا۔
 ”تم بہت اچھی ہو مہر النساء۔ اور مجھے بہت پسند
 ہو۔“ شیر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔
 مہر النساء ششدر رہ گئی۔ اس نے عام سی بات کہی تھی
 اور اس عام سی بات سے کئی رنگ چمک رہے تھے۔
 موتیوں کی پاکیزہ خوشبو ان کو چھو کر گزر رہی تھی اور وہ
 مہر النساء کو دیکھ رہا تھا۔ یونیا کے سرخ پھولوں کی
 ہتھیلی پھیل کر مزید کشادہ ہو گئی تھی۔ اور مہر النساء کچھ
 بھی کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

”تم آج بھی مجھ سے پھول نہیں لوگی۔“ وہ لب
 دبا کر مسکراتی آنکھوں سے تائید خواہ رہا تھا۔ اور
 مہر النساء کو اپنے بارے میں ہوئی غلط فہمی دور ہو گئی۔
 کہ ہر صورت میں بنا وقت لیے صرف وہی نارمل
 ہو سکتی ہے!

”پھول توڑنا منع ہے۔“ وہ جواب دیتی کھڑی
 ہو گئی۔ دلی آنا دکھائی دے رہا تھا۔ شیر بہت نا
 ہارے ہوئے اسے شونی سے کہہ رہا تھا۔

”لیکن تمہیں لینا ہو گا۔“ میں انتظار کروں گا۔
 تمہیں کبھی خوشبو چاہیے ہو تو مجھے آواز دینا
 مہر النساء۔ تم خوشبو کو دور تمہیں یاد کی۔“ خوشبو اس
 سے دور نہیں تھی۔ مگر وہ مڑنا نہیں چاہتی تھی کہ پتھر
 نہیں ہونا چاہتی تھی!

☆ ☆ ☆
 شیر نماز ادا کر کے مسجد سے باہر نکلا تو اندھیرے
 اجالے کا ملبا جاری تھا۔ اندھیرے سے اجالے
 نے شکست کھائی تو شیر دکاتوں سے جھانکی روشنیوں
 میں سرخ گلاب ہاتھ میں پکڑے سڑک کنارے چلتا
 دیکھائی دے رہا تھا۔ مہر النساء اب شاپ بر شاید نہیں
 آتی تھی۔ کچھ دنوں سے شیر بھی مہر النساء کے پرندے
 دیکھنے نہیں گیا تھا۔ مغرب ڈوب چکی تھی۔ اس
 وقت دادو اور وہ کچھ دیرواک کرتے تھے۔!

☆ ☆ ☆
 سورج بر زوال ٹوٹ رہا تھا۔ سرمئی شام دھیرے
 دھیرے پونچھنے لگی تھی۔ مہر النساء کمرے کا
 دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو کمرے میں پھیلا
 اندھیرا ڈرکے بل بھر میں غائب ہوا۔ ابا سامنے بیڈ پر
 دراز تھے۔ آج ان کی طبیعت صبح سے ناماز تھی۔

☆ ☆ ☆
 ”اب بتاؤ۔ کیا بات کرنی ہے۔“ شیر ہنستا چلا
 گیا۔ دادو اس کی خوشی کو دل سے محسوس کر رہی
 تھی۔ شیر ہنستا ہوا کہہ رہا تھا۔
 ”دادو مہر النساء سب سے الگ لڑکی ہے۔ اور مجھے
 بہت پسند ہے۔“ شیر نے شرافت سے وجہ
 بتادی۔ اپنے باپ کی طرح وہ کوئی بھی خاص بات
 کرنے سے پہلے دادو کو پھول دیا کرتا تھا۔ اور یہ کام
 اسے آئے روز کرنا پڑتا تھا۔ دادو ان قریب سوکھے
 پھولوں کی دوکان کھولنے والی تھی۔

”تمہیں وہ اچھی لگتی ہے۔ تو یقیناً وہ بہت اچھی
 ہے۔“ مہر النساء نامہ جو وہ چند بار پہلے بھی سن چکی
 تھیں۔ دوبارہ سن کر بولی تھیں۔ شیر نے بچوں کی
 طرح سر ہلا کر یقین دلایا گیا۔ ہمیشہ کی طرح آنکھیں
 چمک سی بھری ہوئی تھیں۔ سویت لیڈی اسے لاڈ
 بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆
 سورج بر زوال ٹوٹ رہا تھا۔ سرمئی شام دھیرے
 دھیرے پونچھنے لگی تھی۔ مہر النساء کمرے کا
 دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو کمرے میں پھیلا
 اندھیرا ڈرکے بل بھر میں غائب ہوا۔ ابا سامنے بیڈ پر
 دراز تھے۔ آج ان کی طبیعت صبح سے ناماز تھی۔

☆ ☆ ☆
 ”ڈیز سویت ہارٹ لیڈی۔ محبت کی اگر کوئی حد
 ہے تو مجھے آپ سے اس حد سے بڑی ہوئی محبت

مہر النساء بے جا چپ پیدا کیے۔ اسی سے پی ہوئی ان کے سرہانے بیٹھ گئی۔

”ابا۔۔۔“ اس کی پکار پر ابا نے دھیرے سے آنکھیں واکیں۔ آنکھوں سے جماعتی سرخی مہر النساء کو مزید پریشان کرنے کے لیے کافی تھی۔ ابا نے اس کے چہرے پر اضطراب بگھڑا دیکھا۔ تو نقاہت سے مسکراتے کی کوشش کرنے لگے۔

”طبیعت کیسی ہے؟“

مہر النساء پیشانی چھو کر اندازہ لگا رہی تھی۔ ابا کو بہت اچھا لگا تھا۔

”پکی بڑی جلدی پریشان ہو جاتی ہو۔“

”پھر بھی کون سا میری بات مانتا ہے کوئی۔۔۔“ وہ خفگی سے جتا رہی تھی۔ ابا بھی ایسے معاملوں میں پیچھے نہیں رہتے تھے۔

”دیکھو مہر النساء ہم دونوں میں ایک بات مشترک ہے۔ چاہے ہم میں کتنی محبت ہو، ہم ایک دوسرے کی کوئی بات نہیں مانتے۔“ ابا کی بات پر وہ ضبط کے باوجود ہنس پڑی۔

”ابا آپ بھی ناں۔“

”کل خیر شاہ سے ملاقات ہوئی۔“ ابا نے کہا۔

مہر النساء کی ہنسی غائب ہوئی۔ ”ساتھ ہانیہ تھی۔“ وہ مزید بولے تھے۔ مہر النساء شکوہ کنال نگاہوں سے انہیں دیکھ گئی۔

”ابا۔۔۔“ وہ بولی تو ابا کا دل دکھا۔ ”آپ جھوٹ بولتے ہیں ناں۔؟“ وہ ہلکی سی می کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔ ابا کو دس سالہ مہر النساء یاد آگئی جو دروازے میں کھڑی روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ”ماں کو کچھ نہیں ہو گا۔ آپ جھوٹ بولتے تھے ناں؟“ وہ تب نہیں بول سکے۔ آج چپ نہیں رہ سکے۔

”نہیں نساء میری جان۔۔۔“

”نہیں ابا آپ جھوٹ ہی بولتے ہیں۔ میں کوئی پرنسز نہیں ہوں۔۔۔“ صبح کما تھا تو خیر شاہ نے میں اس قابل ہوں کہ کوئی مجھ پر دوسری نظر نہ ڈالے۔ میری طرف بڑھنے سے پہلے لوگ سودھ سوچیں۔ مگر ابا

”میں نے خواب دیکھا چھوڑ دیے ہیں۔“

”تم نے چھوڑے ناں۔ میں نے نہیں۔ تو پر کی لالچی فطرت دیکھ کر ویسے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ تمہیں خوش نہیں رکھ سکتا۔ لیکن اگر تمہاری اس کے ساتھ دل وابستگی تھی تو سوچا جا سکتا تھا۔ میرا جو کچھ ہے تمہارا ہی ہے۔ وہ رشتہ تم نے ختم کر دیا تھا۔“ ابا بھی روٹھے کچھ میں کہہ رہے تھے۔ مہر النساء نے سر جھٹک دیا۔

”اور اب ان باتوں کا مطلب۔۔۔؟“

”میں نے انہیں کھانے پہ انوائٹ کیا ہے۔ اگر تمہیں۔۔۔“ ابا کی بات اس نے درمیان میں کٹ دی۔

”اور اب ان باتوں کا مطلب۔۔۔؟“

”میں نے انہیں کھانے پہ انوائٹ کیا ہے۔ اگر تمہیں۔۔۔“ ابا کی بات اس نے درمیان میں کٹ دی۔

”اور اب ان باتوں کا مطلب۔۔۔؟“

”میں نے انہیں کھانے پہ انوائٹ کیا ہے۔ اگر تمہیں۔۔۔“ ابا کی بات اس نے درمیان میں کٹ دی۔

”اور اب ان باتوں کا مطلب۔۔۔؟“

”میں نے انہیں کھانے پہ انوائٹ کیا ہے۔ اگر تمہیں۔۔۔“ ابا کی بات اس نے درمیان میں کٹ دی۔

”جی۔۔۔ کیوں جوڑ نہیں سکتی تھی۔۔۔ تم کسی سے کم نہیں ہو، بہت اچھے لگو گے تم دونوں۔“ اپنا اسے یقین دلا رہے تھے اور اب کی مہر النساء گم صم کی کھڑی خواب دیکھ رہی تھی۔

یہ ہمارا آغاز تھا۔ ایسی بہار جو خزاں سے نا آشنا تھی۔ مہر النساء صاف دل کی تھی۔ اس کا دل تنویر شاہ نے تھام لیا تھا۔ کچھ لوگ بڑی خوش فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔ تنویر شاہ ان ہی میں تھا۔ اپنی دانست میں ایسا بہیرا۔ جس کی جگہ گاہٹ دو سروں کو بھی منور کر دے۔ ایک فابریہر لہ۔ ”تنویر شاہ“

”خاندان کی لڑکیاں جلتی ہوں گی تم سے۔“ تنویر شاہ نے اسے کہا تھا اور وہ عجیب نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ یہ بھی کوئی بات ہے کرنے کی؟ اس نے بھی ایسا خواب نہیں دیکھا تھا۔ مگر یہ تعبیر پری بھی نہیں تھی۔ تنویر شاہ نے اسے کہا تھا۔

”تم میں بہت سلوگی ہے۔ تم معصوم بھی ہو۔ جیسے اندر ویسی باہر۔ تم میں کچھ بھی بتاؤں نہیں۔“ مہر النساء سنا تو خود پر فخر محسوس کرتا پایا۔ رشک تو اسے پہلے بھی رہا تھا اپنی پاکیزہ سوچوں اور اپنی سیرت پر۔ تنویر شاہ نے اس کا دل چھو لیا تھا یا شاید دل پر قدم رکھ لیا تھا۔ اس نے تنویر شاہ کو حقیقت قبول کر لیا تھا۔ پھر تنویر شاہ نے اسی حقیقت کو توڑا۔ دل بھی توڑا۔ اعتماد بھی۔ قدم جو دل پر تھا۔ ”تمہارے ابا کو راکیت والی شاہیں مجھے وے دینی چاہے۔ میں بڑا س کرنا چاہ رہا ہوں۔“ عام سالجہ تھا۔ ٹھنڈا سا۔ وہ حیران تو ہوئی، مگر تھوڑی۔

”راکیت والی شاہیں، مگر وہ تو۔۔۔ کرائے پر ہیں کیا وہ تم لیتا چاہتے ہو؟“

”ہاں ان کا سب کچھ میرا تو ہے۔ پھر وہ آج لوں یا کل۔“ لہجہ اب بھی چاہے پر سکون ہو۔ مگر اسے وچو کا لگا تھا وہ بھی زور سے۔

”وہ تمہارا کیوں ہے تنویر۔ وہ تو ابا کا ہے۔ یہی تو ان کا اٹا ہے اور ان کا ہے ہی کون؟“ مہر النساء کو برا لگا تھا اور بہت لگا تھا۔ وہ ہرگز ہرگز اسے یہ مطالبہ

”مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے ابا۔ جب دل پر کھری چوٹ لگے تو پھر پاتی چوٹیں کچھ نہیں اثر کرتیں۔ میں نے دل پھر کر لیا ہے۔ تنویر شاہ سے میری پہلے بھی کوئی وابستگی نہیں تھی۔ آپ ہانیہ اور اسے بلکہ تانی جان کو بھی بلائیے گا۔“ وہ کہہ کر وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ دروازہ بند ہوا تو اندھیرا دوبارہ پھیل گیا۔ سورج پر زوال ٹوٹ رہا تھا۔ دھوپ ہنوز سنہری تھی۔

☆☆☆

ابا اس دن بہت خوش تھے۔ دلی کی ماں مہر النساء کو ابھی ابھی پیار کر کے گئی تھیں۔ ان کا گھر دیوار پار تھا۔ مگر گھرے تعلقات کی بنا پر دونوں گھر برابر لگتے تھے۔ مہر النساء ابھی ابھی پھر رہی تھی۔

”نساء تنویر کیسا لگتا ہے تمہیں۔؟“

”باقی سب جیسا۔ انسان ہی۔“ اس نے حیرت کی انتہا پہنچ کر لیا کو جواب دیا تھا۔

”کو نہیں لگی۔ اگر تم دل کی نگاہ سے دیکھو تو تمہیں کیسا لگے گا۔“ ابا بڑی مشکل سے بات کر رہے تھے۔ مہر النساء معاملہ سمجھی نہیں تھی۔

”ابا آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ دل کی نگاہ سے بھی وہ انسان ہی رہے گا۔“ وہ پران کر بولی تھی۔ ابا بار بار ان گئے۔ دلی کی ماں نے کوشش کرنی چلائی تھی۔ مشکل آسان کرتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”مگر وہ تمہیں مل جائے تو۔۔۔؟“ وہ اب کچھ سمجھی تھی۔ مگر اتنا اچانک تھا یہ۔ وہ سمجھتا نہیں چاہتی تھی۔

”تنویر شاہ ہے وہ کوئی کاتھریٹ نہیں۔ جو مجھے مل جائے۔“

”تمہاری پچھپھو نے تمہارے رشتے کی بات کی۔ تمہارا اور تنویر کا۔“ ابا نے وہی کہہ دیا جو وہ سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ششدر رہ گئی تھی۔

”ابا۔۔۔ میرا اور اس کا کیا جوڑ ہے؟“ وہ اچھلتا چاہتی تھی۔ مگر نہ رہ گئی تھی۔ ابا اس کی پٹنی پٹنی آنکھوں کو دیکھ کر بس پڑے۔

ہیں کرے گی۔ اگر کوئی اور بھی کرے تو وہ اپنا کمانے نہیں دے گی۔ تو پر کی لاپچی فطرت چھوٹی سی بات نہیں تھی۔ پہلے دکائیں۔ اب اسے ادھار کا تقاضا پھر گھر۔ ریت سے بنی رشتے کی عمارت زمین بوس ہوتی چلی گئی۔ پچھو پیٹے کے ساتھ تھیں۔ شروع دن سے تھیں۔ آخر تک رہنے والی تھیں تو مہر النساء ہی پیچھے ہٹ گئی۔

”میں اب اسے کچھ نہیں لوں گی۔ وہ سب ان ہی کا ہے۔ ان کا جو دل چاہا دیں گے۔ مگر سب کچھ نہیں۔“

”ٹھیک ہے پھر وہ تمہیں بھی جس کو دل چاہے دیں۔ میں مزید برداشت نہیں کروں گا تمہیں۔ ہے کیا تم میں۔ جو مفت میں مجھ پر مسلط کی جا رہی ہو۔ یہ میں ہوں جو تمہیں قبول کر رہا ہوں ورنہ کوئی اور تمہیں دیکھے بھی نہیں۔ ہزار لڑکیاں خواہش مند ہیں میرے ساتھ کی اور تم۔ جس سے بات کرنے کو بھی دل نہ چاہے۔ تم سے ملنے کا سوچ کر ہی میں جھرجھری لبتا تھا۔ ہونہ تر سوگی میرے لیے۔ اور دیکھنا تمہارے سامنے میں تمہاری کسی عزیز کا ہاتھ تھاموں گا۔ تمہیں پچھتا تا دیکھ کر مجھے بہت مزا آنے والا ہے۔“ وہ پھنکارتے ہوئے انگارے پھینکتا رہا۔

مہر النساء سنی سنی رہی۔ سنی رہی۔ سیاہ پڑ گئی تو اٹھ کر وہیں جا کھڑی ہوئی۔ جہاں سے بھی چلی۔ کسی کو فرق نہیں پڑا۔ لٹا سکون ہی ملا۔ اب اور مہر النساء کا اپنے خاندان سے رسی سا تعلق تھا۔ بلکہ خاندان والوں کا ان سے۔ نساء کے پیدا ہونے سے بھی پہلے۔ اب کی لو میرج بھی تب سے ہی۔ یہ جو قریبی رشتے تھے ناں۔ باپ بیٹی کی محبت سے بھی جل جاتے۔ پھر ان کے بچے بھی۔ تو پر شاہ نے ہانیہ سے دل لگایا۔ تانی جان جٹے دل سے ایسی نہال ہوئیں کہ بس۔ اور یہ ہانیہ کہاں مہر النساء کی عزیز تھی۔ یہ وہی تھی جو کتنی تھی۔

”مہر ڈارنگ تم کس پر چلی گئی ہو۔ شاید اپنی ماں پر۔ دیکھو تمہارے چہرے سے تو نہیں زیادہ میرے پیر سفید ہیں۔“ یہ غرور کی حد تھی اور یقین جاننے پر

پناہ مانگتی تھی۔ اس لیے حسن سے جو تلمیر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس نے دل سخت کر لیا۔ خود کو مضبوط کر لیا۔ پھر ایک لفظوں کا نوک وارتیر مہر النساء کے آر پار بہت اچانک سے گزر گیا تھا۔

”تم یہ پھول لے سکتی ہو پلینز۔ میری طرف سے ایک پیاری سی لڑکی کے لیے پیارا سا تحفہ۔ یہ تیر شمیر فاروق کی طرف سے آیا تھا۔ دادو کے شمیر کی طرف سے۔ اس کے پار اتر گیا۔ مگر وہ چٹخنا نہیں چاہتی تھی۔“

”تمہیں خوشبو چاہیے ہو تو مجھے آواز دے لیتا مہر النساء۔ تم خوشبو کو خوش سے دور نہیں پاؤ گی۔“ یہ ایک اور سنہری جال تھا۔ وہ اس سے نظرس چرا سکتی تھی۔ چرا بھی رہی تھی۔ تو پر شاہ بھی تو پہلے برا نہیں تھا۔ اگر نہیں تھا تو شمیر جیسا بھی نہیں تھا۔ سچ جذبے رکھ میں دے موتیوں کی طرح ہوتے ہیں جو دور سے اپنے وجود کو چٹا دے دیتے ہیں۔ مگر وہ جھپتی ہے وہ کسی کے قابل نہیں۔ وہ ٹھوکر نہیں کھانا چاہتی۔ یقین تو ہرگز بھی نہیں کرنا چاہتی۔ مگر وہ لیڈی صوفیہ کا لاڈلا پوتا ہے۔ ٹھوکر پر سنبھلنا جانتا ہے۔ محبت پر یقین دلانا جانتا ہے۔ تب ہی تو۔

گلابلوں کے پھولوں پر روشنیاں چھینکی گئیں۔ تو گلال میں ڈوبی محبت ملا نمت پر بڑی مسکرا رہی تھی۔!



مٹھم ستاروں کی افشاں امبر کی مانگ میں بکھری ہوئی تھی۔ سرمئی سی تاریکی گہرے رنگوں میں چھپ کر پوری کائنات پر چھا رہی تھی۔ اور اس تاریکی میں گہرے سنائے تھے۔ مہر النساء کے گھر سے اٹھتا ہکا ہکا شور ان سناٹوں کا توڑ ثابت ہو رہا تھا۔ ابانے بیشہ کی طرح اس بار بھی مہر النساء کی سالگرہ کا اہتمام کیا تھا۔ مہر النساء نے شمیر کو بھی انوائٹ کیا تھا۔ دادو خوش اخلاقی سے اندر سب کے ساتھ بیٹیش باتوں میں مشغول تھیں۔

”ہیلو مہر النساء۔“ وہ بچن میں کھڑی فریج سے نکالی

”میں اب اسے کچھ نہیں لوں گی۔ وہ سب ان ہی کا ہے۔ ان کا جو دل چاہا دیں گے۔ مگر سب کچھ نہیں۔“

”ٹھیک ہے پھر وہ تمہیں بھی جس کو دل چاہے دیں۔ میں مزید برداشت نہیں کروں گا تمہیں۔ ہے کیا تم میں۔ جو مفت میں مجھ پر مسلط کی جا رہی ہو۔ یہ میں ہوں جو تمہیں قبول کر رہا ہوں ورنہ کوئی اور تمہیں دیکھے بھی نہیں۔ ہزار لڑکیاں خواہش مند ہیں میرے ساتھ کی اور تم۔ جس سے بات کرنے کو بھی دل نہ چاہے۔ تم سے ملنے کا سوچ کر ہی میں جھرجھری لبتا تھا۔ ہونہ تر سوگی میرے لیے۔ اور دیکھنا تمہارے سامنے میں تمہاری کسی عزیز کا ہاتھ تھاموں گا۔ تمہیں پچھتا تا دیکھ کر مجھے بہت مزا آنے والا ہے۔“ وہ پھنکارتے ہوئے انگارے پھینکتا رہا۔

مہر النساء سنی سنی رہی۔ سنی رہی۔ سیاہ پڑ گئی تو اٹھ کر وہیں جا کھڑی ہوئی۔ جہاں سے بھی چلی۔ کسی کو فرق نہیں پڑا۔ لٹا سکون ہی ملا۔ اب اور مہر النساء کا اپنے خاندان سے رسی سا تعلق تھا۔ بلکہ خاندان والوں کا ان سے۔ نساء کے پیدا ہونے سے بھی پہلے۔ اب کی لو میرج بھی تب سے ہی۔ یہ جو قریبی رشتے تھے ناں۔ باپ بیٹی کی محبت سے بھی جل جاتے۔ پھر ان کے بچے بھی۔ تو پر شاہ نے ہانیہ سے دل لگایا۔ تانی جان جٹے دل سے ایسی نہال ہوئیں کہ بس۔ اور یہ ہانیہ کہاں مہر النساء کی عزیز تھی۔ یہ وہی تھی جو کتنی تھی۔

”مہر ڈارنگ تم کس پر چلی گئی ہو۔ شاید اپنی ماں پر۔ دیکھو تمہارے چہرے سے تو نہیں زیادہ میرے پیر سفید ہیں۔“ یہ غرور کی حد تھی اور یقین جاننے پر

پناہ مانگتی تھی۔ اس لیے حسن سے جو تلمیر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس نے دل سخت کر لیا۔ خود کو مضبوط کر لیا۔ پھر ایک لفظوں کا نوک وارتیر مہر النساء کے آر پار بہت اچانک سے گزر گیا تھا۔

”تم یہ پھول لے سکتی ہو پلینز۔ میری طرف سے ایک پیاری سی لڑکی کے لیے پیارا سا تحفہ۔ یہ تیر شمیر فاروق کی طرف سے آیا تھا۔ دادو کے شمیر کی طرف سے۔ اس کے پار اتر گیا۔ مگر وہ چٹخنا نہیں چاہتی تھی۔“

”تمہیں خوشبو چاہیے ہو تو مجھے آواز دے لیتا مہر النساء۔ تم خوشبو کو خوش سے دور نہیں پاؤ گی۔“ یہ ایک اور سنہری جال تھا۔ وہ اس سے نظرس چرا سکتی تھی۔ چرا بھی رہی تھی۔ تو پر شاہ بھی تو پہلے برا نہیں تھا۔ اگر نہیں تھا تو شمیر جیسا بھی نہیں تھا۔ سچ جذبے رکھ میں دے موتیوں کی طرح ہوتے ہیں جو دور سے اپنے وجود کو چٹا دے دیتے ہیں۔ مگر وہ جھپتی ہے وہ کسی کے قابل نہیں۔ وہ ٹھوکر نہیں کھانا چاہتی۔ یقین تو ہرگز بھی نہیں کرنا چاہتی۔ مگر وہ لیڈی صوفیہ کا لاڈلا پوتا ہے۔ ٹھوکر پر سنبھلنا جانتا ہے۔ محبت پر یقین دلانا جانتا ہے۔ تب ہی تو۔

”اگر میری پہلی بات کا جواب نہ ملے گا تو میری دوسری بات سن لیں۔“

”اے ہانیہ نے مخاطب کیا تھا۔“

”تو ہانیہ۔“ اس نے مسکرا کر کہا تو ہانیہ چلتی ہوئی اندر آگئی۔

”گری ہے ناں۔“ ہانیہ نے پہلا تبصرہ یہی کیا تھا۔ مہر النساء کو ہنسی آئی۔

”ظاہر ہے۔“ لیکن میں ٹھنڈک کہاں سے آئی۔“

”ہوں۔“ اچانک سے خوبر شاہ اندر آیا تھا اور مہر النساء کی ہنسی کو چھپتی نظروں سے دیکھ کر ہنکارا بھرا۔

ہانیہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”کیسی ہو تم۔“ وہ کچھ استہزائیہ انداز میں بولا تھا۔ مہر النساء نے مہارت سے نظر انداز کیا۔

”مکمل شدہ۔“ ہمیشہ جیسی۔“ وہ بدشاشت سے بولی۔

مہر النساء محسوس کر رہی تھی ہانیہ چپ سی ہو گئی تھی اور یہ حیرت کی بات تھی۔

”لگ رہا ہے۔“ ویسے یہ لڑکا کون ہے۔ شہیر صاحب۔ لگتا ہے تمہارے سجدے رائیگاں نہیں گئے۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسا تھا۔ مہر النساء سکون سے بدشاشت کر گئی۔ اصل وجہ سامنے آگئی تھی۔ وہ مہر النساء کو جلن محسوس کرانے کے چکر میں خود حسد کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ مزید کیا کرتی سو خاموش رہی۔

”ہانیہ لو آؤ۔“ کہہ کر۔“ ہانیہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کس قدر حسین تھی اور مہر النساء۔ پھر بھی اس کے فیاسی کو قرار نہیں تھا۔ کیا یہ کافی نہیں تھا کہ وہ ایک بہترین لڑکی کے ساتھ تھا۔ وہ کیوں گھنچتا تھا اس کی طرف۔ بھلے سے جلانے کے لیے ہی، مگر آخر کب تک۔ وہ تو ٹھکرائی نہیں گئی پھر بھی مہر النساء سبقت لے گئی۔ ہانیہ سوچے جارہی تھی۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے۔“

”میرے سجدے اس لیے نہیں ہوتے مسٹر۔“

خوبر۔ اور اس بارے میں میں آپ کو کچھ بولنے کی اجازت نہیں دوں گی۔“ وہ کچھ سرد مہری سے جھڑک گئی تھی۔ خوبر شاہ نے طنزیہ سر جھٹکا۔

”مہر النساء۔“ دادو بلا رہی ہیں۔ کہاں ہوں۔“

سیر جیوں سے اتر کر صحن میں آکر اطلاع دیتی آواز شہیر اور ولی کی تھی۔ وہ آواز چٹا چٹا کی طرف آیا۔ دادو اس کی پر جوشی پر مسکرائی تھیں۔ باقی سب کے ساتھ ابا کی حیرت لی بھی چاڑھ تھی۔

”مہر النساء تم یہاں ہوں۔“ وہ چپکتی آنکھوں سے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ خوبر شاہ کو اس کی بے تکلفی بہت کھلی۔

”اے دیکھ کر مہر النساء کے لبوں پر اپنائیت بھری مسکراہٹ آئی تھی۔ خوبر شاہ کی سلگتی نگاہیں ان ہی پر جمی تھیں۔“

”اے بار آؤ ناں۔“ وہ شاید کچھ زیادہ ہی خوش تھا۔ اندازہ مشکل نہیں تھا۔

”شہیر رک۔“ میں یہ۔“ اس نے ٹرے میں رکھے کپوں کی جانب اشارہ کیا۔ شہیر نے سمجھ کر سر ہلایا۔

”اچھا۔“ چلو پھر۔“ ایک ٹرے وہ خود اٹھاتا باہر نکل گیا۔ خوبر بے یقینی سے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں سے وہ گئے تھے۔

”یہ کچھ زیادہ ہی فری ہو رہا ہے۔“

”خوبر تو کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ شاید پسند کرتا ہو مہر کو۔“ ہمیں۔“ ہانیہ کی آواز میں کوفت تھی۔ بے زاری تھی۔

”ہانیہ شٹ اپ۔“ وہ کیسے پسند کر سکتا ہے اس کو۔ اسے کیا لڑکیوں کی کمی ہوگی اور اسے دیکھو اس کی آنکھوں میں پچھتوے کیوں نہیں۔ جو ہونے چاہیے تھے۔“ وہ جھجکا اٹھ اور اس سے کہیں بڑھ کر ناگوار سے بولا تھا۔ ہانیہ نے دانت پیس لیے۔ (مہر النساء)

”یہ سب بے کار ہے۔ تم پہلے بھی دیکھ چکے ہو اسے پروا نہیں۔“ ہانیہ نے جلتی پرتیل چھڑک دیا۔ سلگ کر وہ کچھ کتے کتے ضبط کر گیا۔ وہ دونوں واپس اندر آئے تھے۔

”تم لوگ باہر نہیں آئے۔“ ہانیہ کے چہرے پر

بے زاری دیکھ کر وہ پوچھ گئی۔ بلی بچی آئیں کریم وہ
فرق میں ڈالنے لگی۔

”ہاں کچھ پوچھا تھا تم سے۔ سوچا اس کا جواب
شاید باہر نہ دے سکے۔“ لفظ چنچا جا کر کہنے پر شبیر نے
چونک کر اس پر کشش پر سناٹا دیا۔ وہ شخص گود دیکھا۔
جانے کیوں اسے حیرت سی ہوئی تھی اس انداز پر۔
مرا لہاء کے چہرے پر سایہ گزر گیا۔

”تویر چلیں۔“ ہانسیہ حلق میں پھنسی آواز سے
بولی۔ مرا لہاء نے محسوس کیا وہ خود کو نظر انداز کرتا
دیکھ کر کھل رہی تھی۔ وہ ہاتھ صاف کرتی ہوئی قریب
آئی۔

”شبیر میرا دوست ہے تویر۔ اور مجھے باہر کیا کسی
کے سامنے بھی یہ بتانے میں عار محسوس کرنے کی
چندناں ضرورت نہیں۔“ وہ تویر شاہ کی آنکھوں میں
دیکھتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ اور سکون سے کہہ رہی
تھی۔ شبیر پہلے چونکا۔ پھر سادگی سے مسکرایا۔

”تم لوگ یہاں آئے میں تم لوگوں کا احترام کرتی
ہوں۔ مگر کچھ فرائض مہمانوں کے بھی ہوتے ہیں کہ
وہ اپنی حد کر اس نہ کریں۔ میں اس وقت کوئی سناٹا
نہیں چاہتی۔ تویر شاہ بانی بہت پیاری لڑکی ہے۔
تمہارے معیار سے بھی اونچی، اس کی قدر کرنا سیکھو اور
جو کانہ نہ حرکتوں کو چھوڑ دو۔ مجھے تم میں ذرا دلچسپی نہیں
ہے۔ یقیناً“ اضطراب میں تم خود ہو۔ جو لوگ
دوسروں کو نچا دکھانے میں لگے رہتے ہیں ان کی زندگی
سے سارا سکون خود بخود روٹھ جاتا ہے۔ میرے دل
میں حسد ڈالنے کی کوشش ترک کر دو۔ جن لوگوں
کے دل پانی کے جیسے شفاف ہوں۔ وہاں آگ نہیں لگا
سکتی۔“

اس نے قتل کی انتہا کر دی۔ شبیر اور بانی مرا لہاء کا
چہرہ دیکھ رہے تھے اور تویر شاہ کے چہرے کی رنگت
متغیر ہو گئی تھی۔ اسے اس سے اس جواب کی ہرگز توقع
نہیں تھی۔ وہ تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ بہت اور
بے حد۔ شبیر اور مرا لہاء باہر نکل گئے تو سپاٹ
چہرے کی نگاہیں زمین پر بکھرتی رہیں۔ اس گھر سے

پیارے بچوں کے لئے

قصص الانبیاء



تمام انبیاء علیہ السلام کے بارے میں مشتمل
ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ
اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

کتاب کی تفصیلات کے لئے

300/- قیمت

بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

جائے وقت اس نے اپنے شک کو یسین میں بدل دیا۔
 ”مہر النساء! کل ہانیہ اور میں شادی کی شاپنگ
 کرنے جائیں گے۔ ہمیں کچھ لینا ہے تو ہمارے
 ساتھ چلو۔“ خور شاہ نے شیر کو بخور دیکھا تھا۔ جس
 نے کسی کے بھی خواب سے پہلے کہا۔
 ”نہیں ایک چوٹیلی۔ یہ میرے ساتھ جائے گی۔
 آفر کا شکریہ۔“ شیر نے خوش اخلاقی سے جواب دیا تو
 وہ بنا تاثرات نوٹ کیے فوراً سے بیشتر گھر سے نکل گیا
 تھا۔



شیر مہر النساء کو شاپنگ کروانے آیا تھا۔
 ”نساء ہمیں چوٹیاں نہیں پہنیں مجھے چوٹیاں
 اچھی لگتی ہیں۔“ اس نے دھیمی سی آواز میں
 سرگوشی سی کی۔ مہر النساء نے کسی کی شرارت پر ہنستے
 ہنستے جواب دیا۔

”وہ ہوں۔“ چوٹیاں میرے لیے ابالاتے ہیں۔“
 ”اور مندی۔“؟“ حنا کی خوشبو ہوا کے رتھ پر سوار
 اس کے ارد گرد بکھرنے لگی۔ خوشبو کی رتھ سے نکلتی
 روشنیاں اس کی سمت لپکتے لپکتے گئیں۔

”مندی لگاؤ۔ وہ دیکھو وہ خاتون بہت پیاری
 مندی لگا رہی ہے۔“ وہ ہلکا سا مہر النساء کی سمت جھک
 کر ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔ مہر النساء نے اسی جانب
 نگاہیں کھدیں۔ وقت کی آنکھوں میں ایک مکمل سی
 تصویر ٹھہر گئی تھی۔ بازار سے اونچا اور اونچا۔ شور
 بلند ہو رہا تھا۔ نساء نے ذرا سانس دیکھا۔ پھر انکار کی
 ہمت خود میں ختم ہوتی پائی۔ مسکرا کر اس نے سر ہلا
 دیا۔ اس کی خواہش کو منظوری دے دی۔ محبت
 زادوں نے محبت زدہ تعویذ بلند کیا اور اس صدائے دور
 تک کا سفر کیے منزل کو پالیا۔ وہ ہیلی سائیکل کیے
 مسکرا رہی تھی۔ شیر اسے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔
 نساء کی ہیلی سیلے ابھری ہی پر حنا کی لکیریں تیزی سے
 پھسلتی جا رہی تھیں۔

”مہر النساء آج تم اپنے سارے غم بھلا دو۔“ شیر نے

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”تم مجھے سنا رہے ہو۔؟ میں تو غم زدہ نہیں
 ہوں۔“ وہ بخوبی اچکا کر پوچھنے لگی۔ شیر نے سر
 ہلایا۔

”نہیں ہو، مگر خوش ہونے سے بھی تو کتراتے
 ہوتے۔“ دوسروں کے بد صورت رویوں سے خود پر
 خوشی کے دروازے بند کر لیتا سب سے بڑی غلطی
 ہے۔“ وہ اسے کیا سمجھانا چاہ رہا تھا۔ وہ سمجھ کر
 نظر انداز کر گئی۔ مہر النساء اب اپنی تکلیف دہ کہانی کی
 اکیلی گواہ نہیں رہی تھی۔

”داؤد کتنی ہیں ٹھکرائے جانے کا خوف جتنا بھی
 دماغ کو اکٹلوں کی مانند جکڑے تے۔ تب بھی ایک نا
 ایک دن محبت اپنی جگہ بنا ہی لیتی ہے۔“ وہ نرمی سے
 اسے بتا رہا تھا۔ اور مہر النساء کو اپنا دل جانے یوں ڈھونڈتا
 محسوس ہوا۔ وہ ڈپٹا سمجھنا بھول گئی تھی۔

”تم بہت اچھی ہو نساء۔ کچھ لوگ ہماری زندگی
 میں نہ رہیں تو اس کلیہ مطلب ہرگز نہ نکالو کہ ہم ان
 کے قابل نہیں تھے۔ بلکہ یہ سوچو کہ اللہ کو ہمارا ساتھ
 قبول نہیں تھا اور اس نے یقیناً کچھ تو سوچ ہی رکھا
 ہو گا اور۔“

”اور۔؟“ مہر النساء نے گہری نیند میں سوال کیا
 تھا۔ وہ کتنا شب سوچتا تھا اور وہ کبھی ایسا سوچ نہیں سکی
 تھی۔

”اور میں۔“ مہر النساء میں۔“ وہ گرم جوشی سے
 کچھ بولتے ہوئے رک گیا۔ مہر النساء بھی رک کر بے
 چین نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”ایک منٹ۔
 جسٹ ون منٹ۔“ وہ اس کے کندھے کو چھو کر کہتا
 ہوا ایک شاپ کی طرف بھاگا۔

مہر النساء اسے سرک پار جاتا دیکھتی رہی۔ وہ شاید
 کچھ لینے گیا تھا۔ جانے کیا۔ مہر النساء ٹرانس کی
 کیفیت میں تھی اور مجسمہ بنی کھڑی تھی۔ سرک پر
 رش معمول سے بڑھ رہا تھا۔ تاریکی میں گاڑیوں کے
 بارن کا شور ساعیتیں چھاؤں جیسا تھا۔ بہت دور سے
 کچھ لڑکے تیز اسپید میں بائیک ڈرائیو کرتے مخالف

سیرۃ نبوی ﷺ



حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں مشتمل
ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ
خود بھی پڑھنا چاہیں گے اور
اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

یہ کتاب کے ساتھ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ
کا شمارہ مفت حاصل کریں۔

قیمت -/250 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ -/50 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

سمت سے آرہے تھے۔ مہر النساء کا دھیان اس طرف
نہیں تھا۔ وہ سامنے شیشوں والی شاپ کو تکیے جارہی
تھی۔ بایک رفتار مزید تیز ہوئی اور مہر النساء کے
قریب آنے پر شرارت سے لڑکوں نے بایک کو جھٹکے
مارنے چاہے۔ ایک بایک اس حرکت پر بے قابو
ہوئی۔ سامنے سے کار بہتی آرہی تھی اور درمیان میں
مہر النساء شاپ سے باہر نکلتے شہیر نے نظرس اٹھا کر
اسے دھوڑا تھا اور۔ بایک پھسلے ہوئے کاری سپدھ
میں گئی اور بایک سے ٹکرانے سے بچنے کی کوشش
میں گاڑی ڈرائیو کرتے شخص نے تیزی سے موڑ کاٹا
تھا۔ شہیر نے رک کر چلانا چاہا مگر۔ کاری زویش آئی
مہر النساء وہکا کھا کر گر گئی۔ سر کا پچھلا حصہ جانے کس
نوک وارچہ سے ٹکرایا تھا خون کی پتلی سی دھار پھوار کی
مانند نکلی تھی۔ شہیر کے ہاتھ سے ڈبا کر۔ مہر النساء
زمین پر پڑی کر رہی تھی۔ اور خون۔

”مہر النساء۔“ وہ وہیں سے چنچا۔ بہت سے سر
اس کی طرف گھومے تھے۔ وہ ہواؤں پر قدم رکھ کر
مہر النساء تک پہنچا تھا۔

”نساء۔“ اس کا سر اٹھاتے ہوئے وہ دیوانہ وار پکار
کر بولا تھا۔ آنکھوں میں مایوسی کی کڑیاں ریزہ ریزہ
ہو کر آنکھوں میں سارہی تھی۔ خون سے شہیر کے
ہاتھ بھیگ گئے۔ وہ شہیر سا دیکھ رہا تھا۔ مہر النساء
نڈھال پڑی تھی اور وہ زرو پڑ رہا تھا۔

”خون دیکھ کر مجھ پر وحشت سوار ہو جاتی ہے۔“
یو جھل پڑتی آنکھوں کے ساتھ مہر النساء کو یاد آیا تھا۔
اس نے شہیر کو پکارنا چاہا۔ مگر شہیر کا دل غ سائیں
سامنے کر رہا تھا۔

”شہیر اسپتال مت لے جاؤ۔ مجھ سے بات
کرو۔“ مٹی کی آواز اس کے بہت پاس گونجی تھی۔
شہیر کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔

”مہر النساء کیا ہو رہا ہے تمہیں۔ مجھے دیکھو۔ پلیز
آنکھیں بند مت کرو۔ مجھے سنو نساء۔ پلیز مجھے آواز
دو۔“ وہ واقعی خون دیکھ کر سن ہو جاتا ہو گا۔ مہر النساء
کو یقین آگیا۔ وہ پوری ہمت جمع کر کے آنکھوں سے

دھند پرے دھکیل رہی تھی۔ شیر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

”شیر میری زندگی بس اتنی تھی۔ تم خوش رہنا۔“ مٹی کی آواز میں جیسے ہر النساء کہہ رہی تھی۔ وہ ہاتھ سے خون روکتا ہوا نہ ہو رہا تھا۔

”ہر النساء مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ ہر اہم موقعے نے مجھ سے کچھ نہ کچھ چھینا ہے۔ میں تمہیں نہیں کھوسکتا۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ مجھے زندہ رہنے دو مت مارو۔“ ہر النساء کا چہرہ آنسو سے بھگ رہا تھا اور وہ معصوم بچے کی طرح ہلکے ہلکے کر رہا تھا۔ بہت سے لوگوں نے۔۔۔ بلکہ سب نے اسے حوصلہ دینا چاہا۔ مگر مٹی پاپا کی کراہیں۔ ٹوٹی سانسیں۔ ہر النساء کا درد سے بے حال وجود۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ ہر النساء کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ پھر کھل رہی تھیں۔ شیر کے لیے۔ صرف شیر کے لیے۔

”شیر۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ سنبھالو۔ ش۔۔۔“ ہر النساء آواز دے رہی تھی۔ شیر نے دیکھا وہ باری نہیں تھی وہ زندہ تھی۔ محبت کو بھی کبھی کسی نے مرتے دیکھا ہے؟ ہاں محبت نے اپنے وجود کو پایا تھا۔ خوف کی جگہ محبت نے لی۔ محبت وجود میں آئی۔ شیر کی زندگی ایک جملے میں سمٹ گئی۔

”شیر میں ٹھیک ہوں۔“ تو شیر نے سنبھال لیا خود کو۔ ہر النساء کے لیے۔ محبت سے خوف کھاتی لڑکی کے لیے۔



”یہ مجھ سے دوستی نہیں کرنا چاہتے۔ میرے ہوتے ہوئے بھی یہ تمہاری لیے اداس بیٹھے تھے۔“ وہ لینے بھی نہیں اترے۔ تم لیٹ کیوں آئیں ہر النساء۔“ شیر نے محبت سے اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے سوال کیا تھا۔ ہر النساء کے سر پر پٹی لگی تھی۔ جو ہر اٹھاتے قدم پر درد کرتی تھی۔

”اب آرام کرنے کی خد کر رہے تھے۔“

”کیا بہت پریشان تھے؟“ ہر النساء نے شرارت سے چھیڑا۔

”تم سے کہ۔۔۔“

”تم مجھے شرمندہ کرنا چاہتی ہو تو ناکام رہو گی۔“

شیر نے ہنس کر کہا تھا۔ ہر النساء نے دیکھا اس کی آنکھوں کو۔ جو رات بھر جاگ رہا تھا شاید رویا۔

مر جھائے چہرے کے باوجود وہ دل سے خوش ہو رہا تھا۔

”پھر بھی تمہیں سب کے سامنے ایسے۔“ وہ لب و لہجہ خاموش ہوئی۔ پرندے ان کے قدموں کے پاس چل قدمی کر رہے تھے۔ آوازیں بکھر رہی تھیں۔

”میں جن کو عزیز رکھتا ہوں انہیں کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہر النساء۔ ساری رات میں تمہارے ہوش میں آنے کی دعا میں کرتا رہا۔“ وہ احسان جتاتے ہوئے افسوس کر رہا تھا۔ ہر النساء نے

”شیر میری زندگی بس اتنی تھی۔ تم خوش رہنا۔“ مٹی کی آواز میں جیسے ہر النساء کہہ رہی تھی۔ وہ ہاتھ سے خون روکتا ہوا نہ ہو رہا تھا۔

”ہر النساء مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ ہر اہم موقعے نے مجھ سے کچھ نہ کچھ چھینا ہے۔ میں تمہیں نہیں کھوسکتا۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ مجھے زندہ رہنے دو مت مارو۔“ ہر النساء کا چہرہ آنسو سے بھگ رہا تھا اور وہ معصوم بچے کی طرح ہلکے ہلکے کر رہا تھا۔ بہت سے لوگوں نے۔۔۔ بلکہ سب نے اسے حوصلہ دینا چاہا۔ مگر مٹی پاپا کی کراہیں۔ ٹوٹی سانسیں۔ ہر النساء کا درد سے بے حال وجود۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ ہر النساء کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ پھر کھل رہی تھیں۔ شیر کے لیے۔ صرف شیر کے لیے۔

”شیر۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ سنبھالو۔ ش۔۔۔“ ہر النساء آواز دے رہی تھی۔ شیر نے دیکھا وہ باری نہیں تھی وہ زندہ تھی۔ محبت کو بھی کبھی کسی نے مرتے دیکھا ہے؟ ہاں محبت نے اپنے وجود کو پایا تھا۔ خوف کی جگہ محبت نے لی۔ محبت وجود میں آئی۔ شیر کی زندگی ایک جملے میں سمٹ گئی۔

”شیر میں ٹھیک ہوں۔“ تو شیر نے سنبھال لیا خود کو۔ ہر النساء کے لیے۔ محبت سے خوف کھاتی لڑکی کے لیے۔



دھوپ سے بھری فٹ ہاتھ پر زندگی رواں تھی۔ رخصت ہوتے جون کی ایک گرم جگر جگر صبح طلوع تھی۔ ساکت کھڑے درختوں پر سناٹے اترے ہوئے تھے۔ پہاڑی کوئے اور گہرے سبز لباس میں طوطے اکیلے ہی آسمان کی سیر کو نکلے ہوئے تھے۔ خاستری چڑیاں شاخوں پر اداس بیٹھی تھیں۔ ہوائے اوڑھے سوتی تھی۔ ہر النساء تیز قدموں سے چلتی چلتی ایک دم

شکر سے خود کو اسی دیکھ لیا۔

”محبت مبارک“ پرندوں کے شور میں مہر النساء پر فدا ہوتا شیر وقت کو گواہ بنا کر عہد کر رہا تھا۔ ”میں شہساری زندگی کو خوشبو سے مرکا دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ مہر النساء“ اور مہر النساء کو بغیر عہد کے بھی اس پر یقین تھا۔ خود سے بڑھ کر تھا۔ موقع کے پھول اسے چھو کر گزر رہے تھے۔ سبز نیل سرخ پھول برس رہی تھی۔ سنہری پانیوں جیسی دھوپ سے بھری فٹ پاتھ پر زندگی رواں تھی۔ اور ایک زندگی میل تھی۔ ”محبت، ہم سفر بن کر اس دن کو یادگار بنا رہی تھی۔ دو خاص لوگوں کے ایک خاص جذبے کے لیے۔“



”کچھ لوگ ہماری زندگی میں بہت خاص ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بھی انتظار کے سفر نہیں چلانا چاہیے۔ انہیں خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹانا چاہیے۔“ نیل کنٹھ اس کو سرگوشی میں کہہ رہے تھے۔ ”گوں نے سنا تو مڑ کر تائید کرنے لگیں۔“ ”تم مجھے کل کچھ دینے والے تھے۔“ وہ یک لخت ہر بوجھ سے آزاد ہو کر کہہ گئی۔ شیر رک کر اسے دیکھنے لگا۔

”کیا اب دل۔۔۔؟“
”ہاں۔“ اس نے شیر کی آنکھوں میں جھنجو جائے دیکھ لیے۔

”نہیں میں اب نہیں جاؤں گا۔ تم کبھی بھی مجھے آواز دے کر رک جانے کا نہیں کہتیں۔ میں پھر بھی تمہیں اکلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“ وہ شاید خوف زدہ تھا اور سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ مہر النساء نے اس کا ہر خوف چن لینے کا فیصلہ کر لیا۔ شیر اس کا حق بھی رکھتا تھا۔

”شیر۔۔۔ تمہیں یاد ہے مجھے خوشبو دینے کا وعدہ کیا تھا تم نے۔“ اس نے آواز دی۔ شیر کی حسرت پوری ہو گئی تھی۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اپنی مہر النساء۔ اور داد کا شیر۔ پرندے ان کے گرد اچھل کود کر رہے تھے۔

”مہر النساء۔ میں تمہیں پھول دے سکتا ہوں۔“ وہ جگمگاتے چہرے سے کہہ رہا تھا۔ آنکھیں پر رونق۔ چمک سے بھری۔ مہر النساء کو پانا کیا اتنی خوشی کی بات بھی ہوگی۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

”پھول توڑنا منج ہے۔۔۔“
”دل توڑنا بھی۔“ سنہری کرنیں شاخوں سے گزر کر ان پر پڑتیں۔ دونوں کو کندن کر رہی تھیں۔ زندگی مسکرا رہی تھی۔ زندگی مبارک ہو شیر کہہ رہا تھا۔

”نساء۔ زندگی مبارک۔“ نساء کے دوست کہہ

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

دستِ کدھر

فوزیہ یاسمین



قیمت - 750/- روپے

32735021

میں ہر کچھ کی نیکی سے سناؤ

عباد گیلانی بلڈ کنسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی بیوی مومنہ کو طلاق دے کر اپنے بیٹے حازم کو اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور دوسری شادی عاظمہ سے کر لیتا ہے۔ حازم اپنی ماں عاظمہ اور بھائی باہر کے ساتھ اچھی زندگی گزار رہا ہوتا ہے، مگر اپنے باپ عباد گیلانی کی بیماری کی وجہ سے فکر مند رہتا ہے۔ جب کہ عاظمہ اور باہر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ عباد گیلانی کو اپنی بیماری میں احساس ہوا ہے کہ اس نے حازم کی ماں مومنہ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ عباد گیلانی مومنہ کے باپ یاور علی کو بلاتا ہے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہے اور حازم کو خاص طور سے اس کے نانا یاور علی سے ملواتا ہے، مگر حازم اپنے نانا سے مل کر اچھے تاثرات کا اظہار نہیں کرتا، مگر بعد میں اپنے باپ کی خواہش پر ان کے ساتھ اپنے نانا کے گھر جاتا ہے اور اپنی ماں مومنہ سے ملتا ہے۔ اس کے دل کے تمام شکوکے بھول جاتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

حوریہ مومنہ کی بیٹی ہے بے حد محبت کرتی ہے اور مومنہ بھی اسے بے تحاشا چاہتی ہے، حازم جب حوریہ کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں حوریہ کے لیے پسندیدگی کے جذبات ابھرتے ہیں اور یہی حال حوریہ کا بھی ہوتا ہے۔ عباد گیلانی حوریہ سے مل کر بہت خوش ہوتا ہے کیونکہ حوریہ میں اسے مومنہ کا عکس نظر آتا ہے اور حازم سے پوچھ کر اس کے نانا یاور علی سے دونوں کی شادی کی بات کرنا ہے۔

حوریہ اپنی دوست فضا سے بہت محبت کرتی ہے، فضا کی ایک امیر زادے سے دوستی ہے اور وہ گھر والوں سے چھپ کر اس سے ملتی ہے۔ حوریہ کو اس بات سے اختلاف ہے، وہ فضا کو بہت سمجھاتی ہے کہ اس راستے پر نہ چلے مگر فضا نہ مانی اور آخر کار ایک دن محبت کے نام پر برائی اپنی قسمت میں لکھوا لیتی ہے اور اس بات کا پتا اس کی سوتیلی ماں جہاں آکر اگوچل جاتا ہے اور وہ اپنے بھانجے نصیر سے اس کی شادی کرنے کا پروگرام بنالیتی ہے، جبکہ فضا اس پر راضی نہیں ہوتی حوریہ کو جب پتا چلتا ہے تو وہ فضا کو سمجھاتی ہے اس امیر زادے کو کہے کہ وہ اس سے شادی کرے اور فضا اس کو مجبور کرتی ہے کہ یہ بات



DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

وہ خود اس کو سمجھائے اور فضا کے مجبور کرنے پر جب وہ باہر سے ملتی ہے تو اپنی غلطی کا شہرت سے احساس ہر ثانیہ سے باہر سے
ہرگز نہیں ملتا چاہیے تھا اور اس بات پہ بھی افسوس ہوتا ہے کہ اس نے ایک غلط لڑکی کو دوست بنایا۔ (اب آگے

کیوں قسطنطنیہ



باہر اپنی حیرت سمیٹ کر خاصی خوش گواریت کے سماجی فضا سے کہہ رہا تھا۔
فضا نے ایک ہلکی سی سانس کھینچی اور شولڈر بیک کندھے سے اتار کر درمیان تپائی..... پر رکھتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”تمہیں برا تو نہیں لگا میرا یہاں آنا؟“
”ارے نہیں نہیں..... آؤ بیٹھو۔ بلکہ خوش ہوئی۔“

”میں دراصل..... یہاں.....“ فضا وضاحت دیتے ہوئے ذرا سا ہچکچاتی گئی۔
”تم سے اس روز ملنے کے بعد میں نے بہت کوشش کی۔ تم سے کانٹیکٹ کروں مگر کوئی کانٹیکٹ نمبر بھی نہیں تھا۔“ وہ ایک کشادہ اور گداز صوفے پر بیٹھ گئی۔

”پتا نہیں مجھے یہاں آنا چاہیے تھا یا نہیں۔ میں نے غلط کیا یا ٹھیک..... بس یہ ہے کہ اس روز ریٹائرمنٹ کے باہر ہماری مختصر ملاقات نے مجھے بہت ڈسٹرب کر دیا تھا۔“
”اوہ.....“ باہر ہلکی سی متاثرانہ سانس کھینچ کر رہ گیا پھر معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ”سوری۔ مجھے نہیں علم تھا کہ تم میر ڈو اور میری وجہ سے تمہاری لائف میں پریشان آ جائیں گے۔ کیا تمہارا شوہر؟“

”ارے نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔“ فضا اس کا مطلب جان کر مسکرا دی۔ ”پھر وضاحت دیتے ہوئے بولی۔ ”میرے پریزنٹ کے تو علم میں ہی نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے نظریں چرائیں۔ ”میں ان فیکٹ پریشان اس لیے تھی کہ اس روز میں نے تم کو بہت ہرٹ کر دیا تھا مجھے تمہارے جانے کے بعد بہت افسوس ہوا کہ مجھے تم سے اتنا روڈی (بختی سے) بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

”نہیں فضا۔ میں یہی ارادہ ہیڈر کر رہا تھا۔“ باہر کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ گم ہو گئی۔ وہ صوفے کے ہتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

”میں نے تمہاری زندگی میں جو ہر گھولا اس کا احساس میرے اندر کانٹے کی طرح کھب کر رہ گیا ہے۔ بس میں یہ کانٹا نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

دولت چب ایک کمزور نفس اور کم ایمان انسان کے پاس ہو تو پھر ایسے ہی افسوس ناک حادثے جنم لیتے ہیں۔ اخلاق کا قتل ہو جاتا ہے..... میں بھی گمراہ ہو گیا تھا۔“

کمرے میں ایک مغموم سی فضا طاری ہو گئی تھی۔ فضا گم صدمہ ہو کر رہ گئی تھی۔

”میں نے بہت کچھ کھو کر زندگی کو سمجھا ہے۔ اور جب سمجھ آئی تو نفع و نقصان کا اندازہ لگایا تو پتا چلا فقط نقصان ہی نقصان اٹھایا ہے۔ کچھ نہیں پایا۔ سوائے کھونے کے۔ اعتبار رشتے، محبتیں..... سب کچھ کھویا میں نے..... ایک خود رو جنگل آگ آیا میرے اطراف..... نفرتوں کا..... اور میں اس بنجر جنگل میں محبت کا پودا اگانے کے جتن کر رہا ہوں۔ تو۔“ وہ ہلکے سے ہنس دیا۔ جیسے خود پر ہنس رہا ہوں۔ ”خیر تم سناؤ۔ بیلپومی۔ (یقین کرو میرا) تمہیں یہاں دیکھ کر بہت اچھا لگا۔“

اس نے یکدم سر کو خفیف سی جنبش دے کر اس افسردہ ماحول سے خود کو نکالا۔ پھر کمرے میں داخل ہوتے امیر علی سے بولا۔

”امیر علی یہ میری بہت خاص الخاص مہمان ہیں۔ ان کے لیے کچھ زبردست قسم کے کھانے کا اہتمام کرو بھی۔“ امیر علی نے فضا پر ایک نظر ڈال کر سر ہلا دیا۔

”علی شاہ کہاں چلا گیا۔“ باہر کا دھماکا ایک دم علی شاہ کی طرف گیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”ارے۔ اسے اس طرح بھاگنے دوڑنے مت دوا میر علی۔ ابھی اس کا زخم کچا ہے۔ اسے یہاں لے آؤ میرے پاس۔“

”جی بہتر۔“ میر علی کمرے سے نکل گیا۔ باہر میر علی کے جانے کے بعد فضا کی جانب متوجہ ہوا جو بالکل خاموش تھی۔ عجیب سے احساسات سے دوچار تھی۔ باہر کے اپنی طرف متوجہ ہونے پر ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”بہت پیارا گھر ہے تمہارا اور بہت بڑا بھی۔“ اس کے لہجے میں حقیقی ستائش تھی۔ جو ابابا پر ہنکارا بھر کر ڈرانگ روم کا طائرانہ جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی جھلکنے لگی۔

”بتا ہے کیا فضا اسکون اور خوشی حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے پرائسٹن گھر حاصل کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے اندر ہوتا ہے۔ ہمارے اپنے ہی کردار اور رویوں سے جنم لیتا ہے۔“

”ہاں اس بات کی سمجھ مجھے آ تو گئی دیر سے ہی سہی۔“ فضا ہلکے سے بولی پھر کمرے میں داخل ہوتے میر علی کی طرف اس کی ساری توجہ مبذول ہو گئی۔ اس کی گود میں ہلستا بچہ باہر کی گود میں آنے کو چھٹا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک بار پھر استفسار سا برپا ہو گیا۔

یہ بچہ اس نے حور یہ کی گود میں دیکھا تھا۔ ہاں یقیناً یہ علی شاہ ہی تھا اسے بالکل بھی غلط فہمی نہیں ہو رہی تھی کہ یہ بچہ حور یہ کا ہے۔

باہر نے کسی قیمتی متاع کی طرح اس بچے کو خود سے چٹا لیا تھا اور بچہ بھی اس کے چوڑے سینے سے لگ کر بے حد مطمئن اور خوش دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کی شہر رنگ آنکھیں کندن کی طرح دمک رہی تھیں۔

”دس از مائی سن۔ مائی پرنس۔“ باہر کے لہجے میں پیار کا دریا بہا تھا۔

”تمہارا بیٹا؟“ فضا کے چہرے سے حیرت جھلکی۔

”ہوں۔ کہہ سکتی ہو۔“ وہ ہم انداز سے مسکرایا۔ پھرنس دیا۔ ”البحمد للہ امت خود کو۔ یہ میرا بھتیجا ہے۔ میرے بھائی حازم کا بیٹا۔“ اب کے فضا کے لیے یہ حیرت کا شدید حملہ ہی تھا۔ وہ میکا کی انداز میں صوفے سے اٹھی تھی۔

مگر کچھ کہنے کی خواہش میں لب فقط کل کر رہ گئے۔ دوسرے ہلکا دہ آہستگی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”مگر۔ یہ بچہ تو.....“

”ہاں۔ یہ حازم اور حور یہ کا بیٹا ہے۔ حازم کی ڈیڑھ تھو ہو چکی ہے۔ اور اب میں اس کا گارڈین ہوں۔“ باہر اس کے ننھے ننھے گداز ہتھیلیوں کو اپنے لبوں سے لگا کر چومتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ فضا کے لیے یہ انکشاف خاصا اعصاب شکن تھا گویا پتھر پڑا تھا کسی شخص پر۔ اور ایک زوردار چھٹا کا ہوا تھا۔ مگر صرف فضا کے دل کی سطح پر۔ اس کی نظریں جوں کی توں باہر پر جمی رہ گئیں۔

انفار چوٹیلی (بد قسمتی) حور یہ کی شادی کے سال بھر بعد حازم کی ڈیڑھ تھو ہو گئی تھی۔ پھر فضا کے چہرے کی طرف دیکھ کر چوٹکتے ہوئے بولا۔ تمہارے علم میں یہ باتیں نہیں ہیں کیا؟ تم الجھ گئی ہو۔“

”ہاں۔ میں صرف اتنا جانتی تھی کہ حور یہ کے ہر بیٹا کی ڈیڑھ تھو ہو چکی ہے مگر مجھے نہیں علم تھا کہ حازم تمہارا بھائی ہے، فضا حیرت کو سمیٹ کر ہلکا بولی۔ پھر ایک ہل آ نکھیں میچ کر کھولیں۔ اس پے در پے جھپکوں کے فشار سے وہ خود کو نکال پاتی تھی۔ یہی اس کے لیے بہت

تھا۔ تاہم وہ ایک امیٹور اب کا شکار دکھائی دے رہی تھی۔

”میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے۔“ یک دم شو لڈر بیک درمیانی میز سے اٹھاتے ہوئے بولی۔

”ارے۔ اتنی جلدی بیٹھو ابھی حوریہ سے مل کر جانا۔“ بابر جلدی سے بولا۔ پھر اندر داخل ہوتے امیر علی سے بولا۔

”امیر علی! حوریہ بی بی سے کہوان کی بیسٹ فرینڈ آئی ہیں۔ ان سے ملنے۔“
”نہیں میرا خیال ہے میں اب چلوں گی۔ کچھ نئی مجھے نصیر کو دکان پر گاڑی بھجوانی ہے ان کی دکان کا آدمی ہی میرے ساتھ آیا ہے۔ نصیر انتظار کر رہے ہوں گے اس کا۔“
”میرا تو خیال تھا تم یہ سب جان کر جس کا شکار ہو جاؤ گی اور مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دو گی۔“ بابر بھی صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”فضا پلٹنے پلٹنے لگی۔ بابر کے لہجے میں کچھ تھا۔ وہ سراسیمہ سی ہو کر رہ گئی۔
”حیرت ہی اتنی زیادہ تھی کہ کچھ مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کچھ پوچھوں۔“ پھر ہلکے سے ہنس دی۔ ”اب کچھ ابھن ہی نہیں رہی۔ سب کچھ واضح ہو گیا۔“ وہ بھی نہ چاہتے ہوئے اسے جتا گئی۔ بابر نے اسے دیکھا، پھر ہلکی سانس کھینچ کر بولا۔
”تم حوریہ کی شادی میں شامل نہ تھیں، ورنہ یہ بات اسی روز واضح ہو جاتی۔“
”کیا فرق پڑتا ہے۔ پہلے ہوئی یا اب ہو گئی۔“ پھر کسی احساس سے نکتے ہوئے لہجے میں نرم تاثر سموتے ہوئے بولی۔

”میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے بابر۔ اور یہ ہی کہنے یہاں تک آئی تھی اور میرا خیال ہے یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔“ وہ پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی تک آتے ہوئے بولی۔
”کیوں؟ کیا میری شادی میں نہیں آؤ گی۔“ فضا چلتے چلتے یک دم یوں رک گئی جیسے پیر میں ٹھوکر لگی ہو اور آہستگی سے اس کی جانب گھومی۔

”شادی..... اچھا کب..... کب کر رہے ہو شادی..... کس سے کر رہے ہو۔“ اس کے لہجے میں تجسس تھا۔ بابر کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس کی آنکھوں میں پل بھر جیسے کوئی دیپ جل کر بجھ سا گیا تھا۔

”کب ہو رہی ہے یا کس سے؟“ یہ نہیں پوچھو، یہ پوچھو کہ کس سے کرنا چاہتا ہوں۔“
”اوہ..... یہ بھی تم ہی بتا دو۔“ وہ دونوں گاڑی کے نزدیک آ کر رک گئے۔
بابر کی نظریں بے اختیار لان کے داہنے طرف نظر آتے میز کی جانب گئیں۔ پھر پلٹ آئیں۔ اس نے حوریہ کو میز پر کھڑے پلٹ کر اندر کی جانب جاتا دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی غالباً ان دونوں کو دیکھ چکی تھی۔

”بتا بھی دو اب سسپنس میت پھیلاؤ۔ کس سے شادی خانہ آبادی کرنا چاہتے ہو۔“ فضا بے حد مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔

بابر نے نہایت اطمینان سے اس کے لیے گاڑی کا بیک ڈور کھولا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولا ”حوریہ سے۔“

فضا کا سارا وجود ایک لمحے کو پتھر سا ہو گیا تھا۔

دعا کرنا..... میں یہ ہم سرگرموں۔ مہماری یہ فریڈ لو مان کے تئیں دے رہی ہے۔ وہ آہستگی سے پیچھے ہٹا اور فضا کو گاڑی میں بیٹھنے کے لیے راستہ دیا۔
 ”فضا جیسے کسی ٹرانس سے باہر نکلی۔ اس نے باہر پر یوں نگاہ ڈالی جیسے اسے باہر کی دماغی حالت پر شک ہو رہا ہو۔“

”او کے سی یو اگین۔“ (او کے پھر ملیں گے) باہر سر کو خم دے کر مسکرایا۔ فضا گاڑی کی سیٹ پر آہستگی سے بیٹھ گئی اور خوش نما روش کی طرف جاتے باہر پر ایک نظر ڈال کر رہ گئی۔ وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ کیا حور یہ بھی اس سے شادی کرے گی۔ وہ راضی نہیں ہے یا مان کر نہیں دے رہی ہے تو..... وہ کیسے شادی کر سکتا ہے اس سے۔ گاڑی آہستہ رومی سے آگے بڑھ گئی، مگر اس کا دھیان پیچھے ہی رہ گیا۔

”کیا حور یہ مان جائے گی۔“
 کیا باہر کے جذبے صادق ہیں۔“
 وہ خود کو عجیب احساس میں جکڑا ہوا محسوس کرنے لگی۔

☆☆☆

حور یہ کھانے کی میز پر آئی تو نفیسہ اس کے آگے کھانے کے لوازمات رکھتے ہوئے بولی۔
 ”آپ سورہی تھیں شاید..... اس لیے میں نے دروازہ زیادہ بجایا نہیں۔ آپ کی کوئی مہمان آئی تھیں۔ باہر صاحب آپ کو بلارہے تھے۔“

”وہ مہمان میری نہیں باہر صاحب کی ہی تھیں۔“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور پلیٹ پر رکھا ٹکین اٹھایا۔
 ”وہ مہمان..... ہم دونوں کی مشترکہ تھی۔“ باہر کی آواز پشت سے ابھری۔ اس کا حرکت کرتا ہوا ایک پل کے لیے رک گیا۔ ”فضا تمہاری بھی بہت اچھی فریڈ ہے۔“ وہ اس کے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور آستین فولڈ کرتے ہوئے میز پر موجود لوازمات پر نظریں دوڑانے لگا۔ جیسے اپنے کیے ہوئے جملے پر اس کے رد عمل اور تاثرات کو جاننے کی ضرورت نہ ہو۔

”وہ ”گیلانی ہاؤس“ میں تم سے ملنے آئی تھی، مجھ سے نہیں۔“ اس کے لہجے میں بے نام سی تشویش تھی۔ باہر نے تھنوں اچکائیں۔

”اسی کی لگن تھی تھی، اس نے تمہیں ڈھونڈ لیا۔“
 ”واٹ۔“ باہر کے اعصاب پر اس کا جملہ کسی پتھر کی طرح کھٹ سے لگا تھا۔ جیسے والکن کے تتے ہوئے تاروں پر کھٹ سے کوئی بے سربا ہاتھ ماروے۔ سارے تار جھنجھٹا اٹھے ہوں۔ ”لگن سے تمہارا کیا مطلب ہے۔“
 ”وہی جو لگن کا مطلب ہوتا ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”وہ اس سٹینس میں نہیں آئی تھی۔“ باہر کا لہجہ دفاعی تھا۔
 ”وہ جس سٹینس میں بھی آئی تھی، میں تو اس کی کچی لگن کو سراہ رہی ہوں۔“ باہر اس کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے یک دم ہنس پڑا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔
 ”تم کہیں اس کے آنے سے اور مجھ سے ملنے سے ڈر رہی ہو گی؟ کہیں، آئی مین کہ جیلس تو نہیں ہو رہی ہو، کوئی رقیبانہ جذبہ وغیرہ وغیرہ۔“

”ایکسپوزی! میرے لیے اس کا آنا اور تم سے ملنا ملا نا کوئی معنی نہیں رکھتا۔“
 ”تمہارے چہرے کے ایکسپریژن سے تو لگتا ہے۔ بات سیدھی تمہارے دل پر جا کر لگی ہے۔“

میرا خیال ہے تمہارے پاس حصولِ دقت بہت ہے۔ وہ یہنیں ہے ہاتھ پوچھے ہوئے کرسی سے اٹھ گئی۔

”ارے ارے سٹ ڈاؤن (بیٹھو) پلیز..... اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ میں تو یوں ہی تمہیں چھیڑ رہا تھا۔“
 ”یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ وہ ناراضی سے کہتی دوبارہ بیٹھ گئی۔
 ”رشتہ تو ہے نا۔ نفرت کا ہی سہی۔“ وہ جواباً ہلکے سے ہنسا۔
 ”ضروری ہے ہمارا جب بھی سامنا ہو، ہم اسی طرح کے ٹاپک پر بات کریں۔“ وہ اس پر ملاحتی نگاہ ڈال کر رہ گئی۔

”سوری.....“ بابر یک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس کے لبوں پر کھلنے والی خوش گوار مسکراہٹ یقیناً گم ہو گئی۔
 ”تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہمارے بیچ بے ارادہ اس طرح کی باتیں ہو جاتی ہیں اور میں تمہیں ہرٹ کر دیتا ہوں۔
 حالانکہ میں تمہیں بہت خوش دیکھنا چاہتا ہوں حوریہ۔“
 حوریہ بے اعتبار لب دانتوں میں دبا کر نظریں چرا گئی۔ ایک لمحے اس کا دل چاہا وہ کہہ دے۔ ”خوش دیکھنا چاہتے ہو تو میری زندگی سے نکل جاؤ۔“ مگر وہ چاہنے کے باوجود نہ کہہ سکی۔ بابر کہہ رہا تھا۔
 ”میں آج بہت خوش ہوں۔“ پھر چوتھے ہوئے ابرو اچکا کر حوریہ کی آنکھوں والی نگاہ پر وضاحتی لہجے میں جلدی سے بولا۔

”فضا کے یہاں آنے سے نہیں بلکہ اس کے مجھے معاف کر دینے سے۔ حالانکہ میں شاید اس کا قائل نہیں تھا۔“

”ہاں..... معاف کر دینے کا حوصلہ کسی کسی میں ہی ہوتا ہے۔ فضا کا ظرف بہت بڑا ہے۔“ وہ بولی، بابر کو اس کے لہجے میں جتانے والا تاثر محسوس ہوا۔ وہ ایک گہری سانس بھر کر اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

”میں فضا کا احسان عمر بھر یاد رکھوں گا۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ ”غلطیاں انسان سے ہی ہوتی ہیں۔ فرشتے کا دعوا تو۔ یہاں کوئی جہی نہیں کر سکتا۔“ اس کے لہجے میں کچھ تھا۔ حوریہ نے سر اٹھا دیا، مگر وہ یہ کہہ پلٹ گیا تھا۔ اس کی نظریں اس کی پشت پر ٹھہر گئیں۔ ایک بے نام سا بوجھل احساس دل کو چھو رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔
 ”کچھ لوگ پیاز کے چھلکوں کی طرح پرت پرت اترتے ہیں، مگر کچھ لوگوں کا ظاہر باطن لمحوں میں ہی واضح ہو جاتا ہے۔ بابر بھی ان ہی لوگوں میں تھا۔ وہ برا تھا تو اس کی ہر برائی ظاہر تھی۔ اس نے کبھی خود کو اچھا بنا کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اب اچھا بن رہا تھا، تب بھی خود ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ وہ اچھا بننے کی کوشش میں ہے۔ عجیب بندہ تھا۔ ہر بار اسے جھنجھوڑ کر پراگندہ کر کے چلا جاتا تھا۔“ اس کا دل کھانے سے یقیناً اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ میز سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

فضا کی بے چینی نصیر سے غنی نہیں تھی۔ رات اس نے فضا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے مد مقابل کھڑا کر دیا۔ فضا گڑ بڑا گئی۔
 ”کیا ہوا؟“

”یہ ہی تو میں پوچھ رہا ہوں کیا ہوا ہے؟“ جواباً نصیر نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ ”کیا پریشانی ہے تمہیں، کون سی سوچ تمہیں پریشان کر رہی ہے۔“ اس نے اس کے ہاتھ سے گرفت ہٹائی اور بیڈ پر جا کر بیٹھ گیا۔
 ”ایسا لگتا ہے میں تمہیں خوش رکھنے میں ناکام ہو گیا ہوں۔“ اس کا لہجہ پست تھا۔ فضا نے تعجب سے اس کی

طرف دیکھا، مگر وہ اس کی طرف نہیں دوسری طرف رخ کیے اٹھا موبائل اٹھا کر اس میں مصروف تھا۔ ”میں نہیں حال میں خوش اور مستقبل میں مگن دیکھنا چاہتا تھا، مگر تم شاید اب بھی ماضی میں سانس لے رہی ہو۔“ یہ پہلا شتر تھا جو نصیر کی طرف سے اسے لگا۔ وہ گھبرا گئی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“

”میں شاید تمہارے قابل نہیں تھا۔“ وہ خود آزاری کی کیفیت میں آ گیا۔ ”ٹھیک ہی ہے جو تعلق دل سے جڑا نہ ہو، وہاں محبت پیدا نہیں ہو سکتی۔ زبردستی کے رشتے عمر بھر سمجھوتے پر چلتے ہیں۔“

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں نصیر۔“ فضا تڑپ گئی اور اس کے نزدیک آ کر بیٹھ گئی۔ میں ایسا کچھ نہیں سوچ رہی۔ نہ پریشان ہوں۔“ وہ اس کے پیروں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ نصیر نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”تم کل کہاں گئی تھیں گاڑی لے کر۔“ پہلی بار اس کی کھوج کر رہا تھا، اسے جانچنی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ فضا نے رخ سے اسے دیکھا۔

”بے اعتبار ہو رہے ہیں آپ۔“

”اعتبار نہ ہوتا تو تمہیں یوں تنہا جانے نہیں دیتا۔ سو سو سوال اٹھاتا۔ مگر ایسا لگتا ہے تم مجھے اس طرح کے سوال اٹھانے پر مجبور کر رہی ہو۔ ویلو فضا میں ایک سیدھا سا وہ بندہ ہوں، روزی کمانا، اپنے بال بچوں کو خوش رکھنا اور اپنی تمام تر محبت اور توجہ ان کو دیتا۔ بس یہ میرا نقطہ نظر ہے اور طریقہ زندگی رہا ہے۔ میں زندگی کو بہت سادہ سے انداز میں دیکھتا ہوں۔ یہ نہیں ہے کہ کچھ سمجھتا نہیں ہوں۔ مگر بے کار کے سوال جواب اور ارجحوں میں گھر کر زندگی کی سچی خوشیوں سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ میں نظر انداز کرنے کے مقولے پر عمل کرتا ہوں۔ جہاں تک ہو سکے ایک دوسرے کی خامیوں اور غلطیوں کو نظر انداز کر دو۔ ہمارے پیش امام صاحب حدیثیں سناتے رہتے ہیں ہمیں، کہ اپنے ملازموں کو بھی ستر بار معاف کیا کرو۔ تو پھر بویوں کے لیے دل تنگ کیسے ہو سکتے ہیں۔ مگر اب سوچ رہا ہوں کہ ہر بار مردی غلط نہیں ہوتا۔“ اس نے آہستگی سے پیر سمیٹ کر موبائل ایک طرف رکھ کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی۔ اس کے لہجے میں اتنی سرد مہری فضا کے دل کو کاٹ کر رہ گئی۔

وہ اس کے نزدیک آ گئی اور بے اختیار اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”اس کا یہ عمل اس قدر اچانک اور شدید تھا کہ نصیر ہڑبڑا کر رہ گیا۔

”آپ کے اعتبار نے ہی تو مجھے زندگی کی طرف کھینچا ہے نصیر، آپ کی عظمت روز بروز میرے دل میں بڑھتی جا رہی ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”میرا مطلب تمہیں رلاتا نہیں تھا فضا۔“ وہ پریشان ہو کر بولا اور اسے کندھے سے تمام کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ ”بس یوں ہی وہم سا ہونے لگا کہ تم میرے ہمراہ خوش نہیں ہو۔ اچھا چلو..... چپ ہو جاؤ۔“ وہ اسے بہلانے لگا۔ فضا نے فرط جذبات سے اس کا ہاتھ تمام کر اپنے لبوں سے لگایا اور چومتے ہوئے بولی۔

”آپ ایک عظیم انسان ہیں نصیر۔ میرے دل میں آپ کی عزت اور عظمت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔“ وہ اسے عقیدت مندانہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”میں واقعی پریشان تھی، بہت زیادہ، میں سوچ رہی تھی کہ معاف کر دینا کتنا مشکل کام ہے۔ ہم زبان سے یہ الفاظ ادا تو کرو پتے ہیں، مگر دل کے کسی گوشے میں اپنے مجرم کے اس کے جرم کے احساس کو مٹاتے نہیں ہیں۔ اسے سنبھال کر رکھتے ہیں، کسی تنفع کی طرح۔ آپ جتنا بڑا دل کسی کسی کا ہوتا ہے نصیر! آپ جیسا انسان بہت خوش نصیب والی کو ملتا ہے۔“ وہ ممنونیت سے کبھی ایک بار پھر اس کے سینے سے لگ کر کرب کا وہاں نکالنے

گئی۔

”آپ کا یہ خلوص بھر احوال میرے گرد نہ ہوتی تو میری منزل جانے کہاں ہوتی اور ہوتی بھی یا نہیں..... بس بھگتی رہتی۔ وعدہ کریں مجھے اپنے اس حصار میں تا عمر قید رہیں گے۔ اپنی پناہوں میں چھپائے رہیں گے۔ آپ ہی میری منزل ہیں۔ مجھے بھگتنے نہ دیں گے۔ بہت کمزور ہوں میں، بہت کمزور۔“

”کیا ہو گیا ہے فضا..... کیوں اس طرح کی باتیں کر رہی ہو۔“ نصیر کے بازوؤں کا حلقہ اس کے گرد تنگ ہو گیا۔ ”کوئی خوف ہے، کوئی دوسرے ہیں تو انہیں دل سے نکال دو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ تم میرے بچوں کی ماں ہو۔ میرے گھر کی چار دیواری ہو۔ جس میں آ کر میں سکون محسوس کرتا ہوں۔“ وہ اسے محبت سے دلا سا دے رہا تھا۔ اسے تسلی دے رہا تھا۔

”خود یہ سے ملنے لگی تھیں نا!“ وہ پوچھنے لگا۔ فضا نے اذیت سے لب بھینچ لیے اور آنسوؤں سے بھری آنکھیں جھپک کر سر ہلادیا۔ اس کا دل پھر اس اذیت سے دو چار ہونے لگا، جسے وہ مسلسل تھپکیاں دے کر سلا رہی تھی۔ اسے اپنا آپ نصیر کے آگے بے حد پست اور حقیر محسوس ہونے لگا۔

”بس اب تم حوریہ سے نہیں ملو گی۔ تم ماضی کا ہر دور واہ بند کر دو گی۔ ہر کھڑکی پر تالا لگا دو گی۔ تمہیں پلٹ کر نہیں دیکھنا فضا۔ یوں سمجھو تم کسی کو نہیں جانتیں۔ بس مجھے، اپنے گھر کو اور اپنے بچوں کے علاوہ۔ بولو، ایسا کرو گی۔“ وہ نرمی سے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اسے دیکھنے لگا، پھر اس کے رخساروں پر آئی بالوں کی ٹٹوں کو نرمی سے کانوں کے پیچھے کیا۔

”جب یادیں خوش گوار نہ ہوں تو پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ حال میں تمہیں کوئی تکلیف ہے، کوئی نا آسودگی ہے تو مجھے بتاؤ۔ مجھ سے شکر کرو۔“

”نہیں..... بالکل بھی نہیں۔“ وہ تڑپ گئی۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں مجھے ماضی میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ بس آخری بار گئی تھی۔ سوچا جو تھوڑا بہت بوجھ ہے۔ وہ بھی اتار کر آ جاؤں۔ کوئی فرض نہ رہ جائے۔“ اس نے تھک کر اس کے کندھے پر سر ڈال دیا اور آنکھیں موند لیں۔

”اب تو حوریہ سے تعلق ختم کرنا ہی پڑے گا۔ اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ ہر بار..... اس سے مل کر خود کو آزمائش میں ڈالوں۔“ نصیر کی لگائے تھے تھامے رکھنا۔ آسان تو نہیں ہوتا۔“ وہ سوچ کر رہ گئی۔

نصیر کی قربت اسے سکون بخشنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی۔ شاید آنسوؤں کا غبار نکال کر وہ پرسکون ہو گئی تھی۔

اس نے سوچا اچھا ہی ہوا آج نصیر نے اسے چھیڑ دیا اور وہ سارا اخبار نکل گیا جو باہر سے مل کر آنے کے بعد اس کے کمر در فیس نے پھر سے اسے بے سکونی میں دھکیل دیا تھا۔ وہ شیطان کے جال میں پھنس کر پھر سے کمزور پڑنے لگی تھی۔ ماضی کی یادوں میں بھٹک جاتی۔ پھر گمراہ ہو جاتی۔ نصیر کے خلوص اور اس کی بڑائی نے اسے اس شکل سے نکال دیا تھا۔ شیطان کے جال کو کاٹ دیا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔

کاش..... ہر مرد نصیر کی طرح درگزر کرنے والا۔ کیفیات کو سمجھنے والا ہو جائے۔ ہر شوہر اپنی بیوی کو ستر بار معاف کرنے والا بن جائے تو عورت کتنی محفوظ اور کتنی آسودہ ہو جائے۔ کتنی عورتیں، باغیانہ سوچوں اور گمراہ کن خیالات سے بچ جائیں۔ محفوظ ہو جائیں۔ ایسا سچا سا بھی ہی تو عورت کی چھت ہے۔ اس کا مان ہے۔ اس کے وجود کو ڈھانپ لینے والی چادر ہے۔

☆☆☆

عاظمہ نے اچانک ہی پکپک کا پردہ گرام بنا ڈالا۔ باہر کوراضی کر لیا اور حوریہ کو بھی بعد اصرار ساتھ لے جانے

لیں۔

”علی شاہ کا زخم بھی بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ وہ خوش ہو جائے گا اور یوں بھی ایک عرصہ ہو گیا۔ اپنی فیملی کے ساتھ اس طرح کے پروگرامز بنائے۔“ عاظمہ کی خواہش پر حور یہ انکار نہ کر سکی۔ اس کا خیال تھا وہ سب لاٹنگ ڈرائیو پر چلیں گے، مگر بابر سی سائڈ لے آیا تھا۔

پر شور..... لاتنا ہی سمندر کا ٹھٹھا میں مارتا پانی، حور یہ کی ساری توجہ اپنی جانب کھینچ گیا۔ کئی بیتے مظر لہروں کی طرح اس کی آنکھوں کے سمندر میں اٹھنے لگے۔

حازم کا ہاتھ تھا سے وہ کئی بار ان ساحلوں پر ننگے پیر چلی تھی۔ بے اختیار ہی اس کی نظریں ساحل کی نرم گیلی ریت پر گردش کرنے لگیں۔ اس کے پیروں کے نقش کو تلاش کرنے لگیں۔ اسے لگا وہ اس کے پاس کھڑا ہو۔

”کم آن حازم.....“ دیکھیں کتنا خوب صورت لگ رہا ہے سمندر۔ اسے نزدیک سے دیکھتے ہیں۔“ وہ حازم کا ہاتھ کھینچنے لگی۔ ”ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں ہمارے پیروں سے لپٹنے کو پھیل رہی ہیں، آئیں نا۔“ وہ بھی لہروں کی طرح چل گئی تھی۔

”پاکل لڑکی! دیکھ نہیں رہیں، کتنا تیز ہے پانی۔“ اسے آگے بڑھتے دیکھ کر حازم نے اسے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ ”وہ لہرا کر اس سے آگئی۔

”تیز لہروں سے کھلتے ہیں گئی۔“ اس کا لہجہ دھیمہ تھا۔

”تیز لہروں سے کیلئے کا ہی تو مزا ہے۔“ وہ ہنسی۔

”آ..... جہا..... میری محبت کے سمندر میں اترتے ہوئے تو ڈر جاتی ہو۔ کبھی ہو طوفانی محبت ہے آپ کی۔“

”ذہب تو چمکی ہوں۔“ وہ شرمیلیں پلکیں اوپر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”اور بار لگنے کی خواہش بھی نہیں۔“

”حازم نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا، پھر کوئی شرارت کرنی چاہی کہ وہ اس کی گرفت سے نکل گئی اور دور جا کر ساحل پر اٹھ گئی۔ لہروں کو پیروں سے اچھا لیتے ہوئے مسکرانے لگی۔

آہ..... اس نے ایک گہری سانس کھینچ کر ایک پل کے لیے آنکھیں میچ لیں۔

کس طرح ختم کر سکتے ہیں تم کو یاد کرنا کہ تم کو صرف محسوس کرنے سے ہم دنیا بھول جاتے ہیں

یہ یہ سمندر..... یہ یہ ساحل، مگر..... آج سب کتنا اجنبی اجنبی لگ رہا تھا۔ لہریں جیسے ماتم کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ہر شے نا مانوسی اور اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔

”ساحل پر کھڑے ہو کر سمندر کی گہرائی تاپ رہی ہو کیا؟“ بابر کی آواز ابھری۔ وہ اس کی پشت کی طرف جانے کب سے کھڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں غرق تھی۔ اس کی غیر متوقع موجودگی پر اس کے بدن میں خفیف سا ارتعاش ہوا تھا۔ وہ ٹھٹھک گئی۔ مگر چہرہ اوپر اٹھا کر یا پلٹ کر اس کی طرف دیکھ نہ پائی۔

ساحل سے کیا جان سکو گے
دریا کتنا گہرا ہے

وہ اپنی ٹراؤزر کے گیلے پانچے نیچے کرتا ہوا اس کے سامنے آ گیا۔

”گہرائی کا اندازہ ہے اسی لیے تو..... دور بیٹھ کر دیکھ رہی ہوں۔“

”یہاں سے گہرائی کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔“ وہ اس کے سامنے آ گیا۔ اس کے لبوں کی تراش میں

بہم ہی مسکرا رہی تھی۔ اس لیے تو کمرہ ہی میں اترتا پڑتا ہے۔

حوریہ نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا اور مٹی ہاتھ سے جمائی کھڑی ہو گئی۔ ایک پر شور لہران دونوں کے چہرہ پر آ کر دم توڑ کریت میں جذب ہونے لگی۔

”بھئی ڈوب کر دیکھو۔ ہر گہرائی، موت کا پیغام نہیں ہوتی۔“ حوریہ کا دل سینے کی دیوار میں سکڑ کر پھیلا تھا۔ وہ نظریں اس کی طرف سے ہٹا گئی۔ بلیک پینٹ اور نیلی ٹی شرٹ میں وہ دھوپ کا چشمہ پیشانی پر لٹکائے اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔

ایک پل اسے لگا یہ نظریں بابر کی نہیں، حازم کی ہیں۔ اس کے سامنے بابر نہیں حازم کھڑا ہے۔ اس روز اس نے بھی تو وہی ڈریس پہنا تھا۔ بلیک پینٹ اور نیلی ٹی شرٹ۔ پیشانی پر دھوپ کا چشمہ لٹکائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اسے جھٹکی باندھے دیکھتے ہوئے کھیر رہا تھا۔

”میری محبت کے سمندر میں اتر کر تو دیکھو ڈیر۔ ڈوب کر ابھرنے کی خواہش ختم ہو جائے گی۔“

”اف!“ وہ یکدم بے اختیاری کے حال سے نکل آئی اور اڑتے بالوں کو ہاتھ سے میٹھے ہوئے بولی۔

”میں وراٹھی شاہ کو دیکھ لوں۔ آئی کو تنگ کر رہا ہوگا۔“ وہ پلٹنے لگی۔ بابر ہلکے سے ہٹا کر بھر کر پلٹ کر شور مچاتی لہروں کی

جانب بڑھ گیا۔ حوریہ یک دم کسی خیال سے چونک کر اسی طرف مڑی۔

”سنو“ وہ اس کا ارادہ جان کر اسے پکار رہی تھی۔ ”زیادہ آگے مت جانا۔ پانی بہت تیز ہے۔“ بابر کے کدے اور سن موڑنے پر وہ

بولی۔ بابر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ متفکر سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی نظریں اونچی اونچی لہروں کی جانب تھی۔ ”آج تو پانی بہت چڑھا ہوا ہے۔“ ایک

حیرت آمیز خوش گواریت بابر کے دل کو چھو گئی۔ وہ ان لہروں پر نگاہ ڈال کر جیسے جمر جمری ہی لے کر رہ گئی تھی۔

”مرا تو اسی تیزی میں ہے۔“ چیخ کر رہا ہوا۔ وہ ہلکے سے ہنس دیا اور آگے بڑھنے لگا کہ وہ گھبرا کر بے

اختیار اس کا بازو پکڑ گئی۔

”پاگل ہو گئے ہو کیا۔ ذرا دیکھو لہروں کو کتنی اونچی اونچی ہیں۔“ ادھر بابر کو اپنا پورا جسم دل بن کر دھڑکتا

محسوس ہونے لگا اور دل خون بن کر گویا رگوں میں دوڑنے لگا تھا۔ رگ رگ میں ہجیان رہا ہو گیا تھا۔

”اگر ڈوبنے کی خواہش ہو تو!“ وہ بے اختیاری کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ اس کے اتنے نزدیک تھی اس کا

دھوپ کی تمازت سے سرخ ہوتا چہرہ، اس کی شہرنگ آ نکھیں جن میں ڈوب کر ابھرنے کی خواہش محدود ہو جاتی

ہے۔ اس کے لمس کی پیش۔ وہ کھڑے کھڑے کسی اور جہان میں پہنچ گیا تھا۔

”ساحل منزل نہیں ہے میری۔ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی موجیں تو کتنی اور بڑھاتی ہیں۔“ بابر کا لہجہ دھیمہ اور

سرسرا تا ہوا تھا وہ اس کی طرف جھکا کہہ رہا تھا۔ حوریہ نے جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ دیا تھا اور پیچھے ہٹی گئی۔ بابر بھی

اس سحر سے نکل آیا اور ہلکے سے ہنس کر بولا۔

”تم بھی۔“ بھی یاد کر دو کی کہ تھا کوئی نادان عشق کے سمندر میں ڈوب گیا تھا..... کیا خیال ہے کتنے سر رکھ دو گی نا۔

ایک نامراد عاشق جو عشق کی گہرائیاں نا پتے نا پتے شہید ہو گیا۔“ وہ نیکی لکڑی کی طرح سٹکی تھی اور سٹکتی نظر اس پر

ڈال کر پلٹ کر وہاں سے بھاگتی ہوئی چلی گئی۔

بابر نے اسے پکارنا چاہا، مگر پھر لب پہنچ گیا اور سر کو خفیف سا جھٹکا دیا اور پلٹ کر سمندر کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ دور جا کر ٹراڈز کی جیبوں میں ہاتھ پھنسا کر اپنی نظریں پہاڑ بنائی لہروں پر جمادیں۔

واپسی کا سفر بڑی خامشی سے طے ہو رہا تھا گاڑی میں غیر معمولی خامشی عاصمہ کو بھی محسوس ہوئی۔ تاہم وہ

علی شاہ کے ساتھ ہلکی پھلکی شرارت میں مصروف رہیں۔ بابر کی نظریں وڈا اسکرین پر بھیجیں گویا وہ گاڑی میں

کی موجودی سے بے نیاز ہو، طراس کے ذہن میں ایک انتشار برپا تھا۔

تیرے حسن کی ہے جو دکھی
تیرے لب کے جو یہ گلاب ہیں
میرے خواب ہیں میری زندگی
تیرے ساتھ ہیں جو یہ داہمہ
کئی دوسے ہیں عذاب میں
میں جو آرزو کے سفر میں ہوں
نہ نظر میں ہوں نہ سفر میں ہوں
کئے کس طرح یہ سفر میرا
میں ہوں منزلوں سے پرے کہیں

گاڑی آہستہ روی سے گیلیانی ہاؤس کے پارنگ ایریا میں آ کر رک گئی تھی۔

میں ہوں منزلوں سے پرے کہیں
کسی دشت میں کسی درد میں
تیری راہ کی اڑی گرد میں
مجھے بخش دو دو کراہتیں
جو ہیں منتظر، میرے خواب کی
تجھے جو آرزو ہے دصال کی
مجھے اپنے کل کی خبر کہاں
مجھے فکر ہے تیرے حال کی
تیرے حسن کو نہ کہن گئے
یہ دعا ہے دست سوال کی

اس نے چہرے کا رخ موڑ کر دیکھا۔ عاقلہ اتر چکی تھیں حوریہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اترنے لگی کہ باہر
نے اس کی اشقی نظروں کو اپنی نگاہوں کی گرفت میں لیتے ہوئے دیر سے کہا۔

”بھی نفرت کی یہ دیوار گرا کر دیکھنا۔ اس کے پیچھے محبت کا ایک سمندر موجزن ہے۔“

وہ غیر محسوس طور پر چونک گئی۔ وہ اپنے کہے ہوئے جملے پر اس کے تاثرات جانچ رہا تھا۔ نظریں ملتے ہی
اس نے اپنی پلکوں کا جال کرا دیا تھا یہ اور بات کہ اس لمبائی تصادم نے دونوں کے دل پر انتشار برپا کیا گیا۔ حوریہ
کا دل بے بسی اور بے اختیاری سے چٹختا تھا بار کا دل فطری خواہشوں کے ظالم سے گزرا تھا۔
وہ کسی قسم کا رد عمل ظاہر کیے بنا چپ چاپ گاڑی سے اتر کر پلٹ گئی تھی..... عجیب سرد مہری چپ تھی.....
شاید خود آزاری کی کوئی کیفیت تھی۔

☆☆☆

مومنہ ناشتے کے بعد یاد رعلی کے پاس بہت دیر تک بیٹھی رہی۔ یاد رعلی آدھے سے زیادہ وقت بس حوریہ
کے متعلق ہی باتیں کرتے رہے۔ اس کی فطریں مٹلتے رہے۔

”وہ آپ سے ناراض کب ہے بھلا اور معافی کا کیا سوال.....“

وہ مجھ سے بات نہیں کر رہی ہے کتنے دن ہو گئے ہیں اسے یہاں سے گئے۔ پلٹ کر نہیں آئی، نہ فون کیا ہے اس نے۔ وہ روٹھ گئی ہے مومنہ۔

ایسی بات نہیں ہے اباجی..... دراصل وہ مصروف ہے عاظمہ کی بھانجی کی شادی بھی ہے اس میں مصروف ہو گئی ہوگی۔ ”مومنہ کا بچہ کسلی دیتا ہوا تھا۔

”اچھا چلو خوش ہے اس کا دل لگ گیا ہے تو اچھی بات ہے۔“ یاد علی کے بارش چہرے پر ایک سکون اترنے لگا۔ پھر چوتھے ہوئے بولے۔

”بابر سے بات ہوئی تمہاری۔“

”نہیں۔“ مومنہ ہلکے سے سانس بھر کر سرفی میں ہلایا۔

”کیا کہو گی اسے..... اس نے تم سے کہا تھا ناں۔ تم حوریہ کو سمجھاؤ گی اور سچ تو یہ ہے مومنہ کہ مجھے بابر میں بظاہر کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ عباد کے بعد تو وہ بہت بدل گیا ہے۔ خاصا ذمہ دار اور سنجیدہ ہو گیا ہے۔ مذہب کی طرف بھی اس کا رجحان ہو رہا ہے اور پھر سب سے بڑی بات وہ علی شاہ کے لیے تخلص دکھائی دیتا ہے۔“

مومنہ نے ان کے پاس سے اٹھ کر صوفے پر بکھرے کفن ترتیب سے رکھتے ہوئے سر اثبات میں ہلادیا۔ ”یہ تو ہے۔“

”علی شاہ کا ساگ چاچا ہونے کے ناطے اس کی انیسیت فطری بات ہے۔ حوریہ کو ہر پہلو پر سوچنا چاہیے۔ اتنی پہاڑ جتنی زندگی بھلا اکیلے کٹ سکتی ہے۔“

”میں اسے سمجھاتی ہوں تو وہ برامان جاتی ہے۔“ وہ رنج سے بولی پھر سوچنے لگی کہ ”بابر بھی تو کہیں کہیں غلط ہے۔ بھلا محبت زور جبر سے حاصل ہو سکتی ہے۔“

”تمہاری بات ہو تو اس سے میرا ذکر ضرور کرنا اور ہاں بابر سے بھی کہنا کہ یاد علی یاد کر رہے ہیں اسے۔“

اس نے آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

”رقیہ بھابھی بتا رہی تھیں وہ آیا تھا مگر آپ سو رہے تھے۔ وہ پلٹ گیا۔“ مومنہ چائے کے خالی برتن سمیٹ کرڑے میں رکھ کر کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔

”اچھا.....“ یاد علی کو افسوس ہونے لگا۔ ”مجھے جگایا دیا ہوتا۔ چلو خیر..... اسے کہہ دینا وہ ضرور آئے میرے پاس..... اس کے آنے سے عجیب سا سکون ملتا ہے۔ حازم کی کمی کا جو خلا ہے وہ پر سا ہونے لگتا ہے۔“

یاد علی نے صبح تین بجے کے نیچے سے نکالی اور نیچے پر سر ڈال دیا۔

”وہ تو پوری کائنات تھا۔ اس کی کمی کا جو خلا ہے وہ کہاں پورا ہو سکتا ہے۔“ مومنہ دل میں سوچ کر رہ گئی۔

”رشتوں کی اہمیت کا احساس اکثر ان کے جدا ہو جانے کے بعد ہوتا ہے درخت کٹ جاتا ہے تو دھوپ آگن کو گھیر لیتی ہے تب درخت کی اہمیت کا احساس ہونے لگتا ہے شدت سے۔“ وہ افسردگی کے سحر میں تھے۔

ان کی نظریں چھت پر مرکوز تھیں۔ مومنہ خامشی سے کمرے سے باہر آ گئی۔

کوئی ابر اڑے کسی قلم سے
اور کوئی کڑھتا ہو، کوئی میرے دیرانے پر
کوئی کڑھتا ہو، کوئی میرے دیرانے پر
میرے دیر سے واپس آنے پر
کوئی بیٹھے میرے پہلو میں

کوئی ہا ہا ہا دھڑکے دھڑکے
کوئی دبے دبے لہجے میں کہے
تم نے اب تک بڑے درد سے
چلو تنہا چلنا کھیل نہیں
چلو ساتھ تمہارے چلتے ہیں

وہ صحن میں چلی آئی۔ دھوپ ڈھل رہی تھی سمٹ کر دیواروں پر جا لگی تھی۔ وہ چمپا کے درخت کے نیچے بنی سینٹ کی کیاری پر بیٹھی گئی۔

☆☆☆

باہر کو لگ رہا تھا آسودگی، طمانیت دل کے ہر گوشے سے ہی نہیں شاید اس کی زندگی سے بھی نکل چکی ہے۔ ایک بے کلی اضطراب اور وحشت کا ایک کانٹے دار جنگل اگتا جا رہا تھا جو رگ رگ سے الجھتا جا رہا ہو۔ عقل اور اعصاب دونوں ہی بے دم ہو گئے تھے۔

وہ آفس چیئر پر بیٹھا خود کو گزیرے لمحات کی اذیت آمیزی سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس کی مومنہ سے فون پر بات ہو رہی تھی۔ مومنہ نے اسے فون کیا تھا اور حوریہ کے حوالے سے باتیں کی تھیں۔ مومنہ کے خیال میں ”وہ اپنے باپ عباد گیلانی کی طرح محبت کے غلط نظریے پر کار بند ہے۔“

”میں حوریہ سے بہت محبت کرتا ہوں..... اسے کھونا نہیں چاہتا۔“ اس نے مومنہ کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا تھا۔

”تم نے بھی عباد کی طرح محبت کو فقط پالینے کا نام سمجھ لیا ہے باہر..... چاہے زور سے جبر سے کسی بھی طریقے سے۔“

”ایسا نہیں ہے۔“ باہر نے احتجاج کیا تھا۔

”اگر ایسا نہیں ہے تو اسے ”گیلانی ہاؤس“ میں رکھنے کا کیا جواز۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی مومنہ تلخ ہو گئی۔

جیسے ماضی کا کوئی خیال کانٹے کی طرح سینے میں کھب گیا تھا۔

”وہ گیلانی ہاؤس کو قید خانہ کیوں سمجھتی ہے۔ کیا آپ کو لگتا ہے میں یہ سب کسی انتقامی جذبے سے کر رہا ہوں۔“ باہر کا لہجہ پست تھا۔

”اگر کوئی انتقامی جذبہ نہیں ہے تو پھر یہ سب کیا ہے۔ یہ محبت تو نہیں ہے..... محبت میں تو اپنی انا، ایگو اپنی ذات بھی نکل جائے درمیان سے، تب وہ خالص ہوتی ہے۔ تب وہ مقابل کے دل پر اثر کرتی ہے۔“ باہر کے لہجے کا کھراؤ مومنہ کے لہجے کو نرم کر گیا۔ باہر افسردہ سانس بھر کر رہ گیا۔

”اُسے بہت چاہنے کے۔ اس سے تخلص ہونے کے باوجود۔ مجھے ایسا کوئی ہنر نہیں آتا جس سے میں حوریہ کے دل میں اتر سکوں۔“ چند لمحے توقف کے بعد وہ بے بسی سے ہنسنے لگا۔ ”کیا آپ مجھے ایسا کوئی ہنر سکھا سکتی ہیں کہ میں اس کے دل میں اتر سکوں۔ اس کا دل جیت سکوں۔“ باہر نے کہا تو مومنہ کے دل کو تکلیف دہ احساس چھو گیا۔

”محبت ہنر نہیں خالص پن مانگتی ہے۔“ وہ آزدگی سے گویا ہوئی۔

اسے باہر ایک ایسا اناٹا ڈرائیو محسوس ہوا جس کی نظر منزل پر جلد سے جلد پہنچنے کے لیے فقط اسپید پر تھی راستوں کے پیچ و خم پر نہیں..... اسے باہر سے عجیب طرح کی ہمدردی محسوس ہونے لگی اسے لگا جیسے حازم ایک بار پھر اس کے سامنے آگھڑا ہوا ہوا اچھا کرتا ہوا..... عباد گیلانی کے لیے۔ سرتاپا سوال بنا ہوا.....

”محبت اپنے راستے خود بناتی ہے باہر۔ یہ جبر کے راستوں سے گزر کر نہیں جیتی..... پانی وہیں بہتا ہے جہاں نشیب ہوگا اور زمین جتنی نرم اور شبکی ہوگی پانی اتنی ہی تیزی سے اس پر جائے گا، مگر یہ بات عباد گیلانی کی سمجھ میں تھی

بھی نہ آئی اور جب آئی تب وہ اپنی زندگی داؤ پر لگا چکا تھا۔ محبت ہنر نہیں مانتی۔ خالص پن مانتی ہے اور خالص پن کا دھوا تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ یہ تو وقت خود ثابت کرتا ہے۔ اس کے جذبے کی صداقت کو چٹائی اور خالص پن کو۔
تم حوریہ کو آزاد چھوڑ دو۔ اس پرندے کی طرح جو آسمان کی طرف دیکھتا رہتا ہے اور سوچتا رہتا ہے کہ کب وہ آزاد ہو اور اپنے پر پھیلا کر اپنی مرضی سے اڑان بھر لے۔۔۔۔۔ مگر کوئی عمر بھر نہیں اڑتا رہتا باہر۔۔۔۔۔ گھونسلے میں داپس آتا ہے ہر پرندہ۔۔۔۔۔ وہ بھی تھک جاتا ہے اڑان بھرتے بھرتے۔۔۔۔۔ اسے بھی طلب ہوتی ہے پر سمیٹ کر بیٹھ جانے کی۔ وہ بھی گھونسلے بناتے ہیں، مگر یہ فیصلہ ہمیں اس کے ہاتھ میں دینا ہوگا۔ یہ جو ہمیں کھیلنا ہوگا باہر۔۔۔۔۔“
”اور ہار گیا پھر۔“ باہر کے گجے میں ہزار اندیشے تھے۔ امید اور ناامیدی کی پیہم یلغار سے گھبرایا ہوا بولا۔
”مومنہ افسردگی سے ہنس دی۔“

”ہار کے خوف سے ہی کہیں ”ہار“ نہ جانا باہر گیلانی۔“ اس نے اداسی کے جاں گسل احساس سے ہلکی سانس بھر کر لائن منقطع کر دی۔
باہر نے تڑپ کر موبائل کو یوں دیکھا جیسے کوئی سلگتا انگارہ چمک کر اس کے کانوں میں پڑا ہو اور سینے سے لپٹ گیا ہو۔
اسے اپنی ہٹھیلی ہی نہیں پورا وجود کی ان دیکھی آگ میں سلگتا محسوس ہوتا رہا۔ اس نے موبائل میز پر چمکتی سطح پر پھینکنے کے انداز میں رکھ دیا اور کرسی پر خود کو ڈھیلا چھوڑ کر سیٹ سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں جیسے کسی احساس سے نجات پانے کی کوشش کر رہا ہو۔

☆☆☆

اک جنوں نے معنی اک یقین لا حاصل
کیا ملا ہمیں محسن اس کی آرزو کر کے

باہر آفس سے نکل کر بے مقصد سڑکوں پر گاڑی بھگاتا رہا۔ عجیب بے معنی سی زندگی ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک افسردگی تھی کہ دل و جاں پر کوڑے کی طرح لگ رہی تھی۔ مومنہ کے الفاظ کی سچائی اس کی رگ رگ میں گرم سلاخوں کی طرح گھسی جا رہی تھی۔
اس نے سنکٹل پر گاڑی روک کر سر کیٹ جلائی اور دیرے دیرے کش لینے لگا، مگر یکدم اسے لگا سارا دھواں اس کے سینے میں موجود دل میں بھر رہا ہو۔ جس کا احساس ہونے لگا۔ اسے یوں لگنے لگا جیسے وہ کسی ڈھیر سارے ٹھٹھے دھوئیں کے پاس کھڑا ہو۔ سلگتا ہوا سیاہ دھواں اس کی رگوں میں بھرتا جا رہا ہو۔۔۔۔۔ اس نے سر کیٹ کو دیکھا پھر بجھا کر ٹھٹھے کے باہر یونہی پھینک دی۔

☆☆☆

عجیب موڑ پر ٹھہرا ہے قافلہ دل کا
سکون ڈھونڈنے نکلے تھے وحشتیں بھی گئیں

حوریہ علی شاہ کو بامشکل سلا بانی تھی پھر عشا کی نماز پڑھ کر یوں ہی ٹیئرس میں چلی آئی۔ عاظمہ اسے دیکھ کر خود بھی روم سے نکل کر ٹیئرس میں آ گئیں۔ نیند تو انہیں بھی اب در بدر تک نہیں آتی تھی۔ وہ غصہ کو چائے لانے کو کہہ کر حوریہ کے پاس چلی آئیں۔ ان کے چہرے پر نظر تھا اور اضطرابی انداز میں اس کے ہمراہ ٹیئرس کی ریلنگ

کے پاس کھڑی ہو کر ڈرائیوے کی طرف نگاہیں دوڑاتے ہوئے بولیں۔
 ”بہت رات ہو گئی ہے باہر نہیں آیا ابھی تک۔ حالانکہ اب تو وہ آفس سے سیدھا گھر ہی آ جاتا ہے۔
 دوستوں میں بھی جانا چھوڑ دیا ہے اس نے۔“ حوریہ اپنے خیالات سے چوکی۔
 ”اچھا۔۔۔“ ایک لمحے اس کا دل انجانے خوف سے گزرا۔ ”آپ نے فون کیا۔“
 ”کب سے کوشش تو کر رہی ہوں، مگر نیل جاری ہے وہ ریسیو نہیں کر رہا ہے۔ شاید خود کہیں مصروف ہوگا اور اس کا سلی فون گاڑی داڑی میں پڑا ہوگا۔“ عاظمہ خود ہی سوال اور خود ہی جواب دیتے ہوئے بولیں۔
 ”آپ پریشان نہ ہوں۔ آ جائے گا۔ چلا گیا ہوگا دوستوں دوستوں میں۔“ وہ تسلی دیتے ہوئے بولی۔
 ”ہاں خدا کرے ایسا ہی ہو۔ علی شاہ سو گیا ہے کیا؟“
 ”جی۔ بہت مشکل سے سویا ہے۔ بہت تنگ کر رہا تھا آج تو۔“ حوریہ کرسی پر بیٹھ گئی۔
 ”پریشان تو کرے گا ناں۔ باہر کو جوئیں دیکھا پورے دن اس نے۔“ عاظمہ ہنس دیں۔ ”عادی ہو گیا ہے نا
 اس کا جب تک گھنٹہ دو گھنٹہ باہر کے ساتھ وقت نہ گزار لے اسے چین نہیں پڑتا۔“ حوریہ کے دل پر چوٹی سی
 پڑی۔ ایک اضطراب اس کے دل پر بلکھو رہے لینے لگا۔

یہی بات تو اسے بھی پریشان کر رہی تھی کہ وہ بہت تیزی سے باہر سے مانوس ہوتا جا رہا تھا بلکہ اس کے بنا
 رہنے کو تیار نہیں تھا جب کہ وہ اسے سینت سینت کر خود تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ حازم کی نشانی کی طرح خود میں
 سمیٹ کر رکھنا چاہتی تھی، مگر باہر اس کے لیے یہ سب مشکل بنا رہا تھا۔ وہ تو بچی تھا محبت کی طرف ہی لپکتا تھا۔ اسے
 غصہ باہر پڑتا تھا، مگر وہ باہر کی محبت اور خلوص کی دل سے قائل تھی۔ وہ جانتی تھی کہ باہر علی شاہ کے لیے بے حد
 مخلص تھا اور یہیں وہ بس ہو جاتی تھی۔۔۔۔۔ یہ بے بسی اسے اور مضطرب کر دیتی تھی۔
 ”باہر بہت بدل گیا ہے امیزنگ چیخ آیا ہے اس میں۔“ عاظمہ کرسی پر بیٹھ گئی تھیں اور نفیسہ کے ہاتھ سے
 چائے گاگ لیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ حوریہ چپ رہی۔

”جانتی ہو یہ چیخ تمہاری وجہ سے آیا ہے اس میں۔“ عاظمہ نے کہا تو اس نے نظریں چائے کے کپ سے اٹھا کر
 ان کی طرف دیکھا۔ وہ عجیب محبت سے اسے تنگ رہی تھیں۔ پھر مغموم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔
 ”آہ۔ محبت بھی عجیب ٹانگ ہے۔ بھی جان ڈال دیتی ہے مردہ جسم میں، بھی طوفانوں کا رخ بدل دیتی
 ہے۔ بندے کا دل اپنی محبت میں لے لیتی ہے۔“ عاظمہ نے ایک ہلکی سانس کھینچی۔

حوریہ نے اضطرابی انداز میں لب دانتوں میں دبا کر نگاہوں کا زادہ بدل لیا اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔
 عاظمہ کے چہرے پر افسردگی جھلکنے لگی۔ وہ حوریہ کو ہنسنے لگیں اور اداسی سے بولیں۔
 ”حوریہ۔ ایک بات کہوں مانو گی۔“ حوریہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”تم باہر کو معاف کر دو۔“ وہ ایک لمحے توقف کے بعد بچی ہو کر بولیں۔ ”صرف ایک بار اسے معاف کر دو۔“
 حوریہ کا دل سینے کی چار دیواری میں جیسے لحظہ بھر کے لیے ختم ہو گیا۔ وہ حیرت سے عاظمہ کو دیکھنے لگی تب
 عاظمہ دل گرفتگی سے بولیں۔

”میں سب کچھ جانتی ہوں حوریہ۔۔۔۔۔ اس سے ماضی میں ایک نہیں بہت غلطیاں ہوئی ہیں اور تمہارے ساتھ
 بھی اس نے جو کچھ کیا اور کرتا ہے وہ یقیناً افسوس ناک تھا، مگر اب وہ حقیقتاً نام ہے اور میں بھی نام ہوں یہ سب میری
 کوتاہیوں کا نتیجہ تھا۔“ عاظمہ کے یہ الفاظ حوریہ کے اعصاب پر اثر انداز ہوئے تھے کسی پتھر کی طرح۔ کھٹ سے
 لگے تھے۔ ”وہ علی شاہ سے ہی نہیں تم سے بھی بہت محبت کرتا ہے حوریہ۔“ عاظمہ دل گرفتگی سے کہہ رہی تھیں۔

”تو آپ بھی ہیں میں بھی اس سے محبت کرنے لگوں۔“ وہ ہلکی ناگواری سے بولی۔
 ”معاف تو کر سکتی ہوں اسے۔“ عاظمہ پست سے لہجے میں بولیں۔ ”وہ تم سے محبت نہیں مانگ رہا، مگر تم
 اس کو محبت کرنے کے حق سے محروم تو مت کرو۔“ حور یہ کا چہرہ ہنسنے لگا۔ وہ احساس بے بسی سے سلگ کر رہ گئی۔
 ”ایسی محبت فقط اذیت دیتی ہے آئی جہاں کوئی منزل کا نام نشان نہ ہو۔“ وہ رنج سے بولی۔ ”یہ صحرا کا سفر ہے
 اور صحرائیں خلستان نہیں آتے۔“ وہ یکسر بے کیفیت لہجے میں کہہ کر کرسی سے اٹھنے لگی کہ عاظمہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”حور یہ! یقین کرو۔ وہ بہت بدل گیا ہے۔ تم اسے آزما کر تو دیکھو۔ وہ تمہیں حازم کی طرح ہی چاہے گا۔“
 ”آئی پلیز۔“ حور یہ کا پورا وجود دھنکنے لگا۔ ”سوری، مگر یہ سچ ہے وہ بہت سنسٹر (تخلص) ہے تمہارے
 لیے۔“ عاظمہ اپنی بات پر قائم رہیں۔ وہ باہر کے لیے ہر حال میں یہ جنگ لڑنا اور جیتنا چاہتی تھیں۔
 ”سنسٹر ہے۔“ حور یہ کے لبوں کی تراش میں ایک مجرد مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوتی گئی۔ ایک رنج نے
 اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔ اس نے عاظمہ کی طرف دیکھا اور اسی سرد و سرد کیفیت کے ساتھ بولی۔
 ”وہ اگر واقعی مجھ سے محبت کرتا ہے میرے لیے تخلص ہے تو۔ اسے کہیے وہ مجھے اس قید سے نکال دے۔
 مجھے علی شاہ کے ہمراہ ”گیلانی ہاؤس“ سے جانے کی اجازت دے دے۔۔۔۔۔ مجھے آزاد کر دے۔ اپنی مرضی سے
 جینے کا حق دے دے۔“

”حور۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ کیا کہہ رہی ہو تم۔“ عاظمہ نے تڑپ کر اس کو دیکھا۔
 ”محبت میں انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔“ وہ ہلکے سے ہنسی۔ اس کی ہنسی میں ایک افسردگی تھی، دل گرقی تھی
 بے کاٹ تھی۔ عاظمہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ جیسے تکلفت کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ سارے رنگ نوج لیے ہوں۔
 ”ایسا مت کرو حور یہ۔“ ان کا ہاتھ حور یہ کے ہاتھ پر کانپ سا گیا۔ دوسرے ہل وہ اس کا ہاتھ اپنے لرزے
 فہم میں لے کر اضطرابی انداز میں دباتے ہوئے بولیں۔

”ایسا مت کرنا حور یہ۔۔۔۔۔ ایسا مت کرنا۔۔۔۔۔ میں۔ میں باہر کو ٹوٹے بکھرتے نہیں دیکھ سکوں گی۔ پلیز
 رہیے۔۔۔۔۔“ ان کی آنکھوں میں ایک وحشت بھرا آئی۔ وہ خوف زدہ نظروں سے حور یہ کو یوں دیکھنے لگیں جیسے کوئی
 تویل قاتل کو دیکھ رہا ہو۔ حور یہ کے لیے ان کا یہ رد عمل خاصا اعصاب شکن ثابت ہو رہا تھا۔ عاظمہ اس کا ہاتھ
 زبردستی پکڑیں۔

”میرے پاس اب کچھ نہیں رہا حور یہ۔۔۔۔۔ حازم اور عباد بھی چلے گئے۔ سینہ اور لائے بھی مجھ سے خفا ہیں۔ تم
 علی شاہ چلے جاؤ گے تو میں اس کو بھی میں اکیلے مر جاؤں گی اور باہر۔۔۔۔۔ باہر تو اس دنیا سے ہی کٹ جائے گا۔ وہ
 کٹ جائے گا دنیا کی اس رونق سے حور یہ۔۔۔۔۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رو پڑیں۔ کب کا دبالا ہوا تھا
 ایک دم بے نکلا تھا۔

”باہر ٹوٹ جائے گا حور یہ۔۔۔۔۔ وہ ٹوٹ جائے گا۔ میں اسے جوڑ نہ پاؤں گی۔ میں عباد کو بھی عمر بھر مومنہ کے
 سے نہ نکال پائی۔۔۔۔۔ میں باہر کو بھی تمہارے غم سے نہیں نکال پاؤں گی۔“
 ”پلیز گاڈ سیک۔ چپ ہو جائیے۔“ حور یہ تکلیف سے کراہی اور وحشت زدہ نظروں سے عاظمہ کو دیکھا پھر
 اس نے ان کے ہاتھ کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہٹی۔

”آپ کیوں چاہتی ہیں کہ میں یہ سزا سہی رہوں۔ آخر کس بات کی سزا سہی رہی ہوں میں۔۔۔۔۔“ وہ دکھ اور
 محبت سے چھٹتے ہوئے بولی۔

”اسے کہیے مجھے اس زندان سے نکلنے کی اجازت دے دے اور میری یہ سزا ختم کرے۔ جو بلا تقصیر میں سہی
 ہوں۔“ وہ رنج سے بولی۔

”اور میری سزا..... وہ کب ختم ہوگی۔“ باہر کی آواز ابجری۔ وہ جانے کب ٹیرس کے دروازے پر کھڑا تھا۔
حور یہ اور عاظمہ دونوں نے ہلکے دقت رخ موڑا تھا۔

”اور میری یہ سزا کب ختم ہوگی حور یہ۔“ باہر اندر آ گیا اور چلا ہوا حور یہ کے سامنے آ کر رک گیا۔ اس کے
چہرے پر غیر معمولی سرخی تھی جو اندر دنی خلفشار اور ضبط کی تھی۔

”میری پیشانی سے یہ داغ کب اور کیسے دھلے گا۔ یہ تذلیل کا دھما کیسے مٹے گا اور کتنے برس لگیں گے خود کو ایک
بہتر انسان ثابت کرنے میں۔ تاؤ؟“ ایک چمکی سی ہنسی اس کے لبوں پر نکھر گئی۔ وہ مجرد نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
”تمہارے دل تک پہنچنے کے لیے یقیناً میری ابردوز غلطی مگر میری محبت نہیں۔ میں فقط تمہیں نکالوں
کے سامنے دیکھنا چاہتا تھا کسی ہوس کے لیے نہیں، تمہاری چاہ میں۔ غلط کیا میں نے..... مگر۔ دقت کے ساتھ
احساسات پدلتے محسوس تم ضرورت بنتی کہیں۔ پھر علی شاہ اور تمہیں خوش دیکھنے کی دھن ہونے لگی۔ شاید یہ محبت کی
پہلی اسچ ہوئی ہوگی جب محبوب کا دل جیتنے کی کوشش کی جاتی ہے۔“ وہ دکھ کے گہرے احساس سے مسکرایا، مگر اس
کی مسکراہٹ کا ساتھ اس کی آنکھیں نہیں دے پاسکیں..... وہاں افسردگی کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ عاظمہ کرب سے
اپنی جگہ کھڑی باہر کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔

”اور محبت کی آخری اسچ کیا ہوتی ہے جانتی ہو۔“ باہر کی آنکھیں آہستہ آہستہ تھمتانے لگی تھیں۔ ان کے
زیریں کنارے سرخ ہو رہے تھے۔ اس کی ستواں ناک کے نتھنے ذرا سا پھول کر پھر سکرے تھے۔ اس نے حور یہ
کے پھرائے ہوئے وجود پر نگاہیں جماتے ہوئے دل گرفتگی سے کہا۔
”اپنی یہ خوشی، خواہش ہر آرزو کا گلا گھونٹ کر محبوب کی خوشی خود پر لازم کر لے۔ اس کی ہر قاتل خواہش
بھی مان لی جائے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے حور یہ کو یوں دیکھا جیسے کوئی اپنے ہاتھ سے بے حد قیمتی متاع بھونے جا رہا ہو اور اسی
کھودنے کے احساس سے چور ہو کر اسے تنگ رہا ہو، مگر یہ پہچان لمحہ بھر کے لیے تھا۔ وہ نظروں کا زادیہ بدل گیا۔
احساس کی لو پیچھے کر لی اور مستحکم لہجے میں بولا۔

”بولو حور یہ..... آج تمہاری خوشی سے میرا دل بندھا ہوا ہے..... تم جانا چاہتی ہو یہاں سے تو جاؤ.....
جہاں رہنا چاہتی ہو رہو..... مجھ سے نفرت کر کے خوش ہوتی ہو تو..... بہت نفرت کر دو۔“
حور یہ دنگ سی رہ گئی تھی۔ کسی بھی طرح کے رد عمل کے قابل نہ رہی تھی۔ باہر کے چہرے کی بڑھتی سرخی سے
اسے خوف آنے لگا۔ اس کے الفاظ کسی تیر کی طرح اس کے سینے میں کھب گئے۔ وہ تڑپ بھی نہ سکی۔ ادھر عاظمہ
دکھ اور صدمے سے باہر کی طرف بڑھنے کی کوشش میں ذرا سا لرزہ کھڑا کی۔

”میں حازم تو نہیں ہوں کہ مجھ سے ملتے ہی محبت ہو جائے، میں اس جیسا نہیں ہوں۔ میں اس جیسا ہو ہی
نہیں سکتا۔ اس کی فطرت میں پاکیزگی، سچائی اور محبت تھی۔ جب کہ میں نے اپنے اندر یہ ساری کوالٹیٹیز
(خوبیاں) پیدا کرنے کی کوشش کی ہیں منسلک ریاضت سے اور شاید تمہیں متاثر کرنے میں ناکام ہو گیا ہوں۔ پھر
میں بھلا اس جیسا کیسے ہو سکتا ہوں۔“ یک دم پلٹا اور ٹیرس سے باہر نکل گیا۔ حور یہ پھر انی نظروں سے اسے جاتا
دیکھتی رہی۔

کچھ الفاظ بھی ایسے تیر ہوتے ہیں جو دل میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ تڑپ بھی نہیں سکتے۔ خون بھی نہیں
رستا۔ بندہ مرتا بھی نہیں ہے اور مرتا بھی جاتا ہے
اس میں پلٹ کر عاظمہ کی طرف دیکھنے کا بھی یار نہیں تھا جو کرسی پر بیٹھ کر بے آواز رو رہی تھیں۔

(بانی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



ہیں۔“ دختر ہلاکو نے عالم کو اپنے سامنے لا حاضر کیا گیا۔ شہزادی مسلمان عالم سے سوال کرنے لگی۔ ”کیا تم لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے۔“

عالم! ”یقیناً ہم ایمان رکھتے ہیں شہزادی۔“ شہزادی! ”کیا تمہارا ایمان نہیں اللہ جسے چاہے غالب کرتا ہے؟“

عالم! ”یقیناً ہمارا اس پر ایمان ہے۔“ شہزادی! ”تو کیا اللہ نے آج ہمیں تم لوگوں پر غالب نہیں کروایا ہے؟“

عالم! ”یقیناً کر دیا ہے۔“ شہزادی! ”تو کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ خدا ہمیں تم سے زیادہ چاہتا ہے؟“

عالم! ”نہیں۔“ شہزادی! ”کسے؟“ عالم! ”تم نے بھی چرواہے کو دیکھا ہے کہ ریوڑ کے پیچھے چرواہے نے اپنے کچھ کتے بھی رکھ چھوڑے ہوتے ہیں۔ اچھا تو اگر کچھ بھیڑیں چرواہے کو چھوڑ کر کسی طرف کو نکل کھڑی ہوں اور چرواہے کی سن کر دینے کو تیار ہی نہ ہوں، تو چرواہا کیا کرتا ہے؟“

شہزادی! ”وہ ان کے پیچھے اپنے کتے دوڑاتا ہے، تاکہ وہ ان کو واپس اس کی کمان میں لے آئیں۔“

عالم! ”وہ کتے کب تک ان بھیڑوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں؟“

شہزادی! ”جب تک وہ فرار رہیں اور چرواہے کے اقتدار میں واپس نہ آجائیں۔“

عالم! ”تو آپ تاتاری لوگ زمین میں ہم مسلمانوں کے حق میں خدا کے چھوڑے ہوئے کتے

اللہ تعالیٰ کے جواب بذریعہ قرآن میں نے کہا: ”تیری مدد کیسے ملے گی یا رب!“ جواب ملا: ”مہر اور نماز سے مدد لیا کرو۔“

(البقرہ، 45) میں نے کہا: ”میں بہت گناہ گار ہوں۔“ جواب ملا: ”اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ سب گناہ بخش دے گا۔“ (الزمر، 53)

میں نے کہا: ”میرے دل کو سکون نہیں ہے۔“ جواب ملا: ”اللہ کی یاد سے ہی دلوں کو سکون اور اطمینان ملتا ہے۔“ (الرعد، 28)

میں نے کہا: ”مجھے کوئی یاد نہیں کرتا۔“ جواب ملا: ”تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔“ (البقرہ، 152)

پانچ سوال حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قیامت کے دن ابن آدم کے پاؤں (اپنی جگہ سے) نہیں ٹپکیں گے تا وقتیکہ اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں سوال نہ کیا جائے، اس کی عمر کے بارے میں کہ اس کو کس چیز میں مغموا یا؟ اور اس کی جوانی کے بارے میں کہ کس چیز میں ضائع کیا؟ اور اس کے مال کے بارے میں اسے کہاں سے کمایا اور کس چیز میں خرچ کیا؟ اور یہ کہ اسے جو علم حاصل ہوا اس پر کیا عمل کیا؟“

ہلاکو خان کی بیٹی بغداد پر تاتاری فتح کے بعد، ہلاکو خان کی بیٹی بغداد میں گشت کر رہی تھی کہ ایک جھوم پر اس کی نظر پڑی، پوچھا۔ ”لوگ یہاں کیوں اکٹھے ہیں؟“

جواب آیا۔ ”ایک عالم کے پاس کھڑے

بغداد پر تاتاری فتح کے بعد، ہلاکو خان کی بیٹی بغداد میں گشت کر رہی تھی کہ ایک جھوم پر اس کی نظر پڑی، پوچھا۔ ”لوگ یہاں کیوں اکٹھے ہیں؟“

جواب آیا۔ ”ایک عالم کے پاس کھڑے

ہیں۔ جب تک ہم خدا سے پیسے بھاڑے رہیں گے

آثار بڑھایا

1۔ جب آپ بالوں میں کھنکھرنے کے بجائے ان سے اپنا سچ چھپانے لگتے ہیں۔

2۔ جب آپ کا بیٹا آپ کی تھوڑی بہت عزت کرنے لگتا ہے۔

3۔ جب آپ کے کپڑے آپ کو فٹ نہیں آتے اور تراش خراش کی ضرورت کپڑوں کو نہیں آپ کو ہوتی ہے۔

4۔ جب فون پر نسوانی آواز کہتی ہے، مجھے پہچانا اور آپ نہیں کہہ کر ریلوے روک دیتے ہیں۔

5۔ یہ خواہش کہ کاش ہم اسی سال پیدا ہوتے اور رفتہ رفتہ اٹھارہ سال کے ہو جاتے۔

6۔ جب آپ کو یہ پوچھنے سے پہلے کہ اپنی عینک کہاں بھول گئے۔ اپنی بیسی اور آلہ سماعت کی ضرورت پڑتی ہے۔

7۔ جب آپ اپنے موزے کی شکلیں درست کرنے کے لیے جھکتے ہیں اور آپ کو پتا چلتا ہے کہ موزے تو آپ نے پہنے ہی نہیں۔

فوزیر میرٹھ، ہانیہ عمران..... سحرات

پیار کی حقیقت

ایک لڑکی نے ایک بزرگ سے پوچھا۔ ”پیار کی حقیقت کیا ہے؟“

بزرگ نے کہا۔ ”باغ میں جاؤ اور جو سب سے خوب صورت پھول ہو وہ توڑ کر لاؤ۔“

لڑکی ایک دن بعد واپس آئی اور کہا۔ ”میں پھول دیکھتی رہی، ایک پھول سب سے خوب صورت تھا، مگر میں اس سے بہتر کی تلاش میں چل پڑی، مگر کوئی پیارا نہیں لگا اور جب لوٹ کے آئی تو اسے کوئی اور توڑ چکا تھا۔“

بزرگ نے کہا۔ ”پیار کی یہی حقیقت ہے۔ جو سامنے ہو اس کی قدر نہیں کی جاتی اور جب واپس لوٹو تو وہ کسی اور کا ہو جاتا ہے۔“

شاہنواز..... کراچی

اور اس کی اطاعت اور اس کے بیچ پر نہیں آجائیں گے، تب تک ہمارا امن، چھن تم ہم پر حرام کیے رکھو گے، ہاں جب ہم خدا کے در پر واپس آجائیں گے، اس دن کام ختم ہو جائے گا؟“

مسلمان عالم کے اس جواب میں آج ہمارے لیے غور و فکر کے لیے بہت کچھ پوشیدہ ہے۔

افشاں سیح..... کراچی

بابے شاہ

پتھر ذہن گلاب نہیں ہوندے

کورے کاغذ کتاب نہیں ہوندے

جے کر لئی باری بھلیا

فریاراں نال حساب نہیں ہوندے

حافظ رملہ مشتاق..... حاصل پور

ابوالکلام آزاد

☆ انسان کی سب سے بڑی عقل مندی عبرت پذیری ہے، مگر سب سے بڑی غلطی غفلت اور اغماز ہے۔

☆ اگر سچائی کو اس کی اصل ضرورت کے وقت پیش نہ کیا جائے تو اس کے وجود کا اعتراف بے کار ہے اور چراغ جلانے کا اصلی وقت غروب آفتاب کے بعد آتا ہے، نہ کہ پچھلے پہر۔

☆ زبان کی بکار ضائع جاسکتی ہے، پر عمل کی صدا کبھی جواب لیے بغیر نہیں رہتی۔

☆ حسن، خوشبو، نغمہ اور زیب و آرائش الگ الگ نام ہیں، لیکن حقیقت صرف ایک ہی نغمہ ہے، یعنی عدل و اعتدال۔

☆ حسن، خوشبو، نغمہ اور زیب و آرائش الگ الگ نام ہیں، لیکن حقیقت صرف ایک ہی نغمہ ہے، یعنی عدل و اعتدال۔

فضانور..... ردھری

پروردہ

ایک بیٹی نے اپنے والد سے پوچھا۔ ”ابا جان! میں جسم کے کتنے حصے کا پردہ کر دوں؟“

باپ نے بڑا اچھا جواب دیا۔ ”بیٹی! جسم کے جتنے حصے پر جنم کی آگ برداشت کر سکو اتنا کھلا چھوڑ دو، باقی کا پردہ کر لو۔“

فاجرہ بٹول اعوان..... موزہ دھمال

اچھی نصیحت

ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی تو میں نے گزارش کی کہ ”کچھ نصیحت کیجیے۔“ انہوں نے عجیب سوال کیا۔ ”کبھی برتن دھوئے ہیں؟“

میں ان کے سوال پر حیران ہوا اور جواب دیا کہ ”جی دھوئے ہیں۔“

پوچھنے لگے۔ ”کیا سیکھا؟“
میں نے کہا۔ ”اس میں سیکھنے والی کیا بات ہے؟“

وہ مسکرائے اور کہنے لگے۔ ”برتن کو باہر سے کم اور اندر سے زیادہ دھونا پڑتا ہے۔“

عابدہ مختل..... بھیر کنڈ مانسمہ

محبت کیا ہے

وکیل نے کہا..... ہمارا ہوا مقدمہ
ادیب نے کہا..... ادھوری کہانی
ڈاکٹر نے کہا..... روح کا کینسر
اداکار نے کہا..... محض ڈراما
طالب علم نے کہا..... ایک مشکل امتحان
مسافر نے کہا..... ایک لا حاصل سفر
فقیر نے کہا..... سوائے دکھوں کے کچھ بھی نہیں
مالی نے کہا..... مزا ہے زندگی کا محبت
اقرا عزیز..... نامعلوم

ابھمن

مجھے خوف ہے
وہ نباہ کے کسی سر ملے پہ
یہ آ کے کہہ دے اب نہیں
میرے دل کو تیری طلب نہیں
(نوٹی گیلائی)

شازیہ اعجاز..... فیصل آباد

☆☆

ریا نور رحمان..... لراہی

سا لگرہ

ایک صحافی شاہراہ عظیم اشان سے گزر رہا تھا کہ سچ سڑک پر واقع ایک گڑھے کے گرد اس نے چند افراد کو ناچنے گاتے دیکھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے فور میں سے پوچھا۔
”کس کی شادی کی خوشیاں منارہے ہو؟“

”جی نہیں۔“ فور میں نے جواب دیا۔ ”ہمارا تعلق کے ایم سی سے ہے اور ہم اس گڑھے کی ساتویں سالگرہ منارہے ہیں۔“

اقرا جٹ..... منجن آباد

دانائی کی باتیں

مسجد میں رہ کر اپنی جوتیوں کی ٹکڑیوں میں رہنے سے گلیوں میں آوارہ پھرتے ہوئے خدا کو یاد رکھنا بہتر ہے

(ڈاکٹر علی شریعتی)

☆ بوجھ میں اگر محبت نہ ہو تو وہ بے شک ایک ٹکٹے کا ہو، برداشت نہیں ہوتا۔

(مستنصر حسین تارڑ)

☆ ستارہ کا ایک تار ٹوٹ جائے تو راگ بے ہنگم ہو جاتا ہے اور جب تک ایک انسان بھی ناخوش ہے، سماج خوش نہیں ہو سکتا۔

(کرشن چند)

☆ دنیا میں بھونکنے والے کتنے بہت ہیں۔ جینا چاہتے ہی تو ان کی آواز نہ سننے کی صلاحیت پیدا کریں۔

(ممتاز مفتی)

☆ زندگی کے چشمے پر اپنی گامگر بھرنے کے لیے ٹھکانا پڑتا ہے۔ بعض اوقات کنارے پار زانو ٹیکتے پڑتے ہیں۔ لیکن ہم اپنی گامگر بھرنے کے لیے جھکنے کا فن بھول گئے ہیں، ہماری انا ہمیں جھکنے نہیں دیتی۔

(اشفاق احمد)

☆ بیوی اور ڈاکٹر کی چپ اچھا شگون نہیں ہوتی۔

(ڈاکٹر پولس بٹ)



وہ بے کیفی کا عالم ہے کہ دل یہ پاہتا ہے
کہیں روپوش ہو جاؤں یا جانک غامشی ہے
سکون خانہ دل کے لیے کچھ گفت گو کر
عجیب ہنگامہ میرا ہے تری لب بستگی سے

کوئی خوش فکر سنا تازہ سخن بھی دیمان رکھ
کہاں تک دل کو پہلا غل میں تیری دکھتی ہے
ایسی عرفان آنکھوں کو بہت کچھ دکھتا ہے
تہیں بے رنگ کہوں لگے لگاہے یہی ہے

حافظہ ملے مشتاق، کی ڈائری میں تحریر
علامہ اقبال کی غزل
تیرے عشق کی انتہا پاہتا ہوں
میری سلوکی دیکھ کیا پاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدہ بے حجابی
کوئی بات میرا آتما پاہتا ہوں
یہ جنت مبارک رہے نادر دل کو
کہ میں آپ کا سامنا پاہتا ہوں
درا ما تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی کہ ترقی مستنا پاہتا ہوں

ماورا طلحہ، کی ڈائری میں تحریر
عین بیویاں کی غزل
خیر کیا محی نہ ملنے کے تھے اسباب کر دے گا
وہ کر کے خواب کا وعدہ مجھے بے خواب کر دے گا

کسی دن دیکھنا وہ آکے میری کشت ویراں پر
اپنی سی نظر ڈالے گا وہ شاداب کر دے گا
وہ اپنا حق سمجھ کر قبول جائے گا ہر حاصل
پھر اس رسم انا کو داخل آداب کر دے گا
نہ کرنا زعم اس کا طرزا حلال یہ ہے
کہ نقی سنگ کو تحریر موج آب کر دے گا

نمرہ، اقرا، کی ڈائری میں تحریر
عرفان ستار کی غزل
بتاتا ہے مجھے آئینہ کیسی بے رخی سے
کہ میں محروم ہوتا جا رہا ہوں دشمنی سے

کسے الزام دہل میں راہیگاں ہونے کا پتہ
کہ سارے فیصلے میں نے کیے خود ہی غرضی سے
مجھے کل تک بہت خواہش تھی خدے گنگو کی
میں چھپتا پھر رہا ہوں آج اپنے آپ ہی سے

کبھی کسی دلی غمزداری مجھ کو دے چالی صدائے دستک
کبھی عبادت کی کیفیت میں نہیں میرا بھی گمان گزرا
تمہارے مجھ کو دعا سے میرا بھی دھیان گزرا
کبھی تمہارے بدن پہ بھی تنہا، عذاب میں کر
کبھی غمزداری ہے
کبھی مجھ کو دل یہ چاہتا ہے سوال پوچھوں

مگر میں چپ ہوں
ہمارے مابین یہ جو دیوار اجنبیت ہے یہ غنیمت
اسی میں تو قیر حرف و لب ہے
یہیں پہ ترک و طلب کی حد ہے

گردیا شاہ، کی ڈائری میں تحریر
احمد ندیم قاسمی کی غزل

اندھیری رات کو یہ معجزہ دکھائیں گے ہم
جراخ اگر نہ ملا، اپنا دل جلائیں گے ہم

تمہاری کوہ کنی کے ہیں مختلف معیار
پہاڑ کاٹ کے رستے نئے بنائیں گے ہم

جو دل دکھائے تو یہ عزم بھی لاپتہ میں
تمام عمر کسی کا نہ دل دکھائیں گے ہم

بہت نڈھال ہیں تو سنا تو لیں گے لے دوں
اُلجھ گیا کہیں دامن تو کیوں چھڑائیں گے ہم

اگر ہے موت میں کچھ لطف پس تو اتنا ہے
کہ اس کے بعد خدا کا سراغ پائیں گے ہم

ہمیں تو قیر بھی تنہا نہ کر کے گی تدبیر
کہ ہر طرف سے زمیں کو قریب پائیں گے



کوئی دم کا مہاں ہوں بسے اہل عقل
جراخ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دوں
بڑے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

شبانہ الطاف، کی ڈائری میں تحریر
ناصر کاظمی کی نظم

اک بات کہوں گر سنتے ہو
تم مجھ کو اچھے لگتے ہو

کچھ چنل سے
کچھ چپ چپ سے

کچھ باغ میں پائیں گے ہو
پرے چاہنے والے اند بہت

پریم میں ہے اک بات بہت
تم اپنے اپنے لگتے ہو

تم مجھ کو اچھے لگتے ہو
یوں بات بات پر کہو جانا

کچھ کہتے کہتے ترک جانا
تم کس اطمین میں رہتے ہو

اک بات کہوں گر سنتے ہو
تم مجھ کو اچھے لگتے ہو

سیدہ نسبت زہرا، کی ڈائری میں تحریر
منوہر جیل کی نظم

خلش،

کبھی کبھی دل یہ چاہتا ہے
تمہاری خاموشی کا احوال پوچھوں

سوال پوچھوں
کہ فکر و زما میں کیسی گزری

یونہی کبھی میرا نام کیا تمہارے ہونٹوں پہ اک پل کو
میری محنت کی یاد ہم کی کبھی تمہارے بھی دانتوں میں



شینہ اسلم
 روٹھو اگر مجھ سے تو یہ ذہن میں رکھنا
 منانا عادت نہیں ہماری اور بدنامی نہ ہونے
 زہر اعجاز
 ایک ہی شخص یہ لٹا دیتے ہیں جو زندگی لہنی
 ایسے لوگ اب کتابوں میں ملا کرتے ہیں
 رہنا لگن
 تریب رہی ہے ہر ایک تمنا
 نہ تم سے ملنے نہ ایسا ہوتا
 بجھی بجھی سی ہے دل کی دُنا
 نہ تم سے ملنے نہ ایسا ہوتا
 سو فیادانی
 مجھ سے بچھڑ کر اب وہ خوش رہتا ہے
 افسوس کہ میں نے اس کی خوشی میں کبھی نہ
 عریلہ نور
 جو بات ہم کہہ نہیں سکتے اسے ہم فرح کہتے ہیں
 چلو ہم فرح کرتے ہیں ہمیں تم سے محبت ہے
 ثنا شہزادہ
 نہیں نگاہ میں منزل تو جیتو ہی سہی
 نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی
 مہر عن جاوید
 دشمنی میں کہاں وہ ہوتے ہیں
 دوستی میں جو وارہ ممکن ہیں
 قرآنہ سرود
 کچھ تو ہوں گی محبت کی مجبوریاں
 کون سہتا ہے ورنہ کسی کے ستم
 صبا حبت
 لوگ کہتے ہیں کہ محبت ایک بار ہوتی ہے
 میں جب جب اسے دیکھتا ہوں مجھے یاد یاد ہوتی ہے

شاد زہر احمد
 آئے قریوں کر مجھے ہمیشہ تھے مہربان
 مجھے قریوں کر مجھے کبھی آشنا نہ تھے
 مریم ناز
 یہ کیا انداز ہے میں کس عجب قرار میں ہوں
 تو آ کے یا بھی چکا ، میں انتظار میں ہوں
 سونیا خان
 پریش کی تمنا ہے مگر ہائے ری مجبوری
 صنم جس سے تراش جائے وہ پتھر نہیں ملتا
 لینی خالد
 دل میں افسوس اکھوں میں غمی سی باقی ہے
 زندگی میں شاید کوئی کمی سی رہتی ہے
 مجھ سے رومہ جاتے ہیں اکثر اپنے دُعا
 شاید میرے غلوں میں کمی سی رہتی ہے
 عذرا ناصر، اقصی ناصر
 کہہ رہا ہے خود دریلے سے خود کا سکوت
 جس میں جتنا ظف ہے وہ اتنا ہی خاموش ہے
 منورہ اقرار
 جو یقین کی راہ پہ چل پڑے
 انہیں منزلوں نے پناہ دی
 جنہیں دوسروں نے قہر ڈرا دیا
 وہ قدم قدم پہ پہک لگتے
 نصہ نور
 وہ بے وفائے تھا تو نہ ہی بدنام ہو گیا
 ہزاروں جاہنے والے تھے جس سے وفا کرتا
 انوش ایضاد
 میری نظروں سے تیرے دوپ کے الاؤ تک
 بھیجی ہوئی ہے اتنا مرفحہ محرموں جیسی
 تشکیل فاضل کٹ بھی گئے تو کیا حاصل
 میں بے قرار مستبد وہ ساحلوں جیسی

میری منزلیں بھی عجیب تھیں، میرا فیض بھی کمال پر
 کہیں سب کچھ ملا بنا طلب، کہیں کچھ نہ ملا سول پر
 عذابا ہر
 کہیں حیات کی ضامن، کہیں وسیلہ موت
 نگاہ و یار تیرا بھی کوئی اعتبار نہیں
 اتنی ناصر
 اک جنوں بے معنی، اک یقین لاماصل
 کیا ملا ہمیں محنت اس کی آرزو کے
 صدف حیران
 جانتے تھے دونوں ہم اس کو خفاستے نہیں
 اس نے وعدہ کر لیا، میں نے بھی وعدہ کر لیا
 ثنا کاشف
 تو مجھے اپنے پاس لکھ لے
 مجھ سے رخصت نہیں ہوا جاتا
 عابدہ نثار
 تعلق بعد میں تبدیل ہو کر جو بھی رہ جائے
 محبت سے وہ پہلا مسکرا نا یاد رہتا ہے
 کسی کی لاکھ باتیں ایک پل میں بھول جاتی ہیں
 کسی کا ایک جملہ بھی پرانا یاد رہتا ہے
 سیما کنول
 سنا ہے کوئی ادھی چاہنے لگا ہے نہیں
 مجھے بڑھ کر اگر چاہے تو اسی کا ہر سنا
 نادیر، عطی
 کچھ الگ تھا کہنے کا انداز ان کا
 کہ سنا بھی کچھ نہیں کہا بھی کچھ نہیں
 کچھ اس طرح بیکھرے ان کے پیار میں ہم
 کہ تو ابھی کچھ نہیں اود بچا بھی کچھ نہیں
 مسرت غافلہ
 زندگی کے سونے میں دیر کتنی گنتی ہے
 محنت کو بگڑنے میں دیر کتنی گنتی ہے
 اس کے بات بات پر روٹھ جاتے ہیں
 ہمیں آدھلے میں دیر کتنی گنتی ہے

وہ عمر جس میں ہمیں خود سے ملنا جانا تھا
 وہ عمر صرف تری جستجو میں کر دی ہے
 ادم کمال
 راز دل نہ سنا نا کسی کو سنا
 دنیا میں سب ہم راز بدل جاتے ہیں
 کسی سے پھر نہ ملے کوئی سرفراز جاتا
 ہاں مگر جینے کے انداز بدل جاتے ہیں
 مریم انیس
 کہنا دیر تجھے دیکھتے رہنے کی سزا ہے
 کھنکھ تو مری آٹھ میں پہلے ہی پڑا ہے
 شانہ امجد
 اس قدر تیس مسلسل شدتیں جدائی کی
 آج پہلی بار میں نے اس سے وفا کی
 میر قفس میں شیدا تھا قیدوں کا اوجھا
 دیکھنا آزادے کا پھر خبر رہائی کی
 سوز یا شاہ
 جو یقین کی راہ پہ چل پڑے
 انہیں منزلوں نے پناہ دی
 جنہیں دوسروں نے آڑا دیا
 وہ قدم قدم پہ بہک گئے
 شفق افکار
 خاموش فضا تھی کہیں سایہ بھی نہیں تھا
 اس شہر میں ہم سا کوئی تنہا بھی نہیں تھا
 کس جگہ میں چھٹی گئی مجھ سے میری بچی
 میں نے تو کسی کا دل دکھایا بھی نہیں تھا
 مددہ بتول
 میرا زار ٹکڑوں تو، آوارگی کی تہمت
 تنہائی میں بیٹھوں تو، الزام محبت
 ملتان

کچھ موتی چنے ہیں

ادار

نشیب و فرار

انسان کی زندگی میں بہت سے نشیب و فرار آتے ہیں اور انسان کو اس کا مقابلہ ہمت سے کرنا چاہیے، لیکن افسوس کہ یہ انسان کی کم ہمتی ہے کہ وہ آسودگی میں تو بہت اطمینان سے رہتا ہے، لیکن تھوڑی سی تکلیف آئے تو انسان کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور وہ دغنی دباؤ کا شکار ہو کے ہاتھ پیر چھوڑ دیتا ہے۔

(صائمہ اکرم چوہدری، دیمک زدہ محبت)
فضہ نور، رد ہڑی

تلخ سچائی

زندگی کی بدترین صورت حال جانتے ہو کون سی ہوتی ہے۔ دو پیاروں میں سے ایک کو چننا۔ اور دو میں سے ایک کو چھوڑ دینا۔ ہاں اور اس سے بھی بدترین وہ سچائی ہے جس میں جسے چنا ہو اس کے ساتھ خوش نہ رہ پانا۔

(سمیر احمد..... یارم)

بنت مشتاق۔ حاصل پور

استغفار

بنی اسرائیل کو شہر کے دروازے میں داخل ہونے سے قبل بخشش مانگنے کا حکم ملا تھا وہ گندم مانگتے رہے بخشش نہیں مانگی یہ بنی اسرائیل کی ریت تھی اور یہی ریت خود اس نے بھی دہرائی تھی۔ ہم زمانہ جاہلیت سے دور اسلام میں آ کر ایک ہی دفعہ توبہ کر لیتے ہیں ہماری عمر پھر عمل صالح تو کرتے رہتے ہیں مگر بار بار کی توبہ بھول جاتے ہیں ہم ایک کھائی سے بچ کر سمجھتے ہیں کہ زندگی میں پھر کبھی کھائی نہیں

آئے گی اور اگر آئی تو بھی ہم بچ جائیں گے ہم ہمیشہ نعمتوں کو اپنی نیکیوں کا انعام سمجھتے ہیں اور مصیبتوں کو گناہوں کی سزا۔ اس دنیا میں جڑا بہت کم ملتی ہے اور اس میں امتحان بھی ہوتا ہے۔ نعمت شکر کا امتحان ہوتی ہے اور مصیبت صبر کا زندگی کے کسی نئے امتحان میں داخل ہوتے ہی منہ سے پہلا کلمہ، حطیہ، کا نکلتا چاہیے مگر ہم وہاں بھی گندم مانگتے لگتے ہیں۔ اللہ اسے زندگی کے کسی مختلف فیر میں لایا تو۔ اسے بخشش مانگی چاہیے مگر وہ ”ہمایوں“ اور ”تیمور“ کو مانگتے لگ گئی حطیہ حطیہ کہنے لگ گئی گندم مانگتا برا نہیں تھا مگر پہلے بخشش مانگی تھی۔ وہ پہلا زینہ چڑھے بغیر دوسرے کو پھلانگتا چاہے رہی تھی اور ایسے یار کب لگا جاتا ہے؟

(نمرہ احمد۔ مصحف)

سدرہ بتول۔ ملتان

اللہ بہتر جانتا ہے

”ہمارے بھوکا رہنے سے جانے والے واہس نہیں آسکتے۔ کیا بھوکی رہ کر تم اللہ سے اپنی ناراضی کا اظہار کر رہی ہو۔ چونکہ اس نے تمہاری دعا میں قبول نہیں کیں، اس لیے تم اب اس کے دیے کھانے کو ہاتھ نہیں لگاؤ گی۔ کیا ہمیں اللہ کے ساتھ ناراض ہونے اور ضد کرنے کا حق ہے؟ ہم نہیں جانتے ہمارے لیے کیا بہتر ہے جو کچھ بظاہر ہمیں غلط ہوتا ہوا لگ رہا ہوتا ہے وہ ہی درحقیقت ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔“

(فرحت اشتیاق..... میرے ہدم میرے دوست)

اشا خیر..... شہداد پور

”تو گویا آپ شاعر ہیں، میرے دوست نے ان کا معائنہ کیا اور آکر ان سے کہا گیا۔“
”صاحب آپ بالکل درست ہیں۔“
بولے۔ ”یہ کس طرح ہو سکتا ہے..... تو گویا ہم یہاں تفریحاً آئے ہیں۔“

آخر تک آکر انہیں بتایا گیا کہ جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں، واقعی وہ ٹھیک ہے۔ ان کا دل گردوں کی جگہ رکھا ہے، گردے ٹکڑوں میں پڑے ہیں، جگر دماغ تک پہنچنا چاہتا ہے اب علاج کا سوال تھا۔
”یہ ایک ڈاکٹر کو کچھ سوجھ گیا۔ پوچھا۔“ کیوں صاحب! آخری غزل آپ نے کب لکھی تھی؟“
بولے ”دوڑھائی میں بنے ہوئے۔“

پوچھا۔ ”اور بیمار کب سے ہیں؟“
بولے۔ ”بس یہی دوڑھائی ماہ سے۔“
پوچھا۔ یہ غزل آپ نے کسی کو سنائی تھی؟“
کہنے لگے ”نہیں تو.....“
کہا۔ ”تو آپ سنا دیجیے۔“

بولے۔ ”نہیں صاحب! یہ کیا فرماتے ہیں آپ۔ کہاں یہ ناچیز اور کہاں اس ناچیز کا کلام لیکن آپ مصرع ہیں تو لیجیے۔“ انہوں نے آدھے گھنٹے میں اپنی غزل کا کرپلر رو کر سنائی۔

ہم نے اچھی طرح داد دی۔ جب وہ غزل سنا کر تھکے تو ان سے کہا۔ ”جناب! انی الحال تو آپ کے لیے علاج کی کوئی ضرورت نہیں، اگر پھر اس قسم کا دورہ آئے تو تشریف لے آئیے گا۔“

وہ ہنسی خوشی چلے گئے۔ چند مہینوں بعد پھر آئے۔ برا حال تھا، انتہائی بے زاری تھی، غزل سنائی دے کر راتے ہوئے تشریف لے گئے۔

(شفیق الرحمن..... لہریں)

افشاں مسیح..... کراچی

محبت

محبت میں اب اور پھر نہیں ہوتے اور نہ ہی ”یہاں“ ”وہاں“ ہی ہوتے ہیں سب ہی موسم محبت کے موسم ہیں۔ سب ہی جگہیں ”محبت کا موزوں مسکن ہیں۔“ ”محبت“ کوئی رکاوٹیں گوارہ نہیں کرتی، جس محبت کی راہ میں کوئی رکاوٹ جائل ہو سکتا ہو کہ وہ ابھی ”محبت“ کہلائی جانے کی مستحق نہیں۔

(میں خاتون مسیحی..... کتاب میرداد)

صدف مسیح..... کراچی

بوڑھا

مما تادمہ کہتا ہے ”اگر دنیا میں پیدا ہونے سے پہلے مجھ سے پوچھا جاتا اور مجھے جو اس مٹی میں بوڑھا پیدا ہوتا اور مجھ کو کرتا۔“ ہر آدمی چاہے وہ کتنا بھی جوان نظر آتا چاہے مگر وہ رہتا بوڑھے کی طرح چاہے گا۔

ہر پرانی چیز قیمتی ہوتی ہے۔ پرانا تو جھوٹ بھی نئے سچ سے زیادہ قابل اعتبار ہوتا ہے۔ انسان کی جتنی عزت بڑھاپے میں ہوتی ہے اتنی ساری زندگی نہیں ہوتی جس کی وجہ یہ ہے کہ بڑھاپے میں اس لیے عزت ہوتی ہے کہ اس وقت تک بندے کو جاننے والے ہم عمر بہت کم زندہ ہوتے ہیں، دنیا میں کوئی بوڑھا بے وقوف نہیں ہوتا، کیونکہ جو بے وقوف ہوتا ہے وہ بوڑھا نہیں ہوتا۔

دنیا میں تین قسم کے بوڑھے ہوتے ہیں، ایک وہ جو خود کو بوڑھا سمجھتے ہیں۔ دوسرے وہ جنہیں دوسرے بوڑھا سمجھتے ہیں اور تیسرے وہ جو واقعی بوڑھے ہوتے ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ مخلص، بوڑھا مخلص ہوتا ہے اور سب سے بڑا دشمن بوڑھا دشمن کیونکہ اس کا اپنا تو کوئی مستقبل نہیں لیکن وہ آپ کا مستقبل خراب کر سکتا ہے۔

بڑھاپے کی اس سے زیادہ برائی اور کیا ہوگی کہ آپ کو پاکستانی کا صدر بننے کے لیے جس کو الیکشن کی ضرورت ہے وہ صرف بڑھاپا ہے۔

(ڈاکٹر یونس بٹ..... شیطاناں)

افزاجت چین آباد

”لوگ کہتے تھے کہ میں پاگل ہوں، جبکہ میری رائے یہ تھی کہ لوگ پاگل ہیں۔“ پاگل نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
ڈاکٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ ”پھر کیا ہوا۔“
”ان کے حق میں ووٹ زیادہ پڑ گئے۔“ پاگل نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔
غزل فاطمہ..... ملتان

نفسہ
غائب دماغ پروفیسر نے ایک دن بھنگ پی لی اور نفسے میں کسی ٹوٹی قبر پر جا کرے۔ صبح آکھ کلی،
نفسہ اتر اتر دور سے بڑبڑائے۔
”غضب خدا کا یوم حشر آ گیا، میں واحد مردہ ہوں جو اپنی قبر سے نکل آیا، بانی تالاق سب ڈھیٹ بنے سو رہے ہیں۔“

آمنہ علی..... جہلم

انتخاب
ٹائپسٹ کی ملازمت کے لیے امیدواروں کا انتخاب ہو رہا تھا۔ ایک امیدوار سے انٹرویو کرنے والے نے پوچھا۔
”آپ ٹائپنگ کے علاوہ اور کیا جانتے ہیں؟“
امیدوار نے کہا۔ ”مذاق کرنا۔“ انٹرویو کرنے والے نے کہا۔
”کیا آپ اس کا عملی مظاہرہ کریں گے۔“
”کیوں نہیں۔“ یہ کہہ کر امیدوار نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر بیٹھے ہوئے امیدواروں سے کہا۔
”آپ لوگ جاسکتے ہیں، کیونکہ میرا انتخاب کر لیا گیا ہے۔“

گھڑی ساز
ایک گھڑی ساز نے اپنی روٹھی ہوئی بیوی کو کچھ اس طرح سے خط لکھا۔
میں نے ہمیشہ 13.7 دیا۔
تم بھی میرا 07.2 دو۔
ہم 02.90 کو ہمیشہ 01.07 رہنا ہے۔
اس لیے مجھ سے روٹھنے کی غلطی 02.12 مت کرنا۔

اسن عامر..... کراچی

مفت مشورہ
ایک بیمار استانی سے اس کا شوہر بولا۔ ”تم اس بار کسی جانوروں کے ڈاکٹروں کو دکھاؤ، تب ہی تم ٹھیک ہوگی۔“
استانی نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“
شوہر نے کہا۔ ”تم صبح مرغی کی طرح جلد اٹھ

جمہوری نظام
ایک ڈاکٹر نے پاگل خانے کا معائنہ کرتے ہوئے پوچھا۔
”تم یہاں، کس وجہ سے لائے گئے ہو۔ مجھے تو تم صحت مند دکھائی دیتے ہو۔“
”اس جمہوری نظام کی وجہ سے۔“ پاگل نے جواب دیا۔
ڈاکٹر نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

چراغوں میں روشنی نہ رہی

ایک صاحب آدمی رات کو اپنے دوست کے یہاں پہنچے اور بولے۔ ”یار! آج رات میں تمہارے یہاں سوؤں گا۔ تمہاری بھابی سے زبردست جھگڑا ہو گیا ہے۔“

”کس بات پر لڑائی ہو گئی۔“ دوست نے انہیں گھر کے اندر لاتے ہوئے پوچھا۔

”بس یار! سونے کے لیے لیٹ چکا تھا، مجھ پر غنودگی طاری ہو چکی تھی کہ اس وقت بیگم نے شاپنگ کے لیے دس ہزار روپے کی فرمائش کر دی۔ میں نے نیند کی سی حالت میں کہہ دیا کہ..... ٹھیک ہے، لے لیتا، دس ہزار روپے، لیکن پہلے وہ خطوط ٹائپ کر کے لے آؤ جو میں نے ڈکلیٹ کرائے ہیں..... بس اس کے بعد.....!“

حاکرن..... چوکی

وعدے

بیوی نے روتے ہوئے کہا۔ ”شادی سے پہلے تم کہتے تھے کہ میں شادی کے بعد بھی تم سے اسی طرح پیار کرتا رہوں گا۔ اب تو تم مجھ سے ہر وقت لڑتے رہتے ہو۔“

شوہر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”اُونے بچا! مجھے کیا معلوم تھا کہ میری شادی تیرے ہی ساتھ ہو جائے گی۔“

اقرا جٹ..... منجن آباد

☆☆

کچن اور آپ

اس ماہ سدرہ بتول کو کچن اور آپ میں انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ ادارے کی طرف سے سدرہ بتول کو تین ماہ کے لیے ”ماہنامہ کرن“ مفت دیا جا رہا ہے۔

جاتی ہو، گھوڑے کی طرح بھاگ کر ڈیوٹی پر جاتی ہو، گدھے کی طرح دن بھر کام کرتی ہو، لومڑی کی طرح ادھر ادھر کلاسیں لیتی رہتی ہو، بندر کی طرح پریل کے اشارے پر ناچتی ہو، گھر آ کر فیملی پر کاٹ کھانے کو دوڑتی ہو۔“ اب بھلا تباہ انسانوں کا ڈاکٹر جھیں کیا خاک ٹھیک کرے گا۔“

ارم کمال..... فیصل آباد

تجربہ

ایک پاگل سائنس دان نے کبھی کے دونوں پر کاٹ دیے اور کہا۔ ”اڑ، جا۔“ وہ نہیں اڑی۔ سائنس دان:- ”تجربے سے ثابت ہوا، اگر کبھی کے دونوں پر کاٹ دیے جائیں تو وہ سن بھی نہیں سکتی۔“

بدنامی

ایک پٹھان سوکھے دریا میں کشتی چلا رہا تھا۔ دوسرا پٹھان! ”ایسے پٹھانوں نے ہمارا نام بدنام کیا ہے، اگر ہم کو تیرا آنا تو جا کر اس کو بہت مارتا۔“

نشانی

”مس! گاندھی جی کے سر پہ بال کیوں نہیں تھے؟“
”مس! بیٹا یہ ذہین آدمی کی نشانی ہے۔“
بچہ! ”اچھا تب ہی لڑکیوں کے اتنے لمبے بال ہوتے ہیں۔“

خودکشی حرام

ایک سیاست دان خودکشی پر تقریر کر رہا تھا کہ ”خودکشی حرام ہے، ظلم ہے، گناہ ہے، بزدلی ہے، پاگل پن ہے۔“
”ایسی موت مرنے سے بہتر ہے کہ انسان اپنے آپ کو گولی مار دے۔“

مہرین جاوید..... لاہور

کا کردار بہت اسڑوٹنگ تھا۔ دوسرا حصہ پڑھ کر پھر میں نے کہانی کا پہلا حصہ بھی پڑھا۔ قرۃ العین سکندر کا ناولٹ ”شہر درد میں ڈوبی تہائی“ بھی بہت اچھا تھا۔ افسانہ ”نک تمنا لا حاصل“ (ساجدہ حسین) پسند آیا۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہم کچھ انوکھے کام کر جاتے ہیں۔

”کرن کتاب“ ”کرن کا دسترخوان“ دن بہ دن ٹکھرتی جا رہی ہے۔ اس کے مفید سلسلے بھی مجھے بے حد پسند ہیں۔ بس وقت کی کمی کے باعث اس کے سلسلوں میں شرکت سے محروم ہوں۔

ج:- پیاری بہن شمیم! آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی، مگر یہ سوچ کر چپ رہے کہ آپ اپنی مصروفیات کی وجہ سے کرن کی محفل میں شریک نہ ہوئیں۔ آپ کا کرن کی محفل میں شریک ہونا بہت اچھا لگتا ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ ہر دفعہ کرن پر تبصرہ کریں۔ آپ فرصت نکال کر ”کرن کتاب“ کے سلسلوں میں شامل ہوں، ہمیں بہت خوشی ہوگی۔

اقرا جٹ..... منجن آباد

”کرن“ سے ہمیں ڈھیروں شکوے ہیں بھئی، ہر دفعہ ہمیں رو کر دیا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی ہماری محبت دیکھیں، ہم باقاعدگی سے کرن پر مکتس دیتے ہیں۔ اکتوبر کا ٹائٹل ٹاکس تھا۔ ”کچھ لوگ جا کر بھی گیا کرتے ہیں“ مصباح علی سید وٹھرنفل موتیوں کو قلمبند کیا آپ نے۔ اٹھریلوں زبردست رہے۔ بات ہو جائے افسانوں کی، تو جی ”ایک سویرا تین رنگ“ عمارہ خان وٹھرنفل، ہلکی پھلکی تحریر میں اک بیٹھا سابق ”پرکھ“ نازی جی آپ کے تو کیا کہنے۔ (اشاء اللہ) ”بہار نثرن“ شبانہ شوکت جی وٹھرنفل

شمینہ اکرم..... بہار کالونی ملیر

سب سے پہلے مجھے ”من مورکھ“ اور پھر ”مجبور نصیم“ پڑھنا ہوتا ہے۔ مگر اپنے سب روٹین کے کام ختم کر کے انہیں ان سے ہی ڈائجسٹ لے کر پڑھتی ہوں۔ ”بیاد محمود فیصل“ مصباح علی سید کے قلم سے ”کچھ لوگ گیا کرتے ہیں“ لفظ لفظ جیسے کہ آنسوؤں سے لکھا گیا ہو۔ جو لوگ دلوں میں زندہ ہوں وہ مگر بھی نہیں مرتے، امر ہو جاتے ہیں۔ اللہ پاک ذوالقرنین جی کو جنت کے باغوں میں رکھے۔ (آمین) 11 نومبر کو شہید معیز اکرم کی بھی پانچویں برسی ہے۔ دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ آپ سب لوگوں سے..... ”من مورکھ“ پسندیدگی کے لحاظ سے صف اول پر آتا ہے۔ پورے کرن میں اس کی کہانی بہت زیادہ دلچسپ موڑ پر آگئی ہے۔ باہر کی شخصیت میں آنے والی مثبت تبدیلی نے جیسے ”من مورکھ“ کی پوری کہانی کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ ”مجبور نصیم“ شکر ہے جیل کی مشکلات آسان ہوئیں اور وہ بھی پردیس کا بن پاس کاٹ کر اپنوں میں واپس لوٹ رہا ہے۔ رواں چہ کی نادانی دیکھیں کہ اتنی بڑی خبر اپنے شوہر سے چھپائے رکھی۔ اب جیل کا ری ایکشن نہ جانے کیا ہو۔ مکمل ناول ”مرحوب“ مریم جہانگیر کا اپنے نام کی طرح منفرد اور اچھوتا لگا۔ اس ناول کی کہانی بہت جان دار اور مکالمہ بازی و جملہ نگاری غضب کی شان دار تھی۔ ”ریجنل“ کی آخری قسط کی خوش خبری ملی۔ عزتعلی عیسیٰ کا اٹھریلوں پڑھا۔ ”رڈن چہرہ“ (عزیزین دلی) کا دوسرا حصہ ”موحد“ (نام کی وجہ سے) پڑھنا شروع کیا۔ موحد میرا فیورٹ نام ہے۔ پوری کہانی موحد کی وجہ سے پڑھی، مگر بعد میں پتا چلا کہ کافی دلچسپ اسٹوری ہے۔ اس میں مریم

لہائیوں کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔ امید ہے کہ اگلے ماہ ان شاء اللہ آپ اپنے خط میں یہ کی دور کردیں گی۔

فصلہ نور..... روہڑی

اس بار ہمیشہ کی طرح کرن 17 تاریخ کو ملا۔ جلدی سے ”تاے میرے نام“ کی طرف بڑھی، لیکن اپنا نام نہ پا کر افسردہ کی ہوئی۔ اس ماہ کا ٹائل بس ٹھیک تھا۔ انٹرویو میں میرا کبھی سے ملاقات اچھی رہی۔ مکمل ناول ”مہجور نشین“ مصباح جی شکر ہے خصل کی ساری مشکلات کو دور کیا اور وہ واپس آ رہا ہے اور روانہ ہے کا انتظار ختم ہونے جا رہا ہے۔ جس طرح مصباح آپ نے جرنی کے قانون کے بارے میں بتایا ہے ہماری رائے از کافی ناچ

کے بعد کہانی لکھتی ہیں۔ یہ بہت محنت کا کام ہے۔ سلسلے وار ناول ”رہنزل“ تزیلہ جی نے جس طرح ماضی اور حال دونوں کو ساتھ بیان کیا، بہت زبردست تھا۔ ناولٹ ملیہ راشد ”زندگی کے رنگ انوکھے“ ویری ناکس، بلقیس پھوپھی انسان کے روپ میں شیطان تھیں۔ بے چاری یتیم بھتیجیوں پر ظلم کرتی رہیں۔ آپلی مجھے پوچھتا ہے کہ اپنی پیاری قارئین سسر زکے نام پیغام بھیجتا ہے کرن کتاب میں طریقہ بتادیں۔

ج:۔ پیاری فضل! آپ کے خط ہمیں مل جاتے ہیں، مگر دیر سے، مگر پڑھے ضرور جاتے ہیں۔ آپ پیغام لکھ کر پوسٹ کریں کرن کتاب میں لگا دیا جائے گا۔

عائشہ..... پتوکی

سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بات بتا دوں کہ میں کرن میں پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں اور اس امید کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرا خط آپ ضرور شائع کریں گی۔ میرا حلق کرن کے ساتھ بہت پرانا اور گہرا ہے۔ دو تین ماہ بعد میری شادی ہے اور اب پتا نہیں کہ میں بعد میں بھی کرن پڑھ سکوں گی یا نہیں۔ ویسے ان لوگوں کو پہلے سے پتا ہے کہ میں ناول پڑھتی ہوں اور ان کو اعتراض بھی نہیں ہے۔ ویسے ان شاء اللہ میں پڑھوں گی، کیونکہ میرے امی

فل ”ایک تمنا لا حاصل“ ٹھوڑی عجیب اسٹوری تھی۔ ”من مورکھ“ آسیر مرزا خوب رنگ بکھیر رہی ہیں۔ ”مہجور نشین“ مصباح جی خصل کے ساتھ کچھ نہ ہو اس اسٹوری میں، بڑی شدت سے نیکس قسط کا انتظار ہے۔ ”رہنزل“ تزیلہ جی ادے کا بدو عا میں دینا ایک آنکھ نہیں بھایا ہم کو۔ کوئین اچھی ہے۔ ٹاکس سی ہے۔ ”شہر درد میں ڈوبی تنہائی“ قرۃ العین جی بہت اعلیٰ لکھا۔ ”روشن چہرہ“ عمیرین ولی دوسرا اور آخری حصہ بھی شان دار تھا۔ ”زندگی کے انوکھے رنگ“ ملیہ راشد موضوع زبردست چنا آپ نے۔ اور سب سے اینڈ پر جی پر بات ہو جائے رمز حب کی سب سے سہلگی یہ اسٹوری موضوع بھی یونیک تھا۔ اسی طرح انٹری دیتی رہیں اور ہمیں اپنی تعریف کا موقع دیں جی۔

ج:۔ پیاری اقرار! ارے بھئی ایسے کیسے سوچ لیا کہ آپ کو رد کیا جائے گا۔ آپ کا یہ خط ہم کو ملا ہے اور شائع کر دیا گیا۔ کرن کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ ہر دفعہ اس طرح خط لکھیے کہ ہم کو 26 تک بھی مل جائے گا تو شائع ضرور کیا جائے گا۔

یاسمین کنول..... پسرور

اکتوبر کی ماڈل ڈھبی مسکراہٹ کے ساتھ بری پیاری لگی۔ فیروزی شیخ نے اس کی دلکشی کو مزید ابھارا۔ میرا کبھی کا انٹرویو اچھا لگا۔ ”رہنزل“ لگتا ہے آخری مراحل میں ہے، اللہ کرے انجام اچھا ہوا۔ انسانوں میں ”اک تمنا لا حاصل“ اچھا لگا۔ مستقل سلسلے تو ہوتے ہی اچھے ہیں۔ ”بیاد محمود باہر فیصل“ کے حوالے سے ”مصباح علی سید“ نے اچھا لکھا۔

انشاء جی کی بیگم شکیلہ انشاء اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں۔ بے حد افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جوار رحمت میں جگہ دے اور خاندان کو صبر جمیل بخشے۔ (آمین ثم آمین)

ج:۔ یاسمین کنول جی! واقعی میں جو لوگ دنیا میں اچھے کام کرتے ہیں، وہ ہمیشہ یاد رہتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں رہتے ہیں۔ اللہ سب کی مغفرت فرمائے۔ (آمین) آپ کا خط کچھ ادھورا سا لگا، آپ نے کرن کی

ٹھک ہی تھی۔ ”بہار نستر“ نام تو بہت اچھا تھا، لیکن اسٹوری بالکل سیدھی ساٹ لو اسٹوری، لیکن بری نہیں تھی۔ باقی تمام سلسلے بھی اچھے تھے۔ ”مہجور نشین“ ابھی میں نے پڑھا نہیں، لیکن آئندہ ماہ پوری کوشش کروں گی اس پر تبصرہ لکھ سکوں۔

ج:۔ ارم بشیر! پابہر نے بے شک کہا تھا کہ وہ مومن کے سامنے نہیں آئے گا، لیکن محبت میں انسان کا دل و دماغ کہاں اپنے بس میں رہتا ہے اور دوسرے پابہر اب اس گھر کا سربراہ ہے، ممکن نہیں کہ ایک گھر میں آئنا سامنا نہ ہو۔ کہانیاں جو پسند آئیں اور جو نہیں پسند آئیں ان کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کرنے کا بے حد شکریہ۔

سدرہ بتول..... ملتان

اس ماہ (اکتوبر) کے کرن میں اپنا خط دیکھ کر یقین کریں دل ٹوٹے ٹوٹے ہو گیا۔ یوں لگا جیسے بھری بس یا گاڑی میں کسی کو زبردستی بٹھا دیا جاتا ہے اور اجتماعی طور پر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ بس نہ اس سے کوئی بات کرے، نہ اس کی بات کا جواب دے، اس سے اچھا آپ میرا خط شامل نہ کرتے تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا، جتنا ادھورا اور نور پلائی والا خط دیکھ کر ہوا۔ خط کا جواب ضرور دیجیے گا، یہ ہی حال دوبارہ مت کیجیے گا۔ ورنہ بچا کچھ دل سرے کی طرح ہو جائے گا۔

ج:۔ پیاری سدرہ! ہمیں آپ کے دکھ کا اندازہ ہے، لیکن یقین کیجیے کہ یہ قصور ہرگز ہم سے سرزد نہیں ہوا۔ ہوتا یہ ہے کہ صفحات کی کمی کی وجہ سے ہمارا پیٹنگ کا شعبہ ہمیں بتائے بغیر آخری خط میں سے ایڈیٹنگ کر دیتے ہیں۔ جس کا علم ہمیں بعد میں ہوتا ہے۔ اس کے لیے ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں۔ ناؤر کے بارے میں جو آپ نے ہم سے پوچھا ہے تو 0212735021 فون کر کے معلوم کر لیجیے۔

حنا نور..... ایٹ آباد

سب سے پہلے افسانے پڑھے۔ ”ایک تنہا

اور ابو دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ان کے جانے کے بعد اگر میں مضبوط بنی ہوں تو کرن کی کہانیاں پڑھ کر، اس لیے یہ اب میری زندگی کا حصہ ہے۔ اب آئی ہوں اس ماہ کے ڈائجسٹ کی طرف، تو ناؤر بہت پیاری لگ رہی تھی۔ جی سب سے پہلے چھلانگ لگا لی مصباح علی سید کے ناول پر، شکر ہے جھل جرنی سے واپس آ رہا ہے اور جب روانہ ہوئے اسے نیا سر پرانز دے گی تو سوچ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ پلیز مصباح جی ان دونوں کو جلد نہ کرنا، باقی کی کہانیاں ابھی نہیں پڑھیں اور ایک بات آپ سے کرنی تھی کہ جولائی 2017ء کا شمارہ میں نے نہیں پڑھا اور اب مجھے مل بھی نہیں رہا۔ پلیز! مجھے بتادیں کہ میں جولائی کا شمارہ کہاں سے لے سکوں۔ پلیز! میرا خط ضرور شائع کریں۔

ج:۔ پیاری عائشہ! ہماری طرف سے بھی آپ کو شادی کی بہت بہت مبارک ہو۔ ان شاء اللہ سہ ماہ میں بھی آپ اور کرن کا ساتھ رہے گا۔ کرن کی پسندیدگی کا شکریہ اور جولائی 2017ء کا کرن آپ اپنا ایڈریس اور 100 روپے کا پی آرڈر بھیجوا کر منگوا سکتی ہیں۔

ارم بشیر..... اسلام آباد

اس ماہ کا کرن ناٹل اچھا تھا۔ عزت عباسی اور میرا سیدھی کا انٹرویو اچھا تھا۔ ”چکن اور آپ“ میں فائزہ بھٹی کی باتیں بہت مزے کی لگیں۔ تھوڑی سی کمی یہ لگی کہ اگر انٹرویو کے ساتھ تصویر کا آپشن بھی ہوتا تو ہم فائزہ کی پیاری باتوں کے ساتھ اس کی پیاری صورت بھی دیکھ لیتے، خیر..... ”من مورکھ“ اس دفعہ اچھا تھا۔ ایک بات کہوں۔ آئیہ جی! پابہر نے حوریہ کو یقین دلایا کہ وہ اس کے سامنے نہیں آئے گا، مگر پوری قسط میں بار بار دونوں سامنے آئے۔ اب یہ تو ہمیں پتا ہے کہ اسٹوری ہے ہی ان دونوں کی، مگر پھر بھی ایک قسط تک تو پابہر اپنی بات بے قائم رہتا۔ خیر..... ”روشن چہرہ“ بہت زیادہ اچھی تو نہیں تھی، بس ابھی تھی، پہلی قسط سے ہی اسٹوری پتا چل گئی کہ موصد ہی مریم کا ہیرو ہے۔ ”ایک سویرا تین رنگ“ عمارہ خان نے بہت اچھا لکھا۔ ”ایک تہنہ لا حاصل“ بھی بس

پر چھٹے بیان کے قائل نہیں، اگر یہ ہوئی میری اولاد بھر اس میں اسے اتنا کھانے کا بتاتی مجھے جلدی پورا کرو، شدید انتظار رہتا ہے، یہ تو ہو گیا ”بھور ٹیشن“ کا رونا، اب باری آگئی ”رہنزل“ اف..... اف..... تخریلہ میری بہن مجھے ملو گی کہاں، کونین تو دل میں ایسے ٹھاٹھا لگی ہے بیان کے قائل نہیں، رونے والے جھلے تھے بھی نہیں، میں پھر بھی روئی رہی، ایسے ہی تو وہ فریفتہ نہیں ہے اس بچی ابھن پر، ایک نئی رہنزل کو بننے سے روکنا چاہ رہی ہے۔ ”من مورکھ“ کی بات ناسنوبہت ہی معذرت کے ساتھ آسیدہج میں بہن میں تمہارے عنوان پر چند اقاط کے بعد ہی پوری طرح کار بند رہی، نہ سنا، نہ پڑھا، نہ دیکھنے کو جی چاہا، جذبہ جی نے سادی، جناب دین ہیر دین گیا، چلو جی اچھا کیا، افسانہ پڑھے، بہن چاروں ہی اور کتنی کہوں گی اس ماہ کے کسی افسانے متاثر تو کیا توجہ تک نہیں دینی نہ لفظ، نہ کہانی، بے سرو پا لکھ کر صفحے گھرے۔ ناولت عزیزین دلی کاروشن چہرے پر کیا خوب صورتی سے لکھا گیا، پڑھ کر دل بھی اجلا اجلا سا لگنے لگا۔ قرۃ العین بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ کہانی اور بیان اچھا شاباش مکمل ناول ”رحر حب“ مرم جہانگیر نام سے بالکل نئی رائٹر لگی۔ چند صفحے، مگر بے جا طوالت کا تاثر ملا پڑھا نہیں گیا۔ آج مکمل پڑھوں، پھر اس پر بھی رائے دوں گی، بہن خط لکھنا اتنا مسئلہ نہیں جتنا پوسٹ کروانا، جان جو کھا ہے بس پوسٹ کی سہولت مل گئی تو پھر نہ لکھیں، تب سستی کہلائے۔

ج:- پیاری بہن! آپ نے خط لکھا، خوشی ہوئی، لیکن لگتا ہے خط لکھنے کی جلدی میں کہانیوں پر توجہ نہ دی، جب ہی ایک بھی افسانہ اچھا نہ لگا آپ کو۔ مصباح تک آپ کا پیار پہنچا دیا گیا ہے۔

ام مرم..... پشاور

اس بار کا کرن 13 تاریخ کو موصول ہوا اور بیٹے بیٹے تاثر والی ماڈل نے بھر پور توجہ دینی۔ کرن کا سرورق دل میں گھر کر جاتا ہے، رسالہ اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ پڑھا اور داد دی آپ کی اور رائٹر کی محنت کو۔ افسانے میں ایک ہی نشست میں پڑھتی ہوں، ناز پہ کول نازی کا پرکھ

لا احسانہ سجادہ عین نے لکھا اور وہی جاتی ہوں لی کہ لکھا کیا، مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی، اگر کسی قاری کو آئی ہے تو پلیز ہمیں بھی بتا دے۔ مرم کا آخر کیا قصہ تھا۔ باقی دو بھی پڑھے، بہت عام سے، مگر اچھے لگے، پھر باری آئی اپنے ”من مورکھ“ کی تو وہ پڑھی، بے شک آسیر اپنے پرانے رنگ میں پرانا ہی پلاٹ لکھ رہی ہیں، مگر پھر بھی مزادے رہا ہے، ”رہنزل“ لپٹتے لپٹتے بھی وقت لے رہی ہے اور دل کی بات کہوں گی میں تو چاہتی ہی نہیں یہ لپٹ کر دے، اس قدر پسند ہے، اس کے بعد ہم کریں گے کیا۔ ”زری کی باتیں“ بہت ہی دل دکھاتی ہیں، کس طرح ماں کے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ”بھور ٹیشن“ میں مصباح علی نے ساتویں قسط میں بھی گرفت نہیں چھوڑی، جس سین میں روانہ حبیل کا فون بارش میں بیٹھ کر سنتی ہے، ایک وہ سین اور ایک حبیل اور اس کی ٹیلی فونک گفتگو مجھے بہت زیادہ پسند آئی۔ بہت ہی خوب صورت جملے اور بے قراری تھی، کئی جگہ رونا آیا، پلیز مصباح حبیل کو مار کر اتنا غلظ ہم اسٹوڈنٹس پر مت کرنا۔ باقی سلسلے بہت اچھے تھے۔ کچھ تو ابھی خط لکھنے کے پکر میں پڑھے نہیں۔

ج:- پیاری حنا! کرن کی محفل میں شریک ہوئیں۔ اچھا لگا، امید ہے کہ آئندہ بھی اس سے زیادہ اچھے تبصرہ کے ساتھ شریک ہوں گی۔

صغریٰ خاتون..... جڑاں والا

آج سے پہلے کسی اتفاق نہیں ہوا خط وغیرہ کسی ادارے میں لکھنے کا۔ اب ایسا بھی نہیں بہن کہ کسی خط لکھا ہی نہیں، جوانی میں بہت لکھے اپنے مایاں کو شادی سے پہلے بھی کزن تھے۔ کچھ دن پہلے میری بیٹی آئی ہوئی تھی پیچہ زدے کر، ڈرامے، رسالے سب دھو ڈالے۔ اسی کے اکسانے پر تو ہم نے خط لکھا، ایک وجہ یہ جو بچی لکھ رہی ہے ”بھور ٹیشن“، مصباح علی بہن اسے تو میرا بہت ہی پیار کہتا اور یہ بھی پوچھو یہ بچی رائٹر ہے؟ پروڈیوسر ہے؟ یا اداکارہ، ایسے لکھ رہی ہے قسم سے جیسے کوئی بڑی سی ایل سی ڈی سامنے لگا کر چلا دی ہو، پتا ہی نہیں چلتا صفحہ پڑھتے آ نکھ تب جھپکتے ہیں جب پڑھو باقی آئندہ جو غصہ اس وقت

سعدیہ..... قائد اعظم یونیورسٹی

حقیقت یہ ہے میں تو کرن پڑھ ہی ”رہنزل“ اور ”مہجور نشین“ کی وجہ سے رہی ہوں۔ مصباح اور تنزیلہ جی کی ہیرنوں اور ہیروز نے باندھ رکھا ہے۔ ایک طرف کونین، دوسری طرف روانیہ، میں جاؤں تو کہاں ایک طرف حبل، دوسری جانب سبج پلیر جلدی سے سبج کے دل میں نینا کی بے تحاشا محبت کا بوتلا لگا دیں اور حبل کو کھینچ کر واپس پاکستان، بہت زیادہ مصروفیت کے باوجود کرن ہاتھ میں آتے ساتھ ہی لسٹ سے صفحہ نمبر پڑھا اور غر آپ ان کے کتابی شکل میں آنے کو بک ریک بے قرار ہے اور دل اداس، دونوں لگتا ہے آگے کیچھے ساتھ چھوٹنے لگے ہیں۔ تنزیلہ مصباح کو بہت بہت سلام۔

ج۔ ج۔ پیاری سعدیہ! ”رہنزل“ اور ”مہجور نشین“ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کا سلام تنزیلہ ریاض اور مصباح علی سید تک پہنچ گیا ہے۔

نذاحمد..... ہری پور

اس ماہ کا کرن ہمہ کی طرح جھگمگا رہا۔ ”رہنزل“ ٹاپ آف لسٹ اور مزے کی بات کے ”مہجور نشین“ کی نئی رائٹر مصباح علی سید نے بہت جلد پرانی رائٹرز میں اپنی پہچان بنائی۔ اللہ زور قلم زیادہ کرے۔ افسانوں میں ”ایک سویرا“ پسند آیا۔ ”رحزب“ مریم جہانگیر کا بہت زبردست لگا۔ میں نے خاص طور پر خط اس لیے لکھا ہے میرے لیے خاص دعا کروائیں، اپنی فیملی سے تین رشتے ہیں، بہت مشکل سلیکشن ہے میرے حق میں، اچھا فیصلہ ہوتا۔ یا ماموں اور خالہ کوئی ناراض نہ ہو۔

ج۔ ج۔ پیاری نذا! آپ نے ٹینشن کی وجہ سے تبصرہ بھی بس توڑا سا کیا۔ ان شاء اللہ۔ اللہ آپ کے حق میں جو بہتر سمجھے گا وہی ہوگا۔ ہماری دعا ہے کہ آپ آئندہ خوشی خوشی کرن کی محفل میں شریک ہوں۔

ماہا کائنات خان..... شاہ سوار

بہت ہی سوسائٹس کا مددگار رہا۔ حاددا کی یالو پٹی بات ہے، بوڑھے کر کے رشتے کرتے رہو تاکہ ان کا اپنا دل رہے، نہ ہی اولاد کی خوشی دیکھ سکیں۔ افسانوں میں یہ ہی کمال کا تھا، باقی سوسو، ناولٹ نمبریں ولی کا روشن چہرہ، ایسا کون ہوگا جسے صبح کی روشنی پسند نہ ہو، کیسے کالی سیاہ رات کے اندھیرے کو مٹا کر رکھ دیتی ہے۔ بہت اچھا لگا۔ مکمل ناول مریم جہانگیر ”رحزب“ واہ واہ لفظ مناظر تسلسل ہر چیز پر پوری طرح چھائی ایک محبت کی لیلیٰ جتنوں جیسی کہانی اور مکمل۔ کئی جگہ آنکھ نمبر آئی کئی جگہ اش اش کیا جس طرح سے کہانی لے کر چلیں بہت سے موڑ بہت سے توڑ مجھے ہمیشہ سے ایسی ہی کہانیاں پسند آتی ہیں، جن میں کہانی ہی کہانی ہو ویلڈن۔ ”مہجور نشین“ مصباح علی سید اب تعریف والفاظ کی محتاج نہیں رہیں، اگر سب اس ناول کو بے پناہ سراہ رہے ہیں تو اس میں ان کی ہالوں کی محنت ہر ہر پرے میں جھلک رہی ہے، ان تک میری دو فرمائشیں پہنچا دیں، پلیر ایک تو خدارا کہانی میں ایک ایٹر کریش بہت نہیں؟ حبل کا دکھ روانیہ تو کیا ہم سب قارئین بھی سہا نہیں پائیں گے۔ دوسرا ان کے بارے میں جاننے کا بہت شوق ہے۔ پلیر پلیر پلیر ان کا چھوٹا سا ہی صبح، مگر ایک انٹرویو ناول کے اختتام پر ضرور لگائیں، بہت کچھ پوچھنا ہے ان سے۔ ”رہنزل“ دلوں میں گھر کرنے کے بعد جگڑ کر جدا ہوتی تحریر، تنزیلہ جی کا شاہکار کونین اپنی پرانی تمام لڑائی جگڑا لو عادات کے ساتھ دل کے بہت قریب رہی اور اب تو وہ بالکل سانس کے قریب ہو گئی۔ محذور سلیم ابھی بھی یاد آتا ہے۔ زری تو مجھے پہلی قسط سے ہی چلتی لگی تھی۔ خاور..... آہ اور سبج کی محبت واہ کاش شہرین ٹھیک ہو سکتی۔ کاش نینا، خاور کی ہوتی۔ کاش ایمین سبج کی توجہ پائی، کتنے کاش رہ جاتے ہیں اس کہانی میں۔ کرن کتاب اور باقی سلسلے آپ کی طرف سے ہمیں محبت کے بوس میں قبول ہوتے ہیں جن کا تہ دل سے شکریہ۔

ج۔ ج۔ ام مریم! کرن کی پسندیدگی کا شکریہ۔

2013ء سے کرن پڑھا رہے ہیں۔ یہی بار فاترہ افتخار کا ناولٹ ”شاید“ پڑھا تھا بس کرن کے عاشق ہیں، اس ماہ ٹائٹل بس ٹھیک تھا قائل ٹائٹل دیا کریں۔ ”رہنزل“ پلیئر ختم کریں ”من مورکھ کو بھی۔۔۔“ مقابل ہے آئینہ“ میں مجھے اتنی جلدی جگہ دینے کا بہت بہت شکریہ۔ ”رمزجب“ پسند نہیں آیا۔ ”زندگی کے انوکھے رنگ“ اور ”روشن چہرہ“ ٹاپ پر رہے جبکہ قرۃ العین سکندر اس دفعہ متاثر نہیں کر سکیں۔ ”برکھ“ ”بہارِ نیشنل“ بھی خوب رہے۔ شبانہ آپنی ناولٹ لکھ ڈالیں۔ ”محبت ہم سفر ہے، عمارہ اور ساجدہ نے بھی اچھا لکھا۔ مستقل سلسلے اے دن تھے۔

ج:۔ پیاری ماہا! اللہ تعالیٰ آپ کی ای کو یوں ہی صحت یاب رکھے آمین۔ کرن کی کہانیاں آپ کو پسند آئیں شکر یہ اور جو پسند نہیں آئیں ان کا بھی شکریہ۔

ج:۔ پیاری اقراء ممتاز! اب کی دفعہ بھی آپ نے کرن کی کہانیاں پر تبصرہ بہت خوب کیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو اس دفعہ ”مسکراتی کرنیں“ پسند نہیں آئیں۔ اقراء یہ آپ بہنوں کا ہی سلسلہ ہے اور آپ بہنوں کی بھیجی گئیں۔ ”مسکراتی کرنیں“ ہی شائع کی جاتی ہیں۔ کیونکہ بہنوں کی خوشی کا خیال رکھا جاتا ہے۔

ج:۔ پیاری ماہا! اللہ تعالیٰ آپ کی ای کو یوں ہی صحت یاب رکھے آمین۔ کرن کی کہانیاں آپ کو پسند آئیں شکر یہ اور جو پسند نہیں آئیں ان کا بھی شکریہ۔

تبسم بشیر عروسی..... شاہ سوار ڈنگہ ٹائٹل بس سو لوگا، حمد و نعت سے ایمان کو غسل دیا اس کے بعد ”کچھ لوگ جا کر بھی جیا کرتے ہیں“ پڑھا واقعی کچھ لوگ نہ ہونے کے باوجود بھی ہمارے دلوں میں ہمیشہ رہتے ہیں۔ کیا خوب لکھا مصباح نے۔ انٹریوز پر ایک نگاہ دورانی۔

اقراء ممتاز..... سرگودھا ٹائٹل گرل کی مسکراہٹ نے دل مولیا۔ انشاء جی کی اہلیہ محترمہ شکیلہ انشاء کی وفات کا سن کر دکھ ہوا خدا ان کو جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائیں (آمین) ”کچھ لوگ جا کر بھی جیا کرتے ہیں“ مصباح علی سید کو پڑھا۔ تمام انٹریوز اچھے تھے۔

”میرے نام“ پہ پہنچے تو یہ کیا ہم وہاں تھے ہی نہیں ایک بل کو سوچا کہ میں نے تو وقت پہ خط پوسٹ کر دیا تھا تو پھر کرن ہمیں رجحانک کرے ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا، اور پھر بہت سوچے سمجھنے کے بعد ڈاک والوں کو خوب ساری دعائیں دیں۔ ”رہنزل“ پلیئر ختم کریں اور کسی اچھی سی رائٹر کا سلسلہ وار شروع کریں۔ جیسے محبت عبد اللہ یا راحت جیس؟ مکمل ناول ”رمزجب“ کا مطلب کیا ہے؟ دیے ناول اے دن تھا امیزنگ۔ ”روشن چہرہ“ دو اقساط کا ناولٹ نہ زیادہ لمبا کھینچنا نہ زیادہ انتظار کروایا مزا آ گیا۔ عزیزین دلی آتی رہا کریں۔ ”انوکھے رنگ“ بس ٹھیک ہی لگا۔ ”شہر درد میں“ دلیل ڈن قرۃ العین جی۔ بہت اچھا لکھا آپ نے، افسانے اس دفعہ چار تھے، ٹاپ پر عمارہ خان کا ”ایک سویرا تین رنگ“ دلیل ڈن عمارہ واقعی ایسا ہی ہے ہر کوئی دوسروں کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اس کی زندگی تو ہم

”من مورکھ کی بات نہ مانو“ میں حوریہ شکر ہے تھوڑی بہت راضی تو ہوئی۔ حوریہ کو چاہیے کہ بابر کا ہاتھ تمام لے۔

”زندگی کے انوکھے رنگ“ اچھی کاوش تھی۔ بلیقہس بیگم تو پھو پھو کھلوانے کے قابل بھی نہیں تھیں۔ حرم نے اپنی زندگی کو دواؤ پر لگا کر ثابت کر دیا کہ بہن سے بڑا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ خدا نے اس کی قربانی راگیاں نہیں جانے دی۔ ”مہجور نشین“ کی یہ قسط کیا سپر ہٹ تھی۔ حبل ذکا شکر ہے خیر خیریت سے واپس پاکستان تو پہنچا۔ ”رمزجب“ اس کہانی کے بارے میں کیا کہوں۔ اس اسٹوری نے شروع سے ہی اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ زین کی باتیں ہمیں تو حیران پریشان کر دیتی تھیں کہ اتنی چھوٹی عمر میں اتنی بڑی بڑی باتیں۔

کے بہترین اداکار ہیں۔ یہ ایک بہت اچھی اور دلکش شہینہ کی روشنی میں ہم کرن کو بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش میں کوشاں ہیں۔ ”مہجور ٹیشن“ میں روانہ پہلے لڑکی تھی شادی لڑکی میں ٹھوڑی بہت تو تبدیلی لائی ہی ہے یہ ایک قدرتی تبدیلی ہے۔

کرن مشاق احمد مہوش مشاق احمد..... ساہیوال ایک لمبے عرصہ سے ہم کرن میں حاضر ہونے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن شاید ابھی قسمت میں منظوری نہیں ہے۔ ایک سال مسلسل اتنے خطوط بھیجے ہیں کہ اب تو خود یاد نہیں ہے، پوسٹ آفس گئے۔ TCS کے لیے لیکن جب طویل انتظار کے بعد کرن ہاتھ میں آتا تو وہاں دنیا جہاں کے نام ہوئے سوائے ہمارے۔ لیکن اب ایک بار پھر ہم کوشش کر رہے۔ شاید اس بار کرن کو دم آ جائے۔ کرن کو آٹھ، نو سالوں سے پڑھ رہے ہیں گھر میں کرن کی ایک کثیر تعداد موجود ہے (ہاہا!) آپنی بہتی ہیں اتنی تو گھر میں ایشیں نہیں ہیں جتنے تم لوگوں کے میگزین ہیں۔ اب کیا کریں کرن سے محبت ہی بہت ہے۔ اب اگر آپ نے ہمیں جواب نہ دیا نہ تو ہم نے خفا ہو جانا ہے۔ بچی، اب ضرور جواب دیجیے گا۔

ج:- پیاری کرن اور مہوش! ہمیں حیرت ہے کہ آپ لوگوں نے اتنے خطوط بھیجے اور ہمیں ایک بھی نہیں ملا۔ حد ہے۔ ٹی سی ایس کے ذریعے بھیجے جانے والے خطوط بھی ہمیں نہ مل سکے۔ آپ لوگوں کا یہ پہلا خط موصول ہوا ہے جو شائع کیا جا رہا ہے۔ کرن سے محبت اور پسندیدگی کا شکریہ۔ ایک شکایت ہمیں بھی ہے کہ کہانیوں پر تبصرہ آپ نے نہیں کیا جو اس محفل کو سنانے کا مقصد ہے۔ نور فاطمہ عابد..... میلی

میرے ماں، باپا بالکل بھی ایسے نہیں کہ رسالے پڑھنے پر پابندی عائد کریں، بس اتنا کہتے ہیں، جب گھر آؤ، تب پڑھو اور پہلے تعلیم۔ اسی لیے میں بھی انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیتی، تاکہ پابندیاں نہ لگیں۔ اس بار کا شمار بہت اچھا تھا۔ دیے کرن نے گزشتہ تین سال میں اپنا معیار بہت اچھا کیا ہے، اس کی اہم وجہ بہترین

نازیہ کول نازی نے بھی بہت خوب لکھا، جبکہ شیانہ شوکت اس دفعہ کچھ رنگ نہ بچا سکیں، ساجدہ نے بھی اچھی تحریر لکھی، ”مستقل سلسلے مجھے ”کرن کرن خوشبو“ بہت پسند ہیں۔

ج:- پیاری تبسم! ہم خطوط رنجکٹ نہیں کیا کرتے کیونکہ آپ بہنوں کے خطوط سے ہی تو آپ لوگوں کی آراء سے آگاہی ہوتی ہے۔ بس شرط ہے وقت پر ملنا چاہیے دیر سے ملنے پر خطوط پڑھے ضرور جاتے ہیں بس شائع ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ ”مرحوب“ کا مطلب ہے ”محبت کا راز“۔

ارم کمال..... فیصل آباد کرن کا جاذب نظر ٹائٹل نے دل موہ لیا۔ سب سے پہلے ”من مودک کی بات نہ مانو“ میں باہر کا اتنا بدل جانا کہ وہ باہر نہ ہو حازم ہو حیرت زدہ کر گیا اے محبت بلاشبہ یہ تیری کرشمہ سازیاں ہیں تو جس پر آتی ہے نازل ہوتی ہے اسے الٹ پلٹ کر رکھ دیتی ہے کہ وہ خود کو بھی پہچان نہیں پاتا۔ مصباح علی سید کا ”مہجور ٹیشن“ میں روانہ کی مصحوبیت کا ختم ہونا اچھا نہیں لگ رہا۔ جنبل کے ساتھ نے اسے پچھل لڑکی سے سو برعورت میں تبدیل کر دیا ہے جبکہ ”رہنزل“ میں نینا کی بے چارگی پر رونا آتا ہے نینا کی زندگی میں خوشی کی کوئی کرن تو ہونی چاہیے نا! ”زندگی کے انوکھے رنگ“ نے حریم کی خاموشی اور صبر نے اس کی زندگی ہی بدل ڈالی جبکہ بقیس بیگم جیسی عورتیں ہمیشہ نقصان اٹھانے کے بعد ہی کیوں سیدی راہ پر آتی ہیں ”بہار نثرن“ میں فضا کے چچانے فضا کو تعلیم کی دولت سے کندن بنا دیا اور سلمان والد کی سختی سے کندن بن گیا۔ مریم جہانگیر کا ”مرحوب“ مسر از کر گیا، محبت میں یقین در یقین کا سفر رانگاں نہیں گیا زبردست مریم جی، عزیزین دلی کا ”روشن چہرہ“ کا آخری حصہ روح کو سرشار کر گیا، مستقل سلسلے کرن میں چار چاند لگاتے ہیں اور مجھے جی جان سے پسند ہیں۔

ج:- ارم کمال جی! کرن کی کہانیوں کو پسند کرنے

خوری کا حازم بنائے پھوڑیں کی رائٹر جی ویسے ہم جی
رائی یہ رضا ہیں۔ دوسرا ناول ”رہنزل“ چلیں لاسٹ
قسط آئی تھی۔ مجھے لگتا ہے یہ شہرین کے بغیر سچ بھی نہیں
رہے گا اور نینا خاوری کی جوڑی بنے گی۔ نینا، ایمن اور مہر
دولوں کو پالے گی۔

مکمل ناول ”زحرجب“ سپر ہٹ یہ ناول لگا۔ کافی
عرصہ کے بعد دل سے کاش نکلا کہ زمین اسی دنیا کا باسی
ہو۔ شروع میں تو لگا یہ ٹین اتج کی محبت ہے، پر جیسے جیسے
تحریر کو پڑھا۔ سحر ساطاری ہونے لگا۔ مریم جی آپ نے تو
کمال کر دیا۔ ”مہجور ٹین“ اس بار کی قسط سوسورہی۔

ناول ”شہر دریں ڈوبی“ ایک سادہ سی تحریر۔ جیسے
کھانے کے ٹیل پر پرانی بغیر سلا بخیر چٹنی کے پڑی ہو۔
”پرکھ“ حقیقت کے قریب تھا ہمارے معاشرے کا البتہ
ہے۔ ”زوجین چہرہ“ دوسرا اور آخری حصہ پڑھا۔ دیے
اپنے دل کی بات کردوں، کیا کہہ رہا ہے، تو جناب ایسے تو
کہیں نہیں ہوتا۔ حقیقت میں کہاں ایسا ہوتا ہے، موجد کا
جو ٹیٹ تھا۔ اس کے لیے پھر یونہی حسن چاہیے ہوتا۔ یا
پھر یہ کہہ لیں کہ مریم قسمت کی وحی نکلی جو موجد جیسا ہیرا
مل گیا۔ موجد اور مریم کا ملاپ اچھا لگا۔ دونوں ”م“ کی
جوڑی موجد مریم۔ افسانے سب سے لاسٹ والا ”ایک
سورہ، تین رنگ“ سمندر کو کوزے میں بند کرنے والی بات
تھی۔ بہت اچھا سبق۔

ج۔ فوزیہ جی! حسب معمول آپ نے کرن کی
تمام کہانیوں کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کیا ہے،
اس سے ہمیں بے حد خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے دل سے
کرن کو پڑھا ہے۔ فوزیہ ”من مورکھ“ میں فضا کیونکہ
اپنے گھر میں سیٹ ہو گئی ہے اور خوش ہے، اس لیے اس
نے تمام پچھلے دکھ بھلا دیے ہیں اور جب انسان خوش ہو تو
سب کو معاف کر دیتا ہے۔ ”زہی بات“ ”مہجور ٹین“ کی تو
رائٹرز اپنی اسٹوری میں کوئی واقعہ بے وجہ نہیں ڈالتے،
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا اور ”زوجین چہرہ“ تو فوزیہ جی
محبت اندھی ہوئی ہے، جب ہو جائے تو وہ ہی سب سے
پیارا ہوتا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا، حاس
طور پر ”ایک سورہ، تین رنگ“ مکمل ناول میں تو ”مصباح
علی سید“ ایسے چھا چکی ہیں کہ کسی کی باری آنے نہیں
دے رہیں۔ ان کے سین ایک ماحول بنا دیتے ہیں جو
آگے پیچھے ہونے نہیں دیتا۔ پسندیدگی کے باوجود مجھے
مصباح سے ایک شدید اختلاف ہے، ان سے کہیں کہانی
ایسی جگہ تو ختم کریں، مہینہ آرام سے تو گزرے۔ ویٹ
بہت حال گسل ہے آپ۔ ”رہنزل“ کا ہر کردار انگوٹھی
میں جھپکنے کی مانند ہے۔

”من مورکھ کی بات نہ مانو“ میں خوریہ کا کردار
بہت مضبوط دکھایا ہے اور نصیب پھو بھی جیسا! بس خوریہ
کے ساتھ سب اچھا ہونا چاہیے۔
آئی! ”یقین کا سفر“ کے ہیرو کا اندر یو ضرور
لگائیں۔ میری ماما آپ سب کو سلام کے ساتھ حزیلہ
آپس مرزا مصباح علی سید، سائبہ اکرم کو بہت زیادہ
دعائیں دے رہی ہیں۔ ان کی کہانیاں بہت پسند ہیں۔
میری ماما کا نام انیلا ہے۔

ج۔ نور فاطمہ جی! ”تاں میرے نام“ کی محفل
میں ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہوسٹل کی تکلیف وہ
زندگی کا ہمیں اندازہ ہے، لیکن کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا
بھی پڑتا ہے۔ پھر تعلیم تو بہت ضروری ہے اور ہمارا تو کہنا
بھی یہ ہی ہے کہ جب آپ جیسی اسٹوڈنٹ کا ذہن پڑھتے
پڑھتے تھکاؤ کا شکار ہو جائے تو ذہن کو پرسکون کرنے
کے لیے ”کرن“ بہترین ذریعہ ہے۔ مصباح سے آپ کو
اختلاف ہے، لیکن یہ بات بھی مد نظر رکھیں کہ سلسلہ وار
کہانیوں کا حسن اسی بات میں ہے کہ قسط ایسے موڑ پر ختم
کی جائے کہ قارئین تجسس کا شکار رہیں اور اگلی قسط کا بے
چینی سے انتظار کریں۔ آپ کی ماما کی دعائیں تمام راسٹرز
کو پہنچا دی گئی ہیں اور آپ کی فرمائش شاہین رشید کو پہنچا
دی گئی ہے۔

فوزیہ جی! ہانیہ عمران، آمیزہ رئیس..... کجرات
اکتوبر کا شمار بادہ کوٹا۔
سب سے پہلے کرن کا پہلا مکمل ناول ”من مورکھ“